

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.Paksociety.com for More

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پہلی کہانیاں

November

2015

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بے مثال اداکارہ صنم بلوچ



READING Section

☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکا خیز ناول

پچی کہانیاں

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانہی سہام مرزا



منیجر مارکیٹنگ

021-35893121

منیجر سرکولیشن

0333-2269932

مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام
مدیر : کاشی چوہان / دانیال سہابی

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رکن آل پاکستان نڈ بیج زوسماکی
رکن کونسل آف پاکستان نڈ بیج ڈاٹ نڈرز

MEMBER
APNS
CPNE

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

خط و کتابت کا پتہ: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کراشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے * جلد: 32 - شمارہ: 11 * نومبر: 2015ء

ایڈیٹر: منزہ سہام نے ٹی پریس سے پیوٹر شائع کیا۔

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دو شیزہ اور چچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل نہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

READING
Section

170 **میشا**
رئیسہ خالد

جوشی کی بات سچ ثابت ہوئی اور میشا.....

166 **دوسری بیوی**
کتول عمران خان

شاید محرش سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتا ہی میرا گناہ بن گیا تھا جو درد.....

158 **سنم بلوچ**
ذیشان فراز

وہ اداکارہ جو آج بھی لوگوں کے دلوں پر راج کر رہی ہے

179 **مفاد**
جوہریہ ملک

اُسے ہر شخص مفاد پرست ملا تھا لیکن وہ لڑکی.....

176 **پھکی**
انیل حسین پنھان

اُس امیر لڑکی نے ثواب کمانے کے لیے اُسے پختا جو پہلے ہی.....

173 **ویر ہے اندھیر نہیں**
ام عادل

خدا جب دینے پر آتا ہے تو پتھر پھاڑ کر دیتا ہے

188 **انسانوں کے جنگل ہیں**
شازی سعید مغل

اُس مرد کی کہانی، جو ایک غیر انسانی مخلوق بن کر رہ گیا تھا

185 **احتیاط ضروری ہے**
حنا بشری

میں آج تک نہ سمجھ پائی کہ سر مجھ ایسی عام سی لڑکی سے کیا چاہتے تھے

182 **قصور کس کا؟**
حاسم وقاص

اوپر والے کو الزام مت دوسارا قصور ان نیچے والوں ہی کا ہے.....

208 **ندامت**
جاوید راہی

اُس مجرم کی مجیبہ سے محبت ہی تختہ دار تک لے گئی

203 **قدرت**
نازیہ بتول رضا

اُس نوجوان کی کہانی، قدرت نے جس کی محنت کی لاج رکھ لی تھی

196 **ایک چھوٹی سی اواسٹوری**
ابوہریرہ بلوچ

اُس نوجوان کا قصہ، جس کی محبت فقط چار دن ہی کی ثابت ہوئی تھی

242 **مسئلہ یہ ہے**
ادارہ

آپ کا مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

233 **واپسی**
ممتاز احمد

اُس نے ٹھوکریں کھا کھا کر ہی سونے اور پیتل کے فرق کو جانا تھا

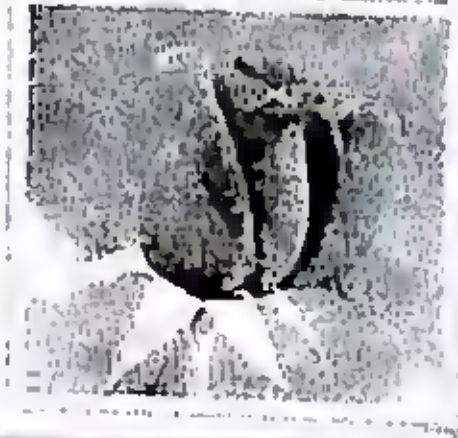
214 **زہر عشق**
کاشی جوهان

خوف اور رنگوں میں لہو جمادینے والے مناظر نے بھر پور نیا سلسلہ

257 **تیر نیم کش**
قارئین

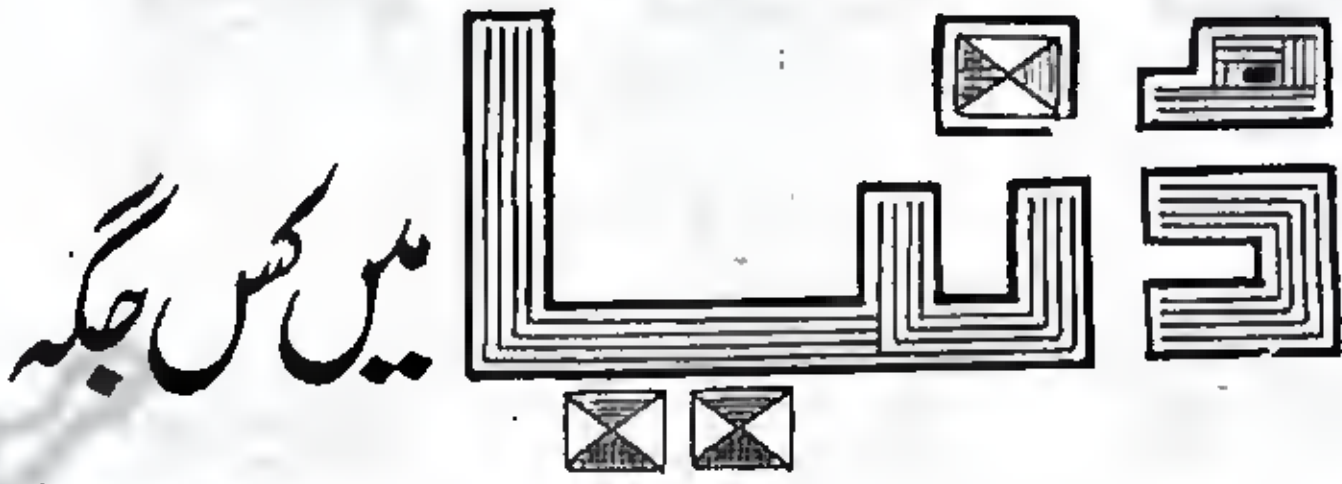
زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ قارئین کی سخن نہیں جو جسے قارئین خود ترتیب دیتے ہیں آزمانا ایک دلچسپ سلسلہ

252 **ہائیڈ پارک**
ڈی خان



ی پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر انٹرنیٹ مشیر جی ایم بھٹی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

READING Section



سچی کہانیاں کے چرچے ہیں

اس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برستے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے۔ سچی کہانیاں میں آپ بتیاں، جگ بتیاں، اعترافات، مجرم و سزا کی کہانیاں، ناقابل یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین دیکھ کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ سچی کہانیاں میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا۔ اپنی نوعیت کا واحد خریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرنٹ پبلی کیشنز : II-C-88 فرسٹ فلور، خیابان جامی کراچی۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی فون نمبر: 021-35893121-35893122

ای میل : pearlpublicatlons@hotmail.com

READING
Section



معجزہ

میں اپنے تمام پڑھنے والوں کو نئے سال کی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ یہ نیا سال ہم سب کی زندگیوں میں روشنیوں کے جھلملاتے ستارے بھر دے۔ کسی کی زندگی میں کوئی غم، کوئی دکھ نہ آئے..... جن لوگوں نے گزرے سال اپنے پیاروں کو کھویا، اللہ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ میری دعا ہے کہ یہ نیا سال میرے وطن کے لیے خوشیوں کے پیغام لائے۔ میرے اہل وطن اس نئے سال اور اس کے بعد آنے والے ہر سال میں صرف امن و آشتی کی راہ کے مسافر ہوں۔ بس چین ہی چین ہو۔ پاکستانی بہت دکھا اٹھا چکے، بڑے بڑے سانحات سے گزر چکے، کرب کے لمحے بھی صدیوں کی طوالت رکھتے ہیں پھر ہم تو برسہا برس سے یقینی اور بے یقینی کے درمیان معلق ہیں۔ میری دعا ہے کہ میرا رب ہمارے گناہوں کو معاف کر کے ہم پر بھی نظرِ کرم فرمائے۔ ہم حضرت محمد ﷺ کے امتی، اُن کے نام لیوا، اُن کے لیے باعثِ ندامت نہ ہوں بلکہ باعثِ فخر ہوں۔ پل صراط کے اُس پار جب وہ ہمارے منتظر ہوں تو ہم گڑھے میں گرنے کے بجائے اُن تک پہنچ سکیں۔ اے سارے جہانوں کے مالک! ہمیں بخش دے۔ ہم بھی تیری بنائی ہوئی دنیا کی خوشیوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ کوئی پاکستانی اب لاپتہ نہ ہو..... انصاف کے حصول کے لیے جان نہ دینی پڑے، پیٹ بھر غذا میسر ہو، سر پر اپنی چھت ہو اور انصاف کابل بالہ ہو..... یا اللہ! معجزے آج بھی ہوتے ہیں۔ یہ معجزہ بھی عطا کر دے۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور ان کے جواب

پیارے ساتھیو!

کہیے کیسے ہیں؟ آپ سے ملاقات کے تیس دن تو اس طرح گزر رہے ہیں جیسے ابھی دو ہی دن ہوئے ہوں۔ مگر پیارو! کیا کریں۔ یہ دو دن بڑے محنت طلب ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو وہ جو کہتے ہیں تاکہ زندگی چار دن کی ہے تو یہ حقیقت ہے۔ چار دن میں ہی سب کچھ سمٹ جاتا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ اُسے ہر دن کچھ نیا کرنا ہے۔ ہمیں اشرف المخلوقات بنایا ہے تو ہم اُس کی بہترین تخلیق ہوئے۔ یہ روزانہ شاہ کو گدا اور گدا کو شاہ بنا دینا، جھونپڑی والے کو کھل عطا کر دینا، خالی جیب والے کا گرینڈ پیپر پرائز نکال دینا، پوچھو پوچھو بڈی لیے مریض کو پھر سے چلتا کر دینا، ایک عام ورکر کالج میں، عمرے میں نام نکل آنا، اچانک سے بحری، بڑی اور فضائی سفر میں آدی کا عازم سفر ہو جانا۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب اللہ کے نئے کام ہیں، جو وہ ہم سے کروانا ہے۔ 30 ستمبر کو ہمارے ساتھ ایک ایسا حادثہ ہوا کہ موت دو قدم پر نظر آئی۔۔۔۔۔ لہولہان وجود لیے امید کا کاسہ ہاتھ میں تھا اور۔۔۔۔۔ یہ خدا کا نیا کام ہی تھا کہ ہفتہ دس دن میں پھر سے میں اپنے پیاروں کے سچ اُسی توانائی کے ساتھ موجود ہوں۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے اپنے پیاروں کی دعاؤں سے شفا اور صحت نصیب ہوئی۔ زخم یوں لگا جیسے جادو سے بھر گئے۔ خوش رہیے۔ زندگی چاروں کی ہے۔ جیو اور جینے دو۔ آئیے اب آتے ہیں اپنے پیاروں کے خطوط کی جانب۔ یہ پہلی حاضری ہے عرصے بعد ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی حنا بشری کی لاہور سے، لکھتی ہیں۔ عقیدتوں کا سفر پڑھ کر واقعی روح میں سکون اُتر گیا۔ ایمان کو تازہ کرنے والی کہانیاں تھیں۔ مجرم کون، واری، دیکھتی آنکھیں، ابا کی بختاور، کینسر، پامسٹ واقعی لاجواب تھیں۔ جیت زیا بدر کی کہانی واقعی خاص تھی۔ عزت دار اور کتے کی موت بے حد عبرت ناک کہانیاں تھیں۔ ارم ناز نے بے حد اچھا لکھا۔ فرزانہ نگہت کی انصاف، مجید احمد جانی کی نرالے یہ بھید ہیں، نیل جاوید کی روگ عمر بھر کا ہے۔ بہت سبق آموز تحریریں تھیں۔ پگی راشد لطیف کی تحریر بھی متاثر کن تھی۔ حکایتیں تمام کی تمام بہترین تھیں۔ سماج سیوا، موکی پرندے، ڈھونڈو گے ہمیں، مرد کہانیوں نے بھی اپنا خوب رنگ جمایا۔ جاوید راہی صاحب اور ممتاز احمد صاحب تو ہمیشہ بہترین تحریر ہی لاتے ہیں۔ سب نے بہت اچھا لکھا سب نے بہت محنت کی، کاشی بھیا زہر عشق بہترین انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ سچی کہانیاں ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ گڈی آپا کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے سوگواران کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) آخر میں ایک اہم بات میں نے تمام خطوط بے حد غور سے پڑھے کہ کسی میں لڑائی جھگڑا تو نہیں تنقید ہو رہی ہے یا تذلیل ہو رہی ہے۔ مگر پڑھ کر بے حد سکون حاصل ہوا کہ تمام خطوط بے حد محبت سے لکھے گئے۔ سب پڑھنے والوں اور لکھنے والوں سے میری گزارش ہے کہ تنقید

صرف اصلاح کے لیے کی جائے نہ کہ حوصلہ شکنی کے لیے کیونکہ ہم سب ایک دوسرے کا حوصلہ ہیں۔ ایک دوسرے کی ہمت ہیں۔ کاشی بھیا اللہ آپ کو سلامت رکھے اور دین و دنیا کی بے حد کامیابیاں عطا فرمائے (آمین) اب اجازت۔

☆ پیاری بہن! سلامت رہو! تبصرے کا شکر یہ۔ اگلے ماہ کے تبصرے کا انتظار تمہارا بھائی ابھی سے کر رہا ہے۔

✉ سرگودھا سے ہمارے بہت پیارے اور معصوم لکھاری ممتاز احمد لکھتے ہیں۔ کاشی بھیا آپ کے ایکسٹرنٹ کا سن کر بہت دکھ ہوا اور شاک لگا۔ اللہ کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے اُس نے آپ کو محفوظ رکھا۔ اللہ پاک آپ کو جلد از جلد صحت یابی و تندرستی عطا فرمائے آمین۔ اکتوبر کا شمارہ عید کے فوراً بعد مل گیا۔ بین الاقوامی حالات کے تناظر میں منزہ سہام کا ادارہ بد نصیب کون دل کو مضموم کر گیا۔ فکر انگیز اور شاندار الفاظ کے ساتھ کاشی نے احوال کا آغاز کیا۔ جی پیارے کاشی بھیا سب سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کو ایسا کیوں لگا کہ میں آپ کا ممتاز نہیں؟ جی جناب میں وہی ممتاز ہوں جو پہلے تھا اور انشاء اللہ وہی رہوں گا۔ پیار، خلوص اور محبتیں بانٹنے والا۔ محترمہ زرینہ جو نیچو احوال میں کرسی صدارت پر رونق افروز تھیں۔ آپ طویل غیر حاضری کے بعد آئیں تو پلیز اب آئندہ غیر حاضری نہیں چلے گی۔ محترمہ تحسین جو نیچو اپنے شاندار تبصرے کے ساتھ دوسرے نمبر پر احوال کو رونق بخش رہی تھیں۔ آپ کی حاضری بھی ریگولر ہونی چاہیے۔ محترمہ روبینہ ناز روبی صاحبہ فیصل آباد سے پندرہ سال بعد احوال میں تشریف لائیں خوش آمدید۔ آپ کی آمد سے احوال کی رونق بڑھ گئی ہے۔ آپ نے مجھ ناچیز کو خوبصورت الفاظ سے یاد کیا آپ کا بہت شکر یہ۔ آپ کی شاعری بہت پسند آئی۔ پیاری سی معصوم سی چھوٹی بہن صاحبہ سحر علیکم السلام پیاری بہنا ہم آپ کو نہیں بھولے۔ آپ نے شادی کے بعد سچی کہانیاں سے رابطہ ہی ختم کر دیا تھا۔ تین سال بعد آپ کی آمد بہت بھلی لگی۔ علی پور کے محمد جاوید پہلی بار شاندار تبصرے کے ساتھ احوال میں آئے۔ جی آیاں نوں۔ بھائی اشفاق شاہین خط پسند کرنے کا شکر یہ۔ برادر مر مقصود احمد بلوچ صاحب اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں آپ سنا میں کیسے مزاج ہیں۔ جناب آپ کو نہیں بھولا آپ خود بہت عرصہ سچی کہانیاں سے غیر حاضر رہے ہیں۔ آپ کو میری استوری پسند آئی بہت شکر یہ۔ ریحانہ نسیم صاحبہ آپ کا خط اور استوری دونوں ہی لا جواب ہوتے ہیں۔ سجدہ صابر احوال میں ویکم کہانی پسند کرنے کا شکر یہ۔ شاہد رفیق سہو پرویز سہو اور فہد سہو آپ سب کیسے ہو؟ آپ بہت پیار عزت احترام دیتے ہو سدا خوش رہو۔ مس منزل خان ویکم السلام آپ سے گزارش ہے کہ اب احوال سے غیر حاضری نہیں ہونی چاہیے۔ باجی صاحبہ کہانی پسند کرنے کا شکر یہ۔ علی حسنین تائبش کیسے

برائے قانونی مشاورت

جی ایم بھٹولاء ایسوسی ایٹس

ایڈوکیٹ اینڈ اٹارنیز

021-35893121-35893122

رابطہ:

Cell:0321-9233256

ہو؟ یار آپ ذرا بہت اچھا لکھتے ہو۔ ثمینہ شہزادی، ایم یعقوب، آپا مسز نوید ہاشمی، سدرہ انور علی، ارم خان، ملازم حسین، عبدالغفار عابد، محترم ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، راشد لطیف، مجید احمد جانی، صائمہ مجید، فیصل ندیم، بھٹی، ابو ہریرہ بلوچ، نیل جاوید، آپ سب کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے میری اسٹوری کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا میری نوصلہ افزائی اور عزت افزائی کی بہت شکریہ۔ برادر مرانا حبیب الرحمن صاحب میری دلی دعا ہے اللہ کریم آپ کو قید سے جلد از جلد رہائی نصیب فرمائے آمین آپ کو میرا خط اور اسٹوری اچھی لگی بہت شکریہ۔ ثمینہ ناز دعا ہے اللہ پاک آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ پیر نوید صاحب، کنول عمران خان، ام عادل، غزالہ شاہین، شائستہ جمال اور مور شاہد حسین آپ سب لوگ کہاں ہیں؟ پلیز جلدی سے احوال کی رونق بڑھا میں آپ سب کے بغیر محفل ادھوری ہے۔ منشی عزیز مے اس ماہ پھر غائب ہیں کیوں جی.....؟ لائف بوائے حقیقی خوشیاں لائے بے مثال کہانی تھی۔ کاروان حجاز اور حجاز میں چودہ دن پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ بصارت کو تازگی اور روح کو پاکیزگی ملی۔ سبحان اللہ مجھے اپنے وہ اکیس دن کا ایک ایک لمحہ اور گھڑی یاد آگئی جب اللہ کریم نے پچھلے سال مجھے گنہگار کو عمرہ کی ادائیگی کی سعادت بخشی تھی۔ سید ملازم حسین شیزاری کی 'مجرم کون' اچھوتی کہانی تھی۔ محترم سلیم اختر صاحب کی 'داری' بہت شاندار کہانی تھی۔ دیکھتی آ نکھیں، ابا کی بختاور انصاف دل کو چھو لینے والی کہانیاں تھیں۔ مجید احمد جانی حسب سابق اس بار بھی ایک بہترین کہانی 'زوالے' یہ بھید ہیں لے کر آئے۔ بہت خوب نیل جاوید نے 'روگ' عمر بھر کا ہے میں اپنے قلم کا خوب جادو جگایا۔ کینسر پامسٹ، عزت دار، پگنی، صدقہ، وڈیری، جیت، سماج سیوا، موسیٰ پرندے، ڈھونڈو گے ہمیں، مفرد، بہترین کہانیاں تھیں۔ بہت پسند آئیں۔ (حسین اختر) گڈی آپا قلم قبیلے کا ایک چراغ گل ہو گیا۔ آفتاب ادب پر چمکنے والا ایک درخشاں ستارہ ڈوب گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو۔

☆ پیارے بھائی! اب بات بنی نا۔ طاب آپ ہمارے وہی ممتاز ہو جو سب میں ممتاز رہتا ہے۔ خوش

رہو۔

✉ شادی وال 'گجرات' سے یہ احوال میں آمد ہے ہماری بہن عائشہ نور عا شا کی لکھتی ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ میں سے کسی نے بھی مجھے یاد نہیں کیا ہوگا اور تو اور کاشی بھیا کو بھی میرا نام بھی ان سنا سا لگ رہا ہوگا۔ (ارے..... لڑکی ہم یہ کیوں الزام لگاتی ہو۔) پھر بھی میں حاضر ہوں کیونکہ سچی کہانیاں کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ کاشی بھیا میں ناراض ہوں آپ سے، ابھی ابھی ستمبر کا شمارہ دیکھا ہے ان فیکٹ ابھی سچی کہانیاں میرے لپ ٹاپ پر کھلا ہوا ہے اور میں خط لکھ رہی ہوں۔ اپنا نام ہر جگہ غائب پا کر بڑا موڈ خراب ہوا۔ میں نے تین کہانیاں اور شاعری بھی سچی تھی اس کے علاوہ خط پوسٹ نہ کر سکی تو ای میل بھی کی مگر کچھ دیکھنے کو نہیں ملا۔ اور سخن آباد آج کل کہاں غائب ہے اور پلیز میری ای میل شامل کر لیا کریں کیونکہ ڈائجسٹ مجھے دیر سے ملتا ہے اور پھر پڑھ کر ہی اچھا تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر میں ای میل کر دیا کروں تو کیا آپ شامل کر سکتے ہیں (بالکل) اور ایک سچ یہ ہے کہ جب سے میں نے یہ ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا ہے دوسروں کے دکھ میں شریک ہونے کی ہمت آگئی ہے مجھ میں، ورنہ میں تو کسی سے بات تک نہ کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارا پیارا سچی کہانیاں ڈائجسٹ ہمیشہ سلامت رہے اور کامیابیاں اس کے قدم چومیں

READING

Section

مبارک باد

ہماری سینئر لکھاری محترمہ الماس روجی صاحبہ نے حال ہی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے قلم قبیلے کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ ادارہ الماس روجی کے اس اعزاز پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہے اور ان کی ترقی کے لیے دعا گو ہے۔

☆ پیاری عائشہ! تمہاری کہانی زیر غور ہے۔ رہی بات شاعری کی تو وہ تم نے دو شیزہ کے لیے بھیجی تھی۔ اب کرو شکوہ اور ہاں..... پیاری گڑیا تمہارا پوسٹ کیا ہوا خط ملا شائع ہو گیا۔ ای میل لیٹر نہ ملا سو..... امید ہے تسلی ہوگئی ہوگی۔

✉ کراچی سے ہماری نئی لکھاری ساتھی سعدیہ عابد رقم طراز ہیں۔ میں آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ کہ آپ نے مجھے دو شیزہ اور سچی کہانیاں کا ستمبر کا شمارہ ارسال کیا۔ آپ کی رہنمائی اور مشورے کے بعد ایک سچی کہانی ارسال کر رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ اس کی نوک پلک سنوار کر اسے سچی کہانیاں کی قریبی اشاعت میں جگہ دی جائے۔ آپ کی طرف سے مثبت جواب کی منتظر۔

☆ اچھی سعدیہ! تمہاری کہانی پڑھ کر جلد مطلع کر دیا جائے گا۔ سعدیہ! ذرا یہ تو بتاؤ پرچہ پڑھ کر تبصرہ کیوں نہیں کیا؟ اگلے ماہ مجھے پرچے پر بھر پور تبصرہ چاہیے۔ امید ہے بھروسہ قائم رہے گا۔

✉ لیجئے ساتھیو! یہ آمد ہے ملکہ احوال حسین جو نیچو کی خیر پور ناٹھن شاہ بورڈی شریف سے لکھتی ہیں۔ مزہ آپی اپنے ادارے میں ایک سوال لے کر آئی ہیں بد نصیب کون؟ اب ہم پہنچے احوال میں جہاں اپنے بھیا محفل احوال سجائے بیٹھے ہیں۔ داد جی محفل کی رونق تو ماشاء اللہ عروج پر ہے۔ نئے نئے چہرے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ محترمہ صائمہ بشیر بڑی نوازش جی گلاب کی پتیوں سے ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ارے یہ کیا دیکھ رہی ہوں یہ تو اپنی جانی پہچانی آپی کی آمد ہے دل سرشار ہوا سیدہ حجاب فاطمہ آپی خوش رہیں۔ ایم یعقوب صاحب بہت شکر یہ خوش رہیے۔ محترمہ مسز نوید ہاشمی بے حد ممنون ہوں سلامتی ہو۔ پیاری سدرہ انور علی لوجی مابدولت حاضر ہیں۔ سلی فون ملاقات بہت اچھی لگی خوشی ہوئی، خوش رہو۔ ملازم حسین صاحب بہت شکر یہ۔ اچھی بھابی صائمہ مجید خوش آمدید۔ آہ ہماری پیاری لکھاری گڈی آپا بھی چل بسیں بہت دکھ ہوا، اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔ اوہو پتا ہی نہیں چلا خط تو طویل ہو رہا ہے کہیں کاشی بھیا کی پیچی صاحبہ ہوش میں نہ آجائے۔ اس سے پہلے بس تھوڑی سی رائے کچھ کہانیوں کے لیے (بی بی! پیچی ہر وقت ہوش میں رہتی ہے۔ کمال دیکھ لیا نا.....) سب نے بہت محنت سے تخلیق کر کے تراش کر چار چاند لگائے ہیں۔ یقیناً سب تحریریں بہترین ہوں گی۔ مگر وقت کی کمی کے باعث صرف چند ہی پڑھ پائے ہیں۔ ان میں ایمان داری کا ٹکٹ کس کو ملتا ہے سیدہ کاظمی کہتی ہیں میں وڈیری ہوں نصرت سرفراز کا کہنا ہے ڈھونڈو گے ہمیں مگر زیبا بدر نے کہا جیت میری ہے۔ ایم سلطان پتا نہیں کیسے کہہ رہے ہیں تم میری ہو تو راشد لطیف نے کہہ ڈالا پگی صدقہ اتارو آفرین انیس۔ مجید احمد جانی بھائی بتا رہے ہیں نرالے یہ بھید ہیں تو نیل جاوید نے چوٹ ماری یہ روگ عمر بھر کا ہے ایک کونے سے ارم ناز نے آواز لگائی یہ عزت دار ہیں۔ اس لیے کاشی بھیا نے کہا عشق زہر ہے خیال رہے لوجی یہ تو ہو گیا اپنا تبصرہ برداشت کرنے کا شکر یہ۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

☆: اچھی تحسین! لوتبرہ وقت پر ڈاک سے موصول ہو گیا۔ لگتا ہے، ڈاک والے بھی تمہارا مقام (ملکہ احوال) پہچان گئے ہیں۔

✉: منعم اصغر ڈیرہ غازی خان سے احوال میں شریک ہیں لکھتے ہیں۔ پورے دو ماہ بعد پھر سے حاضر ہونے پر دلی خوشی ہو رہی ہے۔ آپ کی محبتوں نے سچی کہانیاں سے ایسے جوڑ رکھا ہے کہ یہ دو ماہ بھی بہت لمبا عرصہ معلوم ہو رہا ہے۔ خیر غیر حاضری کے لیے بہت معذرت ہند اسرار نمبر میں میری کہانی لگانے پر ڈھیروں شکر یہ۔ اس بار سچی کہانیاں تین تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل خوبصورت تھا۔ احوال میں تو سچ مچ مزہ آ گیا۔ تحسین جو نیچو فرزانہ نگہت اشفاق شاہین، مقصود احمد، ریحانہ نسیم، فریدہ فری، سجدہ صابر، شاہد رفیق، سہو منزل خان، صائمہ بشر، علی حسنین، تابش، ایم یعقوب، مسز نوید ہاشمی، ایم افضل آزاد، رانا حبیب الرحمن، سدرہ انور علی (کیسی ہیں آپ؟) ارم خان، ملک محمد اکرم، صائمہ سحر، عبدالغفار عابد، نعم شہزادی، ڈاکٹر خادم حسین، کھیرا، ممتاز احمد، راشد لطیف، مجید احمد، جانی، صائمہ مجید، ندیم عباس، فیصل ندیم، بھٹی، عظیمی، شکور، ناظمہ، اشتیاق، محمد جاوید، مومنہ، بتول، حمید علی کے تبصرے بہت زیادہ خوبصورت تھے۔ اب کہانیوں پر تبصرہ نہیں کروں گا کہ سات تاریخ سے میرے پیپر زہور سے ہیں۔ اس لیے کوئی نہیں پڑھی۔ ہاں ابا کی بخاؤر محسن علی شامی کی خوبصورت کہانی تھی۔ باقی تبصرہ اگلے ماہ۔ گڈی آپا کاسن کر بہت دکھ ہوا ان کے لیے دعائیں، رب را کھا۔

☆: اچھے منعم! خوش رہو خدا تمہیں ہر امتحان میں کامیاب کرے آمین۔ اب پلیز احوال سے دور نہ ہونا۔

✉: احمد ندیم ضیاء، کلور کوٹ، بھکر سے احوال میں شامل ہو رہے ہیں لکھتے ہیں۔ میرا تعلق تحصیل کلور کوٹ ضلع بھکر سے ہے۔ مختلف جرائد میرے زیر مطالعہ رہتے ہیں۔ مگر پچھلے دنوں ممتاز احمد صاحب سرکاری ڈیوٹی پر کلور کوٹ آئے تو ان سے ملاقات اور تعارف ہوا تو انہوں نے مجھے سچی کہانیاں کا شمارہ سنبھرایا۔ یقیناً جیسے اتنا عمدہ معیاری اور بہترین لگا کہ اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں صرف پڑھنے کا ہی شوق رکھتا ہوں مگر سچی کہانیاں کا اعلیٰ معیار دیکھ کر پہلا خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ اگر میں غیر جانبداری سے کہوں تو حق اور سچ بات یہ ہے کہ مجھے اس کے اعلیٰ معیار میں کاشی چوہان صاحب آپ کی محنت نظر آتی ہے۔ احوال میں سب کے خطوط بہت اچھے ہوتے ہیں اور رائٹرز کا تو جواب نہیں تمام کے تمام رائٹرز اپنے اپنے قلم کا حق خوب ادا کر رہے ہیں۔ بالخصوص ممتاز احمد صاحب، جاوید راہی صاحب، سلیم اختر صاحب ان سب کی کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ آئندہ بھی خط لکھتا رہوں گا۔ اب اجازت چاہوں گا۔

☆: بھائی احمد ندیم ضیاء! خوش آمدید۔ آپ کے خط سے آپ کی محبت کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ سچی کہانیاں آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔

✉: جنگ صدر سے یہ آمد ہے ہماری گڑیا سدرہ انور علی کی لکھتی ہیں اوائل سردیوں کا پہلا شمارہ ملا ٹائٹل انتہائی دلکش لگا۔ ویلڈن زرینہ جو نیچو ڈیرہ اپنا آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ ڈیرہ ملکہ احوال تحسین جو نیچو محفل آپ ہی سے جیتی ہے۔ سو آپ کو شکر کریں کہ ہر ماہ آئیں کیونکہ آپ ملکہ ہیں۔ حمیرا قریشی، سجدہ صابر، محمد افضل آزاد، ملازم حسین، محمد جاوید، حمید علی سچی کہانیاں میں خوش آمدید۔ جن لوگوں کو میری کہانی اور میں مر گیا پسند آئی ان کا بہت شکر یہ۔ بس منزل خان سیدہ، حجاب، فاطمہ، روبینہ، ناز، صائمہ سحر احوال میں ویلکم بیک، مقصود احمد، بھیا کہانی پسند کرنے کا شکر، میں ٹھیک ہوں۔ جہاں پر اپنے ہوں وہاں کی ہر شے پیاری لگتی ہے۔ تحسین اختر المعروف گڈی آپا کی ڈیجھ کا پڑھ کر افسوس ہوا اللہ رب العالمین ان کی مغفرت

پیر اسرار کہانی نمبر 3

Email : pearpublications@hotmail.com

پیر اسرار نمبر 1 اور 2 کی بے مثال پذیرائی کے بعد پیر اسرار نمبر 3

☆ خوف اور دہشت میں لپٹی سچ بیانیاں

☆ ارواحِ خبیثہ کا شاخسانہ بننے والوں کی کہانیاں

☆ زہر بھری دنیا سے، یادگار ناگ بیتیاں

☆ فراعنہ کی سرزمین سے، اسرار بھرے رازعیاں کرتی خصیعیہ: ایترخان حیرت

☆ پوشیدہ دنیا سے بہت خاص طلسم رکھنے والے تیند کرتی وہ کہانیاں، جو

آپ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے

تو پھر دیر کس بات کی ہے..... لہو نمجد کروینے والے، ماہ دسمبر 2015ء

کے شمارے پیر اسرار کہانی نمبر 3 کی کاپی آج ہی بک کرا لیجیے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں۔

نئی کہانیاں کا دسمبر 2015ء کا شمارہ پیر اسرار نمبر 3 ہوگا۔

READING
Section

کرے۔ اسماء اعوان کی لائف بوائے پسند آئی۔ کاروان حجاز اور حجاز میں چودہ دن پڑھ کر دل و دماغ کو معطر کیا۔ مجرم کون سید ملازم حسین داری انکل محمد سلیم اختر دیکھتی آنکھیں اعجاز احمد فکراں محسن علی کی ابا کی بختاور فرزانہ گھبت کی انصاف نرالے یہ بھید ہیں مجید احمد بھیا نیل جاوید روگ عمر بھر کا ہے۔ کینسر سیمیں غزالہ پامسٹ اکرم آہیر ان سب نے بہت ہی دلچسپ و خوبصورت سبق آموز تحریریں لکھیں۔ ویلڈن میجر عبدالقدوس نے اپنی اہلیہ کو بہت خوبصورت خراج تحسین پیش کیا۔ ندیم عباس کی کتے کی موت پڑھ کر ماتھا سینے کو جی چاہا بے اختیار۔ یہ محبت نہیں رواج ہے۔ یہ سب جسم و حسن کی بات ہے۔ ارم ناز عزت دار، راشد لطیف پگلی آفرین صدقہ شیخ معظم الہی نیکی کرتا جا۔ رانا محمد شاہد ایمان داری کا ٹکٹ عارف شہزاد ادھوری کہانی، جیت زیبا بدڑ ڈھونڈو گے ہمیں نصرت سرفراز بہت خوبصورت تحریریں لگیں۔ زہر عشق پڑھی بہت دلچسپ موڈ پر گامزن ہے۔ ہمشکل میں نہیں پڑھتی ہوں اس کے لیے معذرت کا شئی بھیا عشقیہ اور رومانوی کہانیاں کم شائع ہوتی چاہیے باقی جو آپ کو بہتر لگے۔ شازی سعید مغل کو تاشون کو کتابی شکل دینے پر بہت مبارکباد مور شاہد بھیا شائستہ جمال مسز نوید ہاشمی کو السلام وعلیکم! منشی محمد عزیز آپ کہاں غائب ہیں۔ بحرنگی بھائی جان۔ ہائیڈ پارک اور تیرنم کش میں کبھی نے اچھے انتخابات پیش کیے۔ اسی بات کے ساتھ اجازت کیوں کہ ساتھ تو چھوٹے کو ہوتے ہیں وقت جدائی آن پہنچا اچھی رہی سانس چلتی رہیں مہلت ملتی رہیں تو پھر ہوگی ملاقات تب تک اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اللہ نگہبان۔

☆ گڑیا! تبصرہ شاندار رہا۔ جیتی رہو۔ نئی کہانی کب آرہی ہے ہم

✉ سیمیں غزالہ یہاں احوال میں کراچی سے شامل ہو رہی ہیں، لکھتی ہیں۔ ایک طویل انتظار کے بعد یہ خوشخبری تو آپ نے سنادی کہ میری ایک کہانی اگلے مہینے کی سچی کہانیاں میں شامل ہو رہی ہے۔ مگر کرامت کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کے ساتھ پتا نہیں کیا مسئلہ پیش آ گیا ہے۔ اور کہانی بھیج رہی ہوں اب دیکھیں اس کا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ ابھی تو میرے حج کی روداد کا فیصلہ ہونا بھی باقی ہے۔ کہتے ہیں نا کہ چھٹی نہیں ہے منہ سے کافرنگی ہوئی اسی طرح لکھنے کا نشہ بھی ایسا ہے کہ اگر ایک بار لگ جائے تو کبھی نہیں چھوٹ سکتا ہے (سچ کہا) حالانکہ آج کل زندگی کی مصروفیات اور کشاکش حیات لکھنے کا بروقت موقع نہیں دے رہے ہیں۔ مگر پھر بھی نجانے کس طرح کوئی واقعہ، کوئی قصہ اور کوئی واردات قلم اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اجازت دیجیے، اللہ حافظ۔

☆ اچھی بہن غزالہ! جلد اس کہانی کا فیصلہ بھی ہو ہی جائے گل۔ تبصرہ کہاں ہے اس خط میں؟؟

✉ احوال میں یہ پہلی آمد ہے شین ماہا کی سٹی سیالکوٹ سے، لکھتی ہیں۔ ہم اسکول میں پڑھتے ہیں مگر اکثر سچی کہانیاں پڑھ لیتے ہیں۔ یہ اسکول کا آخری سال ہے پھر شاید باقاعدہ پڑھ لوں۔ 2015 ستمبر کا شمارہ کافی اچھا تھا۔ مگر کچھ باتیں میرے دماغ میں بار بار گھوم رہی ہیں۔ جو نقد ہنر کا سلسلہ تھا وہ مجھے اور بانی کبھی کو بہت پسند تھا وہ کہاں ہے؟ (اب سب ہائیڈ پارک اور تیرنم کش پسند کر رہے ہیں بہت زیادہ) جو پہلے کہانیاں بھیج رکھی ہیں سال بھر ہونے کو آیا ہے محری کو آپ کہاں رکھ دیتے ہیں۔ (نا قابل اشاعت تحریریں ضائع کر دی جاتی ہیں) کیا نئے اور کم عمر احوالی کو بہت دیر سے احوال میں جگہ ملتی ہے (آپ کو احوال میں جلد جگہ کیوں مل گئی پھر؟) ہاں وہ جو مینا تاج آئی تھیں کیا وہ آپ کے دفتر میں کام کرتی تھیں؟ وہ جب بھی ایک دو دفعہ احوال میں آئی تھیں تو فقط ہی شامل نہیں کرتی تھیں اور اس کے علاوہ ان کا جواب دینے کا انداز بہت برا تھا۔ (ارے.....) شکر ہے کہ وہ اب نہیں آتیں۔ سڑک کہانی کا بھی بالکل مزہ نہیں آتا تھا۔ اگر میری

تفہید غلط لگی یا کہ پھر بہت اچھی مگر میرے خط کو برائے مہربانی شامل کرنے کی کوشش کیجیے گا۔ (واہ بھئی واہ! جیو.....) مجھے اس بار یہ کہانیاں پسند آئی ہیں۔ یہ چند کہانیاں بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ عامر امر اور علی بہت زبردست تھی۔ ہاں وہ یا گل تھا اور اک بھول خود دار تھے وہ بہت اعلیٰ اور عمدہ کہانیاں تھیں۔

☆ پیاری سین یاہا! خوش آمدید! بھئی سچ بتاؤ اسکول میں کسی سے لڑائی ہوئی تھی یا امی نے کھانے میں مرچیں زیادہ ڈال دی تھیں۔ ارے گڑیا! تفہید سر آنکھوں پر مگر..... ذرا سا ہلکا ہاتھ..... اگلے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

☞ احوال میں نزابت افشاں کی آمد، مہورہ فتح جنگ انک سے ہو رہی ہے۔ لکھتے ہیں، ماہ ستمبر کا شمارہ 5 ستمبر کو ملا۔ منزہ آپ کی باتیں بہت فکر انگیز ہوتی ہیں۔ آپ کی باتیں پڑھ کر مجھے حفیظ میرٹھی کا یہ شعر یاد آ گیا کہ

واد دیجیے کہ ہم جی رہے وہاں
ہیں محافظ جہاں قاتلوں کی طرح

بہر حال وطن عزیز میں امن کے لیے ہم دعا گو ہیں۔ شو بزنس سوگ زندگی خود تھے وہ بڑی اماں ستارہ ڈوب گیا اور میں مر گیا۔ اس کے علاوہ تمام کہانیاں اور ناول اچھے جا رہے ہیں۔ باقی بہت بہت شکر یہ مجھ ناچیز کو خوش آمدید کہنے کا۔ تمام تبصرے اچھے تھے۔ پھٹ شاہ سے شریک ہونے والی کو خوش آمدید میری مراد سیدہ کا کی سٹر ہیں۔ سدرہ آپ تبصرہ شاندار کرتی ہیں آپ۔ فرح انیس سیز اچھا لکھتی ہیں۔ کوئی کہانی بھی تو لا میں نا ہمارے سامنے۔ اور کاشی بھائی جولائی میں ایک تحریر آپ کو بھیجی تھی معروف شاعر ناصر کاظمی کے حوالے سے، وہ شائع ہوگی یا نہیں؟ کچھ بتائیں یا مجھے بھی داغ دہلوی کی زبان میں یہ کہنا پڑے گا کہ

وفا کریں گے نبھائیں گے بات مانیں گے
تمہیں بھی یاد ہے کہ کچھ یہ کلام کس کا تھا

☆ پیارے نزابت فی الحال تو تمہاری بھئی تحریر پرچے سے لگا نہیں کھا رہی۔ کہانی بھیجو۔ امید ہے ماسٹرنہ کرو گے۔ تبصرے کا ایک بار پھر شکر یہ۔

☞ انیس الرحمن آئی بلاک بورے والا سے رقم طراز ہیں ماہ ستمبر کا شمارہ آفتاب آمد دلیل آفتاب کا مصداق اور اپنی تمام تر خوبیوں سے مرصع و مزین تھا۔ سردق پر نظر پڑی تو دل حسین وادیوں میں کھو گیا۔ احوال کی وادی میں قدم رکھا تو مارے خوشی کے قدم ڈگمگانے لگے۔ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ہمارا خط بھی اتنی جلدی شائع ہو جائے گا۔ کاشی بھائی بہت بہت شکر یہ، آپ نے اس قابل سمجھا کہ ایک نو وارد کو اس احسن انداز سے دیکھ لیا۔ مجھ جیسے قصیر الہمت کی ہمت افزائی کر کے باعث نشاط ہو جب حیات نو اور تازگی کا سبب مہیا کیا۔ احوال کی نگری میں رانا حبیب الرحمن کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی کہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے بھی مستفید ہوتے ہیں۔ اس بار احوال میں نئے اور پرانے احوالیوں نے بارونق محفل سجا رکھی تھی۔ یوں تو سب کہانیاں ایک دوسری سے بڑھ کر تھیں لیکن ایم اے راحت کی کہانی ہم شکل بہت اچھی جا رہی ہے۔ کاشی بھائی کی زہر عشق نے تو دل میں خوف ہراس پیدا کر دیا۔ فضلو کی جو رو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ صاحب حیثیت لگ ب لگ لوگوں کی عزت سے کس دروناک طریقے سے کہتے ہیں۔ اس کہانی میں میرے خیال کے مطابق فضلو کی جو رو کا قصور ہے۔ اگر وہ پہلے دن سے ہی ان کی پیش کش کو ٹھکرا دیتی تو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ باقی رہا بڑے میاں کا حال وہ تو اظہر من الشمس ہے۔ بھائی کاشی ایک بار پھر

آپ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ زندگی رہی تو ہر ماہ آپ سے آدمی ملاقات ہوتی رہے گی۔
☆: پیارے انیس! احوال کی رونق تو تم سب سے ہی ہے۔ جیو یار! اس ماہ تو تم لیٹ ہو گئے کوشش کرو۔ جلدی حاضر ہو جاؤ تاکہ اسی ماہ خط شائع ہو۔

☆: پہلی بار احوال میں حسن عباس نیازی وانڈھی کھنڈ والی میانوالی سے حاضر ہو رہے ہیں لکھتے ہیں میں میانوالی کا رہائشی ہوں اور واپڈا میں ملازم ہوں۔ ممتاز احمد صاحب جو کہ ہمارے محکمے کے آڈٹ آفیسر ہیں تو وہ ہمارے دفتر کا آڈٹ اور انسپکشن کرنے آئے۔ ممتاز احمد صاحب جہاں وہ پیشہ وارانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں، وہیں وہ ایک بہترین قلم کار بھی ہیں تو انہوں نے سچی کہانیاں متعارف کروایا۔ سچی کہانیاں بلاشبہ ایک بہترین اور زبردست ڈائجسٹ ہے۔ اب میں باقاعدگی سے ہر ماہ خرید کر پڑھتا ہوں۔ احوال میں ایک دوسرے کے لیے پیار، عزت اور احترام بھرے جذبات پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے تو میرا بھی دل چاہا کہ احوال کا حصہ بنوں اگر آپ سب نے دیکھ لیا تو پھر ہر مہینے حاضر ہوا کروں گا۔ سلیم اختر، جاوید راہی، ممتاز احمد، ارم ناز، مجید احمد جانی، بہت اچھے رائٹر ہیں۔ احوال میں مسز نوید ہاشمی، عبدالغفار عابد، ڈاکٹر خادم حسین کھیرا، ممتاز احمد، مجید احمد جانی، فیصل ندیم بھٹی کے تبصرے بہت پسند آئے۔ باقی دوستوں نے بھی بہت اچھا لکھا۔ کاشی چوہان صاحب کیا میں بھی رائٹر بن سکتا ہوں؟ اچھا اب اجازت چاہوں گا اگلے ماہ ملیں گے اگر آپ نے دیکھ لیا تو۔

☆: کیجیے حسن نیازی صاحب! ہم نے آپ کو دیکھ لیا۔ اب آپ ہر ماہ حاضر ہو کر اپنا وعدہ وفا کریں گے۔ اور جناب آپ بالکل رائٹر بن سکتے ہیں۔ شرط ہے کہ آپ کو کہانی لکھنا آتا ہو۔

☆: رانا مجاہد جمیل، بہل بھکر سے حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں سلام مسنون مجھے سچی کہانیاں ممتاز احمد کی معرفت ملا اور تسلی سے اس کا مطالعہ کیا تو یہ مجھے دوسرے ڈائجسٹوں کے مقابلے میں بہت اونچے مقام پر نظر آیا۔ آج تک کسی رسالے میں خط نہیں لکھا مگر ستمبر کا شمارہ پڑھنے کے بعد اس کے بہترین معیار کو دیکھتے ہوئے خط لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ سچی کہانیاں بہت اچھا لگا۔ احوال کہانیاں ہائیڈ پارک، تیرنیم کش، تمام سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ سچی کہانیاں کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔ کاشی صاحب کوئی ایسا سلسلہ بنا لیں کہ یہ بھکر، دریا خان اور گلور کوٹ بروقت پہنچ جائے تاکہ آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

☆: پیارے بھیا رانا مجاہد بہل! خوش آمدید ہم نے اپنے سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ تک آپ کی درخواست پہنچا دی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد آپ کے علاقوں میں پرچے کا حصول ممکن ہو جائے گا۔

☆: کراچی سے ہماری بہت پیاری، شفیق مسز نگہت غفار اپنے دلنشین انداز کے ساتھ عرض کرتی ہیں۔ بیٹے جان ہم نے آج 14 تاریخ تک رسالے کا انتظار کیا کہ شاید آج آئے رسالہ شاید کل آئے اور اس آج اور کل کے انتظار میں مکمل مایوسی ہوئی تو پھر ہم نے فہد سے کہا بیٹے چائے پیو اور فوراً بک اسٹال پہنچو سچی کہانیاں پہلے مجھے گھر پر لاکر دو پھر باقی دوسرے کام نمٹانا۔ فہد میاں گھر سے نکلے ہم نے سوچا ہمارے تیسرے نمبر کے صاحب زادے کے ہاں حضور ﷺ کا سلام آیا ہے۔ ماشاء اللہ تیسرا نیا مہمان بیٹی آئی ہے۔ ہم نے سوچا تھوڑی دیر داصف کے ہاں بیٹھ جائیں گے تھوڑی دیر مون کے ہاں یوں دونوں بہویں راضی رہیں گی ورنہ پھر گلہ ہوتا ہے کہ آپ وہاں نہیں بیٹھیں آئیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بہت مجبوری ہو تو بیڑھیاں چڑھا کریں۔ بہر حال ہم نے سوچا ایک دفعہ چکر لگائیں۔ کچھ دن کی بے فکری ہو جائے گی۔ ہم

خواتین کی محبوب قلم کار

رفعت سراج کا تازہ ترین شاہکار 'دام دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں۔

"ایمن" ایک ایسی بہو کی کہانی، جسے دو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں ہر لمحہ سزا، سسر کے طنز اور تشویش کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

تازہ ترین قسط سے کچھ لائسن

اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھیلنے کو دیتی ہے۔ مشکل سے پچاس ہزار کا جہیز لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے ڈال دیے ہم پر۔" فردوس کی بڑبڑاہٹ زہر کی کڑواہٹ کے برابر تھی۔

"ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔" حامد حسین نے لقمہ دیا۔

"پ... پ... پندرہ لاکھ..." فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ یوں گویا کوئی ان پر بندوق تانے کھڑا ہوا اور کہہ رہا ہو۔ نکالو پندرہ لاکھ۔

"ارے کہاں سے لائے گا ہمارا بچہ تیس لاکھ؟" وہ گویا پچھاڑیں کھانے لگیں۔

"آسرا رکھو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہوگا۔" حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمن کی پشت پر

تاک کر نیا تیر چھوڑا۔ ایمن کو پاؤں اٹھانا دو بھر ہو گیا۔

جی تو چاہا پلٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں کے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی ذمہ دار ہے۔ جسے رب العالمین کہتے ہیں۔ جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔ جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

آج کے جدید دور میں بھی ایسے کردار ہر دوسرے گھر میں موجود ہیں۔ رفعت سراج عام بات کو خاص بنانا جانتی ہیں۔

'دام دل' ہر ماہ دو شیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

جیسے ہی نئے آئے میز پر ایک معصوم سی لڑکی نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا ہم نے جھٹ سے رسالہ اٹھایا اور ورق گردانی کرنے لگے پھر ہماری نظر بڑی اماں پر پڑی ہم نے احتراماً سر پر آٹھل پھیلا یا اور ان کا سامنا کیا دل باغ باغ ہو گیا۔ کاشی بیٹے کے لیے دل سے بے حساب دعائیں نکلیں۔ پھر ہم نے آنکھیں کھول کر خواب دیکھا۔ احوال میں بیٹا جانی انشاء اللہ ہم خود پر فخر محسوس کریں گے اللہ تعالیٰ ہمیں اس سوچ میں کامیابی عطا فرمائے بالکل تم بالکل سچ کہتے ہو کسی اچھے کام کو سراہنا اور کام کرنے والے کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔ احوال میں 40 خطوط تھے جس میں ایک میرا..... باقی 39 میں سے یا سمین اقبال نے میرے اور فریدہ جاوید کے اشعار پسند کیے پیاری سی یا سمین اقبال بھی ہمیں پتا نہیں تم کتنی بڑی ہو بیٹا جیتی رہو، شاد و آباد رہو سلامت رہو۔ تیریم کس میں یا سمین اقبال اشفاق شاہین ملائیکہ حریم سدرہ انوارم خان نکلیں کے اشعار و قطعات اچھے تھے۔ ہائیڈ پارک میں حبیب الرحمن راشد لطیف فریدہ فری انعم شہزادی ممتاز احمد یا سمین اقبال کی تحریریں بہت اچھی لگیں۔ شو بزنس سبق آموز کہانی تھی۔ سوگ زندگی ایسے رویے کی امید نہیں بلکہ ناممکن ہے سیانہ نصیب مجبور و قافا کہاں بھاگو گے گرفت اور میں مر گیا دیدہ عبرت اور ستارہ ڈوب گیا قصور میرا وہ اک بھول، صالح ناصر ارے بھی صالح اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا تھا تقریباً بیس بائیس سال پہلے میں اور میری چھوٹی بہن عفت یہی ہم دونوں ٹیچر تھیں (اب یہی اس دنیا میں نہیں ہے) ہم بھی ایک امیر زادے کے چنگل میں پھنس گئی تھیں مگر اس پروردگار نے۔ اس مولا کریم نے ہم گناہگاروں کی لاج رکھی لی تھی۔ ہم بخیر و خوبی گھر پہنچ گئی تھیں۔ صبح گھر سے نکلے تھے اور رات مغرب کے ٹائم گھر پہنچے تھے۔ بہت پیاری سی رضوانہ جی آپ کے کزن کے انتقال پر دلی افسوس ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے دبار میں اٹلی مرتبے سے نوازے اور آپ سب کو صبر جمیل فرمائے آمین۔ قابل احترام ایم اے راحت کے لیے رب کائنات سے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ اللہ پاک ایم اے راحت صاحب کو عمر خضر اور صحت کلی عطا فرمائے آمین۔ اب اجازت چاہنے سے پہلے بیٹے جی..... اب تو خوش ہونا۔

ہم: پیاری آنٹی! خدا آپ کو، آپ کی شفقت کو برقرار رکھے۔ تبصرے کا شکریہ ادا کروں تو مزہ نہیں آئے گا۔ سلامت رہیے۔

ہم: ارادہ لینڈی سے یہ آمد ہے ہماری لکھاری ساتھی فرزانہ گہت کی لکھتی ہیں۔ ایک نئی سچی کہانی حاضر خدمت ہے۔ یہ کہیں اور کا نہیں ہمارے اپنے خاندان میں پیش آنے والا واقعہ ہے۔ صرف کرداروں کے نام ہی تبدیل ہو گئے ہیں۔ پڑھیے امید ہے برائے اشاعت پسند آئے گا۔

ہم: پیاری گہت جی! یہ کیا.....؟ اپنی بات کہی اور بس! ارے احوال میں احوال کا کیا ہوا؟ اگلے ماہ پرچے پر آپ کا تبصرہ بھی چاہیے۔ اسے ہمارا حکم سمجھیں یا محبت۔

ہم: یہ آمد ہے چشتیاں سے ہمارے پیارے سے علی حسنین تابش کی، لکھتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح شماره 28 ستمبر کو بہت جلد موصول ہوا۔ عید کے بعد اک اور عید ہو گئی۔ سرورق بہترین تھا۔ منزہ جی کا ادارہ یہ بد نصیب کون بہترین تھا۔ احوال میں سب سے پہلے مس زرینہ جو جو جو سے ملاقات ہوئی۔ اور پھر تمام دوستوں سے ملاقات ہوتی گئی۔ تمام احوال بہترین تھے۔ گڈی آپا کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ خدا وند کریم ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ کہانیوں میں نئے راز کا اضافہ خوب تھا۔ تمام تحریریں اپنی مثال آپ تھیں۔ مرسلہ اختر اور مجید بھائی کی تحریریں خوب اچھی تھیں۔ نصرت سرفراز ممتاز احمد اور جاوید راہی کی تحریریں بھی بہترین تھیں۔ میوانی صاحب آپ بھی اچھا

احوالیو! سے گزارش

پیارے احوالیو! آپ سے گزارش ہے کہ اپنے تبصرے مختصر اور جامع تحریر کیجیے۔ اگلے ماہ سے آپ کے تفصیلی تبصرے ہماری قینچی دیکھے گی..... سمجھ گئے نا۔ ہم نہیں چاہتے ہمارا کوئی بھی احوالی ہم سے ناراض ہو۔ اس لیے تبصرہ تحریر کرتے وقت خاص خیال رکھیے گا اور بہت جلد بہترین تبصرے بھیجنے والے احوالیو کو 'سند' سے بھی نوازا جائے گا۔

لکھتے ہو۔ سلسلہ وار ناول بہترین رُخ اختیار کیے ہوئے ہے۔ پڑھ کر دل خوش ہوا۔ تیرنیم کش اور ہائیڈ پارک بھی اچھے سلسلے ہیں بہت سی مفید معلومات فراہم کرتے ہیں تمام پرچہ ہی بہترین تھا۔ ہڈ اسرار نمبر 3 کا بے چینی سے انتظار ہے۔ سب کو سلام اب تک کے لیے اتنا ہی زندگی رہی تو پھر سے شامل احوال ہوں گے۔ اللہ نگہبان۔

☆: اچھے حسنین! تمہارا تبصرہ بہترین رہا۔ خوش رہو۔ کہانی کے بارے میں جلد مطلع کر دیں گے۔

✉: بہاولپور سے ہمارے نئے لکھاری ساتھی عثمان بلوچ کی احوال میں آمد ہے۔ اپنے قلم سے کچھ اس طرح موٹی برسار ہے ہیں کاشی بھیا! میرے قلم کی سیاہی وطن عزیز کی محبت میں قرطاس کے دامن کو زینت بخشنے کے لیے بے تاب ہے مگر اندیشہ طوالت کے سبب قلم کو اجازت نہیں مل رہی۔ آئیے۔ چلتے ہیں مقصود کی طرف تو جناب والا احوال کی نگری میں یہ دیکھ کر میری خوشی و مسرت کی انتہا نہ رہی کہ لکھاری حضرات نے بھی میری کوشش کو سراہا یہ بات اس رسالے کے لکھاریوں کی وسیع ظرفی پر دلالت کرتی ہے اور تو اور میرے بہت پیارے کاشی بھیا نے بھی پسندیدگی کے کلمات سے نوازا۔

Downloaded From Paksociety.com وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

اوہ..... سوری..... بات پھر لہی ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ کاشی بھیا کے ماتھے پر بل آئیں ہم ادبی شہ پاروں کو کم کیے دیتے ہیں۔ میں انتہائی مشکور ہوں پیارے بھائی مجید احمد جانی 'مستاز احمد خادم حسین کھینڑا' سدرہ انور علی 'جاندار تبصرہ نگار عظیمی شکور زبانت افشال' کمانڈر شعبان کھوسہ، فیصل ندیم بھٹی 'شاہانہ احمد انیس الرحمان' ہر دل عزیز ندیم عباس میوانی 'اور ابھرتے ادیب ابو ہریرہ بلوچ' کا کہ انہوں نے ادبی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ انعم شہزادی صاحبہ کو سچی کہانیاں کی زینت بننے پر مبارکباد۔ صاحب قلم ایم اے راحت کے لیے دعا گو ہوں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔ منزہ سیام اللہ کرے آپ کی دعائیں بار آور ہوں اور کراچی امن کا گہوارہ بن جائے۔ کاشی بھیا! آپ نے واقعی درست لکھا کہ کہانی کہانی نہیں رہتی بلکہ تاریخ بن جاتی ہے۔ سوگب زندگی اور میں مر گیا 'شو بزنس' بڑی اماں ویدہ عبرت 'عداوت' قصور میرا 'جیون ہار دیا' ہم شکل 'زہر عشق' بہت اچھی رہیں۔ باقی لکھاریوں نے بھی خوب محنت کی۔ لکھتے جائیں پڑھتے جائیں۔ لوجی کاشی بھیا آپ نے یہ کیا کہہ دیا؟ بھلا آپ سے ترک تعلق کیسے ہو سکتا ہے۔ اب تو آپ کی امید یقین میں بدل جانی چاہیے۔

کریں گے ترک تعلق تم سے یہ وعدہ رہا
بدن سے روح کا رشتہ ٹوٹ جانے دو

☆: بہت اچھے عثمان! تبصرہ اچھا لگا مگر پلیز ذرا جلدی ارسال کیا کرو۔ تمہارے لیے سچی کہانیاں ایک

ایسا پلیٹ فارم ہے جو اچھی تحریر کے لیے ہر لمحہ باز دوایے موجود ہے، سلامت رہو۔
 ✨: مار یہ یا سر، کراچی سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہیں لکھتی ہیں میں کافی عرصے سے آپ کا ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھ رہی ہوں۔ میں کہانیاں وغیرہ لکھتی ہوں ایک کہانی آپ کو بھی بھیج رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں آپ کو پسند آئے گی اور اپنے ڈائجسٹ میں شائع بھی کریں گے۔ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

☆: پیاری مار یہ! خوش آمدید کہانی پڑھ کر ہی رائے دی جاسکتی ہے۔ فی الحال تو بڑا سرراہنبر کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ اس لیے انتظار کرو گڑیا۔

✨: چوہدری ابوزر سندھو کی جو ہر آباد سے احوال میں پہلی پہلی آمد ہے لکھتے ہیں۔ میں اسٹوڈنٹ ہوں۔ چند ماہ پہلے اپنے ایک دوست کے گھر چکی کہانیاں دیکھا اور پڑھنے کے لیے لے آیا۔ رسالہ اتنا پسند آیا کہ اب میں ہر مہینے باقاعدگی سے بک اسٹال سے خرید کر لاتا ہوں۔ اس میں چھپنے والی تمام ہی کہانیاں بہت ہی مزے کی ہوتی ہیں۔ بالخصوص جاہد راہی اور ممتاز احمد کی پلیٹ فارم کہانی بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ یہ دونوں قلم کار بہت خوب لکھتے ہیں۔ میں ان کا فین ہوں۔ اس کے علاوہ احوال میں شائع ہونے والے خط بہت اچھے ہوتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے سب ایک ٹیبل کے ممبر ہوں۔ جناب مدیر صاحب میں سچی کہانیاں کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ تو کتنے پیسے بھیجنے ہوں گے۔ آخر میں تمام پڑھنے والوں اور رائٹرز کی خدمت میں میرا ادب بھر اسلام قبول ہو۔

☆: پیارے ابوزر! ایک تو تمہارا نام اتنا پیارا ہے۔ جیو! سالانہ خریداری کے لیے 890 روپے کا منی آرڈر ادارے کے نام ارسال کر دو۔ ہر ماہ تمہارے دیے گئے ایڈریس پر تمہیں پرچہ ملتا رہے گا۔
 ✨: یہ ہے احوال میں پہلی پہلی آمد ہماری عزیز لکھاری سائھی زہت ناز کی کراچی سے، لکھتی ہیں۔ ماہ اکتوبر سن دو ہزار پندرہ کا چمکتا دمکتا، جھومتا گاتا، اٹھلاتا، سرسراتا شمارہ جب آیا تو مانو خوشیوں سے بھری عید ہو گئی۔ سرورق دیکھتے ہی یوں محسوس ہوا کہ ابھی تو عید گزری نہیں..... بہت خوب! احوال پڑھتے ہی یوں لگا کہ جیسے اپنوں سے ملاقات ہو گئی ہو۔ ادی زرینہ جو نیو سے لے کر پیارے بھیا حمید تک محبتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا لائق سلسلہ ہے کہ اس کی رو میں بہہ کر اس وقت خوشیوں سے بھرے آنسو چھلک پڑے کہ جب قارئین نے ایک نئی لکھاری کو دیکھ لیا۔ بہت شکر یہ تمہیں شہزادی آپ واقعی کبیر والا کی شہزادی لگتی ہیں۔ میری کہانی لا علاج کی پسندیدگی کا شکر یہ۔ چوہدری فہد سہو آپ کا بھی بہت شکر یہ کہ ایک نو آموز کو عزت بخشی۔ کراچی سے پیاری آپا مسز نوید ہاشمی آپ کا بھی شکر یہ تمہیں اور سیدہ امامہ علی آپ دونوں کی پسندیدگی کا بھی بہت شکر یہ۔ پیاری بھابی صائمہ مجید ام مناہل صائمہ سحر ڈاکٹر خادم حسین اور فیصل ندیم بھٹی آپ سب نے کہانی لا علاج کو پسند کر کے واقعی مجھے مزید لکھنے کی طرف راغب کیا۔ پیارے بھائی ممتاز احمد آپ نے بھی لا علاج کو پسند کر کے مجھے حوصلہ بخشا۔ آپ کی کہانی بھی لا جواب ہے نہ صرف ستمبر کا قصور میرا بلکہ اکتوبر کی کہانی قلی سے افسر تک بھی بہت خوب ہے۔ کاشی بھائی آپ کا نادل زہر عشق بہت زبردست ہے۔ منور کے احساسات کے ساتھ ہم بھی اسی احساس کے ساتھ جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ..... گڈی آپا (حمین اختر) کا سن کر بہت افسوس ہوا اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔ نصرت سرفراز کی مرد کہانی ڈھونڈو گے ہمیں بازی لے گئی۔ ایم سلطان کی تم یاد آتی ہو راشد لطیف کی پگلی آفرین انیس کی صدقہ زیبا بدر کی جیت اور اسماء اعوان کی لائف بوائے بھی بہت

خوب صورت تخلیق ہے۔ محمد سلیم اختر کی داری، اعجاز احمد کی دیکھتی آنکھیں اور ملک محمد اکرم کی پاست بھی بہت اچھی تھی۔ ہائیڈ پارک میں نور العین کا یاد رکھیں اور بسمہ اشتیاق کی مہارت نے تو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ گاجر کے پتوں کی خوبی پہلی بار چلی۔ آمنہ علی شکر یہ تیرنیم کش میں ماہم نعیم شاد کراچی کا شعر بہت پسند آیا کہ

ہمیں سجدے کیے ہم نے بھی شاہوں کی چوکھٹ پر
ہمیں جتنی ضرورت ہو خدا سے مانگ لیتے ہیں

آخر میں آپ سب کا بہت شکریہ کہ میری تحریر کو عزت بخشی اور اسے پسند کیا۔ اس محفل میں پہلی بار شرکت کی ہے اور بہت مزہ آیا۔ اللہ تعالیٰ کاشی بھائی اور ان کی ٹیم کو مزید ترقی عطا کرے اور رسالے کو بام عروج تک لے جائے۔ آمین۔ میری جانب سے تمام بھائی بہنوں کو اللہ حافظ۔

☆: لیجئے نوبت جی! ایک بار پھر ہم آپ کا **Warm Wellcome** کرتے ہیں۔ تبصرہ کمال کیا، اگلے ماہ انتظار رہے گا۔

☆: تمہارا ڈکوٹ سے کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد مور شاہد حسین احوال میں موجود ہیں۔ لکھتے ہیں۔ کاشی بھیا سلام و آداب! اکتوبر کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے سرورق اچھا تھا۔ اگلے اشتہارات نظر انداز کرتے ہوئے آئی منزہ سہام کا ادارہ بد نصیب کون؟ ہمیشہ کی طرح دل کی آنکھ سے بڑھا۔ اپنوں کی محفل احوال اپنے عروج پر تھی۔ تین ماہ احوال سے غیر حاضر رہنے پر دلی معذرت وجہ ناسازی طبع تھی۔ ماہ اگست میں میری کہانی ڈرگتتا ہے شائع ہوئی اس عزت افزائی اور حوصلہ افزائی پر بے حد شکریہ خدا آپ کو سدا خوش رکھے آمین۔ رب سائیں گڈی آپ کی مغفرت فرمائے اور ان کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے محفل میں تمام نئے آنے والوں حمیرا قریشی، سجدہ صابر، بہن صائمہ سحر، ناظمہ اشتیاق، ایم افضل آزاد، ملازم حسین، محمد جاوید، حمید علی بھلی کرے آیا (خوش آمدید) ادبی زرینہ جو جو سدا خوش و سلامت رہیں۔ آپ کی کہانی کب آرہی ہے۔ ملک احوال ادبی تحسین جو جو گریارانی سدرہ انور علی بہنا خدا آپ کو نظر بد سے بچائے۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ ریحانہ نسیم مسز نوید ہاشمی آپ کیسی ہیں آپ؟ محمد اسماعیل بروہی 20 نومبر کو برتھ ڈے بہت مبارک ہو۔ بھیا جگ جگ جیو، بیبل جاوید، ندیم عباس میوالی، فیصل ندیم بھٹی، سناہیے کیسے ہیں آپ۔ ممتاز احمد بھیا آپ کی تحریریں دل میں اتر جاتی ہیں۔ خدا آپ کو بہت کامیاب کرے۔ مجید احمد جانی بھیا اور صائمہ مجید بھائی خدا آپ کی جوڑی سلامت رکھے اور آپ کو نیک میرت اولاد سے نوازے۔ رانا محمد شاہد، صفدر علی حیدری، ملک صفدر عباس، انکل اشفاق بٹ آپ سب کہاں ہیں۔ منشی محمد عزیز بھیا اور گلاب جیسے سعید گلاب کیا ہو رہا ہے؟ عبدالغفار عابد آپ کی بات دل میں اتر گئی۔ سلسلہ خاص، ہم شکل اور زہر عشق بڑی عمدگی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہائیڈ پارک تیرنیم کش شاندار سلسلے ہیں۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے تبصرے کے لیے معافی، انشاء اللہ اگلے ماہ بھر پور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ آخر میں تمام چاہنے والوں کے لیے پُر خلوص دعائیں۔

☆: پیارے مور! تم دن احوال میں رنگ کم محسوس ہوتے ہیں۔ طبیعت اب کیسی ہے۔ اپنا خیال رکھو۔ ہمارے لیے سمجھے نا..... اب غیر حاضر نہ ہونا۔ ہمیں تمہارے تبصرے کا انتظار ہے۔

☆: جمیل احمد چنزل آباد سے پہلی بار احوالی بن رہے ہیں لکھتے ہیں احوال میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہا ہوں امید ہے کہ آپ میری پذیرائی کریں گے۔ محترم کاشی چوہان آپ کے ماہنامہ سچی کہانیاں کا تعارف مور شاہد حسین کے ذریعے ہوا جو کہ باقاعدگی سے احوال میں شرکت کرتے ہیں۔ اور ماشاء اللہ کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ ماہ اگست کا شمارہ مور شاہد حسین نے تحفے میں دیا۔ ان کی لکھی ہوئی کہانی ڈرگتتا ہے مجھے بے حد

پسند آئی مبارک باد۔ تازہ شمارہ ماہ اکتوبر کا اپنی تمام تر رنجناویوں کے ساتھ موصول ہوا۔ ٹائٹل زبردست لگا۔ منزہ بی کا بد نصیب کون؟ بے حد خوبصورت الفاظ کا ایک مجموعہ تھا۔ پھر احوال میں حاضری دی۔ احوال کی پزیرائی محفل نے مجھے بھی شامل ہونے کے لیے مجبور کر دیا، امید ہے حوصلہ افزائی ہوگی۔

☆: اچھے جمیل! خوش آمدید! مگر یہ کیا..... تبصرہ کہاں ہے۔ اگلے ماہ بھر پور تبصرے کے ساتھ احوالی بننا۔ ہمیں انتظار رہے گا۔

☆: کراچی سے بھیا اشفاق شاہین کچھ اس طرح رقم طراز ہیں، اس بار پرچہ 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی ماڈل مسکراتے ہوئے گزری عید کی مبارکباد دیتے کچھ زیادہ ہی پیاری لگی۔ گڈ، 7 اوراق کی لمبی چھلانگ کے بعد ادارے تک پہنچے جہاں منزہ سہام مسلمان ممالک کی خاموشی پر نوحہ کناں تھیں کاش کہ مسلم ممالک یکجا ہو کر دنیا کو بتادیں کہ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں، یہ ہمارا خواب ہی، اللہ کرے کہ پورا ہو کہ تمام دنیا پر مسلمانوں کی ایک بار پھر حکومت ہو۔ احوال میں پہنچے جہاں اس بار طویل عرصے بلکہ مدتوں بعد زرینہ و تحسین سسر سب سے پہلے ایک ساتھ پہنچیں، بہت خوشی ہوئی، تحسین اب تو باقاعدہ ہو گیا ہوں اور رہوں گا۔ فرزانہ نگہت ملک عاشق انس منزل سیدہ حجاب فاطمہ روبینہ ناز روٹی صائمہ سحر آپ سب کافی عرصے بعد احوال میں آئے ویلکم بیک بس گزارش ہے کہ اب..... جائے گا نہیں، اپنی پیاری پیاری بانوں سے اس بزم کو رونق بخشتے رہیں۔ تجدہ صابر، افضل آزاد ملازم حسین شینا حمید علی، تہہ دل سے احوال میں خوش آمدید، جگ جگ جیو۔ گڈی آنا کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ رانا حبیب آپ کے لیے نیک تمنا میں تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ سدرہ انور بھی خوبصورت خط لکھے ساتھ موجود تھیں۔ عبدالغفار عابد اللہ نے زور قلم اور زیادہ۔ انم شہزادی آپ کا اندازہ کیا کہنے۔ ممتاز احمد، راشد لطیف بہترین خطوط اور بانی دوست بی بی اپنے پیارے ناسوں کے ساتھ رونق بزم بڑھاتے نظر آئے۔ آتے ہیں تبصرے کی طرف حجاز کے واقعات ماہر القادری اور شورش کاشمیری نے روح کو خوش کر دیا۔ مجرم کون ملازم شیرازی نے ایک حساس انسان کے لفظوں کو بہت خوبصورت زبان دی۔ بہت خوب۔ داری زیادہ متاثر نہ کر پائی۔ دیکھتی آنکھیں اعجاز احمد فکر ال نے اچھا لکھا۔ ہلتی سچ بیانیوں میں مجید جانی، نیل جاوید، تیمس غزالہ، کی سچ بیانیاں قابل داد اور پیاری تھیں گڈ۔ ہم شکل بھی کوئی گہرا تاثر قائم کرنے میں نئی الحال تو کامیاب نہیں لگ رہی۔ ندیم میوانی، ارم ناز، راشد لطیف تینوں کے شعلے دکھتے ہوئے انگارے تھے، خصوصاً ارم کا! ویری گڈ حکایتوں میں سیدہ کاظمی اور رانا شاہد بازی لے گئے۔ بہت خوب، خاص کہانی جیت میں زینا بدر نے واقعتاً خاص ہونے کا حق ادا کر دیا۔ گڈ، تین مرد تین کہانیاں تینوں عورتوں نے لکھیں اور کیا خوب لکھیں۔ آخر میں زہر عشق کیا کہنے کاشی بھائی، کمال کر دیتے ہیں آپ۔ ہائیڈ پارک میں انتخاب خوب تھا اور تیر نیم کش بھی زبردست خصوصاً صائمہ مجید، روبینہ ناز روٹی اور تحسین جو نیچو کے اشعار۔

☆: اچھے بھائی! تبصرے کا شکریہ اور اب باقاعدہ ہی رہنا ہے۔ کمرشل کہانی پر آپ کی رائے سر آنکھوں پر مگر کچھ مجبوریاں ساڈیاں دی ہوندىاں نے..... سمجھیا کرو۔

☆: احوال، تلہ گنگ سے ہمارے قاری ساتھی سلیمان شبیر عرض کرتے ہیں ماہ اکتوبر کا ماہنامہ یکم اکتوبر کو ملا اور دو سے تین دن میں مکمل پڑھا۔ کاشی بھیا اتنا اچھا اور معیاری رسالہ دینے پر آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو مبارکباد۔ سب سے پہلے منزہ آنٹی کا بد نصیب کون پڑھا۔ واقعی ہم لوگ ہی بد نصیب ہیں جو کہ اللہ کے اس تحفے (پاکستان) کی قدر نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے بعد احوال پڑھا اور جتنی محبت اور خلوص کے ساتھ

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نومبر 2015ء

کوئین
برائے
احوال

نام:

مکمل پتا:



میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کر لیں۔

نومبر 2015ء

کوئین
برائے
اشاعت
کہانی

عنوان کہانی:

تعداد صفحات:

Downloaded From
Paksociety.com

نام:

مکمل پتا:

فون رسیل نمبر:



میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا کرتی ہوں۔ میری رائے میں

نومبر 2015ء

کوئین
برائے
پسندیدہ
کہانی

اول، عنوان:

مصنف:

دوم، عنوان:

مصنف:

سوم، عنوان:

مصنف:

نام:

شہر:

آپ نے احوال سجا رکھا ہے۔ اللہ پاک اس خلوص اور محبت کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے آمین۔ احوال میں سب نے بہت ہی زبردست تبصرے بھیجے۔ ادی زرینہ جو نیچو ادی تحسین جو نیچو اشفاق شاہین ایم یعقوب آپا مسز نوید ہاشمی سدرہ انور علی اور باقی تمام کے تبصرے بھی بہت اچھے تھے۔ اسماء اعوان لائف بوائے کے حوالے سے بہت اچھی اسٹوری ڈھونڈ کر لاتی ہیں۔ کاردان حجاز مولانا ماہر القادری اور حجاز میں چودہ دن شورش کاشمیری صاحب نے دل میں اللہ کا گھر اور مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کے روضہ کی تڑپ اور بڑھادی۔ مجرم کون، داری، ابا کی بختاور، پامسٹ، کتے کی موت، عزت دار، کہانیاں بہت ہی زبردست تھیں۔ اور اس ماہ کی خاص کہانی 'جیت زیبا بدر کی واقعی خاص کہانی ہے۔ جاوید راہی مفرد اور بھائی ممتاز احمد قلی سے افسر تک دونوں بھائیوں کی تعریف ایسے ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھایا جائے۔ مسئلہ یہ ہے میں بابا جی ذہبی انسانیت کی جو خدمت کر رہے ہیں اللہ پاک ان کو اس کی جزائے خیر دے۔ ہائیڈ پارک اور تیرنیم کش میں بھی سب کا انتخاب اچھا تھا۔ ہم شکل اور زہر عشق کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ آخر میں تمام احوالیوں کو جنہوں نے ہمیں یاد رکھا یا یاد نہیں رکھا سب کو سلام عرض اور سچی کہانیاں کی ترنی کے لیے دن رات دعا گو۔

☆ پیارے سلیمان! بھی سچ پوچھو تو تمہارے تبصرے کا انتظار رہتا ہے۔ سلامت رہو! تم جیسے قاری ہمارا مان ہوتے ہیں۔

✉ احوال میں یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری سی بہن ارم خان کی ڈی جی خان سے، لکھتی ہیں رسالہ پانچ تاریخ کو ملا سب سے پہلے احوال کی طرف دوڑ لگائی جہاں سب سے پہلے بھیا جی ملے احوال کی سرواری سنبھالے ہوئے پھر ان کے بعد سب سے پہلے ادی زرینہ جو نیچو ادی گڈ، پھر باری باری تمام احوال نظر آئے۔ مزے اور محبت کی بات تو یہ ہے کہ کاشی بھیا ہر احوالی کے ساتھ ساتھ رہے اور ان کے خلوص کا پھول ہر احوالی کو حاصل ہوا۔ اپنے خط کے جواب پر آ کر میں رُک سی گئی ہیں۔ بھیا جی ہم خاص نہ تھے اور نہ ہیں مگر پھر بھی آپ نے ہمیں خاص لفظوں سے نوازا بہت شکریہ۔ بہن مسز نوید ہاشمی، ہرا چھائی خود کو منواتی ہے آپ کی کہانی اچھی تھی۔ سو تعریف بھی ہوئی اس میں شکریہ کہنے کی کوئی بات نہیں۔ خوش رہو۔ شاہد رفیق سہو بھائی میرا تبصرہ اور شعر پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ ڈیر سدرہ انور علی، شکریہ کی ضرورت نہیں آپ کا تبصرہ ہر ماہ اچھا ہوتا ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ آپ کا پچھلے ماہ اور اس ماہ والا شعر مجھے کافی پسند آیا۔ میرا شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ ایم یعقوب بھائی ٹھیک کہا آپ نے۔ اپنے کبھی نہیں بھولتے۔ اپنے تبصرے میں یاد کرنے کا شکریہ۔ فرح امیس ڈیر کہاں گم ہیں آپ، جلدی سے حاضری لگوائیں۔ کہانیوں میں داری ابا کی بختاور انصاف نرالے یہ بھید ہیں روگ عمر بھر کا ہے نیکی کرنا جا شاندار تھیں۔ تیرنیم کش میں محمد جاوید شاہد رفیق سہو ایم افضل آزاد محمد ندیم عباس میوالی ابو ہریرہ بلوچ مجید احمد جانی سدرہ انور علی حمیرا قریشی باہین فاطمہ شاہدہ ماہم نعیم شاہ کی شاعری پسند آئی۔ گڈی آپا اس نام کے سوا میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، ہاں اتنا پتا ہے گڈی آپا کا تعلق سچی کہانیاں سے تھا۔ لکھاری تھیں، وہ میری نہ جان پہچان تھی ان سے نہ کوئی رشتہ تھا لیکن آج ان کے اچانک چلنے جانے پر دکھ ضرور ہوا اللہ پاک ان کی مغفرت کرے آمین۔

☆ اچھی بہن! تبصرہ بہترین رہا۔ لو اب انعام بھی حاصل کرو۔ اس ماہ آپ کی کہانی شائع ہو رہی ہے۔

مبارک ہو۔

✉ کراچی سے ہماری بہن منزل خان ہمیں یاد کر رہی ہیں، لکھتی ہیں۔ ہر دلعزیز بھیا اور پیارے

احوالیوں کو منزل خان کا محبت بھرا سلام۔ سب سے پہلے نہایت سلیقے سے سچی دھیمی مسکراہٹ لیے ٹائٹل گرل نے خوش آمدید کہا۔ اشتہارات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ادارے میں پہنچی۔ واقعی انسان بہت ناشکرا ہوتا ہے۔ آزادی کی اصل قیمت وہی لوگ جان سکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے پیاروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتے، کلتے اور دم توڑتے دیکھا ہے۔ ان ہی سوچوں میں ڈوبی احوال میں پہنچی تو کاشی بھیا کے سوال نے چونکا دیا۔ بھیا! زندگی کے جھمیلوں سے تنگ آ کر دو گھڑی سکون کا سوچنے پر ہی تو قلم ہاتھ میں تھا ما ہے۔ بہت سکون ملتا ہے اپنے خیالات کی گردش کو الفاظ کے سپرد کر کے اس بار احوال پر نظر پڑتے ہی میں ڈیٹونک کا اشتہار بن گئی تھی۔ کیونکہ اس بار بہت سے پرانے نام جگمگا رہے تھے۔ جن میں حسین جوینجو، فرزانہ گلہت، حجاب فاطمہ اور صائمہ سحر آپ سب کو دیکھ بیگ۔ نئے ساتھی حمیرا قریشی، سجدہ صابر، ملازم حسین، ابوزر غفاری اور ناظرہ اشتیاق آپ سب کو خوش آمدید۔ مومنہ بتول، بیٹی کی شادی بہت مبارک ہو۔ شاید رفیق، ایم یعقوب، مسز نوید ہاشمی، ممتاز احمد، فیصل ندیم، بھٹی، محمد جاوید بہت شاندار تبصروں کے ساتھ میدان میں آئے تھے۔ سلیمان شبیر آپ کو چکوال میں یہ جریدہ 31 تاریخ کو کیسے مل جاتا ہے جبکہ کراچی میں رہ کر بھی مجھے 3، 4 تاریخ سے پہلے میسر نہیں ہوتا؟ رانا حبیب الرحمن، کاشی بھیا ہمارے خطوط بغل میں گھاس کاٹنے والی پینچی رکھ کر پڑھتے ہیں۔ سدرہ انور، کاشی بھیا اگر سیلفی میں سب سے آگے کھڑے ہوئے تو ہم جیسے چھوٹے موٹے قلم کار ان کے پیچھے نظر ہی نہیں آئیں گے۔ ارم خان آپ دونوں کان کسی اور سے پکڑوا لیتی اور خود اطمینان سے تبصرہ کرتی اس طرح فرح انیس کو شکایت نہ ہوتی اور نہ آپ کو پراہم۔ عبدالغفار بھیا، آپ کی بات صرف دل ہی نہیں بلکہ گردوں، پھیپھڑوں اور جگر تک کو چھو گئی۔ انعم شہزادی آپ خود کیوں پانی پیئیں گی، ہم کس لیے ہیں۔ احوال میں آئی ہیں تو کچھ کھائے پیے بغیر تو ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے۔ مجید بھیا اور بھابی صائمہ مجید سچ بتائیں آپ دونوں میں پہلے کون اس جریدے کو پڑھنے کے لیے حملہ آور ہوتا ہے؟ تیرنیم کش میں ماہم نعیم اور شاید رفیق کے اشعار پسند آئے۔ کہانیوں میں داری، ابا کی، بختاور، کینسر، عزت دار، پگی اور جیت بہت عمدہ کہانیاں تھیں جبکہ دیکھتی آنکھیں، کتے کی موت، صدقہ، نیکی کرتا جا، وڈیری، استاد، ایمانداری کا ٹکٹ، تم یاد آتی ہو، ادھوری کہانی، سماج سیوا، موسیٰ پرندے، قلی سے افسر تک بھی اچھی کہانیاں ثابت ہوئیں۔ اب اجازت اللہ آپ کا اور ہم سب کا حامی و ناصر رہے آمین۔

☆: اچھی بہن! تبصرہ کر کے تو تم نے دل جیت لیا۔ خوش رہو اور اب احوال سے غیر حاضر نہ ہونا۔

☞: ہمارے احوال کی شری عظمیٰ شکور اسلام آباد سے تبصرہ لیے حاضر ہیں، کھتی ہیں۔ ارے واہ کیا صحت بنالی مطلب قربانی کا گوشت بانٹا نہیں خود کو دیکھا ایڈیٹر صاحب اف اف موٹے ہو گئے گوشت کھا کھا کر (ارے ہم تو خود قربان ہوتے رہ گئے بی بی! تم کہتی ہو جان بنالی!) ہاں جی احوالیو! کیسے ہو سب دیکھنے میں تو سب خوش دکھ رہے ہو۔ ہاں جی کاشی صاحب کا ساتھ ہو اور خوشی نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کبھی تو منزہ سہام کے خواب اچھے پاکستان کے حقیقت کا روپ دھاریں گے۔ احوال کے شروع میں کاشی صاحب کے معصوم خیالات پڑھے خوشی ہوئی۔ اس منافق دنیا میں کاشی ملے ہم سب کو خدا کی قدرت ہے۔ تو جی آئیے کہانیوں کی طرف، کچھ کہانیاں بے وفائیوں، کچھ جذبات و احساسات سے عاری لوگوں کی تھیں مگر ہر کہانی الگ ہی رنگ میں تھی۔ دیکھتی آنکھیں، اعجاز احمد، کمال صاحب کمال کی کہانی تھی مطلب آنکھوں والے بے حس ہیں جو اس طرح کے کام کر کے قدرت کا انتقام بھول جاتے ہیں۔ ابا کی، بختاور، محسن علی شامی اچھا لکھا آپ نے۔ اچھا لکھا نصیبوں کے کھلنے کے انتظار میں لڑکیاں باپ کی دلہیز پر ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

ویسے ایسا کیوں ہوتا ہے۔ انصاف فرزانہ نگہت حد کرتی ہیں آپ مطلب اتنی زبردست اسٹوری مگر بھیا تک انجام!! اُف ڈر لگ رہا ہے دنیا سے..... نرالے یہ بھید ہیں ٹھیک ہی تو کہتے ہیں آپ مجید احمد جانی صاحب! یہ بھید وہ اوپر والا ہی جانے۔ مگر اُس کی پکڑ شدید ہوتی ہے۔ قسم سے..... روگ عمر بھر کا ہے اوہو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا قسم سے دکھ ہوا۔ نیل جاوید کینسر سیمس غزالہ یہاں جیسا آپ کا نام خوبصورت ہے نا ایسی ہی خوبصورت کہانی لکھ ڈالی آپ نے زبردست جی۔ جی تو چلیے ذرا ہائیڈ پارک کی ٹھنڈی ہوائے لیس اُف جس بہت ہے۔ دوزخ کی آگ محمد افضل کمال لکھ دیا۔ جزاک اللہ انعم شہزادی کا لکھا کلام بہت اچھا لگا۔ مطلب یوں سمجھیں ہر تحریر حسین تھیں۔ تیر نیم کش میں روبینہ ناز کا شعر مجھے اچھا لگا۔ مجید احمد جانی صاحب ہر جگہ چھائے ہیں آپ، جناب راز تو بتا دیجیے۔ جی تو اجازت دیجیے اُف ایڈیٹر صاحب کو تو دیکھیں کیسے خوش ہو گئے۔ (آپ کا تبصرہ خوشی جو دیتا ہے) جی نہیں اگلے ماہ پھر حاضر ہو جائیں گے ہم تبصرہ لیے۔ اُف ہو گئی نہ ٹھنڈی چائے تبصرے کے چکر میں۔ اوکے جی میں چلوں۔ چائے میرے انتظار میں ہے اور مجھے انتظار رہے گا آپ سب کی خوبصورت باتوں کا اگلے مہینے۔ نا نا، بائے بائے۔

☆: پیاری عظمیٰ! سچ پوچھو تو تم نے احوال کو اپنے منفرد انداز سے اپنا بنا لیا ہے۔ خدا کرے کہ محبتیں یوں ہی برقرار رہیں۔ لڑکی تمہارا تبصرہ بھی زبردست ہوتا ہے۔ جیو۔

✉: کراچی سے ہماری آپا مسز نوید ہاشمی کی احوال میں شرکت ہے، لکھتی ہیں۔ منزہ سہام کا انداز بیان بے حد خوبصورت اور کھلا سچ ہوتا ہے۔ کاشی چوہان احوال کی محفل کو خوبصورتی سے سجائے بیٹھے ہیں۔ سب سے پہلے گڈی آپا کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور میں شاکڈ رہ گئی۔ مرنا سب کو ہے کبھی میری کبھی تیری باری۔ احوال میں سب کے خط پڑھے نمبروں رہے سب۔ مجید احمد جانی اور بھابی صائمہ مجید مجھے آج پتا چلا ہے آپ مسز مجید احمد جانی ہیں۔ ماشاء اللہ شہزادی شہزادے سب ہمارے احوال میں شریک ہیں اور پریاں بھی آسمان سے آکر اس محفل کی رونق کو دو بالا کر دیتی ہیں، پھر کیوں دل نہ لگنے اپنے احوال میں۔ مجھے بھی اپنا یہ پیار بھرا احوال بے حد پسند ہے۔ جو کاشی میرا بھائی بہت محبت سے سجاتا ہے۔ ایم اے راحت آپ کی طبیعت کا سن کر افسوس ہوا۔ میری دعا ہے کہ جب تک میرا یہ خط احوال میں شامل ہو آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں۔ اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے آمین۔ آپ کی ہم شکل ناول اور کاشی چوہان کی زہر عشق سچی کہانیاں کا دل ہے۔ دل کو اگر جدا کر دیا جائے تو کچھ نہیں بچتا ہے۔ بے حد مصروفیات کی وجہ سے کہانیاں نہیں پڑھ پارہی ہوں اور بغیر پڑھے ہم سے تبصرہ نہیں ہوتا۔ انشاء اللہ اگلے مہینے پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔ آپ لوگ یقین کریں میرے بیگ میں ڈائجسٹ ہمیشہ رہتا ہے۔ جب موقع ملے پڑھ گیتی ہوں۔ میرے دوست کلائنٹ سب نے ایک دفعہ مجھ سے لے کر ڈائجسٹ پڑھی تو دوسری بار اپنی مرضی سے ڈائجسٹ خرید لی ہر کوئی سچی کہانیاں کی تعریف کرتا ہے۔ اکثر لوگ اپنی زندگی کی کہانی، اپنی پریشانی، حادثہ مجھ سے ضرور شیئر کرتے ہیں۔ اللہ منزہ سہام کاشی چوہان اور تمام رائٹرز کو اس کا اجر ضرور دے گا کیونکہ وہ سچ کا آئینہ دکھا رہے ہیں۔

☆: پیاری آپا! تبصرہ پڑھ کر آپ کی پرچے سے محبت دو چند ہو جاتی ہے۔ اپنا خیال رکھیں۔

✉: لاہور سے ہماری بہت پیاری سی آپا فریدہ جاوید فری کچھ یوں رقم طراز ہیں اکتوبر کا سچی کہانیاں ملا سب سے پہلے تمام احوالیوں کو دعا اور سلام گڈی آپا کے انتقال کا پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ کہانیاں اس مرتبہ بس سو سو ہیں مگر موکی پرندے اور نیکی کرتا جا۔ کتے کی موت و ڈیری اس ماہ کی خاص کہانی جیت بہت مزے کی تھی۔ زہر عشق کی قسط نمبر 8 پڑھی، لا جواب جارہی

ہے۔ مجید بھائی اور سدرہ انور یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ بے حد سلام اور دعا مقصود بھائی بہنا کو بھول گئے، نہ دعا نہ سلام۔ مسز نوید ہاشمی خوش رہو۔ بے حد سلام! آپ کے تبصرے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ عظمیٰ شکور اور سب کو سلام اور دعا۔ تیرنیم کش میں سدرہ انور شین ماہا صائمہ مجید مجید احمد جانی روبینہ ناز روبی کے شعر دل کو چھو گئے۔ مائیڈ پارک میں دوزخ کی آگ نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اچھا جی اللہ حافظ۔

☆: اچھی آپ! خوش رہیں۔ آپ کی صحت کی فکر دامن گیر ہے۔ اپنا بہت سارا خیال رکھیں۔ تبصرہ آپ کی محبت کا ثبوت ہے۔

☆: ساہیوال سے ہمارے نئے ساتھی ایم افضل آزاد شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں اکتوبر کا چچی کہانیاں لاہور سے بارہ اکتوبر کو ہی مل گیا ویسے کاشی بھائی ٹائم کے بہت کچے ہیں۔ جو دن بتایا اسی دن ہی رسالہ مل گیا ورنہ دوسرے رسالے والے بتاتے ہیں۔ یکم کو آئے گا رسالہ مگر ان لوگوں کی یکم آئی 15 تاریخ کو ہے۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی تو ٹائٹل گرل اپنے خوبصورت انداز میں نہایت ہی حسین لگی۔ اشتہارات کو بنا دیکھتے ہی ہم پہنچے بد نصیب کون، میں وہاں پر دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ بد نصیب ہم ہی ہیں۔ احوال میں نظر ڈالی اپنا احوال دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ مہربانی کاشی بھائی۔ احوال میں تو کاشی کی بات نے دوبارہ احوال میں شامل ہونے کی یاد دہانی کروائی۔ اسٹوری میں سب سے پہلے زہر عشق پڑھی۔ ویلڈن کاشی بھائی بہت اچھی قسط وار اسٹوری جارہی ہے۔ قلی سے افسر تک ممتاز احمد۔ حجاز میں چودہ دن، شورش کاشمیری مجرم کون سید ملازم حسین ابا کی بختاور محسن علی شامی نیل جاوید کی روگ عمر بھر کا ہے، کینسر سیمیں غزالہ مفروز جاوید راہی ڈھونڈو گے ہمیں نصرت سرفراز موہی برندے ریحانہ تنویر جیت زیبا بڈر ایمانداری کائلٹ رانا محمد شاہد وڈیری سیدہ کاظمی تم یاد آتی ہو ایم سلطان پٹی راشد لطیف صبرے والا کی اسٹوری گڈ تھی۔ سب نے قلم سے خوب انصاف کیا۔ آہ گڈی آیا کی موت کاسن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ندیم عباس ڈھکو، عامر وکیل جٹ آپ بھی احوال میں شامل ہوا کرو یا۔

☆: اچھے افضل! تبصرے کا شکریہ اسی طرح ہمارے ساتھ رہنا۔

✉: چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے ہمارے دوست فیصل ندیم بھٹی لکھتے ہیں ماہ اکتوبر کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ ٹائٹل میں لڑکی خوبصورت لباس کے ساتھ بال کھولے ہوئے استقبال کرتی نظر آئی۔ اس کے بعد منزہ سہام کا ادارہ بد نصیب کون؟ پڑھ کر مسلمانوں کی بد نصیبی پر دل بہت دکھی ہوا۔ احوال میں اس بار تو 52 خطوط شامل تھے۔ کاشی بھیا خطوط کی فغٹی ہونے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں یہ سب آپ کی بے انتہا شب و روز کی محنت کا نتیجہ ہے۔ احوال میں نئے آنے والے تمام دوستوں کو خوش آمدید جن میں سجدہ صابر ایم افضل آزاد ابو ہریرہ بلوچ ابو ذر غفاری محمد جاوید حمید علی شاہد رفیق سہو اور صائمہ بشیر صاحبہ خط کی پسندیدگی کا شکریہ دوسرا یہ بتائیں کہ اتنا عرصہ کہاں غائب رہیں؟ ایم یعقوب آپ سے بھی مل کے اچھا لگا۔ فرزانہ نگہت واپس احوال میں آنے پر خوش آمدید۔ مس منزل خان پہلے تو خوش آمدید دوسرا اتنی سینئر لکھاری کے قلم سے میرے خط کی تعریف میرے لیے بہت حوصلہ افزا ہے۔ باجی مسز نوید ہاشمی سنا ہے کراچی کا موسم تو اب بھی اتنا گرم ہے؟ بھائی مجید احمد جانی آپ تو بڑے بھیا ہیں۔ یاد کرنا تو لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھائی کو ہمیشہ خوش رکھے۔ اولیاء اللہ کے شہر میں، اولیاء کے سائے میں یونہی ہنستے مسکراتے رہیں۔ ناظرہ اشتیاق مظفر آباد سے حاضر ہیں۔ خوش آمدید آپ کے ہاں تو موسم ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ممتاز احمد اور عزیز مئے کو سلام۔ عقیدتوں کا سفر میں کاروان حجاز میں حرمین شریفین کے پُر انوار لمحات کو محسوس کرتے ہوئے آنکھوں

سے آنسو اُڑ آئے۔ گویا یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میری روح ان مقدس تجلیات سے سرشار ہو رہی ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں پر تبصرے کی طرف۔ پہلی سچی کہانی مجرم کون؟ وطن سے محبت کی بے مثال کہانی ہے 'داری' دیکھتی آنکھیں ابا کی بختاور انصاف نرالے یہ بھید ہیں روگ عمر بھر کا ہے 'کینسر' پامسٹ بہترین سچ بیانیاں ثابت ہوئیں۔ میجر عبدالقدوس تحسین کو خراج تحسین پیش کر کے سرفہرست رہے۔ ساتھ ہو تو ایسا۔ جو ہم سفر کے چلے جانے کے بعد بھی عقیدت کے پھولوں سے مہکتا رہے۔ ایم اے راحت کا سلسلہ ہم شکل بہترین ہے۔ ندیم عباس میوانی 'کتے کی موت' اتنا بھیا تک انتقام بھی لوگ لے سکتے ہیں۔ کبھی سوچا نہ تھا۔ عزت دار 'رنگی' صدقہ نیگی کرتا جاؤ ڈیری 'استاد تم یاد آتی ہو' ادھوری کہانی بھی گوارا تھیں۔ زیبا بدر کی جیت شمارے کی خاص کہانی بہترین ہے۔ فاریہ کاکڑ کیوں کا ظالموں کے چنگل سے نجات دلانا انسانیت کی معراج ہے۔ سماج سیوا، موسیٰ پرندے ڈھونڈو گے ہمیں، جاوید راہی کی مفروز، ممتاز احمد کی قلی سے افسر تک بھی بہترین کہانیاں ثابت ہوئیں۔ کاشی چوہان کا زہر عشق تو اسراریت کی بہترین کڑی ہے۔ مسئلہ یہ ہے ہائیڈ پارک 'تیرنیم کش' بھی بہترین سلسلے ہیں۔ صائمہ مجید کا شعر بہترین اور سبق آموز ہے۔

☆: پیارے قیصل! تبصرہ اچھا لگا۔ کہانی کے بارے میں تمہیں جلد آگاہ کر دیا جائے گا۔

✉: کراچی سے فرح انیس دو ماہ بعد احوال کا حصہ بن رہی ہیں، ابھی ہیں اکتوبر کا شمارہ قدرے تاخیر سے ملا۔ اس پر غضب یہ بھی ہے کہ دس تاریخ سے پہلے خط بھیجنا ہوتا ہے۔ گڈی آپا کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے رشتے داروں کو صبر دے آمین۔ سدرہ انور علی آپ نے یاد کیا میں آگئی جناب۔ جس جس نے میری کمی کو محسوس کیا اس کا شکر یہ اور جس نے نہیں کیا اس کا بالکل بھی شکر یہ نہیں۔ احوال میں ہمیشہ کی طرح ماشاء اللہ خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ نزابت افشال 'ارم خان' مسز نوید ہاشمی بہت شکر یہ۔ سال گرہ کی مبارکباد کے لیے، انعم شہزادی اور صائمہ مجید خوش آمدید، آپ کی احوال میں آمد بہت اچھی لگی۔ منعم اصغر کہاں غائب ہیں؟ باقی سب کیسے ہیں۔ کاشی بھیا اور سب کی خیریت مطلوب ہے۔ اب آتی ہوں تبصرے کی جانب، مولانا ماہر القادری کا کاروان حجاز اور شورش کاسیری کا حجاز میں چودہ دن پڑھ کر دل کو ٹھنڈک ملی۔ اللہ پاک تمام مسلمانوں کو وہاں کی حاضری کی سعادت بار بار نصیب فرمائے آمین۔ اعجاز احمد فکر ال کی تحریر بہت اچھی لگی۔ ارم ناز کی تحریر آنکھوں کو نم کر گئی۔ اللہ تو اپنے بندے کے عیب چھپا لیتا ہے، ہر لوگ نہیں چھپاتے۔ شیخ معظم کی تحریر ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو اپنی اولاد سے لاپرواہی برتتے ہیں۔ نسیم اللہ کی تحریر استاد بہت اچھی تھی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی، حمیرا خان ویلڈن بہت اچھی تحریر تھی آپ کی۔ ایسی ہی سماج سیوا تو ہو رہی ہے آج کل ملک میں اور ہماری سادہ عوام کرواتی ہے شوق سے ایسی سیوا، ریحانہ تنویر کی تحریر بھی بہت اچھی تھی۔ جاوید راہی کی تحریر بھی زبردست تھی۔ ممتاز احمد کی تحریر بہت اچھی لگی واقعی انسان کی محنت اور ہمت اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ کاشی بھیا کا ناول 'زہر عشق' میں شرجیل کی انٹری نے کہانی کو نیا موڑ دیا۔ زبردست ماشاء اللہ باقی تحریریں ابھی پڑھی نہیں، امید ہے وہ بھی بہت اچھی ہوں گی۔ تیرنیم کش میں سب ہی کے اشعار پسند آئے۔ کاشی بھیا آپ کا شکر یہ آپ نے میری غزل اور شعر لکھا۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

☆: اچھی سی! پیاری سی فرح! جگ جگ جیو! انشاء اللہ بہت جلد تحریر پڑھ کر جواب سے آگاہ کروں گا۔ تبصرے کے لیے شکر یہ۔

✉: راشد لطیف صبرے والا، ملتان سے عرض کرتے ہیں، ماہ اکتوبر 2015 کا سچی کہانیاں بہاولپور سے

خریدا۔ ٹائٹل خوبصورت تھا۔ منزہ سہام کا ادارہ ”بد نصیب کون“ خوب رہا، اللہ تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم پر چلائے۔ آمین۔ احوال میں نئے لوگوں کو خوش آمدید، دیکھو، برانے احوالیوں کے لیے ڈھیروں نیک خواہشات، سلام و دعا۔ مجید احمد جانی، ممتاز احمد، منشی محمد عزیز مئے، فیصل ندیم بھٹی، علی حسنین تابش، سدرہ انور علی، ارم ناز، ندیم عباس میوانی، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، باجی صائمہ مجید، مسز نوید ہاشمی تبصروں کے ساتھ مسکراتے نظر آئے۔ تمام کے تمام احوال زبردست تھے۔ تمام کے لیے چھوٹی سی بات، کہ ہمیشہ حق سچ کا راستہ اپنانا کاشی بھائی آپ کی نظم ہر بار بہت خوب ہوتی ہے۔ ویلڈن۔ نرالے یہ بھید، مجید احمد جانی کمال کا لکھتے ہیں، قلی سے افسر تک، پلیٹ فارم کہانی، ہر بار لکھاری سبق آموز تحریر لاکر ہمارے دلوں کے تار ہلا دیتا ہے۔ محمد سلیم اختر کی کہانی بھی خوب رہی۔ اس کے بعد، کتے کی موت، سماج سیوا، عزت دار، تجاز کے چودہ دن، روگ عمر بھر کا تم یاد بہت آتی ہو، انصاف، دیکھتی آنکھیں، جیت، بہت خوب رہیں۔ اس کے علاوہ باقی کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ زہر عشق شاندار جا رہی ہے اور ہم شکل نے متاثر کیا ہوا ہے۔ چھوٹے سلسلے کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں اور ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ باقی میرے پیارے شاہد رفتی سہو صاحب، ہم فقیر لوگ ہیں، جھوٹ سے نفرت اور سچ بولتے ہیں چاہے گردان اڑ جائے۔ زندگی اور موت رب رحمان کے ہاتھ میں ہے۔ سچ بولنے پر موت آجائے تو خوشی سے سرگٹوا دوں گا۔ سچی کہانیاں کے اسٹاف اور لکھاریوں کے لیے دلی دعا، اس بار پرچہ شاندار رہا۔

☆ اچھے بھائی! تبصرے کا شکریہ، رہی بات حق سچ پر چلنے کی تو ہمیشہ یہ پند و نصائح کا وقت نہیں۔ آپ اپنا راستہ چلیں دوسروں کو ان کے راستے چلنے دیں۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ جیواور جینے دو۔

✽ ہمارے بہت پیارے ساتھی مجید احمد جانی، ملتان شریف سے شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں امید کرتے ہیں رب تعالیٰ کے خاص کرم و فضل سے ہنستے مسکراتے، خوشیاں بانٹتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ رحمتوں اور نعمتوں کے سائے تلے ہمیشہ شاد اور آباد رکھے آمین ثم آمین۔ اس بار سچی کہانیاں بہت دور سے منگوایا، ہاں جی لاہور سے اپنے دوست کو زحمت دی، کیونکہ ملتان میں پرچہ ابھی تک آیا نہیں، آٹھ تاریخ ہو گئی، لیکن سچی کہانیاں کی ٹرین کہیں راستہ بھول گئی، اور ایک ہم ہیں کہ سچی کہانیاں نہ پڑھیں، بخار سا ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو تندرست رکھنے کے لیے سچی کہانیاں پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر حضرات! ہوشیار باش) سرورق دیدہ زیب اور کمال تھا۔ سچی کہانیاں کے سرورق کمال کے ہوتے ہیں، دل جیت لیا۔ آگے بڑھے تو منزہ سہام کا ادارہ ”بد نصیب کون“ ہمارا منتظر تھا۔ منزہ سہام کے ادارے پورے پرچے کی جان ہوتے ہیں۔ احوال کی دنیا، خوابوں کی دنیا، جس میں پریاں، شہزادے پیارے محل میں کاشی بھائی کے ساتھ خوب دل کا احوال پیش کرتے ہیں۔ حسنین جو نیچو، ممتاز احمد، منشی محمد عزیز مئے، ارم ناز، سدرہ انور علی، علی حسنین تابش، فیصل ندیم بھٹی، ندیم عباس میوانی، صائمہ مجید، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، نگہت غفار، مسز نوید ہاشمی، کے شاندار تبصروں کے ساتھ باون شامل احوال تھے۔ یہ سچی کہانیاں کی کامیابی کی زندہ جاوید مثال ہے اور اس کا سہرا پیارے کاشی چوہان صاحب کو جاتا ہے۔ ان کی انتھک محنت اور جدوجہد سے نہ صرف سرکولیشن میں اضافہ ہوا ہے بلکہ نئے لکھاری بھی شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر سو سچی کہانیاں کی گونج ہے۔ چھوٹی سی بات عرض کروں گا، میرے بھائی اپنوں کے رُوپ میں منافق لوگوں سے محتاط رہیے۔ رانا محمد شاہد، صفدر عباس، مبارک علی کشی، اور بہت سے پرانے لوگ کہیں گم ہیں، پلیز لوٹ آئیے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے، قلی سے افسر تک پڑھی، دل کے نہہ خانوں سے مصنف کے لیے دعائیں نکلی۔ ممتاز احمد



میں کس جگہ
سچی کہانیاں

کے چہرے نہیں
آپ سچی کہانیاں کے خریدارین کو ملک کو
ذمہ دار بنانے کے لیے

اندرون ملک = 890 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

155 امریکی ڈالرز	ایران	155 امریکی ڈالرز	کویت
155 امریکی ڈالرز	سری لنکا	155 امریکی ڈالرز	سعودی عرب
155 امریکی ڈالرز	جاپان	155 امریکی ڈالرز	یو اے ای
155 امریکی ڈالرز	لیبیا	155 امریکی ڈالرز	مصر
155 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	155 امریکی ڈالرز	یونان
155 امریکی ڈالرز	جرمنی	155 امریکی ڈالرز	فرانس
155 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	155 امریکی ڈالرز	برطانیہ
155 امریکی ڈالرز	پولینڈ	155 امریکی ڈالرز	ناروے
165 امریکی ڈالرز	کینیڈا	165 امریکی ڈالرز	امریکہ
165 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	165 امریکی ڈالرز	افریقہ

زوسالانہ

آج ہی رابطہ کیجیے II 88-C - فرسٹ فلور - خیابان جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز - 7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

READING
Section

صاحب جی جان سے لکھتے ہیں اور ہر بار عمدہ کاوش لے کر آتے ہیں۔ دیکھتی آنکھیں، حجاز میں چودہ دن، روگ عمر بھر کا، مجرم کون، مغرور، کتے کی موت، جیت، ایمانداری کا ٹکٹ، تم یاد آتی ہو، عزت دار کے ساتھ ساتھ تمام کہانیاں شاندار رہیں۔ زہر عشق، اپنے جادوئی اثر میں جکڑے منزل کی طرف روانہ دواں ہے۔ ہم شکل، خوب چل رہی ہے۔ مستقل سلسلے، کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں، ہو سکے تو کسی نہ کسی کا انٹرویو ہر ماہ شامل اشاعت کریں، مختصر احوال کے ساتھ اجازت، جہاں رہیں سلامت رہیں، خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں۔

☆ پیارے مجید! پرچے سے تمہاری محبت تمہارے قد میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد پرچہ وقت پر آپ کے ہاتھوں میں ہوا کرے گا خوش رہو۔

✉ صائمہ مجید ملتان سے ہماری بہت پیاری بہن لکھتی ہیں ماہ اکتوبر کا سچی کہانیاں قدرے لیٹ ملا۔ سرورق خوبصورت اور شاندار تھا۔ سچی کہانیاں کے حسن کو چار نہیں چوبیس چاند لگا کر حسن میں اضافہ کر رہا تھا، منزہ سہام کا ”بد نصیب کون“ بہت خوب تھا۔ منزہ سہام ادارہ کے علاوہ بھی تحریریں لائیں تو سونے پہ سہاگہ ہوگا۔ کاشی بھسا کی حق اور سچ گوئی بھلی لگی۔ دنیا والے سچے کھرے لوگوں کو چین سے جینے ہی نہیں دیتے، ہیں ناں بھیا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے، پھر کیوں نہ ہمیں حق اور سچ کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اس بار نئے اور پرانے احوالیوں نے خوب احوال پیش کیے۔ ممتاز احمد، سدرہ انور علی، ارم ناز، نگہت غفار، ڈاکٹر خادم حسین، کھیڑا، مجید احمد جانی، ملک عاشق حسین، ساجد، منشی محمد عزیز مئے، راشد لطیف کے احوال زبردست تھے۔ احوالیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ سچی کہانیاں ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ گڈی آیا کے انتقال پر ملال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جو رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور لواحقین کو صبر و جمیل عطا فرمائے آمین۔ کہانیوں میں سب سے پہلے محمد سلیم اختر کی تحریر پڑھی، سادہ اسلوب میں زبردست لکھتے ہیں۔ اس کے بعد قلی سے افسر تک پڑھی، ممتاز احمد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتے کی موت، نرسلے یہ بھید ہیں، مجید احمد جانی، کمال کی تحریر بھی۔ کمرشل کہانی لائف بوائے، خوب جا رہی ہے۔ دیکھتی آنکھیں، روگ عمر بھر کا، مجرم کون، مغرور، تم یاد آتی ہو، سماج سیوا، عزت دار، زبردست تحریریں تھیں۔ زہر عشق نے اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ ہم شکل منزل کی طرف جاتے ہوئے، مستقل سلسلے ہائیڈ پارک، تیرنیم کش بھی خوب چل رہے ہیں۔ اس بار تمام کا تمام پرچہ زبردست رہا۔ میری طرف سے ڈھیروں ڈھیر مبارکباد۔

☆ اچھی بہن! اب اپنی بھی کوئی تحریر بھیج ہی دو۔ تبصرہ ہمیشہ کلمہ طرح اچھا لگا۔

✉ سونیا خان، چاہ شاہ گردیز سے پہلی بار شامل احوال ہیں، لکھتی ہیں۔ ماہ اکتوبر کا سچی کہانیاں، سات تاریخ کو ملا۔ سرورق بہت اعلیٰ تھا۔ منزہ سہام کا ادارہ بد نصیب کون، پڑھ کر دل سوچوں کے نگر میں ڈوب گیا۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ احوال کی محفل مسکراہٹوں سے بھی ہوئی تھی۔ میں شکر گزار ہوں، مجید احمد جانی صاحب کی جنہوں نے سچی کہانیاں سے متعارف کروایا۔ زبردست پرچہ ہے، ہر احوالی محبت سے سرشار ہے اور محبتوں کا پیغام دے رہا ہے۔ میرا کسی رسالے میں پہلا خط ہے، امید ہے ویلکم کریں گے۔ میرے لیے یہ محفل نئی ضرور ہے لیکن امید ہے مجھے اس محفل کے قانون و ضوابط سے آگاہ کیا جائے گا، حسین جونجو، مجید احمد جانی، منشی عزیز مئے، ارم ناز، سدرہ انور علی، ممتاز احمد، راشد لطیف صبرے والا، کے

زبردست تبرے تھے، اس کے علاوہ بھی شاندار احوال تھے اور ان کے خوبصورت جوابات دیے گئے ہیں۔ کہانیوں میں قدم رکھا تو ہر کہانی دوسری سے بڑھ کر تھی۔ کس کا نام لکھوں، کس کو گم نام لکھوں۔ سلسلے وار کہانیاں زہر عشق، اور ہم شکل شاندار ہیں، کاش میں پہلی اقساط بھی پڑھ سکتی، زہر عشق کتابی شکل میں کب آئے گا۔ مستقل سلسلے بھی اچھے لگا۔ قلی سے افسر تک، انصاف، نرالے یہ بھید، کتے کی موت لا جواب کہانیاں تھیں۔ اگر آپ نے میرا ایئر کسی کونے میں ٹانگ دیا تو حاضری یقینی بناؤں گی، ورنہ..... ہم غریب لوگ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں سے جڑے ہر فرد کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، اور دین حق پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے، خاتمہ ایمان ہو، موت کے وقت لبوں پر مسکراہٹ اور دل میں ملال نہ ہو، آمین

☆: گڑیا سونیا! خوش آمدید! زہر عشق کے لیے مارچ سے پچھلے اداریے سے منی آرڈر کے ذریعے منوائے جاسکتے ہیں۔ اور ہاں..... گڑیا اب احوال میں مستقل حاضر رہنا۔ مجھے انتظار رہے گا۔

✉: ہمارے نبض شناس ڈاکٹر خادم حسین کھیرا جب والا، ملتان سے لکھتے ہیں۔ ماہ اکتوبر 2015 کا سچی کہانیاں اسلام آباد سے ملتان آتے ہوئے ایک ٹول پلازے سے خریدا۔ ماشا اللہ اس ورق کے ساتھ بہت خوبصورت پرچہ لگا۔ منزہ سہام کا ادارہ بد نصیب کون نے دل کے نہہ خانے روشن کر دیئے۔ آپ کی سچی باتیں سچی کہانیاں کو حسین بڑھادیتی ہیں۔ احوال میں منشی محمد عزیز، مجید احمد جانی، ممتاز احمد، صائمہ مجید، راشد لطیف صبرے والا، تحسین جونجو، سدرہ انور علی، ندیم عباس میوانی، اور نئے احوالیوں نے خوب لکھا۔ نئے احوالیوں کو مبارک باد قبول ہو، چند پرانے محفل سے غیر حاضر ہیں، وہ بھی وجہ بتائے بغیر۔ اس بار تمام کے تمام احوال شاندار تھے۔ گڈی آیا کی وفات کا سن کر دل کو شاک لگا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، دکھ کی اس گھڑی میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ کمرشل کہانی لائف بوائے خوب رہی، نرالے یہ بھید ہیں، کمال کی تحریر تھی۔ انداز تحریر خوب پسند آیا، معاشرے میں پھیلی بُرائیوں کی عکاس تحریر تھی۔ قلی سے افسر تک، کتے کی موت، عزت دار، تم یاد آتی ہو، سیماج سیوا، جیت، ایمانداری کا ٹکٹ، وڈیری، حجاز میں چودہ دن، انصاف، روگ عمر بھر کا کمال کی تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ باقی تحریریں بھی خوب رہی، زہر عشق، ہڈ اسراریت پھیلائے ہوئے، لمحہ لمحہ بحس میں جکڑے منزل کی طرف سفر کرتے ہوئے خوب جاری ہے۔ ہم شکل، مفرد بھی خوب رہی۔ ہائیڈ پارک، تیرنیم کش، کمال ترتیب کی تحریروں سے مزین تھے۔ اس بار لمبی کہانیاں نے دل پر گہرے نقوش چھوڑے۔ تمام اسٹاف اور لکھاریوں کو مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ سچی کہانیاں کو ترقی کی منزلیں طے کروائے، دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے اور ہمیشہ شاد اور آباد فرمائے۔ آمین۔

☆: ڈاکٹر صاحب! آپ کی احوال میں باقاعدگی ہمارا سر فخر سے بلند کر دیتی ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیں۔ اور ہاں بھیا..... وہ تحریر کیا ہوئی جو ہم تک پہنچ ہی نہیں پارہی ہے۔

✉: کنزہ ملک، قاسم پور ملتان سے پہلی بار ہماری بزم میں شریک ہیں، لکھتی ہیں۔ عرصہ دس سال سے امی سے چھپے چھپائے! سے پڑھتی چلی آرہی ہوں۔ آپ کی سچی کہانیاں سے محبت نے سچی کہانیاں کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔ آج نہ چاہتے ہوئے بھی احوال لکھنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ منزہ سہام کا ادارہ بد نصیب کون ہمیشہ کی طرح خوب لکھا گیا۔ سچاس سے اور احوالیوں کے شاندار احوال، شامل اشاعت تھے۔ کبھی کو مبارک! کنجوسو! ہمیں ویلم تو کر لو۔ کہانیوں کے انتخاب میں ملی سے افسر تک، کتے کی موت، نرالے ہیں یہ بھید، عزت دار، جیت، مجرم کون، سیماج سیوا، تم یاد آتی ہو، مغرور، داری، انصاف نے خوب انصاف کیا، کیا

ہوا اگر میرے ملک میں انصاف کے ساتھ کھلواڑ کیا جا رہا ہے۔ زہر عشق، بہت ڈراتی ہے، بیچارہ مسلمان جن کو پاگل کتے نے کاٹ لیا تھا جو انسانوں میں آدھمکا۔ یہ انسان سب سے خطرناک مخلوق ہے۔ اس کے کئی روپ ہیں اور ہر روپ نرالا ہے۔ ہائیڈ پارک، تیرنیم کش، مستقل سلسلے اچھے جا رہے ہیں۔ اب اجازت

☆: منت کھٹ کنزہ! خوش آمدید، خوش رہو۔ ویلکم اور ہاں لڑکی تبصرہ دس سال بعد بھیجا نوازش مگر اب مستقل احوالی رہنا۔ اب پھر سے نہ کہیں چھپ چھپا جانا۔

☆: کراچی سے ہماری سینئر لکھاری ساہی نغیہ فضل لکھتی ہیں سب سے پہلے انتہائی ہردلعزیز اور قابل لکھاری گڈی آپا کی جدائی کی خبر پر دل دکھی ہو گیا کہ وہ اپنے چاہنے والوں کو، اپنے محبت کرنے والے شوہر اور پیارے پیارے بچوں کو داغ مفارقت دے گئیں۔ اللہ رب العزت تحسین اختر کو اپنے جواز رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ مجھے ان کی پختہ تحاریر سے دلی لگاؤ تھا۔ اب کیا تبصرہ کروں، کہانیوں پر، دل دکھی ہو گیا ہے۔ بہر حال زہر عشق اور ہم شکل تو ہے ہی نامور مصنف کا اس کی تو ایک الگ حیثیت ہے۔ پہلی دو کہانیاں کاروان حجاز اور حجاز میں چودہ دن دل و دماغ کو روشن کر گئیں۔ نصرت سرفراز، ڈھونڈو گے ہمیں، نے روح کو جھنجھوڑ دیا۔ جیت زیبا بدڑ میں تو کم ہو گئی تھی فاریہ کے کردار میں۔ عزت دار، ارم ناز کی زبردست تحریر ہے۔ قلی سے افسر تک ممتاز احمد ندیم عباس میواتی کتے کی موت، مظلوم کی آہ سے بچو! پاسٹ ملک محمد اکرم و ذیری سیدہ کاظمی نرالے یہ بھید ہیں مجید احمد جانی غرض تمام کہانیوں نے ایک تاثر چھوڑا ہے۔ صبح لاسٹ ڈیٹ ہے اس لیے اب اجازت، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ سفر سے پہلے آیت الکرسی ضرور پڑھا کریں۔

☆: نغیہ آنٹی! آپ کے تبصرے کے لیے شکریہ۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیں۔ آپ ہمارا سرمایہ ہیں۔

آخر میں اپنے پیاروں کی نذر ایک تازہ نظم کے ساتھ ہی اگلے ماہ تک کے لیے اجازت۔

انجام

سنہری پیڑ سے پتے جھڑتے ہیں
اور پھر میرے نام کے ساتھ
روز مٹی میں دفن ہو جاتے ہیں
راہن رکھی محبت آزاد ہو جاتی ہے
روز ہوا میں اڑ جاتی ہے
جیب خالی رہ جاتی ہے
بس چمکتی بوندیں مٹی چمکاتی ہیں
روز ایک نیا کام دہرائی ہیں

سنہری پیڑ کی ٹہنیوں پر
بیسرا ہے میری محبت کا
چمکتی بوندیں، راہن رکھی محبت
اپنی جیب میں بھر کر میں
روز ایک نیا کام کرتا ہوں
سلی مٹی پہ اپنا نام لکھتا ہوں
روز اس نام کو دفن کرتا ہوں
سیکڑوں ورق محبت کے پھڑ پھڑاتے ہیں

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

میری کامیابی، لائف بوائے کے ساتھ

لائف بوائے اور سیدیل ملائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

ہی امید افزا تھیں۔

سدرہ بیگم کی صفیہ سے دوستی دو چنڈاُس زمانے میں
ہوئی جب سدرہ اپنے بالوں کی وجہ سے از حد پریشان تھیں۔
صفیہ نے اُن کے دو مو سے بال بہت سارے شیمپو
استعمال کرا کر ٹھیک کرنا چاہے لیکن شیمپو بے کار رہے اور
بال اپنی رہی سہی صورت بھی کھو بیٹھے۔ آخری حل کے طور
پر لائف بوائے شیمپو استعمال کرایا گیا۔ پہلے ہفتے تو نتیجہ
صفر رہا لیکن پھر رفتہ رفتہ جادو ہو گیا اور سدرہ بیگم اپنے
بالوں کی تکالیف سے نجات حاصل کرنے لگیں۔ ایسا جادو
دیکھ کر ہی صفیہ نے اپنے پارلر کا نام Life Beauty
Parlour رکھا تھا۔ لائف بوائے شیمپو ان کی استعمال
کر وہ سب سے کامیاب پراڈکٹ تھی۔ جس کے بنا وہ
بیوٹی کو مکمل سمجھتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

آج کل سدرہ بیگم کی طبیعت ناساز چلی آ رہی تھی۔
وہ چاہ رہی تھیں کہ جلد از جلد چھوٹے بٹے کے لیے اپنی
پسندیدہ ہو لے آئیں۔ ایک جگہ پھر سے لڑکی دیکھی گئی۔
شاء ایک میلاد کی تقریب میں اُن کی نظر میں آئی تھی۔
لاسبے، سیاہ چمکدار بالوں والی اس لڑکی پر اُن کا دل آ گیا
اور جھٹ اس کی بھابی رفعت کے آگے دست سوال و راز

سدرہ بیگم کو بس شوق تھا تو یہی کہ دونوں بیٹوں کی
بہوئیں لائیں تو لمبے لمبے بالوں والی ہوں۔ سیاہ، چمکتے،
لاسبے بال اُن کی کمزوری تھے۔ خود اُن کے بال بچپن میں
کسی بیماری کے سبب بہت روکھے، پھیکے اور بے جان
ہو گئے تھے۔ اُن کے پڑوس میں اُن کی کھلی صفیہ نے
غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنی محنت سے بیوٹیشن کا
کورس کیا اور پھر جلد ہی وہ ایک بیوٹی پارلر میں کام
کر کے انہوں نے اپنے گھر ہی میں اپنا بیوٹی پارلر کھول لیا۔
بیس برس میں ترقی کرتے کرتے بیوٹی پارلر جم گیا اور عزت
کے ساتھ گھر بیٹھے صفیہ بیگم حلال رزق کمانے لگی تھیں۔

سدرہ بیگم ساوگی پسند خاتون تھیں۔ میاں کی اپنی فرم
تھی۔ خدا کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ لیکن اُن کی ساوگی بے
مثال تھی۔ وہ اپنی اس ایک خواہش پر ذرا پیچھے ہٹنے کو
راضی نہ تھیں۔ بڑے بیٹے کی شادی کر دی لیکن بہو.....
بہو ہی تھی، اُن کی خواہش پوری نہ ہوئی تھی۔ وہ خدا کی
رضا پر راضی نہ رضا ہو گئیں۔ قانع ہو گئیں۔ صفیہ سے اکثر
چھوٹے بیٹے کی بابت بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ بھی تلاش
میں سرگرداں تھیں مگر خدا کی مرضی..... لڑکیاں تو بہت
مگر سدرہ بیگم کو گھر ہستی بنانے والی چاہیے تھی،
لانے والی نہیں۔ سو بات بننے اور تلاش رشتہ پر دونوں

READING
Action

کر دیا۔ وہ لوگ عظیم کو بھی دیکھ گئے تھے۔ اب انہوں نے فائل جواب دینا تھا۔

☆.....☆.....☆

فون کی بیل بجی تو سدرہ بیگم چونک پڑیں۔ ایک انجانی مسرت کے تحت ان کے لب مسکرا اٹھے اور آنکھیں جھکنے لگیں۔ وہ تو صبح ہی سے فون کا انتظار کر رہی تھیں اس لیے فون اٹھاتے ہی چہک کر بولیں۔

”ہیلو!“

”آداب آنٹی!“ دوسری جانب ثناء کی بھابی رفعت بول رہی تھیں۔

”جیتتی رہو خوش رہو۔“ انہوں نے حسب عادت خوش دلی سے دعا دی۔ ”اور سناؤ سب ٹھیک ہیں کیا خبر سنا رہی ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

سدرہ بیگم کی بر مسرت آواز اور لہجے کو سن کر رفعت چپ سی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ انہیں کس طرح سے یہ خبر سنائے جب کہ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی اچھی خبر کا انتظار کر رہی ہیں۔

سدرہ بیگم نے بھی اس کی تمبیر خاموشی کو محسوس کر لیا اور ان کا دل انجانے خدشے سے دھڑک اٹھا۔

”بولو نا بیٹی، کیا بات ہے تم چپ کیوں ہو؟“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”آئی ایم سوری آنٹی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کس طرح سے کہوں اصل میں ہمارے ہاں سب گھر والوں کی مرضی سے ہر فیصلہ کیا جاتا ہے آپ یوں سمجھ لیں کہ سب لوگ ایک رائے پر متفق نہیں ہو سکے۔“ اس نے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

”اچھا!“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ”جیسی آپ لوگوں کی مرضی مگر انکار کا سبب تو بتا دو۔“ انہوں نے مردہ لہجے میں کہا۔

”نہیں، کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہے۔ شاید اللہ نے جوڑا بنایا ہی نہیں تھا۔ اچھا خدا حافظ!“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

سدرہ بیگم ایک بار پھر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی بار بار آنکھیں ایک ہی جواب سننے میں مل رہی تھیں۔ آخر ان میں ان کے گھر میں

ان کے ہونہار بیٹے میں ایسی کون سی خرابی ہے کہ کہیں سے بھی ہاں میں جواب نہیں آ رہا۔ اس مرتبہ تو وہ بہت پر امید تھیں۔ دو روز قبل جب ثناء کے گھر والے عظیم کو دیکھنے کے لیے آئے تھے تو جاتے ہوئے بہت خوش اور مطمئن تھے بلکہ ان لوگوں نے تو آپس میں متکئی پر بھی ڈکس کیا تھا اور ایک دوسرے کے رسم و رواج کے متعلق بھی پوچھا تھا پھر آج فون کر کے جواب دینے کا وعدہ کیا تھا اور آج جب جواب آیا تو انہوں نے انکار ہی کر دیا۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو رہی تھیں۔

سدرہ بیگم کے شوہر عظیم خان اپنی فرم کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کی صورت میں دو بیٹے ہی عطا کیے تھے۔ سب کے سب لائق ہونہار اور فرمانبردار تھے۔ سدرہ بیگم بھی نہایت خوش مزاج، سادہ اور دریا دل مشہور تھیں۔ عموماً انہوں نے لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا تھا کہ آپ کے گھر آنے والی بہو بہت خوش قسمت ہوگی۔ نہ نندوں کا بکھیڑا نہ کام کاج کی فکر، کیوں کہ کام کاج کے لیے گھر میں نوکر موجود تھے اور پھر خود سدرہ بیگم بہت منکسر المزاج تھیں۔ غصہ کرنا یا لڑائی جھگڑا کرنا تو وہ جانتی ہی نہیں تھیں۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی مگر ان کے رہن سہن اور اطوار سے کہیں بھی بناوٹ اور تکبر نہیں چھلکتا تھا۔ وہ انتہائی حد تک سادگی پسند تھیں۔

بڑے بیٹے کی شادی وہ خاندان میں کر چکی تھیں مگر بہو مزاج کی تک چڑھی تھی۔ اسے سدرہ بیگم کی سادگی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ ایک روز انہوں نے اپنے کانوں سے سنا ان کی بہو فون پر اپنی ای سے بہت تپے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”پتا نہیں ای اتنی ڈھیر ساری دولت کو جمع کر کے کیا کریں گی؟ نہ تو گھر میں اور نہ ہی ان کی شخصیت میں وہ چمک دمک دکھائی ہی نہیں دیتی جو نظر آنی چاہیے بس ہر وقت سادگی سادگی کی رٹ لگائے رہتی ہیں۔“

سدرہ بیگم بت سی بن گئی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے بہو پر کبھی بلا وجہ روک ٹوک نہ کی تھی بلکہ انہوں نے تو سارا گھر بہو پر یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ بیٹا یہ تمہارا گھر ہے جس طرح چاہو اس کو سجاؤ اور سنوارو اور جتنے پیسوں کی ضرورت ہو مجھ سے لے لو۔ مگر بہو اس گھر کو اپنا سمجھتی تھیں اس کا کہنا تو یہ تھا کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے یہ تو

ساس کا گھر ہے پھر وہ کیوں اتنی محنت کرے۔ اتنی محنت تو بس اپنے ہی گھر کے لیے کی جانی ہے۔

عظیم ان کا لائق بیٹا تھا۔ وہ چائلڈ اسپیشلسٹ تھا اور امریکا سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ اچھی شکل و صورت تھی مگر پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ ہر بار لڑکی والے انکار کر دیتے۔ انہیں یاد تھا کہ ایک مرتبہ جب وہ ایک لڑکی کو دیکھنے گئیں اور انہوں نے اپنے شوہر اور بیٹوں کے متعلق بتایا تو لڑکی کی ماں نے حیرت سے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور منہ بنا کر بولیں۔

”آپ کو دیکھنے سے لگتا تو نہیں کہ آپ کے شوہر اپنی فرم کے مالک ہوں گے اور بیٹے بھی اتنا کماتے ہوں گے۔“
”کیا مطلب؟“ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔
”کچھ نہیں۔“ لڑکی کی ماں نے کہا اور پھر وہاں سے بھی انکار آ گیا۔

اس روز صفیہ جب ان سے ملنے کے لیے آئیں تو انہوں نے تمام حالات بیان کر کے اس سے پوچھا۔
”صفیہ! تم مجھے صاف صاف بتاؤ کہ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ کیا اپنے بیٹے کے ہر رشتے کے انکار کی وجہ میں ہوں؟“

”ایسا ہو سکتا ہے۔“ صفیہ نے جواب دیا۔ ”کیوں کہ تم آج کل کے زمانے اور لوگوں کی سوچ سے واقف نہیں ہو۔ لوگ چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ کر اپنے آپ کو عقل مند تصور کرتے ہیں۔ یہاں تو لوگوں کا حال یہ ہے کہ ادھر چار پیسے ہاتھ میں آئے نہیں اور لوگوں نے اپنا رنگ ڈھنگ اور حلیہ بدلا نہیں چاہے ڈھنگ سے پیٹ میں روٹی نہ جائے مگر جسم پر لباس اتنا قیمتی ہوگا کہ دوسرا انہیں کچھ سے کچھ سمجھ لے ڈرائنگ روم اتنے شاندار طریقے سے سجائیں گے چاہے سارا گھر بھنڈا رہی پڑا رہے اور پھر تم ذرا اپنی جانب نگاہ ڈالو تمہارے ہاں ماشاء اللہ ماہانہ لاکھوں کی آمدنی آرہی ہے اور تم سر میں کالے خضاب کی جگہ مہندی استعمال کرنی ہو۔ سادے کپڑے پہنتی ہو ڈھیروں گولڈ ہونے کے باوجود نمائش نہیں کرتیں۔ نہ ہی اب تم پارلر جاتی ہو۔ بس ادھر تمہارے بال لائف بوائے سیمپو نے ٹھیک کیے، ادھر تم سے نانا توڑ ڈالا۔ شاید تمہیں دیکھ کر لوگ یہی

سوچتے ہوں گے کہ پیسا پاس تو ہے مگر تم جاہل گنوار ہو، معاف کرنا میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے تمہیں جاہل گنوار کہہ دیا۔“ صفیہ نے کہا۔

”مگر صفیہ! میں تو شروع ہی سے ایسی ہوں۔ مجھے تو کبھی ان سب باتوں کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ سادگی اللہ کو پسند ہے۔ نمود و نمائش کو تو رب پیارے نے بھی پسند نہیں کیا اور رہی گھر کو جدید طریقے سے سجانے کی بات تو میں تو ایک طرف ہو گئی ہوں۔ بس بالوں کے مسئلے پر میں خدا سے شکوہ کناں تھی مگر وہ بھی تم نے ہی لائف بوائے سیمپو کے ذریعے حل کر دیا اور یہ گھر میں نے بہو کو سونپ دیا تھا کہ اپنی پسند اور مرضی سے سجالو اس لیے کہ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ بہویں گھر میں ساس کا زیادہ عمل دخل پسند نہیں کرتیں مگر وہ تو یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گئی کہ اپنا گھر وہ ہوتا ہے جہاں کا بلا شرکت غیرے بندہ خود مالک ہوتا ہے اور میں تو جیسی ہوں ٹھیک ہوں اب میں اپنے آپ کو اس عمر میں تو بدلنے سے رہی۔“ سدرہ بیگم نے کہا۔

”تم رشتے بھی تو اچھے گھرانوں میں ڈھونڈ رہی ہو۔ ذرا نچلے طبقے کی طرف جا کر دیکھو۔ تحفے ہاں ہو جائے گی۔“ صفیہ کا مشورہ برا نہیں تھا مگر ان کا دل کسی طرح نہ مانتا تھا۔

”کیوں کیا میرا بیٹا پڑھا لکھا نہیں ہے؟ میرا سارا سسرال تعلیم یافتہ ہے تو میں رشتہ بھی ایسے ہی لوگوں میں دیکھوں گی اور خاندان کی تو میں ایک بہولے ہی آئی ہوں۔ دوسری لانے کو اب دل آمادہ نہیں ہوتا دوسری بہو تو مجھے لمبے چمکدار، بالوں والی چاہیے بانی بالوں کی خوبصورتی میرا لائف بوائے سیمپو پوری کر دے گا۔“ سدرہ بیگم نے صاف گوئی سے کہا۔

”تو پھر تمہیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ ذرا ٹپ ٹاپ سے بڑے لوگوں کی بیگمات کی طرح رہنا سیکھو پھر دیکھو لڑکی والے کیسے تمہارے آگے پیچھے پھریں گے۔ اب یہ انکساری دوسروں سے جھک کر ملنا چھوڑ دو ان باتوں کی کوئی قدر نہیں ہے آج کل ٹھسے سے جاؤ گی تو لوگ تمہیں کچھ سمجھیں گے۔“ صفیہ نے نئی راہ دکھائی تھی۔

”نہیں صفیہ! میں خدا کی ذات سے پُر امید ہوں۔ اس دنیا میں کوئی تو میرے جیسے مزاج کا ہوگا جو مجھے قبول کرے گا۔“

سدرہ بیگم نے کہا تو صفیہ بھی خاموشی سے اٹھ گئیں۔

☆.....☆.....☆

شام کو عظیم گھر آئے تو انہوں نے امی کا ادا اس چہرہ دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ ایک بار پھر انکار میں جواب آیا ہے۔ انہوں نے ماں سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور خاموشی سے ڈائمنگ ٹیبل پر آ بیٹھے مگر سدرہ بیگم آج بالکل خاموش تھیں۔ عظیم ان کے چہرے کے گہرے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے تھے۔

”کیا سوچ رہی ہیں امی؟“ وہ مسکراتے ہوئے سالن کا ڈونگا اپنے نزدیک کرتے ہوئے بولے۔

”کچھ نہیں! مجھے کیا سوچنا ہے سوائے اس کے کہ آخر ہم میں ایسی کیا خرابی ہے جو ہر رشتہ ہی سے انکار ہوا جا رہا ہے۔“ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔ ابھی اس کام کا وقت ہی نہیں آیا ہے۔ جب وقت آ جائے گا پھر کہیں سے انکار نہیں ہوگا۔“

عظیم نے سالن پر نگاہ ڈالی اور امی کا دھیان بٹانے کے لیے بولے۔

”یہ کوفتوں کا سالن یقیناً آپ نے بنایا ہے۔ اس کی خوشبو تو یہی بتا رہی ہے۔“

سدرہ بیگم بیٹے کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرائیں۔

☆.....☆

سین کے دروازہ ناک کرنے پر اندر سے فوراً ہی لیس کمنگ کی آواز آئی تھی اور پھر دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہ بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے اس بارعب شخص پر پڑی تو اس کے ہاتھ لرزنے لگے مگر اپنے آپ کو سنبھال کر اس نے ایک بار پھر بڑے سے دوٹے کو درست کیا اور باعتماد اور پروقار طریقے سے چلتی ہوئی آگے بڑھی اور کرسی پیچھے کر کے بیٹھ گئی۔

”آپ کا نام سین ہے اور تعلیم.....؟“ انہوں نے ایک نگاہ سامنے رکھی ہوئی فائل پر ڈالی اور گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”جی میں نے بی ایس سی کیا ہے۔“ اس نے اپنی طرف سے ہونے والے صاف سحرے لہجے میں کہا۔

”اور عمر.....؟“ پھر پوچھا گیا۔

اس کا دل چاہا کہ جھٹ کہہ دے کہ سامنے سب کچھ لکھا موجود تو ہے۔

”انیس سال۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے لبوں پر ایک وہمی سی مسکراہٹ ووڑ گئی۔ ”واقعی؟“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ میرے خیال میں آپ نے میرے برتھ سٹولٹیٹ کو تو ضرور دیکھا ہوگا پھر بھی شاید آپ یہ اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ میں کس قدر جھوٹ بول لیتی ہوں یا بول سکتی ہوں۔“ اس نے بنا کسی گھبراہٹ کے صاف گوئی سے کہا۔

”محترمہ آپ شاید یہ سمجھ رہی ہیں کہ اس قدر اعتماد اور صاف گوئی کا مظاہرہ کر کے مجھے امپریس کر لیں گی۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں ہے اور شاید آپ کو یہ جان کر افسوس بھی ہوگا کہ اس جاب کے لیے فائل سلیکشن تو ہو چکا ہے کیوں کہ آج کے انٹرویو کی آپ آخری امیدوار تھیں اس لیے میں نے سوچا کہ وقت گزاری کے لیے آپ سے بھی تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت کر لی جائے۔“ اس شخص کا انداز تسخیر آمیز تھا۔

”چلیں اچھا ہی ہوا کہ آپ نے پہلے ہی فائل سلیکشن کر لیا۔ اگر آپ مجھے سلیکٹ کر بھی لیتے تو میں آپ جیسے شخص کے ساتھ کام کرنا قطعی پسند نہیں کرتی جو آفس میں کام سے زیادہ صرف ملاقاتوں اور بات چیت میں ٹائم ضائع کرتا ہو۔“ اس نے شدید تپتے ہوئے لہجے میں کہا کہ اس شخص کے سامنے رکھی ہوئی اپنی فائل تیزی سے اٹھائی اور جانے کے لیے مڑ گئی۔

”ارے آپ تو ناراض ہو گئیں ایک منٹ پلیز! دیکھیں ہو سکتا ہے کہ میں اس امیدوار کو جس کا سلیکشن ہوا ہے ریجیکٹ کر دوں اور آپ کو منتخب کر لوں۔“ وہ اس کی اس حرکت کے باوجود چہرے پر تسستی سی مسکراہٹ سجا کر بولا۔

”بہت شکریہ میں نے ابھی کہا نا کہ میں آپ جیسے لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔ مجھے تو آپ بہت ہی کمزور ذہن کے مالک لگتے ہیں۔ جلدی میں فیصلے بھی کر لیتے ہیں اور اپنے ہی فیصلوں کو بدلنے میں ذرا بھی ٹائم نہیں لگاتے۔“ اس نے تک کر کہا۔

READING
Section

بھوکی پیاسی سڑکیں ناپے اور میں گھر میں مزے سے بیٹھ کر کھانا کھا لوں۔“ اماں نے دکھی لہجے میں کہا۔
 ”اماں! دو تین روز پہلے آپ بتا رہی تھیں کہ زینت آنٹی اپنے بچوں کے ٹیوشن پڑھانے کے لیے کوئی ٹیوٹر تلاش کر رہی ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ ان کے بچوں کو میں پڑھاؤں گی۔“ سبین نے اچانک ایک خیال آتے ہی سراٹھا کر اماں سے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔“ اماں نے پھر ایک گہری سانس لی اور برتن اٹھا کر کچن میں جانے لگیں۔
 ”ارے اماں! آپ رہنے دیں میں برتن سمیٹ لیتی ہوں۔ آپ زیادہ کام مت کیا کیا کریں۔ آرام کریں۔ خدا خدا کر کے تو آپ کی طبیعت تھوڑی بہتر ہوتی ہے۔“ اس نے اماں کو روکنا چاہا پھر اس نے اماں کے چہرے پر مسلسل فکر مندی کے تاثرات دیکھے تو انہیں سمجھانے لگی۔
 ”اماں! آپ کو پتا ہے آج کل ٹیوشن پڑھانے میں بڑی کمائی ہے۔ لوگ ٹیوشن ہی کے ذریعے ہزاروں روپے کماتے ہیں۔“

”پھر بھی بیٹا! خالی صرف پیٹ بھرنے کا تو سوال نہیں ہے۔ میرے آگے سب سے بڑا مسئلہ تمہاری شادی کا ہے کیا کمی ہے میری بچی تیرے اندر؟ حسین ہے سکھڑ ہے پڑھی لکھی ہے نہیں ہے تو دولت اور بڑا گھر نہیں ہے اور لوگ آج کل تو صرف اونچے گھرانوں میں ہی جاتے ہیں۔“ اماں نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں نے کہا ناں کہ آپ ناحق یہ ساری باتیں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے وہ جو کام کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ہر سبیل پیدا کر دیتا ہے۔“ اس نے کہا اور چار پائی پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆.....☆

سبین نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو اماں اور ابا کی پُر شفقت سائے تلے پایا۔ وہ اکلوتی تھی اس لیے اماں ابا کا سارا پیار اس کے حصے میں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے حسن کی دولت سے اسے جی بھر کر نوازا تھا۔ دودھ اور شہد میں کھلی شہابی رنگت، ستواں ناک، بڑی بڑی غلانی آنکھیں اور اونچے لمبے قد کے ساتھ بال بھی خوب دراز تھے۔ اماں آج تک اس کے بالوں میں اپنے ہاتھوں سے

”آپ جاسکتی ہیں۔“ اس ہارا پی بے عزتی پر وہ بھی تپ کر بولا تو سبین تیزی سے باہر نکل آئی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے ایک اچھی ملازمت جو اسے مل سکتی تھی، کھودی ہے مگر کیا کرتی۔ اس نے اس شخص کی آنکھوں اور رویے میں جو کھٹیا پن دیکھا تھا اس کے بعد کہاں ممکن تھا کہ اس کا دل آمادہ ہوتا۔ وہ اک ٹھنڈی سانس لے کر اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی اور اپنے مطلوبہ روٹ کی بس کا انتظار کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو تھکن اور گرمی سے برا حال تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی فائل اور پرس چار پائی پر پھینکا اور خود بھی چار پائی پر ڈھے گئی۔
 ”کیا ہوا بیٹی! کوئی امید بندھی؟“ اماں ہاتھ میں پانی کا گلاس لے کر اس کے قریب آتے ہوئے بولیں۔
 ”نہیں اماں!“ اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”مل جائے گی نوکری بھی۔“ اماں نے اس کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹایا اور اس کے سامنے پانی کا گلاس کر دیا۔
 اماں کو دیکھ کر وہ اٹھ گئی اور پانی پی کر اپنے خشک حلق کو تر کرنے لگی۔

”مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اب کیسے گزارہ ہو گا؟ چند روپے پڑے ہیں آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اور تم ہو کہ سارے پیسے میری دواؤں میں ضائع کر دیتی ہو۔“ اماں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے فکر مند لہجے میں بولیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں اماں! اللہ مسبب الاسباب ہے وہ آمدنی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ نکال ہی لے گا اور کچھ نہیں تو میں گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دوں گی اور آپ نے یہ کیا بات کی کہ آپ کی دواؤں میں پیسے ضائع ہوتے ہیں؟ میری پیاری اماں! آپ ہیں تو سب کچھ ہے ذرا میرے بارے میں تو سوچیں! ابا نہیں رہے اور اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا۔“ اس نے محبت سے اماں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اماں نے سر ہلا دیا۔

سبین کو شدید بھوک کا احساس ہوا تو وہ کھانے کے ارادے سے اٹھی اور بولی۔

”اماں! آپ نے کھانا کھا لیا؟“

سبین نے بھلا یہ کیسے ممکن ہے میری بچی تو

READING
Section

”نہیں آئی مجھے بڑھنے کے علاوہ دوسرا کوئی شوق نہیں تھا۔ سو بس پڑھائی، پڑھائی اور بس پڑھائی.....“ وہ مسکرائی۔

”چندا! بڑھنے کے علاوہ بیوٹی پارلر، سلائی کڑھائی وغیرہ سے متعلق بھی کام آنا چاہیے لڑکیوں کو۔“

”میری ای بھی یہی کہتی ہیں ای بہت اچھی بیوٹیشن اور میسر ایکسپرٹ بھی رہ چکی ہیں لیکن خاندان کی حد تک مگر آئی کی بیماری نے انہیں کسی قابل نہیں چھوڑا۔“

”اللہ کرم کرے گا۔ تم میرا کارڈ رکھ لو۔ میرا پارلر ہے۔ میں وہاں لڑکیوں کو بیوٹیشن کے طور پر ایکسپرٹ بھی کرتی ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ میرے پارلر میں کام کرنے والی لڑکی قسمت بنا جاتی ہے۔“ انہوں نے لائف بیوٹی پارلر کا کارڈ پرس سے نکال کر اُسے دیا۔

”لائف بیوٹی پارلر“ اس نام پر وہ حیران ضرور ہوئی۔

”ارے تعجب کس بات کا ہو رہا ہے۔ سب کچھ لائف ہی کے ساتھ تو ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں اور اس نے بھی کارڈ اپنے پاس رکھ لیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن Life Beauty Parlour کے سامنے کھڑی تھی۔ صفحہ نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اور پھر اُس چھوٹے مگر چلتے ہوئے پارلر میں اُس کی ٹریننگ اشارت ہو گئی۔

کہتے ہیں جس کام میں دل لگا کر محنت کی جائے اُس کا نتیجہ بھی بہت بہتر سامنے آتا ہے۔ دو ماہ کی محنت میں سین بہترین بیوٹیشن بن گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

کئی دنوں سے سدرہ بیگم کا بی بی ہائی ہو رہا تھا۔ سر میں درد اور چکر بھی بہت آرہے تھے۔

”ای! آپ آج ڈاکٹر کو دکھانے ضرور چلی جائیے گا۔ میں گاڑی اور ڈرائیور کو بیج دوں گا۔ میں آپ کو خود لے جاتا مگر آج کل کلینک میں مریضوں کا بہت رش ہوتا ہے۔ چھوٹے بچوں میں ڈائریا کی وہاں پھیلی ہوئی ہے۔“

عظیم نے صبح ہاسپٹل جاتے ہوئے کہا۔

”ارے چھوڑو بیٹا! تم خود کیوں نہیں دوا لکھ دیتے، میں بہت الجھتی ہوں مریضوں کی لائن میں بیٹھنے سے۔“

سدرہ بیگم نے کہا۔

تیل ڈالا کرتی تھیں اور باقی خوبصورتی لائف بوائے شیمپو پوری کرویتا تھا۔ ابا ایک کہنی میں کام کرتے تھے۔ وقت بہت اچھا نہیں تو برا بھی نہیں تھا۔ وہ بی ایس سی کے فائل ایئر میں تھی کہ ابا اچانک ہی چل بسے۔ اماں نے اپنے سلیقے سے جو تھوڑی بہت رقم پس انداز کی تھی وہ کچھ ابا کے کفن دفن وغیرہ میں اٹھ گئی باقی بیٹھے بیٹھے ختم ہونے لگی۔

بی ایس سی کا رزلٹ آیا تو اس نے جاب کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ اس بھرے پرے شہر میں جہاں لاکھوں نوجوان اپنی ڈگریاں ہاتھوں میں اٹھائے خوار ہو رہے تھے وہاں وہ بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئی مگر ہر جگہ تجربہ مانگتے تھے وہ تجربہ کہاں سے لاتی، ایک آدھ جگہ بات بنتی دکھائی دی مگر ان لوگوں کی آنکھوں سے چھلکتی ہوں کی اس سے چھپی نہ رہ سکی سو جاب کی تلاش کا یہ سلسلہ ہنوز جاری تھا مگر آج تو وہ بہت ہی بد دل ہو کر واپس آئی تھی۔ اس نے باہر جا کر جاب تلاش کرنے کا فیصلہ موقوف کر دیا تھا۔ اس کے آگے پیچھے کون تھا۔ نہ باپ نہ بھائی وہ تنہا زمانے کے سرد گرم کا کہاں مقابلہ کر سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ بس میں بیٹھی اسی مسئلے پر مستقل سوچ رہی تھی۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اچانک اس کے پاس بیٹھی خاتون نے اُسے مخاطب کیا۔

”کیا بات ہے بیٹی؟ بہت پریشان دکھ رہی ہو۔“

وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ ”نہیں آئی بس ایسے ہی۔“

وہ شفقت سے مسکرائیں۔ ”کیا کرتی ہو، پڑھتی ہو یا جاب کرتی ہو؟“

”آئی بی ایس سی ہوں۔ جاب کے لیے تلاش جاری ہے مگر.....“

”مگر کیا..... یقیناً وجہ یہی ہوگی کہ لوگ ضرورت مندوں کو پورا کیش کر کے پیسہ دینا چاہتے ہیں۔ آہ! کب بدلے کا نظام۔ کب نوکری ایمانداری سے ہر بندے کو ملے گی۔“

”انشاء اللہ آئی! مجھے ضرور نوکری ملے گی۔ میں اپنے خدا پر پورا بھروسہ رکھتی ہوں اور پھر اپنی محنت پر۔“

”اللہ تمہارے مان کو سلامت رکھے۔ بیٹی یہ بتاؤ کہ کبھی کوئی کورس وغیرہ کیے ہیں تم نے۔“

ہے۔“ اس نے کہا۔

”نارتھ کراچی میں۔“ انہوں نے مایوسی سے دہرایا پھر پوچھا۔ ”تمہارے بہن بھائی کتنے ہیں اور والد صاحب کیا کام کرتے ہیں؟“

”گھر میں صرف میں اور اماں ہی ہیں۔ بہن بھائی کوئی ہے نہیں اور والد صاحب کا چند ماہ پیشتر ہی انتقال ہوا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو کیا گزر بسر کرنے کے لیے تم کوئی جاب کرتی ہو یا والد صاحب بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں؟“ انہوں نے مزید پوچھا۔

”جاب بہت تلاش کی مگر نہیں مل سکی بس اب میں ایک پارلر میں جاب کرتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

اتنے میں اس کا نمبر پکارا گیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور سدرہ بیگم اس کے پارلر کا نام پوچھتی پوچھتی ہی رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

سدرہ بیگم اس رات دیر تک سین کے بارے میں سوچتی رہیں۔ اس لڑکی میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جیسی وہ اپنے عظیم کی دلہن میں چاہتی تھیں مگر وہ اتنے غریب گھرانے میں اپنے عظیم کی شادی نہیں کر سکتی تھیں۔ آخر اس کا کوئی اسٹیٹس ہے وہ اپنے ملنے جلنے والوں سے کیا کہے گا کہ اس نے ایسے گھرانے میں شادی کیوں کی ہے اور شاید یہی سیشن تھی کہ ان کا بی بی نارل نہیں ہو رہا تھا حالانکہ وہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی تمام دوائیں پابندی سے لے رہی تھیں۔

اس روز عظیم نے کہا کہ آپ آج اور جا کر ڈاکٹر سے ملیں اور انہیں اپنی ساری کیفیت بتائیں اور اس بار بھی جب وہ ڈاکٹر کے کلینک پہنچیں تو سین کو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ وہ اس سے کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ ان کی نگاہ اس کے ساتھ بیٹھی خاتون پر پڑی اور وہ بری طرح چونک پڑیں۔ گھڑی کی چوتھائی میں وہ پچیس سال پہلے اپنے باپسی میں پہنچ گئیں۔ وہ اور کوئی نہیں ان کی اسکول کی دوست حلیمہ تھیں۔

”تم حلیمہ ہوتی؟“ انہوں نے حیرت انگیز پرسرت لہجے میں پوچھا۔

”ہاں میں حلیمہ ہوں اور تم سدرہ؟“ انہوں نے کہا۔

”آج کتنے عرصے کے بعد تمہیں دیکھا ہے۔ کیسی

”نہیں امی ڈاکٹر ائیل شوگر کے اسپیشلسٹ ہیں اور وہی آپ کا علاج کر رہے ہیں تو آپ کو ان ہی کے پاس جانا چاہیے۔ میں ان سے فون پر بات کر لوں گا۔“ عظیم نے کہا اور انہیں تاکید کرتے ہوئے نکل گئے۔

صبح گیارہ بجے ڈرائیور گاڑی لے کر آ گیا تو سدرہ بیگم کو مجبوراً ڈاکٹر ائیل کے کلینک جانا پڑا۔

وہی ہوا جس بات سے انہیں کوفت ہوتی تھی۔ مریضوں کا اچھا خاصہ مارش تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ عظیم نے فون کر کے ٹائم لے لیا تھا۔ وہ وہاں پہنچیں تو ریسپشن پر انہیں ان کا نمبر بتا دیا گیا۔ کلینک میں ڈاکٹر کے روم کے باہر صوفے اور کرسیاں رکھی تھیں۔ صوفے بھر چکے تھے کرسیاں خالی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئیں اور وقت گزاری کے لیے ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگیں۔ اچانک ان کی نگاہ قریبی صوفے پر بیٹھی سین پر پڑی تو ان کی نگاہیں تو جیسے ہٹنا ہی بھول گئیں۔ اتنی حسین اتنی دلکش اور اتنی ہی معصوم صورت اور گھنیرے لائے بال!! وہ ایسی لڑکی ہی تو چاہتی تھیں۔

نہ جانے کون ہے کس گھر کی بیٹی ہے کیا خاندان ہے وہ سوچتے ہوئے ٹھٹھکی پاندھے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

اچانک سین کی نگاہ سدرہ بیگم پر پڑی اور اس نے جو انہیں یوں اپنی جانب محویت سے تکتے دیکھا تو جھینب گئی۔ سدرہ بیگم بھی اپنی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ سی تھیں۔ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

”السلام علیکم!“ اس نے بھی جواباً دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ مترنم لہجے میں کہا۔

”جیتتی رہو!“ انہوں نے خوش ہو کر کہا پھر قدرے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم اپنے چیک اپ کے لیے آئی ہو؟“

”جی نہیں آئی میری اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کل تو وہ آئی تھیں مگر آج ان کی طبیعت کافی خراب ہے اس لیے میں تنہا ہی آئی ہوں تاکہ ڈاکٹر صاحب کو اماں کی کنڈیشن بتا سکوں۔“

”اچھا اچھا!“ انہوں نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

”کیا نام ہے تمہارا اور کہاں رہتی ہو؟“ وہ جلد از جلد اس لڑکی کا پتا جان لینا چاہتی تھیں اس لیے موقع ملتے ہی

صاف نام دیتا پوچھ ڈالا۔

سین اور میں نارتھ کراچی سے آئی ہوں۔ کافی

بوائے شیمپو والی بہو..... جس کے لمبے، سیاہ، لہراتے بال ہوں۔ یعنی عظیم کی دلہن مل ہی گئی۔“
”بالکل بالکل! بھئی میں تو سچ میں خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی۔“

☆.....☆.....☆

دوسرے دن سدرہ بیگم اپنے بیٹے عظیم اور صفیہ کو لیے اپنی سہیلی حلیمہ کے گھر موجود تھیں۔ عظیم نے سین کو سدرہ بیگم کی طرف سے ایک گفٹ پیک دیا تھا۔
”بیٹی تم اسے کھولو تو ذرا ہمارے سامنے۔“ سین نے سدرہ بیگم کے کہنے پر گفٹ پیک کھولا۔ اندر سے لائف بوائے شیمپو کے تین بڑے شیمپو نکلے۔
”اس کا مطلب جانتی ہو۔“ صفیہ بیگم نے سین کو

شو کا دیا۔

”اس کا مطلب میں بتاتا ہوں آپ کو۔“ عظیم کھل کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میری ماں کی خواہش ہے کہ ان کی بہو لہراتے ہوئے بالوں والی ہو۔ گھنے سیاہ چمکدار بال ان کی کمزوری ہیں۔ آپ جب یہ لائف بوائے شیمپو استعمال کریں گی تو ان کی فڈورٹ بہو بن کر ہماری ہو جائیں گی۔“

”ارے واہ..... ہم سے تو پوچھا نہیں اور بہو بھی بنالی۔“ اب حلیمہ بیگم بولی تھیں۔

”تم سے بھی اگر پوچھ کر بیٹی کو بیٹی بنایا تو کیا فائدہ..... یہ تو لائف نہ ہوئی.....“ سدرہ بیگم نے حلیمہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”آج سے آپ کی لائف ہماری لائف ہوئی۔“ صفیہ نے کہا تو اچانک سین بول اٹھی۔

”ایک منٹ..... میری امی مجھے لائف بوائے شیمپو ہی بچپن سے استعمال کرائی ہیں۔ اگر آج لائف بوائے نہ ہوتا تو آئی بیہو کے سلسلے میں اس قدر ایکساٹڈ نہ ہوتیں اور میں ان کی بہو نہ بنتی۔ Thank You لائف بوائے کا ہونا۔“

”Thank You Life Bouy“

Shampoo- تم نے آئیڈیل ملا دیے۔“

سب کے مشترکہ قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے تھے۔

☆☆.....☆☆

ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ کتنے بچے ہیں؟“ انہوں نے ایکساٹڈ ہو کر ایک ساتھ کئی سوالات کر ڈالے۔

”ارے آرام سے بھئی ایک ایک کر کے پوچھو۔ اچھا ٹھہرو میں تمہارے پاس آجاتی ہوں۔“ انہوں نے سدرہ بیگم سے کہا اور اٹھ کر ان کے برابر میں جا بیٹھیں پھر بولیں۔ ”کیسی ہوں یہ تم دیکھ ہی ہو شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں اس لیے تمہیں یہاں دکھائی دے رہی ہوں۔ نارتھ کراچی میں رہتی ہوں اور میری ایک ہی بیٹی ہے۔ شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں تمہیں اپنی بیٹی سے ملواتی ہوں دیکھو سین!“ حلیمہ نے سدرہ بیگم کے سوالات کے جوابات دینے کے بعد سین کو مخاطب کیا تو انہیں خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

”ارے یہ تمہاری بیٹی ہے؟ ماشاء اللہ بہت پیاری بیٹی ہے کل میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اور بھئی میں سچ کہوں کہ تم بہت ہی خوش نصیب ہو جو اتنی پیاری بیٹی اللہ نے دی ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو سدرہ! واقعی یہ بہت ہی پیاری بیٹی ہے بس تم یوں سمجھ لو کہ اب تو یہی میرا کل سرمایہ ہے۔ اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔“ حلیمہ نے محبت پاش نگاہوں سے سین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو نہایت دلچسپی سے چھڑی ہوئی سہیلیوں کی اس ملاقات کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جب سے سین کے منہ سے سدرہ بیگم نے Life Beauty Parlour کا سنا تھا۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر صفیہ کے پاس پہنچ جائیں۔

گھر آتے ہی انہوں نے صفیہ کے پارلر میں دوڑ لگائی۔
”خیریت تو ہے؟“

”ہاں بس..... اللہ کا شکر ہے۔“

”اپنی بھانجی بھاگ آنے کی وجہ تو بتا دو۔“

”صفیہ مجھے یہ بتا دو کہ لائف تم نے اپنے پاس چھپا رکھی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”پارے بہن تم نے میری لائف، میری سین کو اپنے پاس چھپا رکھی ہے۔ اور.....“

اچھا تو یہ بات ہے۔ تو تمہیں اپنے لائف

READING Section

اپنے دل سے اپنے شہروں سے موصولہ وہ سچے بیان
جن کو پڑھ کر اپنی مٹی کی خوشبو، آس پاس محسوس ہوتی ہے
پہلی سچ بیانی

دلِ آباد

نعمان آجلی

فیصل آباد سے اُس شخص کی کہانی، جس نے ہمیشہ فخر میں آباد کی تھیں

لاڈلے ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے ہوش سنبھالتے ہی
خود کو نظر انداز ہوتے پایا۔ امی کو ہم تینوں میں سے

میں ٹھسین ہوں۔ تین بہن بھائیوں میں میرا
تیسرا اور آخری نمبر ہے۔ عموں 'چھوٹے' گھر بھر کے

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

بھر میں کسی نے دوٹ نہ ڈالا تھا۔“
الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ ایک ہی قصہ سننے کو ملتا۔

آپا سے میری بے تکلفی کی حد تک دوستی تھی۔ ان سے بھی میں نے بھی حال دل نہ چھپایا اور جب یہ ذکر کیا کہ امی کو احسن کی نسبت مجھ سے کم محبت کی وجہ ممکن ہے کہ یہ ہو کہ میں ابو کی کسی دوسری بیوی کی اولاد ہوں تو آپا ہنس ہنس کر دوہری ہو گئیں۔

”ناول میں پڑھا کرتی ہوں اور دماغ تمہارا خراب ہوتا جا رہا ہے۔“ آپا نے ہنستے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لگایا اور میرا گال چومتے ہوئے کہا۔

”میرے پیارے نے بھائی، جب تم پیدا ہوئے تھے اس وقت میں نو یا شاید ساڑھے آٹھ سال کی تھی اور مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ امی کی طبیعت بہت خراب تھی اور انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ خدیجہ خالہ اُس دن میری، احسن اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے ادھر ہی تھیں۔ میرا دھیان بٹانے کے لیے انہوں نے مجھے پرستان کی شہزادی کی جاود بھری کہانی سنائی تھی۔ پھر اسپتال سے تمہارے پیدا ہونے کی خبر آئی۔“

ای کی احسن کے لیے خصوصی توجہ سنا لہا سال ویسی کی ویسی رہی اور میں عدم توجہی کا شکار، احساس کمتری میں مبتلا ہوتا گیا اور میرے دل میں اپنے سے ساڑھے تین سال بڑے احسن کے لیے حسد کا پودا پروان چڑھنے لگا اور اس حسد کے پودے نے اس قدر نشوونما پائی کہ اس پر نفرت کے پھل بھی لگنے لگے۔

☆.....☆.....☆

لڑکپن سے نوجوانی کا سفر کرتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آنے لگا کہ احسن کے لیے امی کی خصوصی توجہ شاید اس لیے ہو کہ وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بھی ایک غلط قیافہ ہے۔ بلاشبہ میرا رنگ احسن کی نسبت تھوڑا بیٹھتا ہوا تھا لیکن ناک نقشہ اس سے زیادہ اچھا تھا۔ یہ میں نہیں ہر کوئی کہتا تھا۔

اور میرے ابو!! انہیں دنیا میں پیسہ جمع کر کے

احسن سب سے زیادہ پیارا تھا۔ سب سے زیادہ کیا کہنا، بلکہ یوں کہوں کہ صرف احسن ہی سے پیار تھا۔
”احسن بیٹا پوری روٹی کھاؤ۔“ امی اس قدر چاؤ سے کہتیں کہ میں دیکھتا رہ جاتا۔

”احسن تمہیں پٹھ کا گوشت پسند ہے۔ اسی لیے تو میں نے تمہاری رکابی میں پٹھ کی بوٹیاں ڈالی ہیں۔“ احسن کی رکابی بوٹیوں سے بھری ہوتی۔

”آؤ احسن تمہارے سر میں تیل لگا دوں۔ لڑکوں کو اپنے بالوں کے معاملے میں حساس ہونا چاہیے۔ آج بالوں کا خیال رکھو گے تو کل گمنجے ہونے سے بچو گے۔ میرے پیارے بیٹے میں ہر دوسرے دن تمہارے بالوں میں تیل لگا دیا کروں گی۔“ میں ساتھ ہی بیٹھا ہوتا امی احسن کے بالوں میں محبت سے مساج کرتی رہتیں اور درمیان میں مجھ سے سرسری سا کہہ دیتیں۔

”تحسین تم بھی تیل لگوا لیا کرو۔“

آپا سے بھی امی کی محبت یونہی سی ہوتی۔ لیکن میں نے آپا کو کبھی اس سلسلے میں جلتے کھستے نہ دیکھا۔ آپا ناولوں کی شوقین تھیں۔ ان کا بیشتر فارغ وقت ناولوں کے ساتھ ہی گزرتا۔ ان کی زیادہ تر گفتگو بھی ناول کے ہیرو اور ہیروئن کے گرد ہی گھومتی۔ امی کا احسن کے مقابلے میں اپنے سے دوسرے درجے کے شہری کا برتاؤ دیکھتا تو مجھے گمان گزرتا کہ ممکن ہے کہ میں امی کی اولاد ہی نہ ہوں۔ ویسے تو یہ بات بعید از قیاس بھی لیکن پھر بھی میں نے ٹھیک ٹھاک تحقیق کی۔ چچیوں، پھوپھوں اور خالوں سے اپنی پیدائش کے قصے فرمائش کر کے سنے۔ سب کے پاس سنانے کے لیے ایک ہی قصہ ہوتا جس میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی جھول نہ ملتا۔

”تمہارے وقت نسرین کی طبیعت بہت خراب رہتی۔ ہم سب پریشان خوب دعائیں مانگتے۔ آخری مہینے تو نسرین کے ہاتھ پاؤں سوج گئے اور جب ایکشن کے دن اس کا جسم اکڑنے لگا اور جھکے بھی لگنے لگے تو ہم بھانگم بھاگ اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے پیٹ کاٹ کر تمہیں نکالا۔ اس ایکشن میں خاندان

جھگڑوں میں احسن امی کا حمایتی ہوتا۔ میں اور آپا خاموش تماشاگاہی، امی کا حمایتی ہونے کا یہ نقصان ضرور ہوتا کہ وہ ابو کے عتاب کا نشانہ بنتا لیکن یہ فائدہ بھی ہوتا کہ اس کی رکابی پٹھ کی بوٹیوں سے بھری ہوتی۔

آپا اور میں اس معاملے میں کافی بزدل تھے۔ دل ہی دل میں ہم بھی امی کے حق بجانب ہونے کے قائل تھے۔ لیکن ابو کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت ہم میں نہ تھی۔

ان ہی دنوں احسن نے امی کے پاؤں دبانے شروع کر دیے۔ ہم سب گھر کے لوگ گرمیوں میں صحن میں سوتے تھے اور احسن نے یہ معمول بنالیا کہ رات کو سونے سے پہلے پانچ سے دس منٹ امی کے پیرد بابتا۔ تیسرے یا چوتھے دن آپا نے احسن سے کہا تھا۔

”صرف امی کے پاؤں دباننا مناسب نہیں، ابو کو برا لگتا ہوگا۔ تم ایسا کرو ابو کے پاؤں دبالیا کرو، میں امی کے پیرد بالوں کی۔“

”ہرگز نہیں، مجھے ابو اچھے نہیں لگتے۔ پیسے ہونے کے باوجود وہ ہمیں محتاج رکھتے ہیں۔ میں ان کے پاؤں نہیں دباؤں گا۔“ احسن کا لہجہ دو ٹوک اور انداز نفرت بھرا تھا۔ آپا کے ماتھے پر تیوری آگئی۔

”احسن تمیز کا دامن پکڑے رکھا کرو۔ بچے نہیں ہوتے۔ تمہیں ابو پسند نہیں، ایسا کیوں کہا تم نے۔“ آپا کا لہجہ تیز تھا۔

”جب مجھے پسند نہیں تو میں کہوں گا مجھے پسند نہیں۔“ آپا کے تیز لہجے کا احسن پر زیادہ اثر نہ ہوا۔

”جو وہ کھاتے ہیں وہ تم کھاتے ہو، انہی کے گھر میں رہتے ہو اور پھر انہی کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہو۔“

”تمام بچے اپنے والدین کے گھر رہتے ہیں، والدین کا دیا کھاتے ہیں، یہ کوئی احسان نہیں بلکہ ابو تو کنبوسی کر کے ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ ظالم ہیں وہ۔ امی اور ہمیں کیسے حالوں میں رکھا ہوا ہے۔“

بلاشبہ ابو بخیل تھے وہ یقیناً زیادتی کرتے تھے۔ لیکن مجھے بھی احسن کے یہ الفاظ ابو پسند نہیں ظالم ہیں وہ برے لگے تھے۔ لیکن اس وقت میں نے احسن سے

جائیداد خریدنے سے خوب رغبت تھی۔ بھوانہ بازار میں ابو کا خوب چلتا ہوا اسٹور تھا۔ اس کی ماہانہ آمدنی کا مجھے صحیح طرح اندازہ تو نہ ہو سکا لیکن اتنا پتا تھا کہ وہ پورے بازار کا سب سے مشہور اسٹور ہے۔ لیکن اس کے باوجود ابو گھر کے خرچے کے لیے ہمیشہ چند ہزار ہی امی کی ہتھیلی پر رکھتے۔

”لونسرین تمہیں تو جیسے بڑھتی ہوئی مہنگائی کی خبر نہیں۔ کام بہت مندا ہے۔ مہنگائی نے لوگوں کی کمر توڑ دی ہے۔ میں اور سیکلز بوائے گا بک کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے شام کر دیتے ہیں۔“ کیسا جھوٹا بیان ہوتا اور ان جھوٹے بیانات کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ہر سال فروری یا مارچ میں ابو کوئی چھوٹی موٹی دکان، کوئی پلاٹ یا کوئی گھیراج خرید لیتے۔ گھر کے خرچے کے لیے ابو کا بخل خاندان بھر میں ضرب المثل تھا۔ ابو سب ہنس ہنس کر سنتے۔ لیکن کبھی کان نہ دھرتے۔ بچپن کے ابتدائی سالوں میں، میں نے امی کو ابو کے خرچے کی مد میں دی گئی قلیل رقم پر قناعت کرتے دیکھا تھا۔ لیکن جیسے جیسے جائیداد بڑھنے لگی۔ امی پر بھی ابو کے جھوٹ کھلنے لگے اور کچھ خاندان کے مردوں نے بھی امی کو باور کروایا کہ تم خاندان کو سمجھاؤ کہ خوب جائیداد بنالی، اب کھانے پینے اور پہننے اورڑھنے پر توجہ دو۔ بھوکے فقیروں کی طرح تم رہتے ہو۔“

امی کا خرچ کے لیے مزید پیسوں کا مطالبہ گزرتے وقت کے ساتھ زور پکڑنے لگا۔ نتیجہ وہی جو اس صورت میں ہو سکتا تھا۔ جھگڑے ہونے لگے۔ شدید قسم کے جھگڑے اور گھر کا سکون آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگا۔

”نسرین جو خود کھاتا ہوں۔ تمہیں کھلاتا ہوں۔ جو خود پہنتا ہوں وہی تمہیں اور بچوں کو پہناتا ہوں۔ یہ رقم اتنی قلیل بھی نہیں کہ تم کہو کہ اس سے گھر نہیں چل سکتا اور تم میرے پیسوں پر نظر کیوں رکھنے لگی ہو۔ کیا میری کمائی کو نظر لگاؤ گی۔“ پیسوں کے معاملے میں تیرا میرا ہونے لگا اور کشیدگیاں بڑھتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ امی اور ابو جب بھی ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے

ظن سے کام لیتے۔ اور طنز کا نتیجہ ہمیشہ جھگڑا نکلتا۔ ان

READING
Section

احسن مجھ سے تین جماعتیں آگے تھا۔ وہ پڑھائی میں ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ اساتذہ اُسے اتنا ہی پسند کرتے تھے جتنا عموماً اوسط درجے کے طالب علم کو کیا جاتا ہے۔ جبکہ میں ایک ہونہار طالب علم تھا اور اساتذہ کا منظور نظر بھی اور یہ واحد معاملہ تھا جس میں احسن مجھ سے حسد کرتا تھا۔ یوں تو میری کبھی کبھار پوزیشن آجاتی تھی لیکن پہلی پوزیشن پہلی بار آئی تھی اور تقریباً تقسیم اسناد و انعامات میں مجھے ایک خوبصورت سی ٹرائی ملی تھی۔ گھر واپسی پر میں خوشی خوشی جا رہا تھا۔ احسن کے چہرے پر چھائی ہوئی ناہوشی بھی خوب لطف دے رہی تھی۔

”احسن ٹرائی خوبصورت ہے نا، بیٹھک کی سجاوٹ بنا میں گے۔“ میں نے احسن کو جلانے کے لیے کہا تھا۔

”ہاں اچھی ہے، ذرا دکھاؤ۔“ احسن نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ٹرائی اُسے پکڑادی۔

”طاق کے ساتھ جو خانہ ہے وہاں سجاؤں.....“

میرے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ ٹرائی زمین بوس تھی اور دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ میں نے ایک نظر احسن کو دیکھا جس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ میں نے جھک کر ان دو ٹکڑوں کو اٹھایا۔

”میں نے خود نہیں گرایا۔ میرے ہاتھ سے گر گئی۔ میں معذرت خواہ ہوں۔“ احسن کے چہرے پر معذرت کا شائبہ تک نہ تھا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ پل کی پل میں مجھے ایسا غصہ آیا کہ میں احسن پر چڑھ دوڑا۔ ٹرائی کے وہ ٹکڑے میرے ہاتھ سے گر کر مزید ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ میرے مکے کے جواب میں احسن نے مجھے گھونسا مارا اور ہم ایک دوسرے کو مارنے لگے۔ ٹرائی کے ٹکڑے ہمارے پیروں تلے آ کر مزید ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک راہ گیر نے چھڑوایا۔ اگلے پل ہم پھر تقسیم گھٹاتے تھے۔ اس وقت ہم اپنی کلی سے دو ٹکڑوں کے فاصلے پر تھے۔ اپنے محلے کے قریشی صاحب گزرے تو انہوں نے ہمیں چھڑوایا اور اپنے ساتھ لیے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئے۔ ٹرائی تو

کچھ نہ کہا۔ پہلے پہل آپا نے احسن کو تلخ لہجے میں سمجھایا پھر اپنے لہجے میں نرمی لے آئیں، لیکن احسن کے خیالات بدلنے تھے نہ بدلے۔ اس رات آپا ابو کے پیروں کے پاس کھڑی کہہ رہی تھیں۔

”آئیں ابو، آپ کے پاؤں دبا دوں۔“ ریڈیو سے کان لگائے ابو نے چونک کر آپا کو دیکھا تھا۔ چند لمحے تو آپا کو دیکھتے رہے۔ پھر اٹھ بیٹھے۔ آپا کو اپنے ساتھ بٹھایا شفقت سے آپا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

”میری صبیحہ تو سمجھدار ہوگئی۔ شکر یہ بیٹی۔ لیکن مجھے پاؤں یا ٹانگیں دبوانا قطعاً پسند نہیں۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں تمہاری ماں نے بھی کوشش کی تھی کہ میری ٹانگیں دبا لیا کرے لیکن میں نے کبھی ہاتھ نہ لگانے دیا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تم جاؤ سو جاؤ۔ صبح سب سے پہلے تم ہی تو اٹھتی ہو۔ اور ہاں کبھی کبھار اپنی ماں کے پاؤں دبا لیا کرو۔ روز احسن ہی دباتا ہے۔ کبھی تم، کبھی احسن اور کبھی تحسین دبالے تو زیادہ اچھا ہے۔“

میں اپنی چار پائی پر لیشا یہ محبت بھرا منظر دیکھنے سے دیکھ رہا تھا۔

اگلی رات میں نے ابو سے پوچھا کہ میں ان کے پیر دباؤں تو انہوں نے مجھے شفقت سے منع کرتے ہوئے وہی باتیں دہرائیں جو کل آپا سے کہی تھیں۔ میرے دل میں ابو کی کنجوسی کے سلسلے میں کدورت تھی۔ وہ قدرے کم ہوگئی۔ گھر کے خرچ کے لیے کم رقم دینے کے علاوہ تو ابو نے کبھی ہم سے کوتاہ نظری سے کام نہ لیا تھا۔ اس سے اگلے دن احسن سے پہلے ہی میں امی کے پاؤں دبانے بیٹھ گیا۔ ابھی ددمنٹ بھی نہ دبائے ہوں گے کہ امی کہنے لگیں۔

”احسن بیٹا تم آؤ پاؤں دباؤ۔ تحسین کو تو پاؤں دباننا ہی نہیں آتا۔ تم بڑے اچھے پاؤں دباتے ہو۔“

میرے دل میں موجود شکوہ آنکھوں سے جھٹک رہا تھا۔ لیکن اس نیم تاریکی میں امی کا دھیان ہی نہ گیا۔ شاید وہ متوجہ ہو بھی جاتیں اگر انہیں مجھ سے احسن جتنی محبت ہوتی۔

☆.....☆.....☆

باورچی خانے کی طرف جا چکی تھیں۔ دو گھنٹے بعد آ پا کی یونیورسٹی سے واپسی ہوئی تھی تو انہوں نے ہم دونوں سے نتیجے کی بابت پوچھا تو امی کو بھی یاد آ گیا کہ آج ہمارا نتیجہ تھا۔ وہ بھی پوچھنے لگیں۔

”میں کلاس میں اول آیا تھا۔ مجھے ٹرائی ملی تھی۔ احسن نے تو ڈرمی۔“

”نہیں امی میں نے خود نہیں توڑی، میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی، میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑی۔“

”اور احسن تمہارا نتیجہ؟“

”میں بھی پاس ہوں۔“

”بہت بہت مبارک ہو تم دونوں کو۔“ احسن امی کے پاس بیٹھا تھا۔ امی نے پہلے اس کے گال پر بوسا دیا پھر میرے گال پر، آپا منتظر تھیں کہ ٹرائی ٹوٹنے کے بارے میں پتا چلے۔

”اور تحسین تم بھائی سے اس قدر بدگمان کیوں ہو؟ وہ تمہارا بھائی ہے وہ تمہارا انعام کیوں توڑے گا؟“

”ای احسن نے ہی توڑی ہے۔ آپ کو کبھی میری بات پر یقین ہی نہیں آئے گا کیونکہ آپ کو احسن زیادہ اچھا لگتا ہے۔“ میں اٹھ کر جانے لگا۔

”رکو تو، کہاں جا رہے ہو؟ تحسین، تحسین.....“

امی اور آیا آوازیں دیتی رہ گئیں۔ آپا تو دروازے تک بھی آئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ مجھے پکڑتیں میں دروازہ پار کر گیا۔

اسی کے ٹخرے سنبھالیں جو آپ کو زیادہ پیارا ہے۔“

دو پہرے شام ہو گئی میں سڑکیں ناپتا رہا۔ نمایاں کامیابی کی خوشی میں لوگ عموماً اچھا اور زیادہ کھاتے ہیں۔ لیکن میں نے وہ دن بھوکا آوارہ گردی کرتے گزارا اور ایسا میرے بھائی کی وجہ سے تھا۔ مجھے احسن سے نفرت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔

اور جب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو میں واپس گھر آیا۔ امی نے پاس بٹھا کر پیار کیا بال سہلائے، میں زد ٹھے پن سے بیٹھا رہا۔

”تم دونوں میرے بیٹے ہو، میں تم دونوں سے

ساتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑیوں میں بٹ چکی تھی کہ تمام ٹکڑیوں کو سمیٹنا محال تھا۔ پھر بھی میں نے چند ٹکڑوں کو اٹھا لیا۔

”تم کیسی عورت ہو، ہزاروں نوٹ تمہاری ہتھیلی پر رکھتا ہوں۔ پھر بھی تمہیں پورا نہیں ہوتا۔“ گھر میں قدم رکھتے ہی ابو کی پھنکارنی آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔

”ہزاروں ضروریات ہیں، وہ چند ہزار پورے نہیں ہوتے۔ تمہارا ارادہ کفن میں جیب بنوانے کا ہے جو اتنا جمع کیے جا رہے ہو۔ ضروریات پر بھی نہیں خرچ کرتے۔“

”میں کوئی جمع نہیں کر رہا جتنا کماتا ہوں تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔“

”جھوٹ تو مت بولو۔ ایسے ہی تو نہیں ہر سال دو سال بعد جائیداد خریدی جا رہی۔“

”یہ مردوں کی باتیں ہیں، تم میرے پیسوں پر نظر مت رکھو۔“

”میرے پیسے، میرے پیسے، صرف میرے ہی تمہارے ہیں۔ میں اور بچے تمہارے کچھ نہیں لگتے۔“

میں نے ایک نظر امی اور ابو کو لڑتے دیکھا۔ دوسری نظر ٹرائی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں پر ڈالی اور آخری شکایت بھری نظر احسن پر۔ احسن نے اپنے چہرے پر کیمنی مسکراہٹ سجالی۔ میں سر جھکائے صحن کی طرف بڑھ گیا۔ صحن کے ایک کونے میں کوڑا دن تھا۔ ٹرائی کے ٹکڑوں کو کوڑے دان میں ڈالنے سے پہلے میں نے ایک بار محبت سے اُن پر ہاتھ پھیرا اور انہیں کوڑے دان کے حوالے کر دیا۔ وہ ٹکڑے بیٹھک میں سجانے کے قابل ہرگز نہیں تھے۔ آج نہیں توکل انہیں کوڑے میں ہی جانا تھا۔ توکل کی تکلیف سے آج کی تکلیف ہی بھلی۔

یہ میری زندگی کا پہلا انعام تھا جو احسن کی وجہ سے ضائع ہو گیا تھا۔ میں نے دل میں احسن کے لیے نفرت بڑھتی ہوئی محسوس کی تھی۔

ابو پاؤں پیخ کر اسٹور جا چکے تھے۔ امی بھی بیٹھتے ہوئے نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے

چچا شوکت ابو کے تایا زاد بھائی تھے، گاؤں کے رہنے والے، زمیندار، اُن کا بیٹا عمیر میٹرک پاس، خوش شکل، باپ کی طرح زمیندار لی اے پاس آپا کا رشتہ اُن سے طے ہو گیا اور شرماتی مسکراتی آپا گھر میں بلا وجہ پھرنے لگیں۔

شادی کارڈ بننے لگے۔ محلے میں کارڈ بانٹنے کا کام میرے زے لگا۔ ابتداء ساتھ والے قریشی صاحب کے گھر سے کی۔

”کون ہے؟“ دستک کے جواب میں قریشی صاحب کی زوجہ کی آواز سنائی دی۔

”میں ہوں تحسین، ساتھ والے گھر سے۔“
 ”لو اپنے بچے ہو، اندر آ جاؤ۔“ انہوں نے دروازہ داکیا تو میں جھکتے ہوئے اندر چلا گیا۔ آج سے دو تین سال پہلے تو میں بے دھڑک چلا جایا کرتا تھا۔ لیکن اب میں بچہ نہیں رہا تھا۔

”بہت بہت مبارک ہو، صبیحہ تو مجھے اپنی نوین کی طرح ہی پیاری ہے۔ آؤ والان میں چل کر بیٹھو۔ چائے پی کر جانا۔“

”نہیں خالہ، چائے پھر کبھی ابھی کارڈ بانٹنے.....“ الفاظ میرے حلق میں اٹک گئے۔ نوین کو دیکھ کر دل ایسے زور سے دھڑکا کہ مجھے لگا کہ ابھی سینے سے باہر ہی نہ نکل آئے۔

حالانکہ میں اسے پہلی بار نہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر نوین اپنا دوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔ انتہائی سرخ شلووار قمیض کے ساتھ اس کا دوپٹا سفید رنگ کا تھا۔ بالوں کی بے ترتیب سی چوٹی تھی۔ کلائیوں میں چند ایک کانچ کی جوڑیاں تھیں۔ اس نے مجھے دور سے ہی سرگی جنبش سے سلام کیا تو مجھے کچھ ہوش آیا۔

”چائے پھر کبھی۔“ میں ٹوٹے ہوئے الفاظ میں کہتا بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالتا گھر سے باہر آیا۔ قریشی صاحب کے گھر سے اگلے گھر تک اپنے آپ کو کھینچتے ہوئے مجھے لگنے لگا کہ میری کوئی چیز ان کے گھر ہی رہ گئی ہے۔ کیا؟ کیا؟؟ میں ان کے گھر صرف کارڈ لے کر گیا تھا۔ ان کو دیے جانے والے کارڈ کے سوا سب میرے پاس ہے۔ پھر کیا رہ گیا۔

ایک جیسا پیار کرتی ہوں۔ بدگمانی اچھی چیز نہیں۔ میرے لیے جیسے تم ویسا احسن۔“ میں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ آپا اور احسن کے بعد دیکرنے کمرے سے نکلے۔ آپا ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئیں۔ احسن میرے پاس بیٹھ گیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے ثرانی جان بوجھ کر نہیں توڑی۔ میرے ہاتھ سے اچانک گر گئی۔ مجھے معاف کر دو۔“ میں نے ایک نظر احسن کو دیکھا اور پھر سے سر جھکا لیا۔ دل میں موجود کدورتیں ایسی معافیوں سے کبھی نہیں جاتی۔

”اچھا تحسین پہلی بار اول آئے ہو، امی سے انعام نہیں لو گے۔“ آپا ماحول کی کشیدگی کم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ امی نے جھٹ پٹ دد پٹے کے پلو سے بندھے سو روپے نکالے اور میری ہتھیلی پر رکھ دیے۔

”رہنے دیں امی، آپ کے پاس یوں بھی پیسوں کی کمی ہوتی ہے ابو خرچہ جو کم دیتے ہیں۔“

”چل چل رکھ، میرا بیٹا پہلی بار اول آیا ہے میں اسے انعام بھی نہ دوں۔“ امی نے ایک بار پھر میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ آپا اندر گئیں اور اپنا محبوب قلم لے آئیں۔

”تمہیں میرا قلم بہت پسند ہے نا، آج سے یہ تمہارا۔“

اور پھر دن اسی طرح گزرتے گئے۔ امی کی عنایتیں احسن کے لیے مخصوص، میں انتظار کرتا رہتا کہ مجھ پر بھی نظر کرم کریں لیکن یہ انتظار، انتظار ہی رہتا۔ پیسوں کے معاملے میں امی ابو کے جھگڑے بھی جاری رہے۔ مہنگائی نے آسمان سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ ابو پھر بھی اتنے پیسے دتے جتنے آج سے پانچ سال پہلے دیتے۔ یہاں تک کہ گھر کا دسترخوان مختصر ہونے لگا۔ ابو کو دسترخوان کے مختصر ہونے کی زیادہ پروا نہ تھی۔

☆.....☆.....☆

دن گزرتے گئے اور آپا کی شادی کے ہنگامے جا گئے لگے۔

تھی۔ جاتے ہوئے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ مجھے ایک کاغذ تھما گئی اور میں حیران و پریشان وہ کاغذ لیے کھڑا رہا اور خلوت میسر آتے ہی اسے پڑھا۔

”ایک لڑکی ہوتے ہوئے یہ بات کہنا تھوڑا عجیب تو ضرور ہوگا لیکن کہے بغیر چارہ نہیں کہ میں تمہارے عقد میں آنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہوں۔ میں نے تمہیں دعاؤں میں خدا سے خوب مانگا ہے۔ خدا میری دعا میں رو نہیں کرتا۔ لیکن اتنے سال گزرنے کے بعد بھی کوئی وسیلہ نہ بنا نظر آیا تو میں نے سوچا خود ہی کہہ دوں۔ منہ سے کہنے کی ہمت نہ تھی اس لیے ضابطہ تحریر میں لائی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ عمر میں بھی تم سے کچھ بڑی ہوں۔ پاکستان میں بلاشبہ بڑی عمر کی لڑکی سے شادی کرنا عجیب ہے۔ لیکن جہاں محبت ہوتی ہے وہاں یہ سب باتیں بیچ ہیں، میں انتظار کروں گی۔“

اس تحریر کے علاوہ خط کے ابتداء میں القابات تھے اور نہ اختتامی جملہ میں نے حیرانگی سے اس تحریر کو ایک بار پڑھا، دوسری بار پڑھا اور پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے کوڑے دان میں ڈال دیا۔

مجھے نوین سے چند دن پہلے محبت ہوئی تھی اور زہرہ کو مجھ سے چند سال پہلے، محبت سے بڑھ کر خود غرض کوئی اور شے نہیں۔ مجھے زہرہ پر کیا گزر چکی تھی اور کیا گزرنے والی تھی سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ دلچسپی تھی تو صرف خود سے یا پھر نوین سے.....

☆.....☆.....☆

بی اے کے بعد احسن نے ابو کے ساتھ اسٹور پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ مزید پڑھائی کا اس کا ہرگز ارادہ نہ تھا۔ ابواب بھی میرے پیسے کہتے رہتے لیکن پہلے کی نسبت کافی کم۔ اسٹور پر احسن کے عمل دخل سے امی کو اسٹور کے حساب کتاب کا زیادہ بہتر پتا چلنے لگا۔ یوں ابو کچھ زیادہ پیسے دینے لگے اور کچھ احسن ابو سے چھپ کر امی کو دے دیتا۔ امی کے پاس پیسوں کی تھوڑی فراوانی ہوئی تو امی ابو کے جھگڑے کم ہونے لگے۔

پری میڈیکل کے تحریری امتحان کے بعد عملی

میری نظروں کے سامنے سے ایک بار پھر نوین کا سراپا گھوما۔ سرخ نمین، سفید دوپٹا، چند کانچ کی چوڑیاں، اچانک احساس ہونے لگا کہ میرا دل ان کے گھر ہی رہ گیا ہے۔ بس پھر کیا تھا، مشکل تمام کارڈ بانٹے اور گھر آتے ہی چارپائی پر ڈھے گیا۔

نوین کے ساتھ کھیلتے ہوئے میں نے بچپن گزارا تھا۔ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ پھر اب ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ بچپن گزر گیا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تب بھی نوین آنکھوں کے سامنے ہوتی۔ آنکھیں کھولتا تب بھی وہ سامنے رہتی یہ کیا ماجرا تھا۔

محبت، محبت..... اچانک سرگوشیاں ہونے لگیں اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

☆.....☆.....☆

اور بس پھر شادی کی تقریبات میں میری نگاہیں نوین کو ہی تلاش رہیں۔ وہ بالوں کو کچھ اس انداز سے گوندھتی کہ وہ بے ترتیب سے لگتے، اور یہ بے ترتیب انداز اس پر خوب چلتا۔ جوتیاں ہر تقریب میں اونچی ایڑی والی ہوتیں۔ شاید سرخ رنگ اس کا محبوب رنگ تھا۔ اس کے ہر لباس میں وہ کہیں نہ کہیں موجود ہوتا۔

اور جب میں نے سرخ لہنگے میں ملبوس آیا تو دیکھا تو دل بے اختیار نوین کو سرخ لہنگے میں دیکھنے کو چاہا اور جب آپارخصت ہو کر گاؤں جا رہی تھی تب میں فیصلہ کر چکا تھا کہ میری دلہن نوین ہی بنے گی۔

ان دنوں میں پری میڈیکل کے دوسرے سال میں تھا۔ میں نے ارادہ کیا جیسے ہی میڈیکل کالج میں داخلہ لوں گا، امی کو رشتہ ڈالنے کا کہوں گا تا کہ ایک محفوظ مستقبل والے شخص کو اپنی بیٹی دیتے ہوئے قریشی صاحب نہ ہچکچائیں۔

شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو دوسرے شہر سے آئے رشتہ دار بھی جانے لگے۔ خدیجہ خالہ امی کی چھوٹی بہن، اپنے بچوں کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں۔ شہروں کے درمیان فاصلہ ہونے کی وجہ سے میری ان کے بچوں سے بہت زیادہ بے تکلفی تو نہ تھی لیکن اچھی دوستی اور گپ شپ ضرور تھی۔ ان کی بڑی بیٹی زہرہ شاید عمر میں مجھ سے دو سال بڑی

”تحسین تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ ای کو تشویش ہونے لگی۔

میں کچھ دیر خاموشی سے امی اور احسن کو دیکھتا رہا اور ہمت جمع کرتے ہوئے بولا۔

”امی میں نوین سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ امی اور احسن ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگے۔ کتنے لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

”تحسین لیکن.....“

”ای کیا لیکن؟ میں نوین کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کے نزدیک میری پسند کی کوئی اہمیت ہے؟ یا آج بھی آپ اپنے دلارے کی پسند کو جلا بخشیں گی۔ اور مجھے نامراد ٹھہرائیں گی جیسا کہ آپ ہمیشہ کرتی آئی ہیں۔“ کتنے سالوں کی بھڑاس میں نے چند جملوں میں سمو کر امی کے سامنے پیش کی تھی۔ امی خاموش رہیں۔ ان کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہیں لیکن الفاظ ہی نہیں ملتے۔ کتنے لمحوں کی خاموشی کے بعد احسن نے کہا۔

”نہ صرف میں بلکہ نوین بھی مجھے پسند کرتی ہے، اب سے نہیں پچھلے کئی سالوں سے۔“ میں نے بے یقینی سے احسن کو دیکھا تھا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“

”یہ سچ ہے، کچھ دن پہلے ہم دونوں ایک پبلک پارک میں بھی ملے تھے۔ اکٹھے لہجے بھی کیا تھا۔“

”ایسے جھوٹ تو نہ بولو جن کے پاؤں اندھے کو بھی نظر آئیں۔“

”اگر نوین خود ان باتوں کی تصدیق کر دے تو.....“ احسن کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ برف جیسا ٹھنڈا میں مزید کچھ نہ کہہ سکا اور اٹھ کر اندر کمرے میں جانے لگا۔

”تحسین میری بات سنو۔“ احسن نے پیچھے سے پکارا تھا۔

”مجھے کچھ نہیں سنا، ہاں البتہ یہ ضرور بتانا ہے مجھے تم سے نفرت ہے، شدید نفرت۔“ اندر کمرے میں آ کر میں نے اسے مقفل کیا اور بستر پر آڑا تر چھالیٹ

امتحان میں کچھ دن باقی تھے۔ عملی امتحان یوں بھی برائے نام تھا۔ کالج والے اچھے طلباء کے پورے نمبر لگوا لیا کرتے۔ اُس دن بھی امی ہمیشہ کی طرح احسن کے لاڈ اٹھاتے ہوئے اس کے بالوں میں تیل لگا رہی تھیں اور میں ہمیشہ کی طرح لا تعلق سا ایک طرف بیٹھا تھا۔ بیزاریت سے بچنے کے لیے میں آپا کے پرانے سامان سے ایک پرانا ناول اٹھالایا۔

”تحسین تم سر میں تیل لگواؤ گے؟“ ای نے سرسری سا پوچھا تھا۔

”آؤ میرے بیٹے تحسین، کتنا تو تم پڑھتے ہو۔ تیل تمہارے بالوں کی صحت کے لیے ناگزیر ہے۔ آؤ تیل لگاؤں تمہارے بالوں میں.....“ ایسا جملہ تو شاید مجھے کبھی سننے کو نہ ملے گا۔ ایسا پیار تو صرف احسن کے لیے ہے۔

”نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے نفی میں جواب دیا تو امی ایک بار پھر احسن کی ناز براداریوں میں مصروف ہو گئیں۔

”میری پیاری امی جان تیل لگالیں تو ایک خاص بات بتاؤں۔“

”لگا چکی تیل، اب بتاؤ میرے دلارے۔“

”میں اپنی پیاری سی امی کے لیے ایک چاندی بہو پسند کر چکا ہوں۔“

”اوہو، چھپے رستم، پسند کرنے کے بعد بتا رہے ہو، پسند کرتے ہوئے مشورہ تو لیتے۔ چلو بتاؤ کسے اپنی زوجہ کا شرف دینا چاہتے ہو۔“

”نوین۔“ احسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرے اللہ میں بھی ہمیشہ سے نوین کو تمہاری دہن کے روپ میں دیکھتی آرہی ہوں۔“ امی دلارے کی پیشانی چوم رہی تھیں۔ میرے ہاتھ سے ناول چھوٹ کر گر گیا تھا۔ کسی نے دھیان ہی نہ دیا۔

”تحسین تمہاری بھابی کے روپ میں نوین کیسی لگے گی۔“ احسن بوجھ رہا تھا۔

امی بھی مسکراتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئیں۔ میرے چہرے پر کچھ ایسی کرسنگی تھی کہ ان دونوں کے مسکراتے لب بچھ گئے۔

گیا۔ آنکھیں بند کیں تو چہم سے اس لڑکی کا سراپا آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ سرخ لباس جس کا وطیرہ تھا۔ سرخ رنگ شاید بنایا ہی اس کے لیے گیا تھا۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں میں چبھنے لگی تھیں اور آنکھیں پانی سے بھرنے لگی تھیں۔

”نوین..... بھابی.....“ بھابی کہتے ہوئے میں بلک بلک کر رونے لگا۔

امی اور احسن رات گئے تک میرے دروازے پر دستک دیتے رہے لیکن میں نے دروازہ نہ کھولا۔

”تحسین بیٹا، اب دروازہ کھول دو، تمہارے ابو ستنی بار تمہیں بلا چکے ہیں، میں کوئی بہانہ بنانے سے بھی قاصر ہوں۔ انہیں کیا وجہ بتاؤں کہ کس وجہ سے تم کمرہ بند ہو۔“ امی کی کھکھیاتی التجا میں زور پکڑتی گئیں اور بالآخر میں نے دروازہ کھول دیا۔

اس صبح ابو اور احسن کے جانے کے بعد میرے نہ کرنے کے باوجود امی نے اپنے ہاتھوں سے مجھے کھانا کھلایا۔ پھر زبردستی میرا سراپا اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئیں اور میرے بال سہلانے لگیں۔

”ایسا بالکل بھی نہیں تحسین جیسا کہ تم سوچتے ہو۔ تم دونوں میرے ہو، جتنی محبت احسن سے اتنی ہی مجھے تم سے، ہاں البتہ تم سے اظہار کے معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہوتی رہی ہے۔ لیکن یقین کرو اب اس سلسلے میں بھی کوتاہی نہ ہوگی۔“ امی بال سہلاتے ہوئے کہتی رہیں اور میں چپ چاپ آنکھیں بند کیے سنتا رہا۔

”اور جہاں تک نوین کی بات ہے، میں اُسے اپنی بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی چاہے تمہاری یا پھر احسن کی لیکن اب جب احسن کہتا ہے کہ نوین بھی اُسے پسند کرتی ہے تو.....“

”امی اس ذکر کو رہنے دیں۔“ میں نے قطع کلامی کی تو امی خاموش ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

دن گزرتے گئے اور میں سنبھلتے سنبھلتے سنبھل ہی گیا۔ میرے میڈیکل کالج میں داخلے سے پہلے ہی

امی ابو نے نوین کے لیے قریشی صاحب کے گھر چکر لگانے شروع کر دیے۔ اور چھ مہینے چکر لگوانے کے بعد قریشی صاحب نے ہاں کر دی۔

میرا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہونے لگا تو اپنے شہر میں میڈیکل کالج ہونے کے باوجود میں نے دوسرے شہر کے میڈیکل کالج کا انتخاب کیا۔ وجہ میں فی الحال اس چھت تلے نہ رہنا چاہتا تھا۔ جہاں چند مہینوں تک نوین نے دلہن بن کر آنا تھا۔ میں ہاسٹل شفٹ ہوا۔ چند مہینوں تک نوین مسز احسن بن کر ہمارے گھر آ گئی۔

امتحان کا بہانہ کر کے میں نے شادی میں صرف ویسے کی تقریب میں شرکت کی تھی۔ آپا جو شادی پر آ میں تو انہوں نے زچگی کے بعد جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور آپا کے شوہر عمیر بھائی کی وجیہ شخصیت کے پیچھے چھے ان کے اصل انسان کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب آپا نے سارہ کو جنم دیا۔ عمیر بھائی کافی بے صبر نے واقع ہوئے تھے۔ دنیا دکھا دے کو بھی بیٹی کی پیدائش پر خوشی کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ ہر آئے گئے کو بتایا انہیں بیٹے کی تمنا ہے اور انشاء اللہ اگلے سال وہ ایک بیٹے کے باپ بھی ہوں گے۔

انہی دنوں مجھے ہاسٹل کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ زہرہ کا خط، جس کا مضمون پچھلے خط سے چنداں مختلف نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اس بار میں انتظار کر رہی ہوں کے الفاظ نے مجھ پر کچھ اثر ڈالا اور ایک پل کو میں خط کوڑے دان کی نذر کرنے کو ہچکچایا۔ لیکن اگلے پل خط کوڑے دان میں ہی تھا۔

☆.....☆.....☆

آنے والے سال بہت ساری پریشانیاں لے کر آئے اور پریشانیوں کی بڑی وجہ عمیر بھائی تھے۔ آپا کے ہاں ہر سال بچہ پیدا ہونے لگا اور بیٹیوں کی قطار لگنے لگی۔ عمیر بھائی کا رویہ آپا سے خراب سے خراب تر ہوتا گیا۔ اور میری خوش اخلاق ملنساری ناولوں کی تخیلاتی دنیا میں رہنے والی آپا مسکرانا بھی بھول گئی۔ یوں مسکراتیں جیسے رو رہی ہوں۔ ادھر میرا میڈیکل کالج پڑھائی کا آخری سال تھا اور ادھر آپا پانچویں بار

بھی میرے مشورے پر عمل کیا ہو۔“ یہ دھمکی بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔

دم کروانے کے لیے میں خضر کو لیے جا رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر ایک گٹر تھا۔ کوئی کل اس کا ڈھکن چوری کر گیا تھا۔ مجھے علم نہ تھا۔ میں بے دھیانی میں جا رہا تھا۔ یقیناً گٹر میں ہی جا اترتا اگر ساتھ سے گزرنے والا ایک موٹر سائیکل سوار مجھے دھکا نہ دیتا۔ میں تو بیچ گیا۔ لیکن میں خضر کا توازن نہ قائم رکھ سکا۔ اور میری اُسے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش بھی رائیگاں گئی۔ خضر گٹر کے پیٹ میں اتر گیا۔ تین گھنٹے بعد مردہ خضر گٹر سے نکالا گیا اور دو دن بعد آبا طلاق یافتہ تھیں۔ جب عمیر طلاق دینے آیا تو آتے ہی میرے منہ پر دو طمانچے مارے تھے۔ آبا ساتھ کھڑی رو رہی تھیں۔ پھر آبا کی طرف مڑا تھا اور بولا تھا۔

”صبیحہ نثار میں عمیر حیات بقا کی ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔“ لاشعوری میں مجھ سے ہونے والی بے احتیاطی نے بے انت غضب ڈھایا تھا۔ میں اپنے آپ کو آبا کا مجرم پاتا تھا۔ اُن کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا لیکن آپا نے مجھے کچھ نہ کہا۔ گھر میں ایک بار پھر پیسوں کے معاملے میں جھگڑے ہونے لگے۔ یوں تو میرے اور احسن کے برسر روزگار ہونے سے گھر کی آمدنی لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی لیکن ابو کہتے تھے۔

”صبیحہ تو میری بیٹی ہے، لیکن اس کی بیٹیاں تو کسی صورت ہماری ذمہ داری نہیں، عمیر کو ان کا ماہانہ خرچ مقرر کرنا چاہیے۔“ ابو نے ایک بار یہ بات آپا کے سامنے کہہ دی، آپا رونے لگیں۔

”میں اپنی بیٹیوں سے ہی ہوں، میں اس شخص سے اپنی بیٹیوں کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں لینا چاہتی۔ آپ کو عذاب لگتی ہوں تو اپنی بیٹیوں کو لے کر چلی جاتی ہوں۔“ ابو پھر کبھی نو اسیوں کے خرچ کا جوڑ توڑ زبان پر نہ لائے۔ البتہ دل میں ضرور رکھتے۔

☆.....☆.....☆

خدیجہ خالہ کی وفات پر ہم لوگ ان کے گھر گئے تھے۔ زہرہ کے سوا تمام بہنیں بیاہی جا چکی تھیں۔ زہرہ

فارغ ہونے کو آئیں اور اس بار بالآخر انہوں نے بیٹے کو ہی جنم دیا۔ عمیر بھائی تو جیسے خوشی سے پاگل ہونے کو تھے۔ پورے اسپتال میں مٹھائی بانٹی، وہ تو بیٹے کو ابھی گایوں لے جانا چاہتے تھے لیکن آپا کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ زچہ کے بغیر بچہ کو رخصت دینے کا اسپتال میں قاعدہ نہ تھا۔

اس وقفے میں، مجھے زہرہ کے خطوط ملتے رہے۔ جو مختصر ہوتے ہوتے اب فقط صرف ایک سطر تک محدود ہو چکے تھے۔ ”میں انتظار کر رہی ہوں۔“ اور جہاں تک میرے دل کی بات تھی..... میرے دل میں زہرہ کے لیے کوئی خوبصورت جذبہ نمونہ پاسکا تھا۔ بلکہ اب تو مجھے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

احسن اور نوین اپنی زندگی میں مگن تھے۔ اور جب نوین نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا تو آپا اپنے تین مہینے کے خضر کو لیے اپنے بھانجے کو دیکھنے آئیں۔ خضر بہت کمزور تھا۔ یہاں تک کہ تین مہینے کا ہونے کے باوجود نومولود سے چھوٹا لگ رہا تھا۔ جانے کیوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی صحت تنزلی کا شکار ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ہمارے گھر کی گلی سے اگلی گلی میں ایک درزی کی دکان تھی۔ باریش سا درزی، صوم صلوٰۃ کا پابند، شلوار بھی ہمیشہ ٹخنوں سے اونچی ہوتی، دم درود کرتا تھا، اہل علاقہ اُس کی خوب عزت کرتے۔ جس کسی نے بھی اُن سے دم کروایا۔ شفا پائی، روزانہ لگ بھگ پچاس لوگ ان کے پاس دم کے لیے آتے۔ ای کے اصرار پر آپا مان گئیں۔ اور مجھے خضر کو دم کروانے کے لیے بھیج دیا۔ میں اس بات کا بحیثیت ڈاکٹر زیادہ قائل نہ تھا۔ لیکن پھر بھی روانہ ہو گیا۔ حالانکہ میں نے آپا کو فارمولینڈ دودھ استعمال کروانے کا مشورہ بھی دیا تھا، لیکن وہ راضی نہ ہوئیں۔

”فارمولینڈ دودھ بہت سخت ہوتے ہیں۔ میرا خضر پہلے ہی اتنا کمزور ہے میں نے نہیں استعمال کروانے۔“

”آپ لوگ مجھے ڈاکٹر نہیں سمجھتے، مجال ہے جو

بنانا چاہتی ہوں۔ تم بتاؤ۔“ کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔

”میں زہرہ سے شادی کروں گا۔ لیکن شادی کے بعد میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہوں گا۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ آپ احسن کے ساتھ رہتی ہیں اور میں احسن کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ مجھے احسن سے نفرت ہے۔“ میرے لہجے میں صرف نفرت تھی۔

☆.....☆.....☆

”چلو بھی سہی، دو گھنٹے لگیں گے۔ ایک گھنٹہ آنے جانے کا اور ایک گھنٹہ اسکول کا، کیا تم اپنے دوست کے لیے دو گھنٹے بھی نہیں نکال سکتے۔“ عاشق کی باتیں ختم نہ ہوئی تھیں۔ عاشر سے میری دوستی ہاؤس جا ب کے دوران ہوئی تھی۔ عام طور پر عمر کے اس حصے میں دوستیاں کم ہی ہوتی ہیں، لیکن میں اور عاشر پھر بھی دوست بن گئے۔ اور اس میں بھی زیادہ ہاتھ عاشر کا ہی تھا۔ بس مکھ سا عاشر پورا ٹوٹھ پیسٹ کا اشتہار، حالانکہ اس کے دانت کچھ ایسے سفید بھی نہ تھے۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے دانتوں کی نمائش کرتا رہتا۔

آج عاشر پر اپنے اسکول جا کر پرانی یادیں تازہ کرنے کا جنون سوار ہو گیا تھا اور وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ جب اس نے اتنی باتیں کیں تو بالآخر میں نے حای بھری۔ حالانکہ میں کافی تھکا ہوا تھا۔ نیند کی طلب بھی شدید ہو رہی تھی۔

ڈی پی ایس فیصل آباد، اقبال اسٹیڈیم سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اسکول پہنچ کر تو عاشر بچہ ہی بن گیا۔ یوں محسوس ہوتا، چل نہیں رہا بلکہ اڑ رہا ہے۔

”یہاں، یہاں ہماری اسبلی ہوتی تھی اور میں یہاں کھڑا ہوتا تھا۔ میٹرک میں، میں اسکول کا ہیڈ بوائے تھا۔ میرا نام اندر لوح اعزاز پر لکھا ہوا ہے۔ تمہیں اندر جا کر دکھاؤں گا۔“

”اور ادھر یہ وہ گھنٹہ ہے جسے درمیانی وقفے کی اطلاع کے لیے چڑا سی بجاتا تھا۔ ٹن ٹن ٹن ایسی

سب سے بڑی تھی پھر بھی کنواری تھی۔ لوگ تو اب یہی سمجھنے لگے تھے کہ زہرہ نے کبھی شادی نہیں کرنی۔ واپسی سے پہلے ای نے زہرہ کو پاس بٹھا کر سمجھایا تھا۔

”اور کتنی ضد کرو گی زہرہ، ماں گزر گئی۔ اب انکار نہ کرو۔ جو رشتہ آئے اس پر ہاں کر لینا۔ تمہاری رضا ہو تو کہیں بات چلاؤں؟“

”نہیں خالہ کہیں بات نہ چلاؤ، میں شادی کروں گی، ضرور کروں گی، بس آپ دعا کریں۔ خدا میری قسمت جلد کھولے۔ میں انتظار کرتے کرتے تھکنے لگی ہوں۔“ مجھے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کی نمی آنسوؤں کی شکل میں بدلنے لگی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اماں جو بھانجی کے حال سے تھوڑا بہت باخبر تھیں۔ حال دل مکمل جان گئیں۔

”زہرہ کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟“

ای نے راستے میں پوچھا تھا۔

”کیسا خیال؟“ میں جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

”شادی کا..... اس سے شادی کر لو۔“ میں چیپ رہا۔

”بولو، کیا کہتے ہو؟“

”بہن کا گھر اجاڑ دیا ہے۔ اب شادی کر کے کیا کروں؟“

”تم نے گھر نہیں اجاڑا، یہ حادثہ تو خود میرے بھی ہو سکتا تھا۔“

”ای میں نے خود سے خضر کو نہیں مارا، میں قاتل نہیں ہوں۔“ میری آنکھیں بھی آنسو سے بھرنے لگیں۔

”میرے بچے میں جانتی ہوں تمہاری کوئی غلطی نہیں، یہ تو حادثہ تھا۔“ ای نے میرا کندھا تھپتھپایا تھا۔

”بھول جاؤ اسے، جو ہوا وہ میری صبیحہ کا نصیب تھا، تمہارے لیے اس کے دل میں کوئی کدورت نہیں، جانتی ہوں میں اسے، بہت اچھی ہے میری صبیحہ۔“

”میں بھی اپنی بہن کو جانتا ہوں امی، لیکن پھر بھی.....“

”تم اس بات کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ زہرہ سے شادی کرو گے؟ وہ بھی میری بیٹی ہے اور میں اسے بہو

استاد سے مل کر ہم آگے بڑھے تو عاشر مجھ سے گویا ہوا۔

”تحسین ایک بات تو بتاؤ۔“

”پوچھو۔“

”تم اس قدر پریشان کیوں رہتے ہو؟“

”میں..... نہیں تو۔“

”جھوٹ مت بواو تحسین، میں تمہارا دوست ہوں۔ بلاشبہ پرانا دوست نہیں لیکن پھر بھی تم مجھے بتاؤ کہ کیا وجہ ہے کہ تم پریشان رہتے ہو۔ دیکھو آج میں نے تمہیں اپنا اسکول دکھایا ہے یہ میرا ماضی ہے میں اس سے حظ اٹھاتا ہوں۔ انسان کو خوش رہنا چاہیے، تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔ ممکن ہے میں تمہاری مدد کر سکوں۔“

میں چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔

”کینٹین کے سمو سے چھوڑو، یوں بھی ٹھنڈے سمو سے کھانے کی عمر نہیں۔ یہاں پاس میں ایک آکس کریم پارلر ہے وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ اور چند لمحے بعد ہم آکس کریم پارلر میں بیٹھے تھے۔

”بولو اب، شروع سے آخر تک۔“

”یہ پہلی بار ایسا ہوا ہے کوئی مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ میں کیوں پریشان رہتا ہوں، اتنی اہمیت تو مجھے شاید کبھی نہیں ملی۔“

”اب حقیقت ہے یا خود ترسی اس کا فیصلہ تو میں تمہاری کہانی سننے کے بعد ہی کروں گا۔“

”سمجھ نہیں آتا کہاں سے شروع کروں؟“ میں نے میز کی سطح کو کھرچتے ہوئے کہا۔

”جہاں سے جی آئے شروع کرو، میں تمہیں ٹوکوں گا نہیں۔ میں ایک اچھا سامع ہوں۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں گویا ہوا۔

”خضر میرا بھانجا، میں نے تمہیں چند ماہ پہلے اس کی وفات کا بتایا تھا۔ وجہ میں نے غلط بتائی تھی وہ نمونیا سے نہیں مرا تھا۔ میں نے اُسے مار ڈالا۔ وہ بے احتیاطی سے مجھ سے گٹر میں گر گیا۔ اس کے مرنے کی وجہ سے میری بہن کو طلاق دے دی گئی۔ چار بیٹیوں کے بعد میری بہن نے ایک بیٹے کو پیدا کیا تھا اور وہ بیٹا بھی میری وجہ سے.....“

خونناک اس گھنٹے کی آواز ہے، میرے سر میں بعض اوقات درد ہو جاتا تھا۔

”اور یہ دیکھو اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میں اس وقت بال بناتا جب میری کسی ہم جماعت سے لڑائی ہوتی اور اس لڑائی کے نتیجے میں میری کنگھی خراب ہو جاتی تھی۔“

”دسویں میں، میں اس ڈیسک پر بیٹھتا تھا۔ ہیڈ بوائے تھا تو سب سے آگے بیٹھتا۔“

”یہ ہماری لائبریری، ہمارا روزانہ ایک ہیریٹ لائبریری کا ہوتا تھا۔ ہماری لائبریری میں ہر طرح کے اخبارات، رسالے اور ڈائجسٹ آتے تھے جیسے کہ اب بھی تمہیں ہیریٹل پر نظر آ رہے ہیں۔“

”اسکول کا عجائب گھر تو تمہیں دکھایا نہیں، آؤ وہ دکھاتا ہوں۔“

”یہ دیکھو یہ اسکول کا سب سے پہلا کمپیوٹر، اور وہ دیکھو قطار میں پرانے ٹائپ رائٹر پڑے ہیں۔“ عجائب گھر سے نکلتے ہوئے عاشر کو اس کے کوئی پرانے استاد مل گئے۔ ان سے اس نے خوب قبضے لگا کر بات کی۔

”آؤ کینٹین تو دکھاؤں۔ وہاں کے ٹھنڈے سمو سے، اُف کیا بتاؤں ابھی چل کر کھائیں گے بھی۔“

”السلام علیکم! السلام علیکم.....“ ایک استاد جا رہے تھے۔ عاشر نے بھاگ کر انہیں جالیا۔

”دیکھو السلام، لفٹرز ٹو.....“ استاد عاشر سے بغل گیر ہو گئے اور پھر میری طرف مڑ کر بولے۔ ”تو نہیں ملے گا اپنے استاد سے لفٹرز.....“ انہوں نے میری طرف ایک قدم بڑھایا تو میں بھی جھمکتے ہوئے اُن کے پاس آیا، بغل گیر ہوا۔

”کتنا شرارتی ہوتا تھا اور آج ڈاکٹر بن گیا۔“

مجھ سے میری بابت پوچھنے کے بعد انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ میں بھی کھسیا کر ہنسنے میں ان کا ساتھ دینے لگا۔ میں اُن کا شاگرد نہیں تھا، وہ شاید شکل کی مشابہت کی وجہ سے یا پھر اس خیال سے کہ یہاں آنے والا ہر نوجوان اُن کا شاگرد ہوگا، مجھ سے پرانے استاد کی طرح پیش آ رہے تھے۔ اور جب میں ان

”کچھ میں نہیں آتا۔“
 ”دیکھو تحسین تم نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے اور بہت کچھ ابھی دیکھنا ہے۔ بلاشبہ تمہارے ساتھ بہت ساری زیادتیاں ہوئی ہیں اور تم سے بھی اپنے بھانجے کے سلسلے میں کوتاہی ہوئی لیکن اس کا کیا مطلب ہے تم اپنی زندگی یوں ہی گزار دو جیسے کہ تم گزار رہے ہو۔“

”عاشق تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”دیکھو تحسین مجھے یہ جواب دو تمہاری کوتاہی سے تمہارا بھانجا مر گیا۔ لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کیا تم اپنے آپ کو قاتل سمجھتے ہو؟ قاتل کا لفظ اپنے لیے تم خود استعمال کر سکتے ہو؟“ میرا سر نفی میں ہلنے لگا۔

”اس لیے کہ تم قاتل نہیں ہو۔ جو ہوا وہ حادثہ تھا کسی سے بھی ہو سکتا تھا۔ ایک دفعہ میری گاڑی کے نیچے گتے کا پلا آ گیا، وہ پلا خود ہی سامنے آ گیا تھا، میری کوئی غلطی نہیں تھی وہ مر گیا۔ اس کی جگہ کوئی آدمی آ جاتا اور مر جاتا تو میں قاتل ٹھہرتا؟ نہیں نا، تم پھر اپنے آپ کو کیوں خطار کار سمجھ رہے ہو۔ جو ہوا اس پہ خدا سے معافی مانگو اور اسے سر سے اتار دو۔“ وہ کچھ دیر کا پھر بولا۔

”اور آگئی بات تمہارے ابو کی کنجوسی کی جس کی وجہ سے تم نے کئی دفعہ روٹی اچار کے ساتھ کھائی ہے۔ کیا مجھے یہ بتاؤ کہ اچار کا ذائقہ تمہیں ناپسند ہے؟“ میرا سر ایک بار پھر نفی میں ہلا تھا۔

”یہی تو اچار کے ساتھ روٹی کھانے کا شکوہ نما تذکرہ عبث ہے۔ اچار کا ذائقہ ایسا برا نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ روٹی نہ کھائی جاسکے اور باقی کنجوسی کی بات جس کی وجہ سے تم نے بچپن خواہشوں کو مارتے مفلسی میں گزارا تو میرے دوست اپنے آپ کو باور کرواؤ کہ وہ ماضی تھا جو گزر چکا ہے۔ اب تم خود برسر روزگار ہو۔ خود کھاتے ہو۔ ماضی کا مفلسی بھر اور یاد کرنے کا تواب کوئی فائدہ نہیں۔ چند سالوں تک تمہارے ابو گھر بیٹھ جائیں گے اور تم مختار کل ہو گے، تب یہ باتیں اپنے والد کو سنا کر انہیں طعنے نہ دینا۔ جو انہوں نے کیا ان کا ظرف تھا تم اپنا ظرف دکھاؤ اور جہاں تک میں دیکھتا ہوں ان کا ظرف ایسا برا بھی نہیں۔ یہ گھبرو جوان ہو تم۔ 80 کلو سے تو ایک

”میرے ابو بہت کنجوس ہیں، وہ اس لیے کھاتے ہیں کہ مزید جائیداد بنا سکیں۔ ساری زندگی میں نے اپنی ماں کو پیسے کے لیے ابو سے جھگڑتے دیکھا ہے۔ امی کا قصور کم ہوتا تھا۔ ابو ہی بخل کرتے تھے۔ اب میں اور میرا بھائی کمانے لگے ہیں تو حالات اچھے ہوئے ہیں، ورنہ بچپن میں تو اکثر اوقات پیسے کی قلت کی وجہ سے رات کا کھانا ہم اچار سے کھاتے تھے۔“

”اور میرا بھائی احسن مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔ امی کا وہ اس قدر دلارا ہے کہ کبھی کبھار مجھے اپنا آپ سو تیرا لگنے لگ جاتا ہے۔ تمہیں پتا ہے بچپن میں وہ مجھے اسکول سے ملنے والا انعام توڑ دیا کرتا تھا۔ امی اسے کچھ بھی نہیں کہتی تھیں اور اس نے شادی بھی نوین سے کی ہے۔ نوین وہ بھی جسے میں نے چاہت سے دیکھا تھا۔ میں نوین کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا چاہتا تھا۔ ہم دونوں بھائیوں نے ایک ہی دن امی سے نوین سے شادی کی فرمائش کی تھی۔ لیکن احسن نے کہہ دیا کہ نوین بھی اسے پسند کرتی ہے اور وہ دونوں گھومنے بھی جاتے ہیں۔ جھوٹ بولا تھا۔ وہ اور نوین کبھی ساتھ گھومنے نہ گئے تھے اور نہ ہی نوین اسے شادی سے پہلے پسند کرتی تھی۔ ویسے کی تقریب کے بعد احسن کی غیر موجودگی میں، میں نے حسد کے مارے نوین سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں کہاں گھومنے جا چکے ہیں۔ اور نوین نے پتا ہے مجھے کیا بتایا اس نے کہا کہ بچپن کے علاوہ تو اس کی کبھی احسن سے بات ہی نہیں ہوئی اور اس نے کچھ ایسی سنجیدگی سے کہا تھا کہ وہ جھوٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا احسن سے نفرت کرنے کے لیے یہ باتیں ناکافی ہیں۔“ میرا لہجہ کیوں اتنا تیز تھا، مجھے نہیں پتا تھا۔ اور پھر خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔

”بس یا مزید کچھ کہنا ہے؟“ اور میں نے چڑھی تیوری کے ساتھ سر نفی میں ہلا دیا۔
 ”اور اپنی اس کزن کا تو تم نے تذکرہ ہی نہیں کیا جو تمہیں خط بھیجتی رہی ہے اور جس سے تمہاری شادی ہونے والی ہے۔“

”زہرہ، میری سمجھ میں نہیں آتا، وہ کیوں میرے بچھے بڑگنی ہے۔ اس کے بارے میں کیا کہوں؟ میری

ہے کہ تم کھنچے کھنچے رہے۔ ممکن ہے کہ ان کے دل میں احسن کے لیے زیادہ محبت ہو۔ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ ایک اولاد کے لیے دل میں خود بخود زیادہ محبت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایسی قابل گرفت بات نہیں۔ جب تم اپنی والدہ سے دور رہے تو صرف انہیں تو قصور وار نہ ٹھہراؤ۔ اور معاف کرنا میرے دوست، میری بات تمہیں تکلیف دے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم قنوطی ہو۔

”قنوطی.....“ میں نے اچنبھے سے اُسے دیکھا۔

”ہاں قنوطی تم ہر چیز میں منفی پہلو ڈھونڈتے ہو اور جب کوئی منفی پہلو سامنے آ جاتا ہے تو اُسے سینے سے لگا کر بیٹھ جاتے ہو۔ یہ بتاؤ نوین کا تو تم نے خوب تذکرہ کیا اور زہرہ کا نہ خود سے تذکرہ کیا اور جب میں نے کہا تو بھی جان چھڑوائی۔ کیا اس لڑکی کی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں جو تم سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ سات سال سے تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ اپنی محبت کو ثابت کرنے کے لیے وہ کیا کرے اور کتنے سال تمہارا انتظار کرے۔ بولو۔“ عاشر بول رہا تھا اور میں یک ٹک اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

زہرہ سے میری شادی کو ابھی پانچ دن رہتے تھے کہ مجھے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ اچانک شروع ہونے والا شدید قسم کا درد۔ پیشاب میں خون آنے لگا اور پھر خون آنا بند ہو گیا۔ درد تھا کہ ناقابل برداشت، اور جب مجھے میرے فاضل ڈاکٹر نے بتایا کہ مجھے ”Adult Poly Cystic Kidney Disease“ ہے۔ تو میں کچھ بول بھی نہ سکا۔ یہ ایک جینیاتی بیماری تھی جو عموماً تیسرے عشرے کے انتہا پر ظاہر ہوتی ہے۔ گردوں پر بہت ساری خون اور پیپ بھری تھیلیاں بن جاتی ہیں اور دونوں گردے ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ڈائلیزس سے چند مہینے تو گزارے جاسکتے ہیں لیکن اس کا مکمل علاج انتقال کردہ ہے۔ بصورت دیگر اپنی موت کی چاپ سنتے رہیے۔

میرے پورے گھر پر موت کا سناٹا چھا گیا۔ امی، ابو بوڑھے تھے۔ آپا بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور احسن کے ساتھ کر اس میچنگ نہ ہوئی، گھر میں کوئی بھی مجھے گردہ نہ دے سکتا تھا۔ اخبار میں اشتہار دے دیا گیا کہ گردے کی

کلو بھی تمہارا وزن کم نہ ہوگا اور مفلسی میں یہ حال ہے اگر وہ کھلا خرچ دیتے تو یہاں میرے سامنے بیٹھنے والا شخص اتنا اسمارٹ نہ ہوتا، بلکہ موٹا گول گیا ہوتا۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے عاشر ہنسنے لگا تھا اور میں بھی ہنستے ہوئے اُس کا ساتھ دے رہا تھا۔

”اور رہی بات تمہاری اپنی بھائی احسن کے ساتھ تعلق کی تو جہاں تک مجھے لگتا ہے تم دونوں نے ایک دوسرے سے حسد و رقابت کا جذبہ باندھ لیا تھا۔ اوپر تلے کی اولادوں میں یہ جذبہ عموماً موجود ہوتا ہے، جو وقت کے ساتھ کم ہو جاتا ہے۔ لیکن تم نے اس حسد کے جذبے کو ختم ہونے ہی نہ دیا۔ بلکہ پردان چڑھائے رکھا۔ اور اس حسد کے درخت کا پھل کھاتے رہے۔ تمہارا بھائی تمہارے تحائف اور انعامات توڑ دیتا تھا تو کیا تم نے کبھی اسے گزند نہ پہنچایا اور رہ گئی بات نوین کی جو کہ اب تمہاری نوین بھائی ہے اس سلسلے میں تو میں تمہارے بھائی کو داد دوں تو اچھا ہے۔ جو قصہ تم نے مجھے سنایا ہے وہ یہی بتاتا ہے کہ تم نوین کو صرف پسند کرتے تھے۔ یاد کرو تھے تمہارے بھائی جھوٹ موٹ باتیں بنا کر اس سے شادی نہ کرتا تو تم دونوں کی دوریاں مزید بڑھتیں۔ لیکن اب اس کا کیا مطلب بنتا ہے؟ کہ تم اپنے بھائی سے قطع تعلق کر لو، یا پھر نوین احسن سے طلاق لے کر تم سے شادی کر لے اب جبکہ وہ تمہارے بھتیجیوں کی ماں بھی ہے۔“

”نہیں، میں یہ تو نہیں چاہتا۔“

”جب یہ نہیں چاہتے تو چپ کر کے بیٹھو اور اُسے بھول جاؤ۔“

”اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ احسن تمہاری والدہ کا زیادہ دلارا ہے تو تم مجھے ایک بات بتاؤ کہ تمہاری والدہ احسن کے لاڈ اٹھاتی تھیں یا وہ لاڈ اٹھواتا تھا؟“

”یہ کیسا سوال ہے بھلا؟ وہ لاڈ اٹھاتی تھیں تو وہ لاڈ اٹھواتا تھا۔“

”کیا تم نے کبھی ایسے لاڈ اٹھوانے کی کوشش کی؟“

”وہ..... میں..... یہ، کہ..... نہیں۔“ بالآخر سوچ نہیں پر آن ٹوٹی۔

”بس پھر یہ گلہ بھی بے کار ہے۔ قصور تو تمہارا اپنا

قبل کہ میں کوئی جواب دیتا۔ وہ خود ہی بول پڑی۔

”اگر تمہارا جواب ناں ہے تو پلیز جواب رنے دو۔ کبھی کبھی الفاظ اس قدر تکلیف دیتے ہیں۔ شاید تمہیں اندازہ نہ ہو۔“ آن کی آن میں کانسج سی بھوری آنکھیں نم ہو گئیں۔ اور میرا دل اٹھل پٹھل ہونے لگا۔

”رکوز ہرہ!“ زہرہ آنکھیں پونچھتی اٹھ کر جا رہی تھی جب میں نے ہاتھ پکڑ کر اُسے روکا تھا۔ اور پھر سے اپنے پاس بٹھایا تھا۔

”تم میری بیوی ہو.....“

”صرف بیوی ہوں۔“

”محسن ہو۔“

”صرف محسن ہوں؟“

”مجھے کچھ بولنے تو دو۔ کم از کم فقرہ تو سیدھا کرنے

وو۔“ زہرہ کے یوں درمیان میں بولنے پر میں قدرے جھلایا تھا۔

”اگر تم رابطہ مسلسل اور فاصلہ مسلسل کا تعلق رکھو گے تو میں درمیان میں ہی بولوں گی۔“ عموماً زہرہ اتنا نہیں بولتی تھی۔ مگر شاید..... یہ عام دن نہ تھا۔ میں کچھ لمحے زہرہ کو تکتا رہا۔

”اور میری محبوبہ بھی ہو۔“ زہرہ لمحہ بھر کو بت سی ساکن ہو گئی۔

”ہاں زہرہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ زہرہ ساکن سی مجھے دیکھتی رہی۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ بولتی۔ دو آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپکے تھے۔

”تحسین یہ فقرہ تم سے سننے کے لیے میں نے سالوں انتظار کیا ہے۔ وہ سال جو صدیوں سے طویل تھے۔“ زہرہ کے منہ سے الفاظ نہیں جذبات نکلے تھے اور میں اپنی جگہ پانی پانی ہو گیا۔

اور یوں ہم دونوں میں محبت کا جو رشتہ شروع ہوا تو وہ ساری زندگی پر محیط ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ شادی کے سالوں بعد جب میں بیت الخلاء تک جانے کے لیے محتاج ہو گیا تو زہرہ میری چھڑی بن گئی ہے۔ دعا کیجیے، خدا ہمارا ساتھ قائم و دائم رکھے۔ اور یہ دل اسی طرح آباد رہے۔

☆☆.....☆☆

ضرورت ہے۔

اور وہ گھر جہاں میری شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہاں خاموشی رائج کرنے لگی۔ موت یا زندگی کیسا عجب انتظار تھا۔

بالآخر ایک شخصیت آئی۔ وہ مکمل طور پر صحت مند تھی اور مجھے گردہ دے سکتی تھی۔ اس کا نام زہرہ تھا۔ اور ایک طویل آپریشن کے بعد زہرہ کا ایک گردہ مجھے منتقل کر دیا گیا۔ اور اس کے سال بعد میری زہرہ سے شادی ہو گئی۔ وہی زہرہ جو مجھ سے بے تحاشا محبت کرتی تھی، جو میرے لیے سا لہا سال انتظار کر سکتی تھی، جو مجھے زندگی عنایت کر سکتی تھی۔

”آپ سے ہی تو ہے میری زندگی، گردے کے انتقال کے معاملے میں بار بار کی منونیت مجھے بیزار کرتی ہے۔“ یہ زہرہ کے الفاظ تھے۔ زہرہ گردے کے انتقال کے بعد کبھی مکمل صحت مند تھی۔ لیکن Tissue Rejection سے بچنے کے لیے استعمال کی جانے والی وہاں میں مجھے جسانی طور پر کمزور کرتی جا رہی تھیں۔ پہلے میں جوڑوں کے درد میں مبتلا ہوا۔ بمشکل چھڑی کے سہارے چلتا۔ سال کے چھ مہینے تو مجھے چھاتی کا انجکشن رہتا اور وہ میری جی جان لے خدمت کرتی رہتی اور محبت لٹاتی رہتی۔

☆.....☆.....☆

”تھکائیں نہیں میری خدمت کر کے۔“ ایک دن میں نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔ زہرہ کسی کام میں اُلجھی ہوئی تھی۔ میری آواز سن کر اُس کے کام کرتے کرتے ہاتھ ہتھم گئے۔

”نہیں بالکل نہیں۔“ کام ادھورا چھوڑ کر وہ میرے پاس آ بیٹھی۔ اور اس انداز میں وہ میرے ساتھ آ کر بیٹھی تھی اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی کچھ کہنا چاہتی ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

”ایک بات تو بتاؤ تحسین۔“

”جی۔“

”کیا تمہیں اب بھی مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔“ اب میں یک ٹک اُس کا چہرہ دیکھے گیا۔ بھوری کانچ سی آنکھوں والی، زہرہ جو میری نصف بہتر تھی۔ اس سے

READING
Section

دوسری سچ بیانی

ہانڈی والی

صداقت کا پھول

اسکی ماں کے بچے سے ایک ماکرہ جرم کی سرپائے شخص کی کہانی، جس کی رہائی تک بڑی ہوئی تھی

پیسے لینے ہیں اگر انہوں نے مجھے آج نہ دیے اور جن کو میں نے دیئے ہیں۔ جاتے وقت انہوں نے مجھ سے مانگے اور میرے پاس نہ ہوئے تو مجھے بڑی شرمندگی ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”یوسف تم پریشان مت ہو۔ تم اللہ کو یاد کر کے کورٹ جاؤ۔ جن سے لینے ہیں میں لے لیتا ہوں اور جن کو دینے ہیں میں دے دیتا ہوں۔ اگر کوئی رہ بھی گیا تو جاتے ہوئے تم سے کوئی پیسوں کی بات نہیں کرے گا، میں ہوں نہ۔“

میں نے یوسف کو دعاؤں کے ساتھ کورٹ روانہ کیا۔ مجھے یوسف کی رہائی کی اتنی خوشی تھی کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا، پر اپنے تنہا ہونے کا احساس بھی تھا کیونکہ آج سے تین سال پہلے جب میں جیل میں آیا تھا تو بیرک میں اکیلا بیٹھا تھا، کھانے کا وقت ہوا تو سب لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ میں الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ اچانک مجھے آواز آئی۔

”اوائے ادھر آ۔“ میں نے دیکھا سامنے ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس نے کہا کہ ”ادھر آ۔“
مجھے چھ لڑکوں کے ٹولے میں جا کر بٹھایا اور کہا ”کھانا کھاؤ۔“ میں بھی کھانا کھانے لگ گیا۔

میں اپنی بیرک میں بیٹھا کام میں مصروف تھا، پر میری نظریں ہمارے سرکل کے گیٹ پر تھیں۔ آج میرا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا کیونکہ یوسف آج ملیر کورٹ تاریخ پر گیا تھا۔ مجھے بڑی بے چینی سے یوسف کا انتظار تھا۔ آج کورٹ میں یوسف کا فیصلہ تھا کیس کا۔ میرے علاوہ سارے دوستوں کو بھی یوسف کا انتظار تھا کیونکہ آج یوسف نے رہا ہونا تھا۔ جب بھی کسی قیدی کی رہائی کا پتا چلتا تو ہم سب بڑے خوش ہوتے، خاص کر جب کوئی ایسا قیدی جو دوست ہو یا پھر ہانڈی والی (ہانڈی والا کا مطلب جیسے 10 یا 12 یا 6 قیدی آپس میں ایک دسترخوان پر اپنا کھانا ملا کر ساتھ کھائیں تو یہ آپس میں سارے ہانڈی والی ہوتے ہیں)۔ یوسف تو میرا بہت اچھا دوست اور پھر ہانڈی والا بھی تھا۔ صبح ہتھکڑی لگنے سے پہلے جب جیل سے مجرم کو پولیس والے ہتھکڑیاں لگا کر عدالت لے جاتے ہیں اس سے پہلے یوسف میرے ساتھ بیٹھا کہہ رہا تھا۔

”افتخار بھائی! آج میں چلا جاؤں گا۔ یہ پرچی رکھ لو، کچھ لڑکوں سے پیسے لینے ہیں اور کچھ کو دینے ہیں، سب اس میں لکھا ہوا ہے۔ افتخار بھائی جن سے

نہیں کرتا تھا۔ سارے ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہم سب کی ملاقات آتی تھی، کھانا، تیل، صابن، سرف، پیسے اور دیگر ضرورت کی چیزیں سب آتی تھیں۔ میں نے محسوس کیا ہماری ہانڈی میں جب کسی کے گھر کا کھانا آتا ہے یوسف کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ کھاتا نہیں ہے اور جو کھانا جیل کی طرف سے بنتا ہے، وہ کھانا وہ ہمارے ساتھ کھاتا ہے اور یوسف کی ملاقات بھی نہیں آتی۔ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں کبھی کسی سے نہیں لیتا، حتیٰ کہ اپنے ہانڈی والوں سے بھی نہیں۔

اس بات پر ہم تھوڑا پریشان ہوتے تھے۔ میں نے وحید سے پوچھا۔
”وحید..... یوسف کو کتنا عرصہ ہو گیا جیل میں۔“
وحید نے بتایا سات ماہ..... یعنی وہ مجھ سے چھ ماہ پہلے آیا اور مجھے ابھی ایک مہینہ ہوا تھا۔
ایک دن ہم نے یوسف کو بٹھا کر سمجھایا کہ بھائی جب ایک ہانڈی وال کی ملاقات آتی ہے جو سامان

انہوں نے مجھے کہا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“
میں نے کہا۔ ”افتخار بھٹی۔“
انہوں نے کہا۔ ”بات سن، ملاقات وغیرہ آئے گی تیری۔“
میں نے کہا۔ ”ہاں آئے گی۔“ تو وہ بولا۔
”اچھا ٹھیک ہے، ہم چھ ہانڈی وال ہیں۔ تمہیں ملا کر سات ہو گئے۔ اب تمہارا کھانا کھانا، اٹھنا بیٹھنا، سونا سب ہمارے ساتھ، یعنی ہانڈی والوں کے ساتھ۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“
آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہماری ہانڈی میں باقی ہانڈیوں کی نسبت اچھے اور کچھے ہوئے لڑکے تھے۔ اگر کسی کی ملاقات آتی، گھر سے کھانا آتا تو سب مل کر کھاتے، مل کر ایک دوسرے کے کپڑے دھونا، ایک دوسرے کی دیگر ضروریات پوری کرنا اور ہماری ہانڈی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہماری ہانڈی میں سے کوئی شخص نشہ



READING
Section

کرنے لگا۔ وقت گزر رہا تھا۔ جیل کا وقت دکھ سکھ ہم ساتھ سہہ رہے تھے۔ یوسف پر سب سے مشکل وقت وہ آیا جب اطلاع ملی کہ یوسف کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے علاوہ کئی مشکلات اور بھی آئیں مگر ہم سہتے گئے۔

☆.....☆.....☆

قید کا وقت گزر رہا تھا۔ ہماری بیرک میں ایک عالم نام کا آدمی بھی تھا۔ اُس کے گھر سے جب بھی کھانا وغیرہ آتا تھا وہ مجھے اور یوسف کو لازمی دیتا تھا۔ اس کی عمر 60 سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے اچھے اخلاق کو دیکھ کر یوسف اس کے کپڑے دھو دیتا، بستر وغیرہ صاف کر دیتا، اُس کو پانی وغیرہ بھر دیتا۔ یوسف ہر طرح سے عالم چاچو کی خدمت کرنے لگا تھا۔ عالم چاچو ہمیں بٹھا کر اکثر بولتے۔

”بیٹا میں تو بوڑھا ہوں، پر آپ لوگوں کو اللہ جلدی رہائی دے۔“

میں نے کہا۔ ”عالم بابا اللہ آپ کو جلدی جیل سے نکالے۔ آپ اگر نکل جاؤ۔ تو یوسف کے لیے کوئی بھاگ دوڑ لازمی کرنا اس کو نکالنے کی۔“

انہوں نے کہا کہ ”میں ضرور کروں گا۔“

کچھ عرصے بعد عالم بابا رہا ہو گئے۔ میرا اور یوسف کا کورٹ ایک ساتھ تھا۔ کورٹ میں عالم بابا پہلے سے موجود تھا جسے دیکھ کر ہم بہت حیران تھے۔ ہمارے ساتھ رہنے والے ہزاروں لوگ رہا ہوئے پر آج تک کوئی نہیں آیا تھا۔ عالم بابا کو دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا خیر ہم لوگ بیٹھ گئے۔

عالم بابا نے بتایا کہ یوسف تمہارے ویسے ہوئے ایڈریس پر میں گیا تھا کورنگی سو کوارٹرز، تمہارے بہنوئی سے بات ہوئی وہاں۔ اُس نے کچھ خاص رسپانس نہیں دیا۔ آج تمہاری تاریخ ہے، آج اُس نے کورٹ میں آنے کا کہا ہے کہ آج آئے گا۔“

سارا دن ہمارا کورٹ میں گزرا مگر یوسف کا بہنوئی نہیں آیا۔ تین بجے ہم جیل آنے لگے تو یوسف کے چہرے پر مایوسیاں تھیں کہ اتنے عرصے بعد کسی کو اپنے بہنوئی کے گھر بھیجا پر وہاں سے کوئی ہمدردی نہیں

آتا ہے سب کا حق ہوتا ہے تو کیوں نہیں کھاتا۔“ یوسف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمیں کبھی غصہ آتا اور کبھی ترس۔

پھر ایک دن تنہائی میں یوسف کو میں نے بٹھایا اور کہا کہ یوسف تم ہم سے کیوں دور دور بھاگتے ہو۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کیوں نہیں کھاتے۔“ یوسف نے جواب دیا۔

”انتظار بھائی آپ سب کے گھر سے کچھ نہ کچھ آتا ہے پر میرے گھر سے کوئی ملنے تک نہیں آتا۔ کل کسی ہانڈی وال نے کہہ دیا کہ یوسف ہمارے گھر والے آتے ہیں، سامان لاتے ہیں، پر تمہارے گھر سے کچھ نہیں آتا۔ تم ہمارے گھر کا کھاتے ہو پر اپنے گھر سے کچھ منگواتے نہیں تو میں کیا جواب دوں گا یار! اس لیے میں کسی کا کچھ نہیں کھاتا۔“

یوسف کے الفاظ میرے دل کو لگے۔ یوسف کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اُس کی خوداری اچھی بھی لگی۔ ہمارے بار بار سمجھانے اور ہمارے پیار نے یوسف کو ہمارے قریب کر دیا اب وہ ہمارے ساتھ کھانا کھاتا بھی تھا۔ کپ شپ بھی کرتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”یوسف تمہارا کیس کیا ہے؟“

”یوسف نے بتایا 302 یعنی قتل کا کیس۔“

یہ سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ اتنا بڑا کیس، دوسرا نہ کوئی وکیل، نہ گھر والوں کا ساتھ..... یوسف نکل پائے گا جیل سے؟ یہ سوچ سوچ کر میں پریشان ہوتا۔

☆.....☆.....☆

خیر ہماری ہانڈی سے آہستہ آہستہ سب رہا ہوتے چلے گئے۔ پہلے وحید پھر سونا خان پھر عامر، غوث اللہ باقی میں، یوسف اور جمالی بچ گئے۔ نئے ہانڈی وال مل گئے۔ سب نے ہانڈی کا بڑا مجھے بنا دیا۔ جمالی کو ہانڈی سے نکال دیا۔ یوسف اب میرے گھر سے آئی ہر چیز کو اپنا سمجھتا تھا۔ میں کورٹ جاتا۔ یوسف سامان لکھ کر دیتا، میں سارا لے آتا۔ اب یہ پیری بڑے بھسائیوں سے بھی زیادہ عزت

سپاہی نے فوراً ان کو بلا دیا۔ عالم بابا کی نظر جیسے ہی ہم پر پڑی۔ وہ بھی اور ساتھ والا آدمی بھی تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آ گیا۔

دونوں ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ یوسف کا مدعی خود ہی کہنا شروع ہو گیا۔

”یوسف عالم بابا میرے پاس آیا۔ مجھے کہا یوسف کو جیل میں چار سال ہو گئے ہیں۔ تم اسے اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دو۔ میں جیل میں یوسف کے ساتھ رہ کر آیا ہوں۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ باقی مالی مدد جتنی ہو سکی میں کروں گا تمہاری۔ اور یوسف باہر آ کر تمہاری خدمت کرے گا۔ یوسف میں تمہیں اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دوں گا۔ عدالت میں تمہارے حق میں بیان دوں گا کیونکہ تم بے گناہ ہو۔ پر تم اپنے گھر سے کسی کو میرے پاس بھیجوں تاکہ میں کسی کو خاندان میں بتا سکوں کہ اس کے گھر والے آئے تھے۔ معافی مانگی تو میں نے معاف کر دیا۔“

یوسف نے کہا میرے والدین فوت ہو گئے ہیں۔ میری بہن اور بہنوئی ہے میں آپ کے گھر ان کو بھیجوں گا۔“

یوسف نے اپنی بہن کو فون کیا۔ بہاری صورت حال بتائی۔

یوسف کی بہن نے کہا۔ ”میں اور تیرا بہنوئی دو سے تین دن میں مدعی کے گھر جائیں گے اور ان سے صلح کر آئیں گے۔“ یہ سننا تھا یوسف کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

یوسف کی بہن نے یوسف سے وعدہ کر لیا کہ اگلی تاریخ پر تمہارے بہنوئی کو مٹھائی سمیت کورٹ بھیجوں گی۔ مدعی اگر کہہ رہا ہے تمہارے گھر والے آئیں تو میں تمہارے حق میں بیان دے دوں گا۔ تو ہم ضرور جائیں گے۔“

یوسف تو خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا۔ اگلی تاریخ لے کر ہم جیل آ گئے۔

یوسف نے کسی سے کاٹیکٹ نمبر لیے کسی کو دیے خوش ہو کر سب کو بتاتا پھر رہا تھا کہ میں رہا ہونے والا

کورٹ کی سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے یوسف نے مجھے بتایا کہ افتخار بھائی عالم بابا مجھے پیسے دے رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں اپنے لیے کوئی وکیل کر لو۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ سے پوچھوں کہ لوں یا نہ لوں۔“

میں نے کہا ”کتنے پیسے دے رہے ہیں؟“

یوسف نے بتایا۔ ”15 ہزار تک ہیں۔“

میں نے کہا کہ یوسف عالم بابا سے کہو کہ پیسے آپ اپنے پاس رکھو اور آپ خود میرے لیے کوئی وکیل کرو۔“

یوسف نے عالم بابا کو ایسے ہی کہا پیسے اگر آپ سے لے کر میں جیل جاتا ہوں تو خرچ ہو جائیں گے۔ پیسے اپنے پاس رکھو اور آپ خود میرے لیے کوئی وکیل ڈھونڈ لو۔“

عالم بابا نے یوسف سے پوچھا کہ بیٹا تمہارا مدعی کہاں رہتا ہے۔“

یوسف نے کہا کہ وہ بھی کورنگی سو کوارٹرز میں رہتا ہے۔“

عالم بابا نے اس کے مدعی کا نام اور ایڈریس پوچھا اور اگلی تاریخ پر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

اگلی تاریخ میں نے اور یوسف نے ساتھ ہی لی۔ میں نے اپنی تاریخ اس لیے ساتھ لی کیونکہ عالم بابا نے اگلی تاریخ پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلی تاریخ پر جب ہم کورٹ کے سامنے جا کر بیٹھے۔ ہماری نظریں عالم بابا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اچانک یوسف نے مجھے بتایا کہ افتخار بھائی وہ دیکھو عالم بابا۔“ عالم بابا کے ساتھ ایک بندہ اور بھی تھا۔ اُس کو دیکھتے ہوئے یوسف نے کہا۔

”افتخار بھائی عالم بابا کے ساتھ جو بندہ آپ دیکھ رہے ہو یہ میرا مدعی ہے۔ یہ عالم بابا کے ساتھ کیسے ہے؟“

میں نے کہا کہ پریشان نہیں ہو۔“ اور پھر میں نے سپاہی کو کہا کہ وہ بابا جی کھڑے ہیں ذرا ان کو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

یوسف کی تاریخ کے یہ چودہ دن تو جیسے یوسف کے لیے لے لے ہو گئے تھے۔ اللہ اللہ کر کے چودہ دن پورے ہوئے۔ صبح جوڑی کے لیے سیٹی بجی میری آنکھ کھلی میں نے دیکھا یوسف بستر پر نہیں تھا۔ میں فوراً اٹھ بیٹا میری نظر کونے پر پڑی دیکھا تو یوسف جائے نماز پر بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔

ہم لوگ فوراً اٹھے، جوڑی دی۔ یوسف نے اپنے کپڑے نکالے، مجھے کپڑے دیے۔ ہم دونوں نے کورٹ جانے کی تیاری کر لی۔

صبح دس بجے ہم کورٹ میں تھے۔ جلد ہی عالم بابا اور یوسف کا مدعی بھی آگئے۔ یوسف عالم بابا کے ساتھ اپنے بہن بہنوں کو نہ پا کر پریشان ہو گیا۔ عالم بابا بھی کچھ پریشان سے تھے۔

عالم بابا نے بتایا۔ ”بیٹا میں نے کئی بار تمہارے بہنوں سے رابطہ کیا پر وہ میرے پاس نہیں آیا۔ میں ان کے گھر گیا پھر بھی اس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔“ یہ سن کر تو لگا یوسف کا دل کسی نے سینے سے نکال کے کچل دیا ہو۔ پریشانی کے باعث یوسف کو پسینہ آ گیا۔ یوسف کے مدعی کو میں نے ہٹھایا اور کہا۔

”بھائی آپ اللہ کی رضا کے لیے اس کو معاف کر رہے ہو تو کسی اور کو مت بلاؤ۔ انسان کا احساس کرتے ہیں۔ اس کے والدین تو فوت ہو گئے ہیں اب کس کو اس کا احساس ہوگا۔ جیل میں ہم بہت تکلیف میں رہتے ہیں۔ اس کا اب بہن کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اب وہ بھی ساتھ نہیں دے رہی ہے تو آپ اس پر احسان کرو۔“

عالم بابا نے کہا کہ سمجھو میں یوسف کا باپ ہوں۔ میں چل کر آیا ہوں آپ کے پاس، میں معافی مانگتا ہوں۔“ الغرض میں نے اور عالم بابا نے اسے بہت سمجھایا۔ کورٹ کا ٹائم ختم ہو گیا اور ہم پھر جیل آگئے۔

اگلے چودہ دن یوسف پھر بہت پریشان رہا۔ اگلی تاریخ پر یوسف اکیلا کورٹ گیا۔ یوسف کورٹ سے واپس آیا تو میں نے کہا کہ یوسف بتاؤ تمہارے گھر

سے کوئی آیا یا عالم بابا۔“ یوسف نے بس اتنا کہا کہ یار بھوک لگی ہے۔ پہلے کھانا کھانے دو۔“

یوسف نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد کہا۔ ”افتخار بھائی عالم بابا آیا تھا۔ مدعی بھی آیا تھا۔ خوشخبری یہ ہے کہ عالم بابا نے اسے میرے حق میں بیان دینے پر راضی کر لیا ہے۔ اگلی تاریخ پر وہ میرے حق میں بیان دے دے گا۔“

یہ سنتے ہی ہماری خوبی کی انتہا نہ رہی۔ ہم مل کر عالم بابا کو دعائیں دینے لگے۔

اگلی تاریخ میں کورٹ گیا تو وہی تاریخ لے آیا جو یوسف کی تھی۔ ہم دونوں اگلی تاریخ پر ساتھ کورٹ پہنچ گئے۔ عالم بابا مدعی کو لے کر آ گیا۔ انہوں نے کسی دلیل سے بات کی ہوئی تھی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وکیل آ گیا۔ فٹنٹ بیان ہونے لگے مدعی نے اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے کہا کہ حج صاحب مرنے والا میرا بھائی تھا۔ میں یوسف کو اللہ کی رضا کے لیے معاف کرتا ہوں اور عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ یوسف کو رہا کر دیا جائے۔

جب ہم عدالت سے باہر نکلے تو سب یوسف کو مبارکباد دینے لگے کیونکہ قتل کے کیس میں اگر مدعی معاف کر دے تو عدالت اس ملزم کو چھوڑ دیتی ہے۔ ہم اگلی تاریخ لے کر خوشی خوشی جیل آ گئے۔ یوسف کو اب جیل قید خانہ نہیں لگ رہی تھی۔ وہ ہر وقت سوچوں میں باہر کی دنیا میں جی رہا ہوتا۔

خیر اللہ اللہ کر کے تاریخ آگئی۔ سب دوستوں سے مل کر ہم کورٹ جانے لگے سب کہنے لگے۔

”یوسف بھائی آج تو رہائی کا لیٹر لے کر آنا۔ یوسف نے کہا۔

”انشاء اللہ لے کر آؤں گا۔“

کورٹ پہنچے عدالت میں حاضری کا وقت آیا۔ مجھے اور یوسف کو ساتھ ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ عدالت گئے عدالت نے کہا آج اخبار میں اشتہار دینا ہوگا کہ فلاں کیس میں فلاں کا قتل ہوا۔ مدعی جو اس کا بھائی تھا

گیا۔ جاتے ہی کہا۔
 ”یوسف مبارک ہو۔“ یوسف نے کوئی جواب
 نہیں دیا۔

میں نے کہا۔ ”یوسف خیریت تو ہے۔ چپ
 کیوں ہو۔“ یوسف کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے
 اور کہا۔

”افتخار بھائی میرا دل پھٹ رہا ہے۔ میری
 ساری امیدیں ٹوٹ گئی ہیں۔ میرا کیا بنے گا۔“
 میں نے کہا کہ یوسف بات کیا ہے۔ مجھے بتاؤ تو
 سہی۔“

یوسف بولا ”افتخار بھائی حج نے کہا یہ جو مدعی ہے
 یہ مرنے والے کا سگا بھائی نہیں ہے اس لیے عدالت
 اس کے معاف کرنے سے تمہیں نہیں چھوڑے گی۔
 جب تک مرنے والے کے ماں باپ یا سگا بھائی نہ
 ہو۔ کیا مدعی عدالت میں کہتا رہا کہ اس نے مرنے
 والے کو بچپن سے میں نے پالا ہے۔ اس کے والدین
 فوت ہو گئے ہیں اور اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ اس کا
 سب کچھ میں ہی تھا۔ پر حج نے کہا نہیں۔ تمہارا معاف
 کرنا قابل قبول نہیں۔“

آج شام جیل میں ہم پر قیامت بن کر آئی۔ آج
 یوسف کو ایسا لگ رہا تھا جیسے آج اس کا سب کچھ چھین
 کر کسی نے اسے جیل میں بند کر دیا ہو۔ اور آج جیل
 میں اس کا پہلا دن ہو۔ آج یوسف بہت ٹوٹ گیا
 تھا۔ پر مجھے امید ہے کہ جلد ہی اللہ پاک یوسف کی
 رہائی کا کوئی آسان راستہ بنا دے گا۔

ساتھیو! قانون تو انسان نے بنائے ہیں۔ اللہ کا
 قانون، اللہ کی کتاب میں درج ہے۔ یوسف کی طرح
 کتنے ہی بے گناہ اسی طرح سزائیں کاٹتے رہیں گے۔
 ہمارے قوانین میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ قانون کی
 آنکھوں پر بندھی کالی پٹی کب اترے گی؟ کب
 انصاف ہوگا۔ کب تک بے گناہ، گناہ گار بنے
 سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگیاں بخر کرتے رہیں گے۔
 ”آپ سب میرے دوست میرے ہانڈی وال
 یوسف کے لیے دعا کریں میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

☆☆.....☆☆

اس نے معاف کر دیا ہے۔ اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ
 سات یوم کے اندر عدالت سے رجوع کرے۔“
 عالم بابا نے فوراً تین ہزار روپے اخبار میں
 اشتہار کی بیس وکیل کو دی اور وکیل کو ہدایت کی کہ وکیل
 صاحب یہ اشتہار آج ہی اخبار میں دے دو۔ وکیل
 نے کہا ٹھیک ہے ہم واپس جیل آ گئے۔

دس دن کی تاریخ تھی۔ یوسف نے ایک سوٹ
 الگ کیا اور کہا۔ یہ رہائی والے دن پہن کر جاؤں گا۔“
 باقی کچھ کپڑے غریب قیدیوں میں بانٹ دیے جو
 سامان وغیرہ تھا وہ بھی بانٹ دیا۔

دس دن بعد آج یوسف پھر کورٹ گیا۔ شام میں
 ہم سب نے آتے ہی پوچھا۔

”یوسف آج تو پکارا ہا ہور ہے ہونا۔“
 یوسف نے کہا کہ نہیں یارا اگلی تاریخ دی ہے پانچ
 دن کی۔ اس پر عدالت چھوڑ دے گی۔“

”کیا وکیل نے اخبار عدالت میں پیش کیا اور کہا
 حج صاحب اخبار میں اشتہار دے دیا ہے۔ سات دن
 سے اوپر ہو گئے ہیں کسی نے اعتراض جمع نہیں کرایا۔
 عدالت اب یوسف کو رہا کر دے۔ حج صاحب نے 5
 دن بعد کی تاریخ دی ہے۔ اور کہا ہے کہ اس پیشی میں
 فیصلہ دے دوں گا۔ اب میں یہاں پانچ دن کا مہمان
 ہوں۔ پانچ دن بعد چلا جاؤں گا۔“

اب ہم رات دن ہنس کھیل کر گزارنے لگے۔ اللہ
 کی مہربانی سے پانچ دن اور گزر گئے۔ یوسف آج پھر
 کورٹ گیا اور میری نظر سرکل کے گیٹ کی طرف تھی۔

☆☆.....☆☆

آج یوسف نے رہا ہونا تھا ساڑھے تین سال
 جیل میں ساتھ دکھ سکھ کاٹے۔ اس کی رہائی کی خوشی جو
 مجھے تھی شاید ہی کسی اور کو ہو۔ ساڑھے تین سال ایک
 پلیٹ میں کھایا، وہ بھی جیل میں۔ اس کی اہمیت جیل
 کاٹنے والا ہی جانے۔ میں نے وقار سے پوچھا۔

”یار کورٹ کی گاڑی نہیں آئی کیا؟“

وقار نے بتایا کہ آگئی ہے۔ میں نے یوسف کا
 پوچھا تو وہ بولا کہ وہ بیرک میں ہے۔“

میں نے رجسٹر بند کیا اور بھاگتا ہوا بیرک میں

READING
 Section

مئی مئی

رفیقہ سچ احمد

امریکہ میں مقیم اس ماں کی کہانی جس نے ایک معصوم کی زندگی بچا کر اپنی خوشیاں حاصل کر لیں

میں کھوٹ نہ ہو تو آدمی کام آج سے شروع کرتا ہے نہ کہ کل سے اور چھوٹے موٹے بہانے تلاش نہیں کرتا۔ میں نے کہا۔ چلو آج سے ہی ابھی اتنی روشنی ہے کہ اپارٹمنٹ کا ایک چکر لگایا جاسکے۔

”بسم اللہ۔“ دل نے خوش ہو کر کہا۔ ”چلو احتیاطاً بڑوسن سے بھی پوچھ لیں کہ اکثر ساتھ ٹہلنے جانے کا ذکر کرتی ہے۔“

بڑوسن کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجائی اور ساتھ چلنے کو کہا تو جواب ملا۔ ”آج نہیں آج میرے پاس کپتھی ہے۔“ مطلب یہ کہ کوئی بیٹھا ہے۔ میں نیچے اتری۔

بادلوں کے ٹکڑے سفق کے رنگ میں گھل کر افق پر پھلتے جا رہے تھے اور اندھیرا نہیں نکلنے کی کوشش میں تھا۔ بارکنگ لائٹ میں گاڑیوں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ صبح کے گئے قریب قریب سارے ہی چمچی گھولسوں میں آگے تھے۔ اس وقت کچھ زیادہ ہی سناٹا ہو جاتا تھا۔ بچے کھیل کھال کر گھروں میں چلے جاتے تھے۔ دفتروں سے لوٹ کر آنے والے اور آنے والیاں لی وی کے پروگرام اور کھانے کے انتظام میں مشغول ہو جاتے تھے۔

اس کپلیکس میں کئی عمارتیں تھیں۔ سب کا

میرے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔ ’بھاگو بھاگو یہ تمہارے بس کاروگ نہیں ہے تم تنہا سے نہیں جھیل سکتیں تم کمزور ہو اور یہ بڑا جھمیلا ہے۔‘ میرا دل للکار رہا تھا۔ بڑا ہویا چھوٹا اب صرف تم یہاں ہو اور کہیں ہی جھیلنا ہے اسے سیمیں لی بی! کمزور ہونے کے بہت مواقع آئیں گے۔ گھر میں چوہیا نکل آئے تو پائے وائے کر لینا۔ یہ بہادر بننے کا وقت ہے۔ ایک زندگی کا سوال ہے۔ تم نے اس بچے کی آواز اپنے کانوں سے سنی ہے اگر وہ بند ہوگئی تو کیا تم زندگی بھر خود کو معاف کر سکوگی؟ دل سے دو بہ دو تو ہوتی رہتی تھی مگر ایسا نازک وقت اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔

اچھا صرف ایک منٹ اسے آکسیجن مل جائے اس کے بعد میری ذمے داری نہیں۔

کبھی کبھی کوئی کھینچ کر مجھے ایسی جگہ لے جاتا ہے جہاں جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ دل سے دو بہ دو اس بات پر بھی ہوتی میں نے کہا کہ کل سے باقاعدہ چہل قدمی شروع ہوگی آج تو اندھیرا ہو چلا ہے۔ دل نے کہا کہ بزرگوں نے کہا ہے کل کبھی نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ ارادہ مضبوط ہو اور من میں کھوٹ نہ ہو تو کل ہمیشہ ہے۔ دل نے کہا کہ ارادہ مضبوط ہو اور دل

آ رہی ہے۔ کوٹھڑی برابر ڈسٹر سے باہر نکالنا میرے بس میں نہیں ہوگا یا نہیں، یہ بعد کی بات ہے، دیکھ تو لوں۔

ڈسٹر کے پاس پہنچی تو آواز بند ہو چکی تھی۔ اونچے ڈسٹر میں اچک کر جھانک کر دیکھا، بلی نہیں تھی۔ دفعتاً نحیف سی آواز پھر آئی۔ یہ وہاں پڑے بڑے بڑے کالے تھیلوں میں سے ایک تھیلے سے آئی تھی، تو کیا بلی تھیلے میں بند ہے؟

تب ہی دل نے کہا۔ 'بچی کیوں بن رہی ہو، یہ کسی نوزائیدہ بچے کی آواز ہے۔'
دوبارہ کان لگا کر سنا، دل ٹھیک کہہ رہا تھا، کسی

طرز تعمیر ایک تھا۔ آگے سب کے لان تھے پیچھے کار پارکنگ اور ہر دو عمارتوں کے درمیان ایک بڑا سا ڈسٹریا کوڑا گھر جس میں دو عمارتوں کا سارا کوڑا ایک بنتے تک سایا رہے۔ ہمارا کپلیکس آخری تھا، اس لیے حد بندی کے لیے خاردار تار تھی اور اس کے آگے جنگل۔

ہلکی سی آواز، بہت ہلکی کوڑے گھر کے پاس شاید بلی کی۔ گاؤں ہی تو تھا، کھلی ہوئی بلیاں جو شہروں میں نظر نہیں آتیں یہاں دکھائی دے جاتی تھیں۔ اپنے ملک میں کوڑے کے آس پاس بلی عجوبہ نہیں مگر امریکا میں جہاں انہیں بلور کے برتنوں میں کٹا ہوا قیرہ وٹامن



Downloaded From
Paksociety.com

نوزائیدہ بچے کی آواز تھیلے کے اندر سے آ رہی تھی، کھٹی کھٹی، اگر اسے فوراً نہ نکالا گیا تو آکسیجن کی کمی سے مر جائے گا غریب۔ میرے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔ 'بھاگو، بھاگو، کس مصیبت میں پڑ رہی ہو؟' اور دل کہہ رہا تھا۔ 'ایک زندگی کا سوال ہے، بچہ مر گیا تو ساری زندگی خود کو کیا منہ دکھاؤ گی؟'

ملے گوشت اور کھیلنے کے لیے پلاسٹک کے چوہے اور ہڈیاں فراہم کی جاتی ہیں، وہ کوڑا گھر میں کیوں جھانکیں؟ یہ سوچتی ہوئی آگے بڑھی کہ واقعی کوئی آفت کا مارا بلی کا بچہ پھنس گیا ہے تو اس کی مدد کروں۔ دوسری آواز..... 'می می۔' بالکل میاؤں بھی نہیں تھیں، یقین ضرور ہوا کہ آواز ڈسٹر کے اندر سے

خیالات کی یلغار۔ بچے کو نکالوں پولیس کو اطلاع دوں کسی کو مدد کے لیے بلاؤں؟

اندھا دھند نزدیک ترین کسپلیکس اپارٹمنٹ کی طرف بھاگی اندر داخل ہوئی تو کسپلیکس کا اندر جانے والا دروازہ مقفل تھا۔ ڈاک کے ڈبوں پر رہنے والوں کے نام لکھے تھے اور ہر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے کے لیے الگ گھنٹی کا بٹن تھا۔ میں ان اپارٹمنٹس میں کسی کو نہیں جانتی تھی یوں ہی بٹن دبایا اور کسی کے آنے کی امید نہیں ہے تو دروازہ نہیں کھلے گا پھر بھی موہوم سی امید میں جلدی جلدی سارے بٹن دبائے مگر دروازہ نہیں کھلا۔ کچھ دن پہلے لوگ کھول بھی دیتے تھے مگر جب سے ایک شرابی نے یہ وتیرہ اپنایا تھا کہ اپنے اپارٹمنٹ میں جانے کے لیے کسی بھی گھر کا بٹن دبا کر اندر داخل ہو جاتا تھا اور پھر نشے میں جس گھر کو اپنا گھر سمجھتا تھا وہاں گھنٹیاں بجا کر لوگوں کا ناطقہ بند کر دیتا تھا۔ اگر وہ صحیح عمارت میں پہنچ کر صحیح جگہ کی گھنٹی بھی بجاتا تو دروازہ نہ کھلتا کہ اس کی دھرم پتی نے طلاق کے مقدمے کے ساتھ شوہر سے تحفظ کا پروانہ بھی لے رکھا تھا۔ وہ نیک بخت پولیس کو بلا لیتی اور رات کو پولیس اسٹیشن اس کا ٹھکانہ ہوتا۔ چنانچہ اب کوئی دروازہ نہیں کھولتا یہ بات یاد آتے ہی میں پھر باہر بھاگی۔ دفتر میں تو اس وقت کوئی ہوگا نہیں گھر سے فون کروں تو تین منزل چڑھ کر فون کرنے تک اس گھنٹی کھٹی آواز پر کیا گزرے گی؟

”آخری فیصلہ بچے کو خود نکالنا کوئی قانونی اڑچن تو نہ ہوگی؟ بلا سے ہو کوڑے کے ڈھیر سے پھول سے بچے کو نکال سکوگی کبھی پہلے یہ کام کیا ہے؟ جس نے ڈالا ہے اس نے دیکھ لیا تو ٹینٹو ادا دے گا اور پولیس کہیں یہ نہ کہے کہ تم نے اغوا کیا اور مارا؟“

’چپ‘ چپ‘ یہ بولنے کا وقت نہیں کام کا وقت ہے۔ دیکھو میرے ہاتھ پہلے ہی کانپ رہے ہیں ہونٹ موٹے ہو گئے ہیں زبان بھاری ہو گئی ہے بس اب نہ بولنا۔ اپنے اندر اٹھنے والی آوازوں کو چپ کرانا بھی بڑا کام تھا۔ میں نے تھیلے ٹولے آواز پھر بند ہو گئی تھی۔

’بھاگو بھاگو بچہ مر چکا ہے۔‘

’چپ‘ چپ‘ آواز آرہی ہے ہلکی ہو گئی ہے۔

’جب تک نکالو گی مر ہی جائے گا۔‘

”می..... می..... می.....“ آواز آخری تھیلے سے آرہی تھی جیسے تیسے کھینچ کر نکالا۔ خاصا بھاری تھا کمر نے احتجاج کیا مختلف اعضا مختلف اوقات میں احتجاج کرتے رہے۔ کم بخت یہ بھی نہیں دیکھتے کہ ایمر نخسی ہے باغیانہ ذہنیت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ جانک کی روشنی اتنی ہلکی تھی جیسے کسی ٹارچ کے سیل ختم ہو گئے ہوں اور پہلی روشنی آخری ہچکیاں لے رہی ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے تھیلے میں لگی گرہ کھولنے کی کوشش کی نہیں کھلتی کم بخت تھیلے کو پھاڑنے کی کوشش کی۔

”می..... می.....“ جیسے کوئی ہمت بندھا رہا ہو مگر گھنٹیازدہ کلائی اور انگلیاں احتجاج کرنے لگیں۔ ’میں کم بخت میں تو کھول کر دم لوں گی۔‘ میں پھر گرہ کھولنے لگی۔ اتنی دیر میں نظر آیا کہ تھیلا کئی جگہ سے تھوڑا تھوڑا اکٹھا ہوا ہے وہاں سے پھاڑنے میں یقیناً آسانی ہوگی۔

اندھیرا اب نیچے اتر آیا تھا شفق کے رنگ اندھیرے میں ڈوب گئے تھے خاردار تار کھبے اور عمارتوں کے ٹیڑھے میڑھے سائے ماحول کو پراسرار بنا رہے تھے کہ اتنے میں ایک سیاہ میری طرف بڑھا۔ میں ڈر کر چیخ مارنے والی تھی کہ آواز آئی۔

”امی.....!“ بیٹا میری تلاش میں نکلا تھا۔

’فرمان‘ جلدی آؤ ڈمسٹر کے پاس جلدی۔“

فرمان بھاگتا ہوا آیا۔ ”یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہی احتجاج اب بیٹے کی طرف سے۔

”دیکھو اس تھیلے میں کوئی بچہ ہے میں اسے نکال رہی ہوں۔“

”خدا کے لیے آپ نہ نکالے۔“ جیسے وہ رونے والا ہو۔

”کیوں کیوں نہ نکالوں؟“

”پولیس کو فون کیجیے۔“

”تم کر دو مجھے کوشش کرنے دو، ورنہ وہ مر جائے“

پڑتی زینے سے اتر کر نیچے بھاگی مگر جب تک وہ ننھا پھول سا بچہ ختم ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ مردوں اور لڑکوں کی بھیڑ لگ گئی، کچھ عورتیں گھروں کے دروازوں سے جھانک کر صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک بڑے میاں نے پہلے مجھے غور سے دیکھا پھر نہایت حشمتی سے بولے۔

”بی بی! آپ کا یہاں کیا کام ہے؟ آپ گھر جائیے۔“

میں اوپر سے آن کر دیکھتی رہی، بچہ وہیں پڑا تھا۔ بھیڑ بڑھ رہی تھی، لوگ ایک دوسرے کو اخکامات دے رہے تھے۔

”پولیس اب تک نہیں آئی، تم جاؤ میاں، جا کر دوبارہ کہو۔“

”قبلہ آپ ذرا اپنے گھر سے فون کر دیں۔“

”ارے سامنے والی دکان پر چلے جاؤ وہاں پر فون ہے۔“ کوئی سن رہا تھا، کوئی نہیں سن رہا تھا اور میں کھڑکی میں کھڑی کانپ رہی تھی۔

”یا اللہ..... ایک انسانی جان کی یہ قدر؟ اور اسے مارنے کے بعد یہ فضیلتا؟“

فرمان اب تک نہیں لوٹا تھا۔ ماؤں کی رکھی ہوئی چیزیں ویسے بھی بچوں کو آسانی سے نہیں ملتیں۔

میرے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہوا سا میں سا میں کر رہی تھی۔ لگتا تھا درخت صورت حال معلوم کرنے کئی قدم نزدیک کھسک آئے ہیں پھر یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے جسم سے الگ کھڑی اس ہولے کوادیکھ رہی ہوں جو نیم تاریکی میں چھوٹی سی کھڑکی کیلئے سے لگائے ہوئے ہولے کانپ رہا ہو۔

جیسے ہی فرمان ٹارچ اور تولیالے کر آیا سڑک پر ’ٹیاؤں‘ ’ٹیاؤں‘ کرتی ایسبولینس کی آواز سنی اور پھر ایسبولینس فائر انجن اور پولیس کی گاڑیاں اندر آ کھڑی ہوئیں۔ میری جان میں جان آئی۔ بچے کو ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر ایسبولینس میں ڈال کر لے گئے۔ آگ بجھانے والا انجن بھی چلا گیا۔ پولیس والوں نے میرا بیان لکھا، جائے وقوع کی تصویریں لیں، وہ کوڑے گھر کی حد بندی کر رہے تھے جب ہم ماں بیٹے ان سے

گایا تم نکالو تو میں گھر جا کر فون کرتی ہوں۔“

آخری بات سنتے ہی وہ گھر کی طرف بھاگا، میں نے چلا کر کہا۔ ”ایک ٹارچ اور تولیالے کر فوراً واپس آؤ۔“

میرے ہاتھ مسلسل تھیرلا پھاڑنے میں مصروف تھے۔ آخر خاصا بڑا سوراخ ہو گیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا، مڑے مڑے کاغذ ڈبل روٹی کے ٹکڑے، پھلوں کے چھلکے اور بیج، شیشے کے ٹکڑے اور ایک مناسا بچہ۔ ایک دم سردی سی لگی اور میں سر سے پیر تک کانپنے لگی۔

بیٹا ٹھیک کہتا تھا، نہیں، دل ٹھیک کہتا تھا۔ اب کیا کروں؟ بچے کو اپنے دوپٹے میں لیے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے نکالتے ہوئے ہاتھوں میں جو چیچا ہٹ محسوس ہوئی، وہ بڑی لرزہ خیز تھی۔ بہت دور درخت کی ایک شاخ کے بیچ چاند بند اسٹاکا ہوا تھا۔ اس چاند کی ہلکی روشنی میں پتا چلنا محال تھا کہ یہ چیچا ہٹ تھی یا شیشے کے ٹکڑوں نے بچے کے بدن پر زخم ڈال دیے تھے۔

میرے جسم کی گرمی اسے بھلی لگی یا کیا کہ وہ خاموش ہو گیا اور ساکن بھی۔

اور کھڑکی سے روشنی کی رمتی آئی۔ کسی کو باتوں کی آواز سے کچھ شبہ ہوا یا شاید کوئی میری طرح کھڑکی سے جھانکنے کا شوقین تھا۔

کراچی میں اپنی کھڑکی سے جو منظر میں نے کئی سال پہلے دیکھا تھا، جیسے وہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ صبح کا وقت تھا، یوں ہی موسم کا اندازہ کرنے کھڑکی سے جھانک رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پر کوڑے کے ڈھیر کے پاس کچھ بچے کھڑے ہنگامہ کر رہے ہیں، یکا یک دو چار بچے چلائے۔ ”ملا جی، ملا جی یہاں آن کے دیکھیے، ایک بچہ پڑا ہے۔“

ملا جی فجر کی نماز سے لوٹتے ہوئے کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے، دم بھر کور کے اور کہا۔ ”مار ڈالو حرام زادے کو.....“

بچوں نے ملا جی کی بات کو حکم سمجھا اور اس بچے پر پتھر برسانا شروع کر دیے۔ میں اوپر سے چلا کر منع کرنے لگی مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، تب میں گرتی

اجازت لے کر گھر واپس آئے۔
گھر کی تین سیڑھیاں چڑھ کر سرخ پتھر پر فرمان
دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس
کے چہرے سے ایک ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا تو
یوں لگا جیسے پگھلتا برف کا ٹکڑا ہاتھ میں لے لیا ہو۔ اس
کے چہرے کی پیلاہٹ پورے چاند نما ہنڈے کی
روشنی میں اور نمایاں ہو گئی تھی۔ خاردار تار پار جنگل
میں کسی بھٹکے ہوئے جگنو کی روشنی جلتی اور امیدوں کی
طرح ٹٹھا کر بجھ جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ رات عجب قیامت کی رات تھی، کسی طرح
نیند نہیں آ رہی تھی، رہ رہ کر خیال آتا تھا، "جاؤں بیٹے
سے کچھ پوچھوں، کیا پوچھوں؟" اب تو دل بھی دم
سادھے پڑا تھا، کچھ نہ بولتا تھا۔ رات بھر سوئی جا گئی
رہی، طرح طرح کے برے خواب دیکھتی رہی، رات
بھر گھر کے سامنے لگا درخت میسر کے جنگلے پر ہاتھ
مارتا رہا اور میں چونک چونک کر اٹھتی رہی، ایک مرتبہ
آنکھ کھلی تو بے چین ہو کر اٹھی، بیٹے کے دروازے تک
گئی، یوں لگا جیسے اندر کوئی سسکیاں لے رہا ہو۔ نہیں
شاید پنکھا چل رہا ہے۔

پھر میں نے کچھ نہیں سوچا نہ دل کو بولنے کی مہلت
وی۔ بڑے نام دروازہ کھٹکھٹا کر جھٹ اندر داخل ہو گئی۔
بجلی کا بٹن دبایا کہ میں اسے اور وہ مجھے دیکھ لے۔ میرا
خیال تھا کہ وہ جاگ رہا ہے مگر وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اس
نے آنکھیں ملیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سو رہا تھا مگر اب
واپسی کی کشتیاں جل چکی تھیں۔

"کیا بات ہے امی؟" اس نے پوچھا۔

"ایک بات میرے ذہن پر سوار ہے تم سے
پوچھنا چاہ رہی تھی۔"

"رات کے دو بجے؟" اس نے گھڑی کی طرف
دیکھا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور جب تک یہ بات
صاف نہیں ہوگی، مجھے نیند نہیں آئے گی۔ تم میری
عادت جانتے ہو اس لیے یہ بات ابھی پوچھنا چاہتی
ہوں۔"

وہ چپ رہا۔ میں انتظار کرتی رہی کہ کہے پوچھیے
مگر وہ کچھ نہ بولا۔

میرے بہت کہنے پر بھی بیٹا نہیں اٹھا بلکہ اس نے
ایسی رکھائی سے جس سے وہ آج تک مجھ سے نہیں بولا
تھا، کہا۔ "خدا کے لیے آپ اندر جائیے اور مجھے اکیلا
چھوڑ دیجیے۔"

مجھے بھی ایک خیال میرے ذہن میں کوندا، اس
پڑوس نے جو میرے ساتھ ٹہلنے نہیں گئی تھی، مجھے بتایا تھا
کہ جب تمہارا بیٹا یہاں اکیلا رہتا تھا تو ایک امریکن
لڑکی اکثر اس کے ساتھ نظر آتی تھی۔ اس کیپلیکس کا ہر
پہلا گھر ایک بیڈروم کا تھا، جس میں اس کیپلیکس کے
ملازمین یا کالج یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں رہتے
تھے۔ وہ بھی ایسے ہی کسی ایپارٹمنٹ میں تھی مگر اب
بہت دنوں سے نظر نہیں آئی۔ ایک مرتبہ کسی اسٹور میں
ملی تو وہ ماں بننے والی تھی۔ میں نے اس بات کو کوئی
اہمیت نہیں دی تھی کہ ممکن ہے وہ فرمان کی کوئی کلاس
فیلو ہو۔ ماں بننا یہاں کوئی عجوبہ تو ہے نہیں۔ میں تو
جب اس گھر میں آئی تھی، میں نے کسی لڑکی کو اس کے
ساتھ نہیں دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے کچھ
نہیں چھپاتا۔ اس نے خود مجھے اس گھر میں بلایا تھا کہ
وہ ہاسٹل میں رہنا چاہتا تھا، اتنی دور سے آنے جانے
میں اس کا وقت خراب ہوتا تھا۔ ہر ہفتے وہ مجھ سے ملنے
آتا تھا، میں ہفتے بھر کا کھانا پکا کر ساتھ کر دیتی تھی، وہ
بھی خوش، میں بھی خوش۔

اپنے گھر میں جانے سے پہلے میں نے پڑوس کی
گھنٹی بجائی، پڑوس نے دروازہ کھولا، ایک گنجا موٹا سا
مرد سامنے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ پڑوس بھی سچی سجائی تھی۔
اس کے بال جو عام حالات میں خاصے پرانگندہ رہتے

بغیر کسی تیاری کے میرے منہ سے نکلا۔ ”کیا وہ تمہارا بچہ تھا؟“

فرمان کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا اس کا چہرہ سرخ ہونا شروع ہوا دیکھتے دیکھتے گلزار ہو گیا اور کان جیسے جلتے ازگارے۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ مجھے تو بچ جو اب سنا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا بیک وقت غصہ، رحم، بے اعتباری اور دکھ رنج کی وہ چھائیاں جنہیں بیان نہیں کیا جاسکتا پھر وہ رونے لگا۔ میری گود میں سر ڈال کر کہنے لگا۔ ”آپ مجھے اتنا برا سمجھ سکتی ہیں میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

نہیں معلوم کیوں میں سر سے پیر تک کانپی۔

میں نے کہا۔ ”بیٹا معاف کرنا کل اس بچے کو دیکھ کر تمہاری جو کیفیت تھی تو جانے کیوں خیال آیا کہ.....“

”مجھے ہی خیال آتا رہا، کہیں وہ مرنے گیا ہو کیا وہ زندہ تھا امی؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی دعا تو یہی کر رہی ہوں مگر یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔“

”میں بھی یہ سوچتا رہا کہ..... کہ وہ میرا بھی ہو سکتا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”ڈیڑھ سال ہوا آپ کے آنے سے پہلے میں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ ابا کے انتقال کے بعد آپ نے کتنی مشکلوں سے میری پرورش کی ہے میری خواہش پر مجھے پڑھنے امریکا تک بھیجا ہے میں کسی طرح آپ کو ناخوش نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ آپ ایمان کی حد تک یقین رکھتی ہیں کہ اگر میں نے کسی امریکن لڑکی سے شادی کی تو آپ مجھے کھو دیں گی۔ اس لیے ابھی میں آپ کو نہیں بتا سکتا اور نہ تعلیم کے دوران بچے کا بار اٹھا سکتا ہوں۔ جب میں نے کئی بار اس سے ابارشن کر لینے کی بات کی تو وہ ناراض ہو گئی۔ اب چھ مہینے کے بچے کو وہ اکیلی پال رہی ہے۔ مجھ سے بات تک نہیں کرتی مگر میں اپنے بیٹے کو دیکھ آتا ہوں۔“

ای..... اوہ اتنا پیارا ہے کہ کیا بتاؤں کل اس بچے کو دیکھ کر خیال آیا کہ وہ میری بات مان لیتی تو میرا بیٹا بھی اسپتال کے کوڑے گھر کی نذر ہو جاتا..... وہ سسکیاں لینے لگا میں بھی رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اس کا سر تکیے پر رکھ کر کہا۔ ”تم سو جاؤ میں بھی اب تھوڑی دیر لیٹوں گی۔“

وہ میری طرف دیکھتا رہا جب وہ بچہ تھا تو ایسی ہی امید بھری نظروں سے دیکھتا تھا کہ میں اسے دوسری ثانی دوں گی یا نہیں؟ میں اٹھ کر جانے لگی تو وہ بولا۔ ”ای.....! کیا کل ہم جمی اور اس کی نان کو یہاں لے آئیں؟“ اس کی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن تھے۔

”نہیں۔“ میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں کے چراغ بری طرح ٹٹمانے لگے۔

میں دروازہ اور روشنی بند کر کے ٹیرس پر چلی آئی۔ ٹیرس کی لکڑی کا فرش اور جنگلاتر تھا، جسے رات روتی رہی ہو۔ چاند اوپر آ گیا تھا۔ کوڑا گھر کے چہار طرف لگا زروٹھپ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ میرے ذہن میں ’ی‘ کی آواز ابھری، پھر وہ معصوم بچوں کی خاموش چیخیں جیسے میرے سینے میں سلاخوں کی طرح گڑ گئیں۔ مجھے اس بہادر لڑکی کا خیال آیا جو میرے بیٹے کے بیٹے کو اس محبت سے اکیلی پال رہی تھی کہ اگر وہ مجھے چھوڑ بھی دے میں اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

میں یہ بات فرمان کو فوراً نہیں بتانا چاہتی تھی۔ عورت ہونے کے ناتے میں اسے تھوڑی سی سزا دینا چاہتی تھی۔

لیکن یہ تو سوچو اتنی بڑی قربانی اس نے صرف تمہاری خاطر کی، صرف تمہاری خوشی کی خاطر کی، صرف تمہاری خوشی کی خاطر۔ دل پھر بدلنے لگا۔ مجھ سے بھی صبر نہیں ہوا، میں دوبارہ اس کے کمرے میں گئی، دروازہ کھولا اور کہا۔ ”سنو فرمان! جب تک میں اپنے پوتے کے لیے زمری نہ بنا لوں اور بہو کو دلہن بنا کر لانے کا انتظام نہ کر لوں اسے کیسے لاسکتی ہوں؟“

☆☆.....☆☆

وہ ماٹوس اجنبی

ارم خان

ذریعہ غازی خان سے، اُس دو شیزہ کا قصہ جسے زندگی بھر ایک اجنبی یاد آتا رہا

تنگ کر دیا کیونکہ جمع پونجی سب شادی پر خرچ ہو گئی تھی۔ ہمارے پاس اب گھر کے راشن کے پیسے بھی نہ تھے۔ چونکہ ہم کرائے کے گھر میں رہتے تھے تو مکان کا کرایا کیسے ادا کرتے۔

ایک دن ابو نے آ کر ہمیں بتایا کہ ہم سب گاؤں جا رہے ہیں۔ وہاں کچھ رشتے دار ہیں، کچھ ماہ وہاں رہیں گے پھر جیسے ہی کچھ حالات بہتر ہوں گے ہم واپس لوٹ آئیں گے۔

اور پھر ہم اُداس دل کے ساتھ اگلے دن گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں ہمیں ہمارے ایک انکل کا خالی گھر بھی مل گیا تھا۔

ہم وہاں رہنے لگے۔ زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ مجھے ہمیشہ اپنی دوستوں اور کزنز کی یاد آتی، دل کرتا میں اُن کے پاس پہنچ جاؤں۔ دعائیں مانگتی اور پھر ایک دن شاید میری دعا قبول ہو گئی۔ میرا کزن گاؤں آ گیا۔

اس نے بتایا کہ صبا جو کہ میری کزن تھی، اُس کی منگنی ہے اور وہ ہمیں اس میں شرکت کے لیے دعوت دینے آیا ہے۔ یہ خبر سن کر میں تو جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ ایک تو یہ خوشی تھی کہ میں شہر جاؤں گی۔ دوستوں

آج میں شادی شدہ ہونے کے ساتھ دو بچوں کی ماں ہوں۔ میرا شوہر بہت اچھا ہے۔ میری زندگی مکمل ہے اور میں بھرپور طریقے سے اسے گزار بھی رہی ہوں۔ لیکن جس گھر میں، میں پیدا ہوئی وہ ایک نہایت غریب گھر نہ تھا۔ مجھ سے بڑی ایک بہن تھی پھر میں یعنی بانو پھر میرے بعد ایک بھائی اور بس خاندان مکمل۔ میرے ابو ایک مزدور اور امی لوگوں کے گھروں میں کام کرنے والی سختی عورت تھیں۔ ہم تین بہن بھائی کی عمروں میں بس دو دو سال کا فرق تھا۔ ہمیں تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا لیکن پانچ پانچ جماعتوں کے بعد ہمیں اسکول سے ہمیشہ کے لیے چھٹی کرنی پڑی۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا اور اب ہم بہن بھائیوں میں دو کا اور اضافہ ہو گیا۔

میری عمر تب سترہ سال تھی جب بڑی بہن کے لیے ایک اچھے گھر کا رشتہ آیا۔ گھر والوں کے قبول کرنے کے بعد آنا فانا شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ کچھ ہی عرصے میں شادی کا دن بھی آ گیا اور وہ رخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔

شادی کے بعد غربت نے اپنا دامن ہم پر اور

کیسے جا سکتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نورین گھر میں ہے مادہ سب۔“ نبیال نے کی تم جاؤ اپنی تیاری کر۔ تمہارے ابو بھی نہیں جا پائیں گے۔ اللہ کا نام لے کر تم مکانی میں جاؤ۔

”اگر کوئی نہ گیا تو بہت بری بات ہوگی۔“ اور اس طرح جانے کی خوشی اور امی کی فکر لیے میں اگلے روز پارسل کے چوٹے بنیائی ذیشان کے ساتھ شہر کے لیے روانہ ہوئی۔

یہ میری زندگی کا پہلا سفر تھا جو میں اکیلے کر رہی تھی، دل کے کسی کونے میں خوف بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن اب خوف سے نہیں ہمت سے کام لینا تھا۔ خدا خدا کر کے سفر ختم ہوا تو میں نے سکھ کی سانس لی۔

دوبختے کے سفر نے تمکا دیا تھا۔ میں ڈی جی خان کے اڈے پر اترتی تو سکون محسوس ہونے لگا۔ ڈر کہیں

سے ماہوں گی۔

دوسری خوشی یہ کہ میری کزن کی منگنی تھی۔ وہ بھی اس کی جو میری بیسٹ فرینڈ تھی۔ میں خوشی خوشی آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگی۔ میرا کزن ایک رات وہیں ہمارے پاس رُک گیا پھر اگلے دن وہ اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

میں چار دن بعد جانا تھا لیکن جانے سے ایک دن پہلے امی کو بہت تیز بخار ہو گیا، جس وجہ سے ہمارا جانا تقریباً کینسل ہو گیا اور میرے منہ پر اُداسی ناچنے لگی۔

امی میری خوشی سے اچھی طرح واقف تھیں۔ انہوں نے مجھے اُداس دیکھ کر اپنے پاس بلا پایا اور کہا کہ تم چلی جاؤ۔“ لیکن امی آپ کی طبیعت خراب ہے۔ میں



READING
Section

ہمارے آگے جانے کے کچھ ہی دوری پر رُک گئی۔ کار کو اپنے سامنے رُکے ہوئے دیکھ کر میرے چلتے قدم بھی رُک گئے۔ کچھ ہی سیکنڈ بعد کار کا فرنٹ ڈور کھلا اور ایک خوبصورت سالز کا جس کی عمر یہی کوئی بائیس یا تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اُتر اور ہماری طرف قدم بڑھانے لگا۔

میں نے خوف سے ذیشان کے ننھے ہاتھ کو اور زور سے جکڑ لیا۔ وہ اجنبی چلتا ہوا آیا اور ہمارے سامنے آ کے رُک گیا۔

پہلے اُس نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے تھوڑا سا جھکا اور گول منوں سے ذیشان کے گالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھپتھپانے لگا لیکن میں نے ذیشان کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس اجنبی نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور اب اس کی نظروں میں، میں تھی اور وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”کون ہیں آپ؟ کیوں پیچھا کر رہے ہیں ہمارا؟“ آخر میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

”انسان ہوں کوئی جن تو نہیں ہوں۔ اور یہ آپ اتنا ڈر کیوں رہی ہیں۔“ اس نے مسکرا کے پوچھا۔

”ہمارا راستہ چھوڑیں، ہمیں جانے دیں۔ کیوں تنگ کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ لیکن اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ذیشان کو گود میں اٹھا لیا اور پھر اس کے گالوں سے تھپتھپانے لگا۔

”بہت پیارا بچہ ہے۔“ ذیشان کے دونوں گالوں کو اس نے چومتے ہوئے کہا۔ لیکن میں نے اس کا پیارا اور بات دونوں نظر انداز کر دی۔ میرے دماغ میں اب صرف ایک ہی سوچ تھی کہ یہ آدمی میرے بھائی کو مجھ سے لینے کے لیے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ شاید ان میں سے ہے جو بچوں کو اغواء کر کے لے جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں آنندھیاں چلنے لگیں۔ میں نے ایک قدم ذیشان کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو بھولا سا ذیشان بھی مجھے تو کبھی اجنبی کو دیکھتا۔

چھپ گیا تھا کیونکہ یہ میرا اپنا شہر تھا۔ مجھے یہاں خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں بس سے اُتری تو ایک ہاتھ سے ذیشان کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ میں اپنی ضرورت کا سامان تھام لیا اور پیدل چلنے لگی۔ اس وقت میں تانگے ہوا کرتے تھے۔ میرا سفر اڈے سے دور آدھے گھنٹے کا تھا لیکن میں تانگے پر نہیں بیٹھی کیونکہ میں کچھ دیر پیدل چلنا چاہتی تھی۔ ذیشان اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ تو تلی زبان بھی چلا رہا تھا۔ میں اس کے معصوم سے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اس کے چلنے کی رفتار کے ساتھ چل رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے ہم اڈے سے کافی دور آ گئے تھے۔

روڈ کے ایک جانب ہم چلے جا رہے تھے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ پہلے میں نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن تھوڑی دور جانے کے بعد وہم یقین میں بدل گیا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سفید کار ہمارے پیچھے آرہی تھی۔ میرے دل میں ایک دم خوف اٹھا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے چلتے قدم اور تیز کر دیے۔ میرے ساتھ چلتا ذیشان جیسے اب بھاگ رہا تھا۔ میری چال ہی اتنی تیز تھی کہ اُسے بھاگنا پڑا۔

اب کچھ دور اور جا کر میں نے سوچا کہ تانگے پر بیٹھ جانا ہی بہتر ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ اب کوئی تانگہ نہیں مل رہا تھا۔ جو بھی ملتا سواریوں سے بھرا ہوا ملتا۔ سخت گرمیوں کی جلاتی ہوئی دھوپ تھی۔ ہم روڈ کی ایک جانب چلے جا رہے تھے۔ ایک اور پریشانی یہ تھی کہ روڈ پر رش نہیں تھا۔ سناٹا مجھے مزید خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔

میں اپنے خوف سے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے تیز تیز چل رہی تھی کہ وہ کار ہمارے بالکل قریب آ گئی اور پھر اگلے ہی پل وہ ہمارے قریب سے ہو کر آگے نکل گئی میں نے سکون کی ایک لمبی سانس لی اور قدموں کی رفتار دہمی کر دی۔ لیکن شاید یہ سکون ایک پل کا تھا کیونکہ وہ کار

کیا تھا ہم نے سامان سمیٹا اور جس جس نے ہماری مدد کی تھی، اس کا شکر یہ ادا کر کے دو دن بعد ہم شہر کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہمارے شہر میں آنے سے پہلے ابو شہر میں کرائے کے مکان کا انتظام کر چکے تھے۔

مکان خالہ کے گھر کے قریب تھا۔ ایک یہ بھی آسانی تھی صبا اور میں ہر روز ایک دوسرے کے گھر آتی جاتیں۔ دیر تک ساتھ بیٹھ کے باتیں کرتیں۔ اگر کہیں جانا ہوتا تو ایک ساتھ جاتیں۔ بازار، کسی سہیلی کے گھر یا کہیں بھی ہم دونوں ساتھ ہی جاتی تھیں اور ہمارے ساتھ صبا کا بھائی عارف جاتا، جو ہمیں اپنی بانیک پر لے جاتا تھا۔

دن رات اسی طرح گزر رہے تھے۔ زندگی کی وہی پہلے والی روٹین تھی لیکن ہم سب کو کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ وقت جیسا بھی ہو گزر جانے کے لیے ہوتا ہے۔ آخر ہمارے برے وقت نے بھی گزر ہی جانا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھی لیکن میری سوچ کہیں اور تھی۔ پتا نہیں کیوں میں چاد کر بھی اس اجنبی کو بھلا نہیں پاتی تھی۔ اب مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے اسے جیسا سمجھا تھا وہ دیا نہیں تھا۔ جانے کیوں اس اجنبی کا چہرہ اب بار بار میرے سامنے آ رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ، ذیشان کو پیار کرنا اور خاص طور پر مجھے اپنی گہری آنکھوں سے غور سے دیکھنا۔ میں خیالوں میں گم کام میں مصروف تھی کہ اچانک صبا بھائی کے ساتھ بانیک پر آگئی۔ اسے دیکھ کر مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ کہیں جانے کی تیاری کے ساتھ آئی ہے۔

”کہاں جا رہی ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”میں نہیں ہم دونوں جا رہی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کہاں؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”او فو! ایک تو تم سوال بھی بہت کرتی ہو۔ ہم بازار جا رہی ہیں اور پھر اگر ٹائم ملا تو ریحانہ کے گھر بھی چلیں گے۔“

”چھوڑو میرے بھائی کو ورنہ میں یہاں چلانے لگوں گی۔ پھر لوگ جمع ہو جائیں گے۔ چھوڑو میرے بھائی کو۔“ میں نے بے بس ہو کر ایک کمزوری دھمکی دی جو کام کر گئی۔ اس نے ذیشان کو تو چھوڑ دیا۔ لیکن اب پہلے سے زیادہ ہنسے لگا۔

اسی وقت میری نظر ایک خالی تانے پر پڑی میں نے اسے روکا اور اس میں سوار ہو گئی لیکن اب میں خالہ کے گھر کے بدلے اپنی ایک دوست کے گھر جا رہی تھی۔ کیونکہ جہاں میں کھڑی تھی دوست کا گھر وہاں سے دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اب میں جلدی اپنے کسی جاننے والے کے گھر جانا چاہتی تھی کیونکہ وہ اجنبی اپنی کار میں ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہمارا سفر ختم ہوا تو کرایا دیتے ہوئے میں نیچے اتر کر روڈ سے گلی میں آگئی۔ میں نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنی دوست ریحانہ کے گھر پہنچی تو تسلی ہوئی۔ ریحانہ میری اچھی دوستوں میں شامل تھی۔ سو میں نے اسے اس اجنبی کے بارے میں بتایا اور پھر ایک گھنٹے بعد ہم خالہ کے گھر کے لیے نکل پڑیں۔ دل میں خیال تھا کہ کبھی وہ اجنبی باہر کھڑا نہ ہو لیکن یہ بس ایک خیال ہی رہا۔

☆.....☆.....☆

”وہاں کا سارا حال دو مجھے۔ کون کون آیا تھا کیا کیا ہوا تھا اور اتنا سفر تم نے اکیلے کیسے کیا۔ کیا تمہیں ڈر نہیں لگا۔“

پانچ دن خالہ کے گھر رہ کر میں کچھ دیر کے پہلے ہی تو گاؤں واپس اپنے گھر آئی تھی اور آتے ہی نورین کے سوالوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اس اجنبی والی بات کے سوا میں نے اسے ہر بات بتائی، تو وہ بھی خاموش ہو گئی۔

وقت کی چال میں کوئی فرق نہ ہوا دن رات اپنے معمول کے مطابق روشنی اور اندھیرے میں بدلتے رہے۔ ہمیں گاؤں میں رہتے ہوئے، چھ ماہ گزر گئے۔

پھر اچانک ایک دن امی نے بتایا کہ ہم سب واپس شہر جا رہے ہیں۔ اب ہم وہیں رہیں گے۔“ پھر

READING
Section

ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے اس کی آنکھیں اس کی زبان کی گواہی دیتی معلوم ہوئیں لیکن میں نے کچھ کہا نہیں مجھے خاموشی دیکھ کر اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

میں نے آپ کو کافی تلاش کیا۔ اس دن آپ جس گھر میں گئی تھیں۔ میں وہاں بھی گیا۔ جانا نہیں چاہتا تھا، مجھے آپ کی عزت کا بھی خیال تھا لیکن پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں وہاں گیا تو پتا چلا وہ آپ کی دوست کا گھر ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اس لڑکے ندیم کو جو شاید آپ کی دوست کا بھائی ہے، اعتماد میں لیا اور آپ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ آپ یہاں شہر میں نہیں رہتی ہیں اور نہ ہی یہاں کی ہیں۔ کالی دور گاؤں میں رہتی ہیں۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ جب آپ پھر ان کے گھر جائیں گی تو وہ مجھے بتائے گا۔ پھر میں آپ کا انتظار کرنے لگا لیکن کئی ماہ گزر گئے لیکن یہ انتظار انتظار ہی رہا۔ اور پھر آج راستے سے گزرتے ہوئے آپ پر نظر پڑی تو میں رُک گیا۔“

اس نے اپنی بات مکمل کی اور خاموشی سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تو آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ کو ان سے عشق ہو چکا ہے۔“ صبا نے اس دوران پہلی بار اپنی زبان کی تیزی اس اجنبی کو دکھائی تھی۔

”جی کچھ ایسا ہی ہے۔“ اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ ایسی باتیں اس طرح روڈ پر کھڑے ہو کر کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔“ صبا نے کہا۔

”جی مجھے بھی ٹھیک نہیں لگتا لیکن میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ آپ مجھے گھر کا ایڈریس دے دیں، میں اپنی فیملی کو رشتے کے لیے بھیجوں گا۔“

”اوہ..... نام کیا ہے آپ کا؟“ صبا شاید اس کا انٹرویو لے رہی تھی۔

”عمیر علی۔“ اس نے بتایا۔ اس سے پہلے کہ صبا اس سے دوسرا سوال کرتی نظر سامنے سے آتے

”ہوں۔ لیکن پتا نہیں امی اجازت دیتی ہیں یا نہیں۔ میں نے اپنی سوچ ظاہر کی۔ ایک منٹ کہہ کر وہ اندر روم میں چلی گئی، جہاں امی بیٹھی تھیں۔ وہاں جا کر پتا نہیں اُس نے کیا کہا۔ کیسے انہیں منایا کہ امی نے جانے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملی تو میں فوراً تیار ہو گئی۔ تیار ہو کر ہم روانہ ہو گئے۔ پہلے ریحانہ کے گھر پھر بازار۔ اس طرح تین گھنٹے بعد ہم واپس لوٹ رہے تھے کہ راستے میں بانیک پکچر ہو گئی۔

عارف نے ایک عصبیلی نگاہ ہم پر اور ایک پکچر بانیک پر ڈالی اور ہمیں وہاں چھوڑ کر خود پکچر لگوانے چلا گیا۔ اب ہم دونوں وہاں کھڑی عارف کا انتظار کرنے لگیں۔ مجھے فکر تھی جلدی گھر پہنچنے کی کیونکہ میں جانتی تھی امی ہمارا ہی انتظار کر رہی ہوں گی۔ نام بھی کافی ہو گیا تھا ہم کو۔ میں جتنی فکر مند تھی اس سے زیادہ صبا کی زبان چل رہی تھی۔ مجبوری میں مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ ہم باتوں میں مصروف تھیں کہ اچانک ہمارے سامنے ایک سفید کار آ کر رُکی۔

ہم دونوں نے ایک پل دیر کے بغیر اس گاڑی کی طرف دیکھا۔ تو میں دیکھتی رہ گئی مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی ہے جسے اب تک میں بھلا نہیں پائی۔ حیرت سے میرا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔ کار سے نکل کر اب وہ اجنبی میرے سامنے کھڑا تھا۔ صبا بھی مجھے تو کبھی اس اجنبی کو غور سے دیکھتی لیکن اس نے بولا کچھ بھی نہیں۔

”پہچان تو لیا ہو گا نہ مجھے آپ نے؟“ اس نے مجھے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی..... لیکن کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ میرا پیچھا کیوں کرتے ہیں۔ اس دن وہاں پیچھا کیا اور آج یہاں بھی پہنچ گئے۔“ میں نے اُلٹا سوال کر دیا۔

”اُس دن قسمت اور آج شاید میری دعا نے ہمیں ملایا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے کہا۔

”دیکھو میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا، بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس دن آپ کو دیکھا۔ آپ مجھے پسند آ گئی ہیں۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا

بنانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

”اب تم دونوں سچ سچ بتاؤ یہ کون تھا؟“ اب عارف کے غمے کا نشانہ ہم تھے۔

”بھائی قسم سے ہم نہیں جانتے یہ کون تھا۔“ صبا نے یقین دلانے کے لیے قسم کھائی اور یہ کافی حد تک ٹھک تھا کہ ہم اسے نہیں جانتے تھے۔ عارف کو بڑی مشکل سے یقین دلایا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ شکر یہ تھا کہ عارف نے گھر میں کسی کو کچھ نہ کہا۔

☆.....☆.....☆

دقت کچھ گزرا تو میرے لیے ایک رشتہ آیا جو منظور کر لیا گیا پھر ایک سال بعد میری شادی ہو گئی۔ لیکن یہاں پر ایک بات بتانی چلوں کہ اپنی شادی سے دو ماہ پہلے ایک بار پھر میں نے عمیر علی کو دیکھا تھا، راستے سے گزرتے ہوئے لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ پایا تھا۔

پھر اس کے بعد آج تک میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ ریمانہ سے بھی میں نے دوستی ختم کر دی تھی کیونکہ عمیر علی جانے کتنی بار اُس کے گھر گیا تھا لیکن اس نے مجھے ایک بار بھی نہیں بتایا تھا۔ کیوں.....؟ میں نہیں جانتی تھی۔

پندرہ برس گزر چکے ہیں لیکن میں آج تک اس شخص کو بھول نہیں پائی۔ عجیب شخص تھا وہ ہر بار مجھے ایک اُلجھن میں ڈال جاتا تھا۔

میں نہیں جانتی اس کا اتنی بار مجھے ملنا صرف اتفاق تھا یا قسمت کا کوئی کھیل۔ وہ مجھے واقعی پسند کرنے لگا تھا یا بس اس کی باتیں ہی تھیں۔

بس ایک بار دیکھ لینے سے اتنی محبت ہو جائے کہ وہ شخص اپنی محبت کو تلاش کرتا پھرے..... بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔

یہ سب سوچ کر میں اب بھی اُلجھ جاتی ہوں لیکن یہ سچ ہے یہ اُلجھن مجھے اس کی یاد دلاتی ہے۔ اور دلالی رہے گی۔ وہ مانوس سا اجنبی اکثر مجھے سب کچھ بھلا دیتا ہے۔

☆☆.....☆☆

عارف پر پڑی تو ہم دونوں کا خون جیسے جم کر رہ گیا۔ عارف نے آکر اپنی بائیک ہمارے قریب روک دی۔ پہلے اس اجنبی کو دیکھا پھر۔ کون ہے یہ۔“ کا سوال آنکھوں میں لیے ہمیں گھورنے لگا۔ ہم کیا جواب دیتیں، سونپتیں جھکا لیں۔

”کون ہو تم۔“ اب عارف اس اجنبی کی جانب رخ کیے پوچھ رہا تھا۔

”عمیر علی۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہاں کیا کر رہے ہو۔“ اب عارف نے غمے سے پوچھا۔

”سب بتا دیتا ہوں اگر آپ ٹھنڈے دماغ سے نہیں تو۔“ اُس نے کہا۔

”ہماری عزت کے ساتھ تو اس طرح سر عام کھڑا ہے اور کہتا ہے میں ٹھنڈے دماغ سے بات سنوں۔“ بے غیرت انسان۔“ عارف نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”میں تمہیں پیار سے سمجھانا چاہتا ہوں اور تم اتنا غصہ دکھا رہے ہو کہ میرا گریبان تک پکڑ لیا۔“ اس نے اپنا گریبان عارف کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا۔

”میں تمہیں معاف کر رہا ہوں کسی کی خاطر اور جارہا ہوں۔ اگر مجھے کسی کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو تجھے اچھی طرح دیکھ لیتا اور میں کیا ہوں، یہ بھی سمجھا دیتا۔“ وہ کہہ کر اپنی کار کی طرف مڑ گیا۔

اس نے فرنٹ ڈور کھولا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کار میں بیٹھتا، وہیں رُک گیا اور عارف کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میرے خیال میں آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کیوں کھڑا تھا۔ کیا چکر ہے۔ اگر آپ واقعی ایسا سوچ رہے ہیں تو یہ غلط سوچ ہے آپ کی۔ نہ یہ مجھے جانتی ہیں اور نہ میں انہیں، بس راستے سے گزرتے ہوئے میری نظر ان پر پڑی تو میں چلا آیا کہ شاید کوئی مسئلہ تو نہیں۔“

اور جو تم نے میرا گریبان پکڑا ہے۔ اس کا بدلہ بھی لیتا اگر مجھے ان دو لڑکیوں کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو کیونکہ یہ شریف معلوم ہوتی ہیں اور عورتوں کو تماشا

READING
Section

بھرم



محمد سلیم اختر

ممتا کا بھرم رکھتی ایک بیوہ کا زندگی نامہ راوہ پنڈی سے

لے آتا تھا۔

راشد..... سکیٹ کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ اور اسے بھابی کہتے نہ تھکتا تھا۔ جلال اور سکیٹ کو اس پر بے حد اعتماد تھا۔ جب سے نومی دنیا میں آیا تھا۔ سکیٹ کی زیادہ توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ نومی کو جب وہ اپنے ساتھ لیٹاتی تو اس کا سینہ مسرت و شادمانی کی بے نام سی لہروں سے بھر جاتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا نومی کوئی علیحدہ وجود نہیں بلکہ اس کے جسم کا ہی ایک حصہ ہے۔ جو کچھ دیر کے لیے اس سے جدا ہو کر کھیل کود کر اسکول جا کر ہنس بول کر پھر اس کے جسم سے پیوست ہو جاتا ہے۔

ممتا کا جذبہ تو ہر عورت کے سینے میں ہر لمحہ موجزن رہتا ہے جو اللہ کی دین ہوتی ہے مگر سکیٹ میں یہ جذبہ کچھ زیادہ ہی تھا اور شدید تھا۔ اسے شروع سے ہی بچوں سے بہت انس تھا۔ پھر جب اس کی اپنی گود میں پیارا سا پھول کھلا تو اس کی تمام محبتیں سمٹ کر ممتا کا روپ دھار گئیں۔ نومی ہی اس کی زندگی کا حاصل اور مقصد بن گیا جو اس کی محبت کی نشانی تھی۔ نومی بھی اپنے ماں باپ کو بہت چاہتا تھا۔ وہ ان کی نرالی محبتیں پا کر نہال ہو جاتا۔ وہ دونوں کی زندگی تھا۔ جینے کی امنگ اور سہارا تھا۔

ان دنوں نومی پانچ سال کا تھا کہ اس کی زندگی میں

سردیوں کے دن تھے۔ دو دن سے بارش ہو رہی تھی۔ جس نے سردی کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ شام ڈھلنے والی تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سکیٹ اپنے پانچ سالہ نومی کو گود میں اٹھائے بیٹھی تھی۔ نومی تو کھانسی اور بخار کی شدت سے رو رہا تھا۔ سکیٹ کی آنکھیں بھی سادوں بھادوں بنی ہوئی تھیں۔ اس کی اڑھلیاں نومی کے نرم بالوں میں ریگ رہی تھیں۔ اسے نومی کی بیماری کی بے حد فکر تھی مگر آج اس کے آنسو نہ صرف نومی کی بیماری بلکہ راشد کی اس حرکت کی وجہ سے بہ رہے تھے۔ جو آج اس نے اس کے ساتھ کی تھی۔

☆.....☆.....☆

سکیٹ اور جلال نے محبت کی شادی کی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو پا کر بہت ہی خوش تھے اور جب نومی ان کی زندگی میں آیا تو ان کی خوشیاں دو چند ہو گئیں۔ وہ ان کی آنکھوں کا تارا تھا اور وہ اسے دیکھ کر جتے تھے۔ ان دنوں ان کی زندگی اتنی حسین تھی کہ انہوں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ جلال ایک سرکاری ادارے میں گریڈ اٹھارہ کا آفیسر تھا۔ راشد بھی اسی دفتر میں کام کرتا تھا اور وہ جلال کا اسٹنٹ تھا۔ نہایت ہی اسماٹ، محنتی اور ایماندار، جلال اسی لیے اسے پسند کرتا تھا اور اسے کبھی کبھار اپنے گھر بھی



بھی وہ خاص خیال رکھتی تھی کہ وہ ایک بیٹے کی ماں معلوم ہی نہ ہوتی۔ کئی لوگ اسے کنواری سمجھتے تھے۔ یہی ترتیب فٹنس اور خوبصورتی اس کی شخصیت پر بھی حاوی ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک پانچ سالہ بچے کی ماں ہے۔

☆.....☆.....☆

نومی کو سردی لگ گئی تھی۔ اسے کھانسی کے ساتھ بخار بھی تھا۔ سیکینہ پریشان ہو گئی۔ اس نے ڈاکٹر کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ مگر گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ تو اس کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔ وہ نومی کی تکلیف برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ بارش میں وہ ٹیکسی لینے بھی نہ جاسکتی تھی۔ اچانک اس کے ذہن میں راشد آ گیا۔ راشد نے جلال کی وفات کے بعد دفتری حساب کتاب کے لین دین میں اس کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ اور اسے دفتر کا ایک چکر بھی نہیں لگانے دیا تھا۔ اور تمام واجبات اسے گھر آ کر ادا کیے تھے۔ اور پھر یہ پیشکش بھی کی تھی کہ جب کبھی بھی اسے اس کی ضرورت پڑے تو اسے بلا تکلف کہہ دیا کرے۔ سیکینہ اس کی بے حد ممنون ہوئی تھی کہ اس نے جلال کا دوست اور ساتھی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن اب تک سیکینہ نے

ایک سانحہ رونما ہو گیا۔ زندگی تو ہے ہی حادثات کا دوسرا نام..... جلال ایک حادثے میں جاں بحق ہو کر سیکینہ کی زندگی کو بھی تہہ وبالا کر گیا۔ لوگوں نے سیکینہ کی جوانی اور خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے اسے دوسری شادی کے مشورے دیے۔ لیکن اس نے کسی کے بھی مشورے پر کان نہ دھرے۔ اس کے عزیزوں نے بھی بہت زور لگایا۔ اسے سمجھایا کہ مرد کے بغیر تم زندگی کا طویل سفر طے نہ کر سکو گی۔ مگر اس نے شادی کرنے کے حق میں ہر دلیل اور تاویل سنیں..... جس کا جواب وہ نومی کو سینے سے لگا کر اس کا منہ چوم کر دیتی۔ اور یہی اس کا آخری فیصلہ اور جواب ہوتا تھا۔

اب اس حادثے کو تین برس گز گئے تھے۔ مگر اسے اپنے اس فیصلے پر کبھی کوئی پچھتاوا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ دس مرلے کے ایک خوبصورت سے گھر میں رہتی تھی اور ایک منظم زندگی گزار رہی تھی۔

جلال اس کے لیے اس گھر کے علاوہ دو فلیٹ اور اتنا بینک بیلنس چھوڑ گیا تھا کہ وہ باقی کی زندگی بغیر کسی محتاجی کے گزار سکتی تھی۔ دو فلیٹ سے ملنے والا کرایہ ہی اس کے ماہانہ خرچ سے بھی زائد ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ کوئی نہ کوئی مصروفیت ڈٹونڈ لیتی تھی۔ اس کی زندگی میں ایک خاص ترتیب اور خوبصورتی پائی جاتی تھی۔ اپنی صحت کا

آخر میں اس نے لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو دھوکے دے رہی ہو۔ مرد کے بغیر عورت نامکمل ہوتی ہے۔ تم ایک لا حاصل جنگ لڑ رہی ہو۔ مگر میری محبت کی شدت تمہیں پگھلا دے گی۔ میری چاہت اتنی سچی ہے کہ ایک روز تم خود چل کر میرے پاس آؤ گی۔

سیکنہ نے خط پڑھ کر پھاڑ ڈالا۔ اور راشد کو بھلا کر زندگی کے ہنگاموں میں کھو گئی۔

☆.....☆.....☆

یوں ہی چند دن گزر گئے تھے۔ سیکنہ خیالوں میں گم لیٹی ہوئی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ تو اس کے سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ سیکنہ نے اس عورت کو دیکھا تو اسے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ راشد کی والدہ تھی۔ راشد اور اس کی والدہ سے ملاقات دو سال قبل ہوئی تھی۔

انہیں دیکھتے ہی سیکنہ کے منہ سے بے ساختہ ”ماں جی“ نکلا اور وہ انہیں لے کر کمرے میں آ گئی۔ سیکنہ نے ان کو صوفے پر بڑے احترام سے بٹھایا اور پوچھا۔

”آپ کیا پیئیں گی ٹھنڈا یا گرم؟“ بوڑھی عورت نے ہاتھ بڑھا کر سیکنہ کا بازو تھام لیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

”کچھ نہیں بیٹی..... کچھ بھی نہیں..... بس یہ دیکھو..... یہ میری پھیلی ہوئی جھولی دیکھو..... اس میں میرے راشد کی زندگی کی بھیک ڈال دو۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سیکنہ پہلے تو بھونچکی سی ہو کر کھڑی رہی۔ پھر اس نے راشد کی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولی۔

”ماں جی! ہوا کیا ہے؟“ بڑھیا آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔

”بیٹی سیکنہ! میرا بیٹا راشد تمہیں پسند کرتا ہے۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر تم اس سے انکاری ہو۔ اس نے مجھے یہ کہلوا کر تمہارے پاس بھیجا ہے کہ اب اس سے تمہاری جدائی برداشت نہیں ہو پارہی۔ اگر تم نے ہاں نہ کی تو وہ اپنی جان دے دے گا۔“ یہ سن کر سیکنہ کا چہرہ سفید ہو گیا۔ اور سوالیہ نگاہوں سے بڑھیا کی طرف دیکھنے لگی۔

”بیٹی..... راشد کے ارادے آج بہت ہی خطرناک

کبھی راشد کو کسی بھی معاملے میں زحمت نہ دی تھی۔ راشد اب اس کے گھر تو نہ آتا تھا۔ مگر کبھی کبھار فون کر کے ماں بیٹی کی خیریت ضرور معلوم کر لیتا تھا۔

سیکنہ نے راشد کا نمبر ملایا اور اسے نئی کوڈ اکثر کے پاس لے جانے کا کہا تو اس نے دیر نہ لگائی اور فوراً ہی آ گیا۔ وہ دونوں کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ نومی کا معائنہ کرایا اور اسٹور سے ادویات بھی اپنی جیب سے لے کر دیں۔

راشد بہت ہی خوش تھا کہ سیکنہ نے اسے کسی کام کے بہانے بلا یا تو ہے۔ راشد جلال کے انتقال کے بعد سیکنہ کے بہت قریب آ گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگا تھا مگر اس میں اظہار کی جرأت نہ تھی۔ یہ سب کچھ بتدریج اور اتنے غیر محسوس انداز میں ہوا تھا کہ سیکنہ کو پتا ہی نہ چلا اور نہ ہی راشد کو، راشد دل ہی دل میں سیکنہ کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگا۔

اسپتال سے واپسی پر سیکنہ کو اس وقت شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ جب ڈرائیونگ کرتے ہوئے راشد نے اپنا ہاتھ سیکنہ کے ہاتھ پر رکھ دیا اور جلتی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

سیکنہ تو سکتے میں رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بعض اوقات حالات اتنا بڑا دھوکہ بھی دے جاتے ہیں اور جذبوں کو اتنے غلط معنی بھی پہنائے جاسکتے ہیں۔

راشد ایسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور وہ گھر میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اس روز کے بعد سیکنہ کبھی راشد سے نہ ملی۔ اس نے بے شمار فون کیے۔ اس کے دروازے تک آیا۔ ہر طرح سے اس تک رسائی کی کوشش کی۔ لیکن سیکنہ نے دوسری شادی کا باب ہی بند کر دیا۔ اس نے اپنے آپ کو پتھر کا بنا لیا۔ اس سے جو ایک غلطی ہوئی تھی وہ ہی بہت تھی۔ اب وہ کسی بھی طرح سے راشد کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی تھی اور اگر وہ ایسا کرتی بھی تو یہ سراسر دھوکہ ہوتا۔ قریب ہوتا، کیونکہ وہ تو دوسری شادی کا خیال بھی دل میں نہیں لاتی تھی۔ راشد نے ہر طرف سے

مایوس ہو کر ایک خط سیکنہ کے نام لکھا اور اس کے گھر کے دروازے پر ڈال گیا۔ اس نے بہت ساری باتیں لکھی تھیں اور اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کا اور نومی کا وفادار رہے گا اور ان کی زندگی میں پھول کھلا دے گا۔

نہیں تھا کہ ایک روز وہ اس انداز میں بھی سوچے گی۔ وہ تو ایک آہنی عورت تھی۔ آرن لیڈی تھی۔ نہ جھکنے والی نہ ٹوٹنے والی..... لیکن ایک ماں نے اس کی ممتا کو چھیڑ کر اسے موم بنا دیا تھا۔ اس کے اپنے ہی تیرے اُسے شکار کر لیا تھا۔ اس لیے اب سوال کسی مرد کا یا اس کی خواہش کا نہیں رہا تھا۔ اب سوال ممتا کے بھرم کا تھا۔ ممتا اور اس کی بھگی آنکھوں کا تھا۔ سیکنہ اب سب کچھ بھولتی جا رہی تھی۔ اب اسے ایک ہی بات یاد تھی کہ اسے ایک ماں کے بیٹے کو بچانا ہے۔ جو آج کسی وقت اپنی جان لینے والا ہے۔

وہ دیر تک خالی نظروں سے دیواروں کو کھورتی رہی۔ راشد کی بوڑھی والدہ بھگی آنکھوں سے اس کے رخ چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں ممتا کا نور ٹھانٹھیں مار رہا تھا۔ سیکنہ کے بال ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ وہ مہربان اور عظیم جذبوں کی مالک کوئی قدیم دیوی نظر آ رہی تھی۔ جس کی ایک نگاہ کسی لاعلاج مریض کی مسیحا کی کر سکتی تھی۔ آخر وہ بولی۔ ”ماں جی! میں ماں ہو کر ایک ماں کا بھرم رکھوں گی میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“

☆.....☆.....☆

ادھر راشد اپنے کمرے میں بے چینی سے ماں کی واپسی کا منتظر تھا۔ سائڈ ٹیبل پر خواب آور گولیوں کی بوتل اور پانی کا گلاس رکھا تھا۔ ناکامی کی صورت میں اس نے گولیوں کی بوتل حلق میں انڈیل لینی تھی۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور زندگی کی ٹکون روشنی کی صورت اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ماں سیکنہ اور نومی کو دیکھا تو سکھ کا سانس لیا۔ اور اس کا سینہ جذبات انگیز دھڑکنوں سے بھر گیا۔ اس کی محبت جیت گئی تھی۔ بے اختیار اس کے آنسو اس کے گالوں کو بھگونے لگے۔ اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”مجھے یقین تھا تم آؤ گی سیکنہ!“

”ہاں راشد میں آگئی ہوں۔ میں نے ایک ماں کی لاج رکھ لی ہے۔“ سیکنہ بولی۔ راشد بے اختیار ہو کر آگے بڑھا اور تمام دوریاں مٹ گئیں۔

☆☆.....☆☆

لگ رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنی زندگی ختم نہ کر ڈالے۔ میں اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔ بیٹی تم سے دور ہو کر میرے بیٹے نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اس کی زندگی اور موت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم کسی طرح اسے بچالو۔“ بڑھیا رونے لگی تھی۔ سیکنہ کچھ دیر سر جھکائے سوچتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ماں جی آپ کی حالت پر میرا دل رور رہا ہے۔ مگر افسوس میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ میں ایک بچے کی ماں ہوں۔ مرحوم خاوند کی یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ میں عمر بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ اب میں اپنی جان تو دے سکتی ہوں مگر میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔“ سیکنہ کے جواب نے بوڑھی کے چہرے پر مایوسی پھیلا دی۔ وہ لرزتی ہوئی اٹھی اور نومی کا ہاتھ چوم کر بولی۔

”بیٹی! میں اور تم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تو بھی ماں ہے اور میں بھی ماں ہوں۔ تیرا بھی ایک بیٹا ہے اور میرے دل کا ٹکڑا بھی ایک ہی ہے۔ ذرا میری جگہ اپنے آپ کو رکھ کر سوچو۔ تم نے تو اپنے بچے کے ساتھ صرف پانچ سال گزارے ہیں۔ مگر میں پچیس سال گزار چکی ہوں۔ پچیس سال میری آنکھوں نے اس کی بلائیں لی ہیں۔ میں نے اسے پھلتا پھولتا دیکھا ہے۔ اب میرے دل میں اس کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو جوان ہوئی ہے۔ پچیس سال بعد اگر کل مجھے اپنے جوان بیٹے کا لاشہ دیکھنا پڑا تو مجھ پر کیا گزرے گی۔ تم اپنے معصوم کو دیکھو اور سوچو کہ میرا کیا حال ہوگا۔ میں نے بھی اسے تیری طرح لوریاں دی ہیں۔ سینے سے لپٹا کر سلایا ہے۔ گلے میں بستہ ڈال کر اسکول بھیجا ہے۔ اس کے انتظار میں اپنی تپتی دوپہروں کو بے قرار کیا ہے۔ لیکن یہ تو بہت پہلے کی باتیں ہیں۔ اب تو وہ جوان ہو چکا ہے۔ اب تو میرے مہر کی شاخوں پر پھول کھلنے والے تھے۔ اب اگر وہ مجھے اکیلا چھوڑ گیا تو کیا ہوگا میرا..... میں بھی مر جاؤں گی۔ میری قبر بھی اس کے ساتھ بنے گی۔“ راشد کی والدہ پھر زار و قطار رونے لگی۔

اچانک سیکنہ کو احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی ہے۔ ایک ماں کا دکھ دوسری ماں ہی محسوس کر سکتی ہے۔ یہ دکھ ایک دھومیں کی طرح خود بخود سیکنہ کے سینے میں بھرتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی

READING
Section

آیت خدا اور اوپر

ہمراہ

ڈیرہ غازی خان سے ایک عزت کے لٹیرے کا دلخراش قصہ عبرت

سمجھ گیا کہ ماں کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، اس طرح میں کھل کر بد تمیزیاں کرنے پر اتر آیا۔ اب اسکول میں جن دوستوں سے مجھے چڑھتی کہ وہ بہت بری باتیں کرتے ہیں میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا اور وہ جو مجھے 'مسجد کی کڑی' کہتے تھے۔ اب وہ مجھ سے ہر وہ بات کہتے جو مجھے بری لگتی تھی لیکن اب مجھے وہ باتیں بری کہاں لگتی تھیں۔ اب تو میرا ان کے بغیر دل ہی نہیں لگتا تھا، یوں میں گمراہ ہوتا گیا اور گناہوں کی دلدل میں دھنستا گیا۔

☆.....☆.....☆

پھر ایک بار ہمارے اسکول میں پارٹی تھی۔ وہ شاید عید ملن پارٹی تھی یا شاید نئے سال کی پارٹی تھی، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ خیر اس میں یونیفارم میں نہیں بلکہ کپڑے پہن کر جانا تھا۔ کھانا اپنی طرف سے لے کر آنا تھا اور موبائل کیمرہ وغیرہ بھی لانا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا۔ اسکول میں ہر طرف جیسے رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ احسن اور شہروز اپنے کیمرے لائے ہوئے تھے اور ہم سب ایک جگہ چھپ کر لڑکیوں کی فوٹو بنانے لگے۔ کسی لڑکے ہمیں دیکھ لیا اور ہمارے کلاس ٹیچر کو بتا دیا جس سے ہمیں بہت ڈانٹ پڑی

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہماری فیملی کوئی بہت بڑی نہیں تھی میں، میری بہن، ای اور ابوتھے۔ ابو کی اپنی کپڑوں کی چھوٹی موٹی دکان تھی اور فیملی بڑی نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا خوشحال گھرانہ تھا۔ ابو اور ای ہم دونوں سے بہت پیار کرتے کیونکہ ہم ہی ان کی کل کائنات تھے۔ انہوں نے ہمیں بہترین اسکول میں تعلیم دلوائی تھی۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن میری عادتیں بہت خراب ہو رہی تھیں، اس کی وجہ شاید میرے دوست تھے جو کہ مجھ سے بھی زیادہ امیر تھے، وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی گھنیا حرکت کرتے رہتے تھے۔

پہلے پہل تو مجھے یہ سب بہت برا لگا لیکن پھر میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ کبھی ای ابو نے بھی کوئی نصیحت نہیں کی تھی۔ وہ صرف ہمیں ایک ہی نصیحت کرتے کہ دل لگا کر بڑھنا اور اچھے نمبر لے کے آنا۔ اس طرح ہمیں کھلی چھٹی مل گئی اور اب میں بھی انہیں گالی کا جواب گالی سے ہی دیتا اور ای ہمیشہ مجھے ابو سے بچا لیتی تھیں۔ وہ میرے لیے پوری دنیا سے لڑنے کو تیار تھیں۔ ان کو اگر کوئی یہ کہہ دیتا کہ تمہارا بیٹا بگڑ رہا ہے تو وہ اس پر برس پڑتی تھیں۔ اس طرح میں

تھی۔

پھر احسن نے کھڑے ہو کر کہا۔

”سر میری تو بہن ہی نہیں..... ماں تو ہے۔“

کے کہنے پر وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے، دیکھو بیٹا یہ مت سمجھنا کہ تم

کسی کی بہن کے ساتھ بد تمیزی کرو گے تو تمہاری بہن

محفوظ رہے گی۔ نہیں یہ قدرت کا انصاف ہے۔ جب

تم برا کرو گے تو تمہاری بہن کے ساتھ بھی ضرور ہوگا

اور پھر دیکھنا تمہاری ایک غلطی تمہاری پوری زندگی میں

طوفان کھڑا کر دے گی۔“

لیکن ہم نے اُن کی کسی بات پر دھیان نہیں دیا

پھر کچھ دن بعد ہماری کلاس میں سرفراز صاحب

آئے جو کہ ہمیں قرأت پڑھاتے تھے۔ انہیں بھی وہ

بات پتا چل گئی تھی اور پھر وہ نرم لہجے میں سمجھانے لگے

کیہ یہ بہت بری بات ہے۔ لیکن ہم بے زار سے بیٹھے

تھے تبھی سر بولے۔

”دیکھو بیٹا ابھی تم لوگوں کو ہماری باتیں غلط لگتی

ہیں۔ جب تم لوگوں پر گزرے گی تو تب تمہیں پتا چلے

گا اگر کوئی تمہاری بہن کے ساتھ ایسا کرے تو تم

لوگوں کو کیسا لگے گا؟“



READING
Section

سے ساتھ لے آئیں اور یوں معصوم سی بھولی بھالی شازیہ بے فکر ہو کر اسے اپنا گھر سمجھنے لگی۔

☆.....☆.....☆

شازیہ کو جو کام بتایا جاتا، ڈٹ کر وہ کام کرنے لگتی اور وہ میرے کام تو بہت ہی شوق سے کرتی تھی، ایک دن میں نے اُسے کپڑے استری کرنے کا کہا تھا وہ گنگناتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

”کسی دن بنوں کی میں راجہ کی رانی.....“

”عدیل بھائی کون سے کپڑے استری کروں؟“

اس نے معصومیت سے پوچھا تھا اور میرے اندر کا ورنہ آہستہ آہستہ جاگنے لگا تھا۔

”وہ سفید والے کر دو۔“ میں نے کنگھا کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ہیں عدیل بھائی! آج آپ یہ والے کپڑے پہنودیکھو کتنے پیارے لگ رہے ہو آپ۔“ اس نے کپڑے دکھاتے ہوئے کہا اور میں نے اُسے زور سے اپنے گلے لگایا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی مزید بیش قدی کرتا، وہ پیچھے ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”کیا ہوا؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں بھیا! میں سوچ رہی تھی کہ اتنا پیار تو کبھی میرے گلے بھائی نے بھی نہیں کیا، جتنا آپ کرتے ہیں۔“ اس نے آنسو صاف کیے اور باہر نکل گئی اور میں کیمنی سی ہنسی ہنستا اُسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ”سبزا تو گھر میں ہی موجود ہے۔ ایک دم نرم اور فریش فریش۔“ یہ سوچ کر میں ہنسنے لگا بہت کینے خیال آ رہے تھے مجھے اور میں یہ بھی نہیں سوچ سکا کہ وہ بھولی بھالی لڑکی مجھے بھائی مانتی ہے اور وہ تو اتنی معصوم ہے کہ میری ہر بری بات کو سمجھتی ہی نہیں بلکہ وہ سمجھتی تھی کہ میں بھائی ہونے کے ناتے اُسے گلے لگاتا ہوں۔

☆.....☆.....☆

پھر کچھ دن بعد سب کو کسی مایوں کے فنکشن میں جانا پڑا۔ شازیہ نے جانے سے انکار کر دیا اور میں نے بھی موقع غنیمت جان کر انکار کر دیا۔ اتنا اچھا موقع پھر نہیں آسکتا تھا۔ سارے افراد جاچکے تھے تو میں

اور اپنے کاموں میں مشغول ہو کر اپنی جوانی کی سیڑھی پر قدم رکھا پھر کیا تھا اب ہم پورا کام کرنے لگے تھے۔ لڑکی کو دیکھتے اس سے دوستی کرتے، پھر پیار میں مبتلا کرتے اور ہونٹ کے کمرے میں لے آتے۔ جس میں احسن اور شہروز پہلے سے ہی موجود ہوتے اور اُس پر بھوکے بھینٹے کی طرح جھپٹتے۔ وہ لڑکی روتی چلاتی لیکن اُس کی چیخیں کمرے میں دب کر رہ جاتیں اور ہم لوگ مل کر اُسے بھنبھوڑ ڈالتے۔

پھر ایک دن میں کسی لڑکی کو اجازت کر گھر پہنچا تو گھر میں ایک بھولی بھالی معصوم لڑکی کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، امی نے اس لڑکی سے کہا۔

”جاؤ شازیہ بیٹی! یہ تمہارا بڑا بھائی ہے عدیل۔“

وہ معصوم سی بھولی بھالی حسینہ مسکراتی ہوئی میری طرف آئی اور کہنے لگی۔

”سلام بھیا۔“ اُس نے سر جھکایا تاکہ میں اُس کے سر پر ہاتھ رکھوں لیکن میں نے آگے بڑھ کر ڈھٹائی سے اُسے بانہوں میں بھر لیا۔ جس کا اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا اور شرماتی مسکراتی تھوڑی دور ہو کر کھڑی ہو گئی، بھی امی بولیں۔

”بیٹا یہ شازیہ ہے۔ اب یہ ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں ہی رہے گی، اسے بھی تم اپنی چھوٹی بہن ایمن کی طرح سمجھنا۔“ امی نے کہا۔

”اور شازیہ یہ آج سے تمہارا بڑا بھائی ہے اور تم بھی میری طرح اس پر اپنا حق جتانو۔“ ایمن نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

شازیہ امی کی دور پرے کی ایک رشتے دار کی بیٹی تھی۔ امی اور شازیہ کی ماں بہت اچھی دوست بھی تھیں۔ شازیہ کے دو بھائی تھے، اس کے ماں باپ وفات پاچکے تھے۔ دونوں بھائی بھی شادی شدہ تھے اور وہ اُس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ دونوں اپنی بیویوں میں مست تھے اور اُس کی بھابھیاں اس سے خار کھاتی تھیں۔ آئے دن نند سے جھگڑا کرتی تھیں۔ اس لیے وہ امی کے ساتھ آگئی تھی۔ امی تو دیے بھی حقوق العباد سے واقف تھیں، سو وہ اُسے خوشی

سب لوگ مایوں سے واپس لوٹے تو اُسے اس حالت میں دیکھ کر سب کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ امی نے بھاگ کر اُسے کپڑوں سے ڈھانپا اور ایمن اُسے گلے لگا کر رونے لگی، پھر امی نے اس سے پوچھا۔

”تو اُس نے میرا نام لیا اور میں صاف منکر گیا کہ میں نے ایک آدمی سے بات کرتے دیکھا تھا۔ میری طرف اشارہ کرنے پر امی سخت طیش میں آ گئیں اور اُسے برا بھلا کہنے لگی۔

”گھنی میسنی..... میں نے تجھے گھر میں پناہ دی اور تو میرے ہی بیٹے کو پھنسانا چاہ رہی ہے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم کتنی کمیننی ہو، اس لیے تو تجھے بھائیوں نے نکال دیا ہے۔“ وہ روتی رہی، صفائی دیتی رہی لیکن کسی نے اُس کی بات نہیں سنی، کسی نے اُس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میں ایک کونے میں کھڑا اُسے دیکھتا اور مسکراتا رہتا، یہاں تک کہ امی نے اُسے گھر سے بے دخل کر دیا، ابھی میں بھی باہر نکل آیا۔

”دیکھو شازیہ! میں نے کہا تھا نا کہ کسی کو مت بتانا۔ اب دیکھا تمہارا کیا حال ہوا ہے، اب کہاں جاؤ گی؟ اگر تم میری بات مانو تو میں تمہیں اس گھر میں واپس لے جاسکتا ہوں۔“ میں نے گھٹیا پن کی حد کر دی۔ اس نے ایک زوردار کھپڑ میرے منہ پر مارا اور کہا۔

”کہنے تو میری عزت سے کھیلا ہے، دیکھنا کل میرا بدلہ کوئی تم سے ضرور لے گا۔ اس دنیا میں کسی نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا لیکن ادھر والا ضرور انصاف کرے گا۔“ یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

اس کے بعد وہ اپنے بھائیوں کے گھر گئی کیسے گئی مجھے نہیں پتا لیکن وہاں بھی اُس کی کہانی سننے کے بعد بھائیوں نے اُسے کمیننی، بے غیرت جیسے الزام لگا کر گھر سے باہر پھینک دیا۔ اس نے ہر وہ دروازہ کھٹکھٹایا جو وہ جانتی تھی لیکن سب نے اُسے باہر کر دیا۔ تنگ کے شدید احساس سے وہ سرخ ہو چکی تھی۔ وہ ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔ کوئی اُسے پناہ دینے کو تیار ہی نہیں تھا۔

نہانے کے لیے واٹس روم میں گھس گیا۔ میں کچھ دیر پانی بہاتا رہا پھر میں نے شازیہ کو آواز دی۔ وہ بھی کہ شاید میرے کپڑے مانگ رہا ہوں۔ وہ کپڑے لے کر آئی تو میں نے اُس کی کلائی پکڑ لی۔

”بھیا کیا کر رہے ہیں، یہ لیس کپڑے، میری کلائی چھوڑیں۔“ اس نے دیوار کا سہارا لیا اور کپڑے مجھے دے کر واپس اندر چلی گئی۔ میں نے شلوار پہنی اور باہر نکل آیا، شازیہ اندر اپنے کپڑے تبدیل کر رہی تھی میرے اندر کا درندہ پوری طرح جاگنے لگا۔

☆.....☆.....☆

میں اندر داخل ہو گیا۔ شازیہ نے بوکھلا کر دوپٹا آگے کیا اور کہنے لگی۔

”سوری بھیا! میں نے کنڈی نہیں لگائی، آپ باہر جائیں، میں ابھی آتی ہوں۔“ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”وہ کیا ہے شازیہ مجھے جلن ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کہاں ہو رہی ہے بھیا؟“ وہ پریشانی سے بولی تو میں نے کمینگی سے ایک گندہ اشارہ کیا، جس سے وہ زرد پڑ گئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھیا۔ بہنوں سے بھی ایسا مذاق کرتے ہیں کیا۔“ وہ روہا تھی ہو کر بولی تھی۔ لیکن میں بے پردا آگے بڑھا۔

”پلیز مجھے اپنی پیاس بجھانے دو۔“ میں نے مسکرا کر کہا تھا۔

”بھیا پلیز آپ بہن بھائی جیسے پاکیزہ رشتے کی توہین کر رہے ہیں۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

”دیکھو شازیہ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور ہم مزے بھی کر لیں گے۔“ میں ایک دم آگے بڑھا اور اُس کو پکڑ لیا۔

”بھیا مجھے چھوڑیں..... خدا کا واسطہ عدیل مجھے چھوڑ دو..... خدا کے قبر سے ڈرو، تمہاری بھی بہن ہے..... یا اللہ۔“ وہ چیختی رہی، چلاتی رہی لیکن میں نے اپنا کام پورا کیا اور اُسے برہنہ چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

READING
Section

میں ایمین کا رشتہ آیا جو کہ ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ ای نے جھٹ ہاں کر دی اور پھر روز شاپنگ ہونے لگی۔ ایمین کا سارا جہیز اکٹھا ہو چکا تھا۔ میں بھی بہت خوش تھا اور ہوتا بھی کیوں نا، آخر میری بہن کی شادی تھی اور جہاں تک شازیہ کا قصہ تھا، اس سے تو میں بالکل بھی شرمندہ نہیں تھا کیونکہ میں نے تو شازیہ جیسی کئی لڑکیوں کو اُجاڑا تھا اور مجھے کوئی پچھتاوا بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ لوگ کہتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ کرتا ہے اُس کے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے لیکن میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، اب تو میری بہن کی شادی بھی ہو رہی تھی، یہ سوچ کر ہی پُ سکون تھا لیکن کہتے ہیں نا کہ اللہ کے آگے دیر ہے اندھیر نہیں۔

اس طرح ایمین کو ماپوں میں بٹھا دیا گیا اور ای ابو بازار فرنیچر کا سامان دیکھنے چلے گئے۔ میں ایمین کے پاس آیا اور کہا کہ تم کھانا مت بناؤ میں ہوٹل سے لے آتا ہوں۔ میں مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہوٹل ہمارے گھر سے تھوڑی ہی دوری پر تھا۔ اس لیے کھانا لیتے ہوئے مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ خیر میں کھانا لے کر واپس آیا تو میں نے اپنے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ جنہوں نے ہاتھوں میں موبائل لے رکھے تھے، میں بھڑک کر چیرتا ہوا اندر داخل ہوا تو ساکت رہ گیا۔

مخن میں میری بہن برہنہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے شازیہ کو چھوڑ کر گیا تھا۔ میں کانپ کر رہ گیا اور لوگ کھڑے اُس کی تصویریں بنا رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اُسے اٹھایا اور کمرے میں لے گیا۔ ای ابو بھی آگئے۔ وہ بھی سینہ پیٹ کر روئے لگے۔ مجھے شازیہ یاد آنے لگی تھی۔ جو مجھے بھیا کہتی تھی اور ہر وہ لڑکی یاد آنے لگی جو مجھے بہن کا واسطہ دیتی تھی۔ آج مجھے پتا چلا کہ جب اپنی بہن کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو کیسا لگتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ ”کس نے کیا ہے؟“ ایک آدی نے کہا۔

”بلے (بلاول) نے۔“ میں نے پستول اٹھائی اور اُس کے گھر میں کھس گیا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا۔ میں نے ساری گولیاں اُس کے سینے میں اتار دیں۔ محلے

وہ یا گلوں کی طرح گلی گلی، مگر مگر پھرتی رہی۔ کہیں اُس نے کچھ مردوں کو کھڑے دیکھا اور اندھا دھند بھاگنے لگی۔ عدیل کے بعد اُس کا ہر رشتے سے اعتبار اٹھ چکا تھا۔ وہ سمجھی کہ وہ مرد بھی اُس کا جسم نوچنے کے لیے کھڑے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے کسی چیز سے ٹکرائی اور اچھل کر سڑک پر جا گری، وہاں سے آتے ٹرک نے اُس کے جسم کی دھجیاں اُڑا دیں۔

اُس کے مرنے کے بعد اُس کا قصہ دب کر رہ گیا۔ کسی نے مجھ پر کیس نہیں کیا اور تو اور کسی نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ معصوم سی لڑکی جس چیز سے ٹکرائی تھی، وہ میری بانٹیک تھی اور وہ بھی میں نے جان بوجھ کر کیا تاکہ کوئی مجھ پر کیس نہ کر سکے کہ میں نے اُس لڑکی کا ریپ کیا ہے اور پھر میں تھوڑی دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب اُس نے اپنی آخری سانسیں لے لیں، تب میں نے سکون کی سانس لی اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

اب ہمارے گھر میں شازیہ کا ذکر نہیں ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ وہ کبھی ہمارے گھر کا حصہ تھی ہی نہیں۔ ابو اور ای اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے اور میں اپنے کاموں کو پھر سے کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

اس واقعے کو گزرے سال ہو گیا کہ ایک دن مظہر شازیہ کا بھائی اس سے ملنے آ گیا۔ ہم سب حیران ہوئے کہ انہیں شازیہ کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا، حالانکہ شازیہ اپنے گھر بھی نہیں گئی تھی۔ امی نے اُسے سارا واقعہ بتایا تو وہ یک دم طیش میں آ گئے، لیکن امی نے اسے بے عزت کر کے گھر سے باہر نکال دیا۔

مظہر گھر پہنچا تو اس نے سب سے پہلے اپنی بیوی ناہید کو اپنے پاس بلایا اور اس سے شازیہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ یہاں نہیں آئی تھی۔ جب مظہر نے اُسے دو تھپڑ مارے تو اس نے سب بتا دیا کہ اُس نے اُسے اپنے گھر ہی نہیں آنے دیا۔ مظہر نے اُسے جانوروں کی طرح پٹا لیکن اب کیا فائدہ تھا۔ وہ معصوم تو اس دنیا سے جا چکی تھی، وہ بھی ”بدکار“ کا نام پا کر۔

پھر پانچ سال کا طویل عرصہ گزر گیا، اس عرصے

حضرت عمر فاروقؓ

اسلامی سال کا آغاز اس جانباز انسان کی شہادت سے ہوتا ہے جو 22 لاکھ ایکڑ زمین پر تنہا حکومت کرتا تھا۔ جو اپنے دور حکومت میں راتوں کو اٹھ کر اوکوں کی خبر گیری کرتا تھا۔ جس کے قدموں کی آہٹ سن کر شیطان میلوں دور بھاگ جاتا تھا۔ جو حکمران ہونے کے باوجود بھی سوکھی روٹی کھاتا تھا۔ جس کے خوف سے کفار کانپتے تھے۔ وہ اسلام کے خلیفہ دومؓ "حضرت عمر فاروقؓ" ہیں۔

☆.....☆ ☆.....☆

حضرت عمر فاروقؓ کی زوجہ (کاتکہ) کہتی ہیں کہ عمرؓ بستر پر سونے کے لیے لیٹتے تو نیند ہی اڑ جاتی۔ بیٹھ کر رونا شروع کر دیتے تھے۔ میں پوچھتی تھی۔ "اے امیر المؤمنین! کیا ہوا؟" فرماتے۔ "مجھے محمد ﷺ کی امت کی خلافت ملی ہوئی ہے اور ان میں مسکین بھی ہیں ضعیف بھی ہیں اور مظلوم بھی، مجھے ڈر لگتا ہے اللہ تعالیٰ مجھ سے ان سب کے بارے میں سوال کرے گا۔ مجھ سے جو کوتاہی ہوئی تو میں اللہ اور اس کے نبی ﷺ کو کیا جواب دوں گا۔"

حسن انتخاب: راز عدن۔ بحرین

سزا ملی تو وہ ایک دن مسکراتی ہوئی آئی تھی۔
"دیکھا عدیل کسی نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا لیکن قدرت کا انصاف دیکھو۔ اُس نے کیسا انتقام لیا ہے میرا۔"

اتنے عرصے میں عدیل کی ماں صرف دو بار ہی اُس سے ملنے آئی تھی۔ وہ ماں جو اس کے لیے ساری دنیا سے لڑنے کو تیار تھی۔ وہ آج اس کی وجہ سے اپنے خاندان سے کٹ کر رہنے لگی تھی۔ پہلی ملاقات پر ماں نے کہا تھا۔

"عدیل مجھے یہ کہتے ہوئے بہت ہنک مٹوس ہو رہی ہے کہ میں نے تجھ جیسے سنیو لیے کو جنم دیا ہے اور دراصل غلطی میری ہے میں نے تجھے اگر شروع سے ہی لڑکیوں کی عزت کرنا سکھائی ہوتی تو آج یہ نوبت ہی نہ آتی۔"

میری بہن ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی ہے اور یہی حال اب میرے ماں باپ کا بھی ہے۔ گلی سے گزرتے ہوئے انہیں کتنی ذلت اٹھانی پڑتی ہے یہ تو وہی جانتے ہیں۔

لیکن ایک بات طے ہے انسان جو بھی کچھ کرے بالخصوص برائی تو اس سے پہلے اپنا انجام بھی اچھی طرح سوچ لے۔

☆ ☆.....☆ ☆

میں بھونچال آ گیا، اسی وقت پولیس آگئی اور مجھے پکڑ کر لے گئی۔

اس کے بعد مجھے عدالت لے جایا گیا جس میں، میں نے اپنے سارے اگلے پچھلے گناہ قبول کیے کہ شازیہ سے میں نے زبردستی کی تھی۔ ای ابو سید تھام کر رہ گئے اور مظہر اور اظہر کی بیویاں شرمندہ سی نظریں چرا گئیں۔ میں نے سارے گناہ قبول کر لیے تھے اس لیے عدالت سے مجھے عمر قید ہو گئی۔

آج پورے گیارہ ماہ ہو گئے ہیں مجھے جیل میں بیٹھے ہوئے اور اس سب کا میں خود ذمے دار ہوں۔ میں نے اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے ختم کر ڈالی۔ شازیہ صحیح کہتی تھی کہ قدرت ضرور انصاف کرے گی اور وہ ٹھیک کہتی تھی۔ آج قدرت نے انصاف کر دیا تھا، یہی میری سزا ہے جب مجھے والدین کی خدمت کرنی چاہیے تھی۔ میں جیل میں آ گیا تھا۔ میری بہن کی میرے کرموں کی وجہ سے شادی ٹوٹ گئی تھی۔ اگر میں شادی کر لیتا اور ایک عزت دار زندگی گزارتا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ شازیہ ضرور میرے خواب میں آئی تھی اور مجھے کہتی۔

"عدیل تمہیں سزا ضرور ملے گی۔" اور جب مجھے

ساتویں سچ بیانی

دکھ کی فصیل کٹ گئی

مسنویدہ شاہی



کراچی سے اُس دوشیزہ کی کہتا، جس نے ایک ٹویل دکھ کی فصیل کے بعد سکھ پایا تھا

اچھا کھانا آرام وہ گاڑی میں گھومنے سے محروم رکھا اور اوپر سے شکل صورت بھی خوبصورت نہیں بنائی۔ اسد سب سے بڑا تھا جس کی عمر 13 سال تھی۔ عمر 12 سال کا تھا اور کنول 10 سال کی تھی۔ کنول میری ہم عمر تھی۔ میں اپنے والدین کی شادی کے دس سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ اوپر سے حسن کی دولت سے مالا مال تھی۔

چچا کی فیملی اکثر ہمارے گھر آتی رہتی تھی۔ ای چچی جان کی فیملی کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ چچا جان اور چچی جان ہر وقت میری نظر اتارتے رہتے تھے۔ گود میں اٹھائے رکھتے۔

چچی جان میرے ناز اٹھانے میں ہمیشہ سب سے آگے رہتی تھیں۔ وہ اکثر کنول کو کہتی تھیں کہ دیکھو طوبی کے ساتھ بیٹھی یہ ایسی لگ رہی ہے جیسے طوبی کی داسی ہو۔

ای کو چچی جان کی باتیں سن کر بڑا غصہ آتا۔ جس کا وہ برملا اظہار بھی کرتی تھیں کہ آپ یہ کیسی باتیں کرتی ہیں کنول بھی پیاری بچی ہے۔ گورا کالا سب اللہ کے رنگ ہیں۔ اللہ کو پسند ہیں اس لیے اس نے بنائے ہیں۔ بس دعا کریں کہ اللہ قسمت اچھی

میرا نام طوبی ہے۔ میں اپنی خوبصورتی کی وجہ سے ہمیشہ ہی خاص رہی ہوں۔ مگر جو جو کسی نے کہا ہے کہ اچھی صورت بھی کیا چیز ہے، جس نے ڈالی نگاہ غلط ڈالی۔

میں حقیقت میں سونے کا چیمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ دولت ہمارے گھر کی باندی تھی۔ سب لوگ میری گوری اور گلانی رنگت سنہرے بال دیکھ کر بے ساختہ ماشا اللہ ضرور کہتے تھے۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ میرے والد کا نام شکیل تھا۔ میرے ایک چچا بھی تھے جن کا نام عقیل تھا۔ اُن کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

ابا جتنے دولت مند تھے، چچا اتنے ہی غریب، مفلسی نے اُن کے گھر میں ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ اوپر سے تین بچے اور تینوں بچوں کی شکل پر ایسا لگتا تھا کہ جیسے خدا نے کالک پوت دی ہے۔ جی ہاں، اُن کے رنگ بہت کالے تھے۔ لڑکے تو کالے چل جاتے ہیں مگر کالی کلوتی لڑکی کو کوئی نہیں پوچھتا اوپر سے جلن اور حسد نے لڑکی کا چہرہ اور بگاڑ دیا تھا۔

اکثر تینوں بہن بھائی خدا سے شکوہ کرتے کہ اے اللہ تو نے ہمیں دولت سے محروم رکھا، اچھے کپڑوں

کرے۔“

بات سن کر چچی تنگ کر کہتیں۔
آپ ایسی باتیں کر سکتی ہیں کیونکہ آپ کی بیٹی
خوبصورت ہے۔ میری گڑیا، میری رانی میری
آنکھوں کی ٹھنڈک۔“

امی کی بات سن کر وہ کہتیں۔ ”ارے بھی جو
خوبصورت ہے اسے تو خوبصورت ہی کہوں گی۔ میری
بیٹی تو کالی کے ساتھ ساتھ قسمت بھی بری لکھوا کر لائی
ہے۔“

میں چچی جان کا اتنا پیار دیکھ کر خوش ہو جاتی۔ اور
خود پر رشک کرتی مگر کبھی غرور نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میری
امی نے میری اچھی تربیت کی تھی۔

”کنول بھی میری بیٹی ہے۔ جتنا میں طوبی کو
دوں گی اتنا ہی کنول کو بھی دوں گی۔“ امی یہ کہہ کر کنول
کو گلے سے لگا لیتی تھیں۔ مگر چچی ہنس کر کہتیں۔

☆.....☆.....☆

دن اسی طرح ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ اچانک
امی ابو کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ ابو موقع پر ہی دم توڑ گئے۔
امی کافی زخمی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی
ریڑھ کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ شاید اب یہ

”کالا رنگ تمام خوشیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔“
”نہیں بھابی گورایا کالا نہیں، اچھی سیرت ہی
زندگی بناتی ہے۔ یہ رنگ روپ تو چار دن کی کہانی
ہے۔ تمام عمر تو لڑکی اپنے کرموں ہی کا کھاتی ہے۔“ یہ



READING
Section

کیسے کیسے سانپ لوٹتے ہیں میرے سینے پر۔“ یہ کنول کی آواز تھی۔ جس نے میری ریڑھی کی ہڈی میں سنناہٹ بھردی تھی۔

”ارے بیٹا تو میری چندا ہے۔ ذرا صبر کر لو۔ اسد سے طوبی کے رشتے کے لیے تمہارے بابا اور میں سوچ رہے ہیں۔ گھر کی دولت گھر میں ہی آجائے گی۔ پھر اس کو تمہاری نوکرائی نہ بنا دیا تو میرا نام بدل دینا۔ بس جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں تھوڑا صبر اور میری جان!“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب مجھے ساری زندگی اس حسین چڑیل کو جھیلنا ہوگا۔ نہیں ایسا نہ کریں۔ کچھ ایسا کریں کہ یہ ہماری نظروں سے دور ہو جائے۔“ کنول زہرا اٹھ رہی تھی۔

”بیٹا تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔ جب تک اس کی ماں زندہ ہے، ہم طوبی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”ہا ہا! وہ عورت اپنا بیچ ہوتے ہوئے بھی ابھی تک نہیں مری۔ شوہر کے غم میں ہی مرجاتی۔ پتا نہیں کب تک انتظار کرائے گی بڑھیا۔“

اتنی زہر بھری باتیں سن کر میرا سانس یکدم ہی گھٹنے لگا تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ میں خوبصورت ہوں۔

چچی جان میں تو اپنا دل پہلے ہی اسد کو دے چکی تھی۔ میرے نزدیک تو خوبصورتی بدصورتی کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی تھی، میں تو خود بہ خود اس دولت جائیداد کو چچا کے نام کر دینا چاہتی تھی۔ میں نے ای سے بات کر بھی لی تھی مگر بس مناسب وقت کا انتظار تھا۔ مگر آپ سب نے میری آنکھیں کھول دیں کہ میں تو خود اپنے پیروں پر کلباڑی مارنے والی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اللہ نے میرے سامنے اعتبار کی دیوار کے پیچھے کا اصل روپ آپ ہی آپ ظاہر کر دیا۔

☆.....☆.....☆

اس سے پہلے کہ میں اپنی ماں کو ان باتوں کا راز دار بناتی کہ ایک حادثے نے میرا سب کچھ لوٹ لیا۔ ابھی میں نہا کر کمرے میں آئی تھی۔ آج میں نے

تمام زندگی کھڑی نہ ہو سکیں۔ یہ سب سن کر میرا برا حال تھا۔ ایسے دردناک موقع پر میری چچی جان نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی کوشش تھی کہ میں اس حادثے سے جلد سے جلد نکل آؤں۔ اس مشکل گھڑی میں چچا اور چچی نے میرا بھرپور ساتھ دیا اور یوں میں دوبارہ زندگی سے نانا جوڑنے میں کامیاب ہوئی۔

چچا جان نے ابو کے کاروبار کی باگ ڈور سنبھال لی۔

ای جان اپنے دیور اور دیورانی کی شکر گزار تھیں کہ ایسے حالات میں اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو ہمارا کیا ہوتا؟ امی کی دیکھ بھال میری دیکھ بھال، گھر کا سارا انتظام چچا اور چچی نے سنبھال لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر وقت نے کروٹ لی اور کچھ سال آگے سرک گئے۔ چچی جان کے بچوں کی اچھی رہائش، اچھی خوراک اور اچھا لباس بھی ان کے کالے رنگ کو نہیں بدل سکا۔ ہاں بس اتنا ہوا کوئی دیکھتا تو انہیں بس قبول صورت ہی کہتا۔ مگر میں ان حادثات سے گزرنے کے باوجود بھی روز بروز نکھرتی ہی چلی گئی۔ جو مجھے دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔

ایک روز مجھے میٹھ کے سوال حل کرنے میں کچھ پرابلم ہو رہی تھی اس لیے میں اسد بھائی سے مدد لینے کے لیے ان کے کمرے کی جانب چل دی۔ جب میں چچی کے کمرے کے پاس سے گزری تو اپنا نام سن کر چونک گئی اور بحس سے ان کی بات سننے پر مجبور ہو گئی کہ میرا نام کیوں لیا جا رہا ہے۔ چچی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

”طوبی کی تعریف کر کے اب میں تنگ آ چکی ہوں۔ الو کی پنہی کے نام تمام جائیداد ہے۔ ابھی صرف پندرہ سال کی ہے۔ تین سال ابھی اور اس کو سہنا ہوگا۔ جب یہ جائیداد اپنی مرضی سے اپنے چچا کے نام کر دے گی تو مجھے سکون آئے گا۔“

”مگر ماما تب تک میں آپ سے کالی کالی کا گانا سنتی رہوں گی۔ اور وہ حسن کی پری بنی رہے گی۔ آپ کو پتا نہیں ہے جب کوئی اس کی تعریف کرتا ہے تو

گھلائی لباس پہن رکھا تھا۔ میں اپنے لمبے بال سکھا رہی تھی کہ چچا جان کمرے میں داخل ہوئے۔

”میری بیٹیا کیا کر رہی ہے۔ ارے نہا کر آئی ہے۔“ میں چچا جان کو دیکھ کر پہلے حیران ہوئی پھر ان کی ٹیٹھی باتوں پر مجھے اپنے بابا جانی یاد آ گئے۔

وہ بھی مجھے پیار میں بیٹیا ہی کہتے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ چچا جان کو کیا پتا کہ چچی جان اور کنول کے دل میں میرے لیے کتنی نفرت ہے۔ ”دل چاہا انہیں سب کچھ بتادوں لیکن ایک نادیدہ طاقت نے مجھے خاموش کرادیا۔ اس لیے میں چچا جان سے کچھ بھی نہیں کہہ پائی۔

”طوبی بیٹی تمہارے بال کتنے لمبے ہیں انہیں کیسے سلجھائی ہو آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ چچا جان نے محبت سے کہا تو میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ چچا جان پھر بولے۔

”تمہیں پتا ہے کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ یہ خوبصورت تم نے کہاں سے حاصل کی۔ تمہیں میں جب سے جانتا ہوں جب تم تیرہ سال کی ہوئی تھیں۔ تمہیں پیار کر کے مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تمہارے گورے گورے ہاتھ تھام کر بہت مزہ آتا ہے۔“ میرے ذہن میں چچا کے روپ میں میرے بابا تھے اس لیے مجھے ان کی باتیں سن کر اچھا لگ رہا تھا۔ میں خوش تھی کہ چلو چچا جان تو مجھ سے سچا پیار کرتے ہیں۔ پھر چچا جان نے میری کمر کے گرد اپنے ہاتھ جمائل کر دیے اور ان کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی اب مجھے ہوش آ گیا کہ یہ محبت اور شفقت نہیں بلکہ ہوس ہے۔ اور میرے ساتھ میرے گے چچا کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔

”چچا جان آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟“ میرے منہ پر رومال باندھ کر انہوں نے میری عزت تار تار کر دی۔ مجھے لوٹنے کے بعد وہ بولے۔

”اب تم اپنی زبان بند رکھنا۔ اس بند کمرے کی بات باہر نہ جائے بہتری اسی میں ہے۔ اے لڑکی! خاموش رہنا۔ اگر کسی کو کچھ بتایا تو اچھا نہیں ہوگا۔ تیری حسین صورت سے مجھے نفرت ہے، جو میری بیٹی کو

پچھے چھوڑ گئی ہے۔ اب تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تیری خوبصورتی ہی تیری بربادی ہے۔“ میں حیرانی سے سب باتیں سن رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی بربادی کا ماتم کروں تو کس سے اور اب کس طرح سے میں اپنی اس زندہ لاش کو زندگی کے تابوت میں دوبارہ لے کر جاؤں؟

مجھ پر کیا بیٹی، کس کو بتاتی۔ اپنی اپناج ماں کو، جو خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتی، وہ میری حفاظت کیسے کرتی۔ جس کو باپ سمجھا وہ لٹیرانکلا۔ اور میری عزت کا جنازہ نکال کر، میرے ہی گھر میں پورے استحقاق کے ساتھ موجود تھا۔

ادھر کنول کی مجھ سے نفرت دن بے دن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آخر اس کی نفرت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے میرا چہرہ جلانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس کام میں ایک مشکل تھی اگر کسی کو خبر ہو جاتی کہ مجھ پر تیزاب پھینکا گیا ہے تو پولیس ان سب کا جینا حرام کر دیتی آخر اس نے سوچ لیا کہ وہ مجھ پر کھولتا ہوا پانی پھینک کر میرا چہرہ جلانے لگی۔

اب کنول موقع کی تلاش میں تھی۔ آخر اسے وہ موقع مل ہی گیا۔

☆.....☆.....☆

میں نماز پڑھنے کھڑی ہوئی تو کنول نے کھولتا ہوا پانی مجھ پر پھینک دیا۔ اسی وقت میں رکوع میں گئی تھی اور اس ظالم نے کھولتا ہوا پانی مجھ پر پھینک دیا جس سے میرا پیٹ پاؤں اور سر جل گیا۔ میں بے ساختہ چیخ پڑی میری چیخ سن کر چچا اور چچی نے آ کر دیکھا کہ میری پیٹھ اور پاؤں بری طرح جلے ہوئے ہیں میں درد سے چلا رہی تھی اور کنول کھولتے پانی کی بالٹی لیے کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ گھر کے نوکر یہ منظر دیکھتے۔ چچا جان نے پانی کی بالٹی ایک طرف رکھی اور مجھے اٹھا کر باتھ روم میں پھینک دیا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ اور پھر وہ دونوں باہر کھڑے ہو کر چیخنے لگ گئے کہ طوبی دروازہ کھولو کیا ہوا ہے بیٹا دروازہ کھولو۔“ چچی مگر مجھ کے آنسو بہائے چلی جا رہی تھیں۔ اتنے میں چچا آگے آئے اور بولے۔

صاحب کا گناہ میری کوکھ میں ہی ختم کر دیا گیا۔

☆.....☆.....☆

ماں کے بعد میری زندگی کو چچی جان نے ایک کمرے میں قید کر دیا۔

میں نے اپنے کمرے سے نکلنا بند کر دیا۔ بہت ضرورت کے وقت ہی میں باہر نکلتی ورنہ نہیں۔ مہینوں سے میں ایک ہی کمرے میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ باہر کیا ہو رہا ہے مجھے کچھ پتا نہ ہوتا۔ نہ ہی کوئی مجھے کچھ بتاتا تھا۔ کسی نے آ کر یہ تک نہ پوچھا کہ تم کمرے سے باہر کیوں نہیں آتی ہو؟

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ میں نے خدا سے لو لگالی۔ وہ جو سب کے حال سے واقف اور مختار کل ہے۔ کل تک دولت جس کے گھر کی باندی تھی آج وہ یتیم ہو کر اپنے ہی گھر میں قید تھی۔

عقیل صاحب نے آفس کے ایک قابل لڑکے کو دولت کا لالچ دے کر کنول سے شادی کرنے پر راضی کر لیا۔ اسد بڑھائی کرنے لندن چلا گیا اور دولت کو ہر مرض کی دوا سمجھنے والوں کو دولت نے ہی بگاڑ دیا۔ عمر غلط کام جوا، شراب کا عادی ہو کر دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا تھا۔

چچا، چچی کو صرف عمر کا ہی تھوڑا غم تھا کہ وہ بگڑ گیا ہے ورنہ وہ خوشیاں خوب کیش کر رہے تھے۔ اپنی خوشیوں میں خوش تھے انہیں دوسروں کے غم کی کیا پروا تھی۔

☆.....☆.....☆

اللہ ظالم کی ری دراز ضرور کرتا ہے مگر جب پکڑتا ہے تو.....

ایک دن چچا سوئے تو دوسرے دن ان سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ پتا چلا کہ ان کو فالج کا حملہ ہوا ہے۔ ان کا آدھا دھڑ بالکل بے جان ہو گیا۔ پیسہ پانی کی طرح بہا یا گیا مگر وہ ٹھیک نہیں ہوئے، بلکہ پتا چلا کہ ان کے دل کے تینوں وال بھی بند ہو گئے ہیں۔ اسی غم میں چچی کو شوگر اور ہائی بلڈ پریشر ہو گیا اور لینے کے دینے بڑ گئے۔

لوگوں کو شوگر ہوتی ہے ہائی بلڈ پریشر ہوتا ہے مگر

”تم پیچھے ہٹو میں دروازہ توڑ دیتا ہوں۔“ جب تک گھر کے نوکر کمرے تک آچکے تھے۔ چچا نے دروازہ توڑنے کی اداکاری کرتے ہوئے زور سے کک لگائی اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی چچی جان چلا کر بولیں۔

”عقیل آپ سب باہر کھڑے رہیں، میں اور کنول اندر جا کر دیکھتے ہیں۔ پتا نہیں طوبی باتھ روم میں کس حالت میں ہو۔“ وہ دونوں باتھ روم میں داخل ہوئے اور وہیں سے چیخنے لگیں۔

”عقیل صاحب! جلدی سے اسپتال چلنے کی تیاری کریں، ہماری گڑیا طوبی جل گئی ہے۔“

مجھے ایک ہفتے کے بعد ہوش آیا تھا۔ میری کمر اور پیر بری طرح جل گئے تھے۔ ہاسپٹل میں میرا علاج شروع ہوا علاج کے دوران ایک نیا انکشاف سامنے آیا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ یہ بات سن کر سب مجھے برا بھلا کہنے لگے اور سب میں یہ مشہور کر دیا گیا کہ اسی پاپ کی وجہ سے میں خود کو جلا رہی تھی۔ کج بخت حسین تو تھی ہی مگر بد کردار بھی نکلی۔ ”سب مجھ پر تھو تھو کرنے لگے تھے۔“

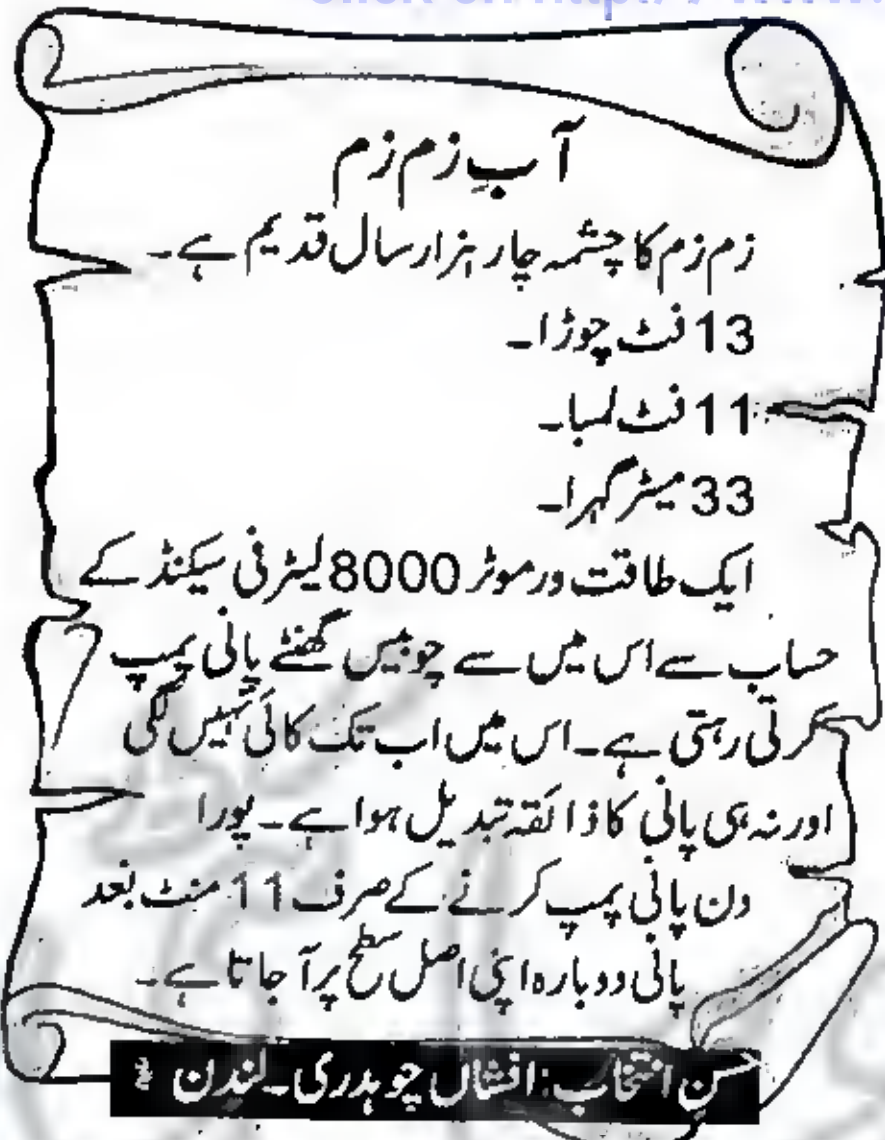
☆.....☆.....☆

جب امی کو پتا چلا کہ میں کنواری ماں بننے والی ہوں اور اس وجہ سے میں نے اپنے آپ کو جلانے کی کوشش کی ہے۔ تو اس غم میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میری ماں میری دنیا ویران کر کے بہت دور چلی گئی۔

اب میں تنہا رہ گئی تھی۔ لوگوں کی نفرت بھری نگاہیں سہنے کے لیے ابھی میں صرف 16 سال کی ہوئی تھی۔ مگر بدنامی میں، میں نے اتنا نام کما لیا کہ اسپتال میں بھی ہر کوئی مجھ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

اوپر سے چچا جان نے ڈاکٹر پر زور دینا شروع کر دیا کہ کچھ ایسا کریں کہ میری کوکھ میں پل رہے بچے سے میری جان چھوٹ جائے۔ آپ جتنا پیسہ مانگیں گے میں دوں گا۔“

چچا جان جانتے تھے کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ اب وہ کسی بھی قیمت میں اس بچے کو اس دنیا میں نہیں لانا چاہتے تھے۔ آخر عقیل صاحب کا پیسہ جیت گیا اور عقیل



آب زم زم

زم زم کا چشمہ چار ہزار سال قدیم ہے۔

13 فٹ چوڑا۔

11 فٹ لمبا۔

33 میٹر گہرا۔

ایک طاقت ور موٹر 8000 لیٹرنی سیکنڈ کے

حساب سے اس میں سے چوبیس گھنٹے پانی پمپ

کرتی رہتی ہے۔ اس میں اب تک کافی نہیں لگی

اور نہ ہی پانی کا ذائقہ تبدیل ہوا ہے۔ پورا

دن پانی پمپ کرنے کے صرف 11 منٹ بعد

پانی دوبارہ اپنی اصل سطح پر آ جاتا ہے۔

حسن انتخاب: انشاں چوہدری۔ لندن

ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔

یہ سنتے ہی عقیل صاحب کی آنکھوں میں آنسو

آگے۔ کیونکہ انہوں نے بھی ایک محصوم بچی کے

ساتھ یہی کچھ کیا تھا۔

پھر خبر آئی کہ کنول کی بچی زخموں کی تاب نہ لا کر

مر گئی ہے اور کنول اسی گم میں پاگل ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

اسد جب گھر واپس آیا تو یہ سب حالات دیکھ کر

حیران رہ گیا۔ اب کنول بالکل پاگل ہو چکی تھی۔

کبھی وہ بلیڈ سے اپنے آپ کو زخمی کرتی کبھی

چھری سے اور کبھی سے اپنے سر کے تمام بال کاٹ لیتی

۔ چچا جان تو خود تکلیف میں تھے۔ اوپر سے کنول کا غم،

مگر انہیں موت نہ آتی تھی۔

ایک دن اسد نے ملازم سے پوچھا کہ طوبی کہاں

ہے؟

ملازم نے اُسے بتایا کہ طوبی تو اپنے کمرے میں

ہوتی ہیں کچھ ہو جائے وہ کمرے سے باہر نہیں آتی۔

سالوں بیت گئے، اُن کو کسی نے نہیں دیکھا۔ ہاں ایک

ملازمہ عائشہ ہی صرف اُس کے کمرے میں جاتی

ہے۔ اسد یہ سب سن کر غصے میں طوبی کے کمرے

وہ سالوں جیتے ہیں، مگر اُن کی یہ بیماری اتنی خطرناک ہو گئی کہ اُن کے جسم میں پانی بھرنا شروع ہو جاتا پھر وہ پانی پھوڑا بن کر پھٹ جاتا اور وہاں زخم بن جاتا۔ دوسرا غم اُن کو یہ لگا کہ ان کے لاڈلے عمر کو کسی نے گولی مار دی۔ جوان بیٹے کی موت نے اُن دونوں کو توڑ کر رکھ دیا۔

پھر سونے پہ سہا کہ یہ ہوا کہ کنول کے شوہر نے کنول کو طلاق دے دی۔ اپنی چار سالہ بیٹی کو لے کر کنول روتی پیٹتی گھر آ گئی۔ اُس کی بچی بھی اپنی ماں کی طرح کالی سیاہ تھی۔

مگر کنول اب خود ماں تھی اس لیے اُسے اپنی بیٹی حور پر ی لگتی۔ ان پر یہ حادثات کو برداشت کرتے اور بیماری سے نبرد آزما بچی جان کا ایک دن اس دنیا سے ناپاٹا ٹوٹ گیا۔

اب چچا جان بستر پر موت کے منتظر موت سے بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ اب اُن کے جسم پر کیڑے پڑ جاتے تھے اور جسم سے عجیب ناگوار بو آتی تھی۔

وہ سب سے کہتے ہیں کہ خدا کے لیے میری موت کی دعا کرو۔ مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔

کنول نے اپنے بڑے بھائی اسد کو فون کیا اور یہاں کے حالات بتا کر گھر آنے کی تاکید کی۔ اب

کنول اکیلی باپ اور بیٹی دونوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ مگر کسی نے میرے کمرے میں جا کر نہیں جھانکا کہ میں کیسی ہوں زندہ بھی ہوں یا مر گئی ہوں۔

میں نے پہلے ہی سب سے ناپاٹا توڑ کر کمرے میں بسیرا کر لیا تھا۔

کوئی ملازمہ آتی کھانا پانی دیتی اور چلی جاتی۔

☆.....☆.....☆

ایک دن اچانک شور و غل نے مجھے باہر جھانکنے پر مجبور کیا۔ آخر وجہ کیا ہے؟ کنول کیوں چیخ رہی ہے۔

یہ گھر میں کیسا شور ہے۔ یہ کیا ہنگامہ ہے۔ چچا جان نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنے ملازم سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ کنول کیوں آسمان سر پر اٹھا رہی ہے۔

انہیں ملازم سے پتا چلا کہ کنول کی چھ سالہ بیٹی کی مالی کے بیٹے نے عزت خراب کر دی ہے۔ اور وہ بچی کو

چچا جان اتنے سالوں کے بعد مجھے اپنے رو برو پا کر حیران ہو گئے اور مجھے دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑنے لگے۔

”مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔“

اسد نے پوچھا کہ ”ابو آپ طوبیٰ سے معافی کیوں مانگ رہے ہیں۔“

”اسد چچا جان سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ مجھ سے پوچھو۔“

”خدا یا تم ہی بتا دو طوبیٰ۔“

”میری عزت چچا جان نے ہی خراب کی تھی۔ اور کنول نے کس طرح گھولتا پانی ڈال کر مجھے جلایا تھا میں ٹھیک تو ہو گئی۔ مگر پیچھے سر میں بال آج تک نہیں آئے۔ بدنامی، ذلت سے بچنے کے لیے میں نے کمرے میں پناہ لی تھی۔“

اسد میرا ہاتھ تھام کر کنول کے پاس لے آیا مگر وہ ہوش میں کبھی۔ عجیب وحشت ٹپک رہی تھی اس پر اس کے چہرے پر جگہ جگہ سے زخم اور سر کے بال کٹے ہوئے تھے۔ میں اس کا ایسا حشر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کنول مجھے دیکھ کر پاگل پن میں بھی پہچان گئی اور بے ساختہ بولی تھی۔

”نہیں نہیں! میں تمہارا سامنا نہیں کر سکتی..... کبھی نہیں۔“ اور یہ کہتی ہوئی وہ بھاگنے لگی اور سیڑھیاں چڑھتی تیسری منزل پر پہنچ گئی۔ سب نے کوشش کی کہ وہ بچ جائے مگر اس نے تیسری منزل سے چھلانگ لگا دی۔

کنول کی موت اور بیٹے کے سامنے رسوائی سے اسی پل چچا جان کا بھی دم نکل گیا۔

یہ بھی میری کہانی! آج میں اسد کے ساتھ ایک بھر پور زندگی گزار رہی ہوں۔ ظالم اپنے انجام کو پہنچ چکے۔ اسد رنگ کا کالا ضرور ہے لیکن من کا اجلا ہے۔ ہیرے جیسے دل والا اسد میری تمام محرومیوں پر اپنی محبت کے پھائے رکھ چکا ہے۔ خدا میری جنت پر اب کسی کالے دل والے کا سایہ نہ پڑنے دے۔ (آمین)۔

☆☆.....☆☆

میں چلا گیا۔ ”اُف یہ کون سی پری ہے جو حوروں جیسا پاکیزہ چہرہ لیے قرآن پاک کی تلاوت کر رہی ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے نور نے اُس کے چہرے پر ایسا گل کھلایا ہوا کہ نگاہ بے ساختہ عقیدت سے جھک جائے۔ وہ طوبیٰ کو مخاطب کر کے بولا۔

”یہ سب کیا ہے طوبیٰ اس گھر میں اتنا کچھ ہو گیا مگر تم اس کمرے سے باہر نہیں آئی ہو۔ کیا کیا قیامت گزر گئی اس گھر پر مگر تم آرام سے اس کمرے میں رہیں۔ تمہیں امی کی موت کا غم نہیں، عمر کا غم نہیں، کنول کے اجڑنے کا غم نہیں، میرے ابو کے تڑپ تڑپ کر جینے کا غم نہیں۔ کنول کی بیٹی مر گئی ہے، تمہیں اُس کا بھی غم نہیں۔“

کنول کی بیٹی کا سن کر میں نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ کب ہوا۔ سچی مجھے بتائیں۔“ یہ کہتے میرا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ میرے اس شدت سے رونے پر اسد حیران ہو گیا پھر میں دوبارہ بولی۔

”وہ سچی بچی مر گئی اور میں آج تک زندہ ہوں۔ مجھ سے زیادہ بے شرم اور کوئی نہیں۔“ اب اسد کو ساری بات سمجھ آ گئی تھی وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ طوبیٰ تم صرف یہ بتا دو کہ تمہاری عزت کس نے خراب کی تھی۔“

میں آنسوؤں سے تر چہرہ لیے اسد کو دیکھنے لگی۔ ”پلیز طوبیٰ! میں تم کو بہت چاہتا تھا۔ جب مجھے پتا چلا کہ تم ایسی ہو تو تم سے دور چلا گیا۔ مگر تمہارے آنسو بتا رہے ہیں تم پاکیزہ ہو، تم پاک ہو۔ تمہیں کسی نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔

پلیز دیکھو یہ قرآن رکھا ہے۔ تم اُس کو پڑھتی ہو۔ تمہیں اس کی قسم بتا دو۔“

”اسد تم سن سکو گے، تم میں سچ سننے کا حوصلہ ہے۔“

”ہاں ہاں! مجھ میں سچ سننے کا حوصلہ ہے۔“ ”تو چلو چچا جان کے پاس۔ وہاں جا کر میں تمہیں بتاتی ہوں۔“

☆☆.....☆☆

آٹھویں سچ بیانی

کانچ کی گڑیا

میرا خان

شاہ کوٹ سے اُس دو شیرہ کی کہانی، جسے کانچ کی چوڑیوں کی چاہ نے چکنا چور کر دیا

کو اس نے بے حد لاڈ سے پکارا۔
”کیا ہے تجھے؟، سکون سے سبزی بھی نہیں لینے

”اماں..... او اماں، سنو نا۔“ سامنے والے
اسٹور پر نظر جمائے سبزی کے لیے بھاؤ تاؤ کرتی ماں



READING
Section

”لے دو نا اماں! دیکھو نا کتنا اچھا ہے“ اس سے پہلے کے سکینہ انکار کرتی وہ ماں کا پلو تھام کر اس سے بولی تو سکینہ اپنی مٹھی میں دبے دبے دس دس کے چارنوٹوں کو بھینچ کر رہ گئی۔

”ابھی رہنے دے عید پر لے دوں گی“ وہ مرے مرے سے لہجے میں کہتی فاطمہ کا ہاتھ تھام کر دکان سے باہر نکل نکلنے لگی مگر فاطمہ بس سے مس نہ ہوئی۔

”لے دو نا اماں۔“ وہ ضد پر اتر آئی۔

”چل ضد نہ کر کہا نا عید پر لے دوں گی۔“ وہ پھر سے اس کا ہاتھ پکڑ کر دکان سے باہر کھینچنے لگی ”کون سی عید پر لے کر دے گی اماں، عید پر تو نے کہا تھا بکر عید پر لے دوں گی اور پھر بکر عید بھی گزر گئی، میں آج چوڑیاں لیے بنا نہیں جاؤں گی“ فاطمہ کی بات پر سکینہ دکاندار کے سامنے شرمندہ ہو کر رہ گئی، اس بار اس نے سختی سے فاطمہ کا ہاتھ کھینچا تو وہ اس کے ساتھ چلتی چلی آئی۔

”شرم نہیں آتی تجھے دوسروں کے سامنے ذلیل کراتے ہوئے“ وہ آہستہ آواز میں اسے جھڑکتے ہوئے ایک بار پھر سبزی کی ریڑھی کی طرف بڑھی۔

”ارے کیوں ڈانٹ رہی ہے۔ بچی ہی تو ہے، آجا میں دلا دیتا ہوں چوڑیاں۔ ویسے سکینہ اب تیری فاطمہ بھی بچی نہیں رہی دیکھ تو ماشاء اللہ کیا اٹھان ہے“ ندیم نجانے کب سے کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اب سرخ اور کالے پرنٹ کے سوٹ کے ساتھ سرخ دوپٹہ اوڑھے فاطمہ کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بڑے گھٹیا انداز میں بولا تو سکینہ کو تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

”چل دفع دور تجھے کتنی باز کہا ہے میرے رستے میں نہ آیا کر۔“ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ لہجے کے ہزاروں حصے میں فاطمہ کو اس خبیث کی نظروں سے کہیں دور لے جائے، یا پھر سامنے کھڑے ندیم کو ہی فنا کر دے۔ آج تک اس نے ہزاروں بار اسے دھتکارا تھا مگر وہ بھی بڑا ڈھیٹ تھا۔ ہر بار اس کے راستے میں چلا آتا ”اماں میں نے آج ہی لینی ہیں“ ان دونوں کی باتوں پر بالکل بھی دھیان دینے بنا

دیتی خبردار جو آئندہ میرے ساتھ آئی ہو، گھر رہا کر اپنی دادی کے پاس“ سبزی کی قیمت نے ویسے ہی سکینہ کا دماغ گرم کر دیا تھا اوپر سے فاطمہ کی بے وقت پکار، وہ بری طرح چڑ کر بولی۔ ”اماں، سن نا اماں“ ماں کو ایک بار پھر سبزی کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر فاطمہ نے اس کا پلو بھینچ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

”ہاں بول بھی، میرا ٹیم (ٹائم) کھوٹا نہ کرا بھی جا کر مجھے ہانڈی چولہا بھی کرنا ہے۔ تیرا باپ گھر آنے ہی والا ہوگا، کھانا تیار نہ ہو تو پھر ٹھیکہ (مصیبت) کھڑا کر دے گا“ اس کی پکار پر سکینہ بولتی ہی چلی گئی مگر فاطمہ نے اس کا ایک لفظ بھی نہیں سنا اس کی نظریں تو سامنے اسٹور کے شوکیس سے جھانکتی لال ہری چوڑیوں پر لگی ہوئی تھی۔

”اماں مجھے وہ دلا دے نا۔“ اس نے شوکیس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا تو اس بے وقت کی فرمائش پر ایک لمحے کو سکینہ نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا مگر توجہ دے بنا بھی نہ رہ سکی، کہ آخر اس کے سینے میں ماں کا دل تھا اور بیٹی کی آنکھوں سے جھلکتی شدید خواہش اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی مگر جب بولی تو لہجے میں وہی ہمیشہ کی کٹی کھلی ہوئی جومدت سے اس کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی۔

”کیا دلا دوں تجھ مہارانی کو اب میں“ اسٹور کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بیٹی کی مطلوبہ شے کو کھوجنا چاہا۔

”اماں وہ..... وہ سامنے رکھی ہیں نا لال ہری کانچ کی چوڑیاں، اماں مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہیں“ اس نے جیسے التجا کی۔

”اچھا چل دلا دیتی ہوں“ سکینہ جانے کس موڈ میں تھی کہ فاطمہ کا ہاتھ تھامے اسٹور کی طرف بڑھ گئی۔

”یہ چوڑیوں کا سیٹ کتنے کا ہے؟“ لال ہری چوڑیوں کے درمیان میں سنہری چوڑیاں اور کڑے لگا کر بڑا خوبصورت سیٹ بنایا گیا تھا۔ اگر فاطمہ کا دل لپچا گیا تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔

”پچاس روپے کا۔“ دکاندار کی آواز پر فاطمہ نے فوراً اماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔

فاطمہ شوکیس پر نظریں جمائے ایک بار پھر ضدی لہجے میں بولی تو سکیئہ کا ندیم پر آیا سارا غصہ انگلیوں کے نشان کی صورت فاطمہ کے گورے گلابی گالوں پر اتر گیا۔

”بہت ضدیں کرنی آگئی ہیں تجھے ہاں، ٹو گھر چل تجھے ٹھیک کرتی ہوں۔ میں آج تیری ساری ضدیں نکالتی ہوں۔ بہت سرچڑھ گئی ہے تو۔“ پھپھر نے ایک منٹ میں فاطمہ کو چوڑیوں سمیت سب کچھ بھلا دیا تھا اور اب وہ پورا منہ کھولے بھاں بھاں کر کے رو رہی تھی اور اس کا بازو تھامے سکیئہ بولے چلی جا رہی تھی۔ فاطمہ کے اس طرح رونے پر ارد گرد کے دکاندار ادھر متوجہ ہوئے تو ندیم چپکے سے وہاں سے کھسک گیا، اور سکیئہ لوگوں کو متوجہ ہوتے دیکھ کر سبزی بھول بھال کر روتی ہوئی فاطمہ کا ہاتھ تھامے اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی، تمام رستے نہ تو فاطمہ کے آنسو تھے تھے اور نہ سکیئہ کی بڑبڑاہٹیں۔

☆.....☆.....☆

سکیئہ کی گلی میں نکل والا گھر ندیم کا تھا، جب سکیئہ بیاہ کر آئی تو وہ اپنی ماں کے ساتھ اس گھر میں رہتا تھا اور اسے گلی کے آوارہ لڑکوں کے گروپ کا لیڈر کہا جا سکتا تھا، اور آج اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی وہ ویسا ہی تھا۔ اس کی زندگی میں بس اتنی تبدیلی آئی تھی کہ اب اس کی ماں اس دنیا میں نہیں رہی تھی شاید اس لیے اب وہ بالکل آزاد ہو گیا تھا، محلے کے لوگ اس کے منہ لگنے سے کتر کر گزر جانا بہتر سمجھتے۔ اپنی شادی کے کچھ ہی دنوں بعد سکیئہ محلے میں ہونے والی ایک شادی میں اپنی ساس کے ساتھ گئی اور وہیں ندیم نے اسے پہلی بار دیکھا، کچھ تو نئی نئی دہن کا پائپن اور کچھ شادی میں شرکت کے لیے کیا گیا سنگھار وہ تو اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس پورے محلے میں ایسی خوبصورت لڑکی نہ تھی۔

”سنو کیا نام ہے تمہارا، آج سے پہلے تو نہیں دیکھا تمہیں اس محلے میں“ موقع دیکھ کر ندیم اس کا راستہ روک کے کہرا ہو گیا۔

”کیوں بتاؤں تمہیں اپنا نام راستہ چھوڑو میرا

READING
Section

”سکیئہ نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرا دنگ لہجے میں کہا۔ اسی دوران سامنے سے لڑکیوں کے ایک گروپ کو اس طرف آتے دیکھ کر ندیم اسے گھورتا وہاں سے کھسک لیا، اور سکیئہ اسی گروپ میں شامل ہو کر آگے بڑھ گئی جو کہ شاید کمرے سے مہندی کے تھال لینے جا رہی تھیں۔

”کیا کہہ رہا تھا تمہیں؟“ لڑکیاں ندیم کو اس کے ساتھ کھڑا دیکھ چکی تھیں تبھی سکیئہ کے ساتھ چلتی لڑکی نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

”نام پوچھ رہا تھا۔“ سکیئہ لا پرواہی سے بولی۔

”ہا ہا آج نام پوچھا ہے کل..... اس سے ذرا بچ کر ہی رہنا۔“ لڑکی معنی خیز انداز میں کہہ کر ہنسی، وہ باتوں کی شوقین لگتی تھی۔ کمرے تک جاتے جاتے وہ سکیئہ کو ندیم کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی، جس پر سکیئہ نے زیادہ دھیان دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس کی دنیا دین محمد سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی تھی، لیکن اس دن کے بعد سے نوجوان ندیم کا سارا دھیان اسی کی طرف ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

سترہ سال پہلے جب سکیئہ دہن بن کر اس آنگن میں اتری تھی تو پندرہ سال کی ایک الہڑ غیار تھی، خوابوں کے بوجھ سے جھکی جھکی پلکیں بڑی بڑی خار آلود آنکھوں پر بسیرا کے رتیں، چھوٹے سے آنگن میں جب وہ سچ سچ کر چلتی تو یوں لگتا جیسے نیند میں ہو اور خوابوں کے ٹوٹنے کے خوف سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہو۔ ایسے میں اس کے پیروں میں پڑی پائل انوکھے گیت چھیڑ دیتی، اور جب بھی دین محمد چپکے سے آکر اسے ڈرا دیتا تو وہ کانپ اٹھتی اور دینو ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتا، مگر اس غلطی کی سزا میں پھر اسے گھنٹوں سکیئہ کے پیچھے پیچھے پھر کر اسے منانا پڑتا، اور جب وہ مان جاتی اور اس سے پوچھتی۔

”پھر بھی ایسا تو نہ کرو گے۔“

”کروں گا اور ضرور کروں گا۔“ وہ وہ بڑی

ڈھٹائی سے کہتا۔

”اچھا تو یہ بات ہے“ وہ خفا ہو کر اس کے پاس

رہے تھے۔

”اور کیا پیسے کی کمی پیار کو بھی کم کر دیا کرتی ہے؟“ وہ آئینے میں نظر آتے اپنے عکس سے پوچھنے لگی اور پھر خود ہی ہنس دی، جب ایک ٹیم کھا کے اگلے ٹیم بھوکے رہ جانے کا خوف ہو تو پیار محبت بے کار کی چیزیں بن کر رہ جایا کرتے ہیں، اس میں دینو کا بھی کیا قصور؟ اس نے جیسے اپنے دکھتے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔

”ایاں پانی“ فاطمہ سے چھوٹی زہرہ سوتے سے جاگ گئی تھی اور اب نیند بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی تو وہ بھی جیسے جاگ سی گئی ”میں بھی کیا پاگل ہوں فضول باتوں میں اپنا دماغ کھپانی ہوں۔ میرا وقت گزر گیا ہے۔ اب تو مجھے اپنے بچوں کا سوچنا ہے بس، اس نے جھک کر زہرہ کے ساتھ سوئی فاطمہ کے گال کو چوم لیا جہاں اب بھی اس کی انگلیوں کے نشان بڑے واضح تھے، ادرہ نشان سیکنہ کے دل کو کتنی تکلیف دے رہے تھے یہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا، اور کاش اس لمحے فاطمہ اپنی ماں کی ایک جھلک دیکھ لیتی تو جان جاتی کہ اس کے دل میں اپنے بچوں کے لیے کتنا پیار چھپا ہے، جو اس کی مجبور یوں میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ ندیم کے الفاظ یاد کر کے اس کا دل ایک بار پھر غم و غصے سے بھر گیا، ”کینہ“ وہ دھیرے سے بڑبڑائی اور ایک بار پھر فاطمہ کے گالوں کو چومتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی نظر اتاری۔

یہ مگر رات کی کہانی تھی اگلی صبح زندگی اپنی تمام تر بد صورتیوں کے ساتھ سیکنہ کے دروازے پر آکھڑی ہوئی تو وہ بھی ایک تلخ عورت، اور سخت گیر ماں بن چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

”یہ لے تیرے لیے یہ گیند بلا“ بہادر کو گیند بلا تھماتے ہوئے دینو کی آواز میں زندگی پوری طرح چمک رہی تھی۔

”اور ابا میرے لیے؟“ چھوٹا ماجد بھی اشتیاق سے آگے بڑھا اور دینو کے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں جھانکنے لگا۔

سے اٹھنے لگتی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر ہنس پڑتا۔

”ارے بگلی اسی لیے تو ستاتا ہوں کہ تجھے منانے میں مزا آتا ہے مجھے“ وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں تھام کے کہتا تو وہ شرما کے رہ جاتی۔

”پاگل ہے تو بھی، بھلا یہ کیا بات ہوئی“ وہ ناز سے کہتی اس لمحے چاہتوں کے غرور سے چور لہجہ اسے کچھ اور خوبصورت بنا جاتا، اور دینو یک ٹک اسے دیکھے چلا جاتا۔

وہ بھی کیا دن تھے خواب جیسے، اب تو نہ جانے کب سے دینو نے میری طرف دھیان سے دیکھا تک نہیں۔ وہ بستر سے اٹھ آئی اور دیوار پر ہنگے آئینے میں خود کو دیکھنے لگی، سرخ و سفید رنگت سنوا گئی تھی۔ کھلتے گلاب کا سا چہرہ مرجھایا ہوا پھول بن چکا تھا۔

”ٹو برتن نہ مانجھا کر سیکنہ، تیرے ہاتھ خراب ہو جائیں گے“ ماضی کے مہکتے لمحوں میں دینو کا ناراض لہجہ گونج رہا تھا۔

”اچھا میں نہیں دھوتی۔ تو ایسا کر مجھے نوکرانی لگوا دے؟“ سیکنہ کھلکھلائی۔

”کاش میں اس قابل ہوتا تو تجھے تو ہاتھ بھی نہ ہلانے دیتا۔ سارے کاموں کے لیے نوکر لگوا کر دیتا مگر میں تو ایک مزدور ہوں۔ تجھے بس ایسی ہی زندگی دے سکتا ہوں“ وہ یکدم ہی اداس ہو گیا تو سیکنہ بھی ساری شوخی بھول گئی، ”نہیں بھئی مجھے نہیں چاہیے کوئی نوکر و کر، یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ یہ میرا گھر ہے میں خود کام کروں، خود اسے سجاؤں، سنواروں۔ اسی میں تو میری خوشی ہے“ وہ ہلکے ہلکے لہجے میں کہتی دینو کی اداسی ختم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”سچ کہہ رہی ہے تو اس میں خوش ہے؟“ دینو نے جیسے یقین دہانی چاہی۔

”تو اور کیا میں تجھ سے جھوٹ بولوں گی بھلا“ وہ اس کے کاندھے پر سر رکھ کر لاڈ سے بولی تو وہ جیسے سو جان سے قربان ہو گیا، سیکنہ کی آنکھوں سے دو قطرے ٹپک کر اس کے سامنے پھلے ہاتھوں پر گرے تو وہ چونک کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ یہ وہ ہاتھ تو نہ تھے۔ سخت کھردرے ہاتھ تو کسی اور ہی عورت کے لگ

READING

88

طرف نلکا لگا تھا جس کے ارد گرد کی اینٹیں لگائی گئیں تھیں۔ نجو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ فاطمہ کے باپ کی طرح اس کا باپ بھی مزدوری کرتا تھا۔

”ہاں ہاں آجا اندر کمرے میں ہے“ نجو کی ماں جواب دے کر ایک بار پھر گندم دھونے میں مصروف ہو گئی۔

”اچھا تو، تو یہاں بیٹھی ہے، اور میں صبح سے تیرا انتظار کر رہی ہوں، کھیلنے کیوں نہیں آئی“ فاطمہ کے اچانک بولنے پر نجمہ عرف نجو ایک دم اچھل پڑی مگر پھر صنبھل کر مسکرائی۔

”یہ کیا چھپا پاٹو نے دکھا ذرا“ فاطمہ کی نظروں سے نجو کی یہ حرکت چھپی نہ رہ سکی تھی۔

”ارے تجھ سے کیا چھپانا۔ تو تو میری سب سے اچھی دوست ہے، آدکھالی ہوں مگر پہلے ذرا دروازہ ٹھیک سے بند کر آ“ نجو نے ہنستے ہوئے کہا تو فاطمہ جلدی سے دروازہ بند کر کے اس کے پاس آ بیٹھی۔

”ارے اتنی ساری چیزیں..... ساری تیری ہیں“ ڈھیر ساری چوڑیاں اور ہار بندے دیکھ کر فاطمہ رشک اور حیرت سے بولی۔

”ہاں تو اور کیا تجھے لگتا ہے میں نے چوری کی ہے۔“

”نہیں نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں تھا، مگر اتنی ساری چیزیں تیرے پاس آئیں کہاں سے؟ اتنی چیزیں تو نے کیسے خرید لیں اتنے پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس؟ نجو کو خفا ہوتے دیکھ کر فاطمہ جلدی سے بولی۔ اس وقت نجو کو ناراض کر کے وہ ان سب چیزوں کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ہاتھ سے بالکل نہیں گنوانا چاہتی تھی۔

”خریدی کہاں ہیں! یہ تو تحفہ ہیں۔“ نجو پر سرار انداز میں مسکرائی ”تحفہ! اتنی ساری چیزیں..... کس نے دیا یہ تحفہ؟“ فاطمہ کے بڑی بڑی آنکھوں میں بحسین ہلکورے لینے لگا۔

”نجو بس بہت باتیں ہو گئیں، اب چل کے ذرا آنا گوندھ دے میں روٹی لگا لوں پھر مجھے اماں رشیداں کو بھی پوچھنے جانا ہے سنا ہے بے چاری

”آہاٹ بال“ اپنی پسند کی چیز دیکھ کر ماجد چہکا تو دینو کو سیروں خون بڑھ گیا۔

”تو، تو نے کیا سمجھا تیرا ابا بھول گیا تھا تیری فرمائش، ایسا نہیں مجھے یاد تھا اور دیکھ جیسے ہی پیسے آئے میں لے آیا“ آج دینو بہت خوش تھا کیونکہ عرصے بعد اس کے پاس اتنے پیسے آئے تھے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کوئی کھلونا لاسکتا۔

”مجھے گڑیا نہیں لینی ابا“ گھر کا ماحول عرصے بعد بہت خوشگوار ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے تحفے دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے، سیکنہ بھی پیار سے مسکراتے ہوئے کبھی اپنے شوہر اور کبھی بچوں کو دیکھ رہی تھی تبھی فاطمہ کی آواز پر سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”کیوں نہیں لینی تجھے گڑیا؟ لڑکی ہے تو گڑیا سے ہی کھیلے گی نا“ دینو کے ماتھے پر بل پڑنے لگے تو دادی نے مداخلت کرنا ضروری سمجھا ”تو ٹھہر میں پوچھتی ہوں، ہاں مجھے بتا کیوں نہیں لینی تجھے یہ گڑیا، اچھی نہیں لگی کیا؟“ وہ فاطمہ سے مخاطب ہوئیں۔

”اچھی ہے مگر..... مجھے کالج کی چوڑیاں لینی ہیں“ سیکنہ کی تنبیہ نظریں فاطمہ کو کچھ بھی کہنے سے روک رہی تھیں، اسے اس دن کا بھپڑ بھی یاد تھا پھر بھی وہ نظریں جھکا کے بول گئی۔

”چل بس اب زیادہ خرے نہ کر پھر کبھی لے لینا چوڑیاں چل جا اب بہن کے ساتھ کھیل جا کے۔“ اس کی خواہش کو سمجھے بنا دینو اس پر خفا ہونے لگا تو وہ دل مسوس کے رہ گئی۔

”تو بھی کچھ عقل کر دینو اب وہ بچی نہیں رہی کہ گڑیا سے کھیلے، اب اس کے لیے اور چیزیں لایا کر“ فاطمہ کو اس ہوتے دیکھ کر دادی دین محمد کو سمجھانے لگی، جبکہ فاطمہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

”خالہ! نجو گھر ہے کیا“ صحن میں نجو کی ماں کو دیکھ کر فاطمہ نے دروازے سے ہی ہانک لگائی۔ یہ بھی فاطمہ کے گھر جیسا ہی ایک چھوٹا سا کچا گھر تھا ایک کمرہ کمرے کے دائیں طرف بکریاں بندھی تھیں اور کمرے کے سامنے چھوٹا سا کچا صحن جس کے ایک

READING
Section

کی سوچوں میں گم تھی۔ سیکنہ نے اس کی خاموشی اور کھوئی کھوئی کیفیت کو محسوس کیا اور اسے چوڑیاں نہ ملنے اور تھپڑ لگنے کا رد عمل سمجھ کر سوچا، ”کتنی بار سوچتی ہوں اپنے بچوں کی ساری خواہشیں پوری کروں مگر یہ مہنگائی چین لینے دے تب نا، اور پھر بیٹیوں کے زیادہ ناز نخرے نہیں اٹھانے چاہیے ہیں اگلا گھر نہ جانے کیسا ملے۔ اسے ابھی سے ضدیں پوری کرانے کی عادت پڑ گئی تو آگے جا کے مشکل ہوگی، اپنے بڑوں کے منہ سے سنی باتیں اس کے کانوں میں گونجیں۔

”ایک دو دن میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی، آخر میں اس کے بھلے کے لیے ہی تو سوچتی ہوں“ تھوڑی دیر پہلے نرم پڑتا دل اس سوچ سے سنبھل گیا۔ اپنے بڑوں کی طرح اس نے بھی کبھی یہ نہ سوچا کہ بیٹی نے اگلے گھر جانا ہے جہاں نہ جانے اسے کیسے حالات ملیں تو کیوں نا ماں باپ کے گھر اس کو اتنا پیار دیں اتنی توجہ دیں، کہ وہ ان محبتوں کے سہارے آنے والے حالات کا مقابلہ کر سکتے، اور اس کے دل میں خواہشیں اور حسرتیں نہیں بلکہ محبتیں گھر بنائیں، مگر جسے یہ سب سوچنا چاہیے تھا وہ بیٹی کے چہرے سے نظریں ہٹائے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہو چکی تھی، اور بیٹی انوکھے احساسات میں گھری، انجانے خوابوں کی سرزمین پر جانے کیا کچھ کھوجتی نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☆.....☆.....☆

”اے فاطمہ چل نا میرے گھر چل کر کھلتے ہیں، میں نے نیا چوڑیوں کا سیٹ لیا ہے، وہ بھی تجھے دکھانا ہے“ آج بہت دن بعد نجو اس کے پاس آئی تھی۔

”لیا ہے کہ تجھے میں ملا ہے؟“ اس دن سے وہ نجو سے کچھ چڑی ہوئی سی رہنے لگی تھی، نہ اس کے گھر جاتی وہ غیر ارادی طور پر اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن نجو فاطمہ کے لہجے کی لٹنی کو محسوس کیے بنا اس کی بات پر زور سے ہنس دی۔

”چل نا تجھ سے ایک ضروری بات بھی کرنی ہے“ نجو کے ہاتھ پکڑ کر اٹھانے پر وہ بادل نجو استہ اٹھ

سیڑھیوں سے پھسل کر ٹانگ تڑوا بیٹھی ہے۔ ”نجو کی ماں نے دروازے سے جھانک کر اپنی عادت کے مطابق لمبی بات کی۔

”آئی ہوں اماں“ الماری کے نچلے خانے میں کپڑوں کے نیچے اپنی چیزوں والا سا پر چھپائی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مگر میں نے تو ابھی ٹھیک سے تیری چیزیں دیکھی بھی نہیں“

”چل کل دیکھ لینا ابھی میں نہ گئی تو اماں کا تجھے پتا ہے نا پھر“ فاطمہ کے افسوس بھرے لہجے پر نجو نے تسلی کرائی۔

”لیکن یہ تجھے دے دیے کس نے؟“

”شش آہستہ بول ماں باہر ہی بیٹھی ہے، کل بتاؤں گی ابھی تو جا“

”کل تو نہ آنا میں آؤں گی تیرے گھر تاکہ تیری چیزیں بھی دیکھ لوں۔“ فاطمہ کا دل ابھی تک ان چیزوں میں ہی اٹکا تھا۔

”چل ٹھیک ہے تو آ جانا“ فاطمہ کے اشتیاق پر نجو نخر سے ہنس دی۔

☆.....☆.....☆

”کیا کوئی کسی کو اتنے تجھے بھی دے سکتا ہے؟ اور کیا نجو مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟ مجھے تو کبھی کسی نے ایسے تجھے نہیں دیے“ آئینے کے سامنے کھڑی وہ اپنا اور نجو کا موازنہ کر رہی تھی۔ سانولی سلونی کمزوری نجو کو جوانی کی دستک نے دلغری بخش دی تھی مگر وہ پھر بھی فاطمہ کا مقابلہ کرنے میں ناکام تھی اور آئینہ اسے یہ حقیقت باخوبی سمجھا رہا تھا بھی اس کے دل میں حسد دیرے دیرے ہلکورے لینے لگا۔ نجو نے اسے بتایا تھا کہ جنرل اسٹور والے کاشف نے اسے یہ سب تجھے دیے تھے کیونکہ نجمہ اسے بہت اچھی لگتی تھی، نجمہ نے جس نخر یہ لہجے میں کچھ شرماتے ہوئے یہ سب بتایا تھا اس نے فاطمہ کے دل میں عجیب سے احساسات پیدا کر دیے تھے جنہیں وہ خود بھی نہ سمجھ پا رہی تھی۔ بس وہ یہ جانتی تھی کہ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اور وہ جب سے نجو سے مل کر آئی تھی اسی طرح

اتنا آسان اور چھوٹا سا عمل منٹوں میں اتا دیا۔
”تو کب چلے گی ملنے؟“ فاطمہ جانے لگی تو نمبر
نے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ عجیب سے لہجے کہتی باہر نکل گئی۔
”وہ کہتا ہے تم اسے اچھی لگتی ہو“ آنے والے
بہت سارے دنوں میں یہ فقرہ اس کے کانوں میں
گو بختار ہا مگر وہ ملنے جانے کی جرأت نہ کر سکی۔

☆.....☆.....☆

”شش.....شش“ اس آواز پر صحن میں بیٹھی
اسکول کا کام کرتی فاطمہ نے چونک کر دیوار کی جانب
دیکھا جہاں نجمہ اسے اشارے سے اپنی طرف بلا رہی
تھی۔

”کیا ہے؟؟ فاطمہ نے دیوار کے قریب آ کر
پوچھا۔

”سنو میری ماں کو میرے اور کاشف کے بارے
میں معلوم ہو گیا ہے۔ اس نے میرا گھر سے لکلنا بند کر
دیا ہے۔ کاشف نے مجھے خط بھجوایا تھا جس میں تیرے
دوست کی طرف سے پیغام تھا۔ وہ تجھ سے ملنا چاہتا
ہے، جب بھی تو اس سے ملنا جا ہے تو بازار میں گلز
والے ارشد جنرل اسٹور پر جا کر کہہ دینا کہ امجد سے
ملنا ہے سبھی اور اس نے کہا ہے کہ جب بھی آنا وہ
چوڑیاں پہن کر آنا، جو اس نے تجھے بھیجی تھیں“ نجمہ ہار
بار پیچھے کی طرف دیکھتی آہستہ آہستہ بول رہی تھی شاید
اسے اپنی ماں کے آجانے کا ڈر تھا۔

”ہاں سمجھ گئی، سن اس سے مل ضرور لینا بہت پیار
کرتا ہے تجھ سے، اور ہاں اگر میں کل یہاں رہوں تو
مجھ سے اپنے تحفے لے جانا جو اس نے تیرے لیے
بھجوائے ہیں، اچھا اب میں جاتی ہوں ماں نہ
آجائے، تو آنا کل۔“

”لیکن تو کہاں جا رہی ہے۔“ فاطمہ کو کسی انہونی
کا احساس ہوا۔

”معلوم نہیں۔“ نجمہ عجیب سی مسکراہٹ کے
ساتھ بولی اور فاطمہ کو حیران پریشان چھوڑ کر جلدی
سے دیوار سے اتر گئی۔

”تو امجد نام ہے اس کا، اور تحفے بھی بھیجے ہیں

کھڑی ہوئی۔
”یہ دیکھ، کیسی ہیں؟“ اپنے گھر پہنچ کر اس نے
پیکٹ میں سے چوڑیاں نکال کر فاطمہ کے سامنے
لہرائیں ”وہ چوڑیوں کا وہی سیٹ تھا جس کے لیے ضد
کر کے فاطمہ نے ماں سے مار کھائی تھی۔
”یہ بھی تمہیں تحفے میں ملا ہے؟“ فاطمہ نے
مرے مرے لہجے میں پوچھا۔

”ارے نہیں یہ تو تمہارے لیے ہے، لور کھ لو۔“
”میرے لیے؟ تم لائی ہو؟“ فاطمہ نے چوڑیوں
کے لیے ہاتھ بڑھائے بنا حیرت سے پوچھا۔

”نہیں بھئی یہ تو کسی نے تمہارے لیے تحفہ بھیجا
ہے، وہ کہتا ہے تم اسے اچھی لگتی ہو“ نجمہ نے چوڑیاں
اس کی گود میں ڈالتے ہوئے لا پرواہی سے کہا، اور
فاطمہ کے سینے میں جلتے الاڈ پر جیسے کسی نے ٹھنڈا ٹھار
پانی ڈال دیا۔

”کون کہتا ہے؟“ اس نے کھوئے کھوئے لہجے
میں پوچھا۔

”اس نے نام بتانے سے منع کیا ہے، وہ تم سے
ملنا چاہتا ہے۔“

”کک کیا میں بھلا کیسے مل سکتی ہوں۔ میری ماں
کو جانتی ہونا جان نکال دے گی میری“ فاطمہ کا دل
کچھ اور کہہ رہا تھا۔ زبان کچھ اور

”چل تیری مرضی ہے، میں نے پیغام دے دیا
آگے تمہاری مرضی“ نجمہ کے رکھائی سے کہنے پر فاطمہ
کچھ گڑبڑ اسی گئی۔ وہ تو بس اس احساس کو محسوس کرنا
چاہتی تھی کہ کوئی اس سے ملنا چاہتا تھا اور وہ انکار کر
رہی تھی۔ یہ احساس کتنا دل فریب تھا مگر نجمہ کا خفا لہجہ
اسے اس احساس سے نکال لایا۔

”اچھا ان چوڑیوں کا کیا کروں۔“

”یہ تمہاری ہیں، اپنے پاس رکھو۔“

”مگر ماں سے کیا کہوں گی؟“ فاطمہ تذبذب کا
شکار تھی۔

”کہہ دینا نجمہ کا ماموں اس کے لیے بہت ساری
چیزیں لایا تھا ایک سیٹ تجھے دے دیا بس“ نجمہ نے
پرانے کھلاڑیوں کی طرح فاطمہ کی اتنی بڑی مشکل کا

سوا چارہ بھی کیا تھا جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر ایک دن سکول سے واپسی پر اس کی ملاقات نجمہ سے ہو گئی، جی بنی ہنستی کھلکھلائی نجمہ کو دیکھنے والا بنا پوچھے جان سکتا تھا کہ اب تک اس کے دامن میں صرف اور صرف خوشیاں آئی ہیں۔ نجمہ نے کیا کہا۔ کیا پوچھا۔ اسے کچھ بھی ہوش نہیں تھا، ایک بار پہلے اٹھنے والی حسد کی لہر اس بار بہت شدید تھی۔

”نجمہ کیوں..... میں کیوں نہیں؟“

”کیونکہ تجھ میں نجمہ جیسی اہمیت نہیں، آج تک اس سے ملنے تو جانہ سکی اور کیا کرے گی۔“ اس کے دل نے آئینہ دکھایا۔

”میں اس سے ملوں گی“ اس نے فیصلہ کر لیا، کچھ فیصلے جو بظاہر اتنے اہم نہیں ہوتے مگر زندگی اور موت کے فیصلے بن جایا کرتے ہیں، مگر وہ ناوان لڑکی اس حقیقت سے بھی بے خبر تھی کہ قسمت ہر کسی پر نجمہ کی طرح مہربان نہیں ہوتی۔

☆.....☆.....☆

”من نجو میں اس سے ملنا چاہتی ہوں“ اس کی ماں سبزی لینے گئی تھی اور دادی بخار کی وجہ سے ابھی تک دوائے کر سورہی تھی وہ موقع دیکھ کر نجمہ کے پاس چلی آئی۔

”ہاں تو مل لے میں نے کب منع کیا ہے“ نجمہ کھلکھلائی۔

”تو بھی چلنا میرے ساتھ۔“

”میں..... نہ بابا میں تو نہیں جا سکتی تو خود چلی جا تجھے طریقہ تو میں نے بتا دیا تھا نا“ نجمہ فوراً اجنبی بن گئی۔

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”بابا ہا ڈر..... ارے اس میں ڈر کی کیا بات ہے بھلا، کچھ نہیں ہوتا۔ میں بھی تو ملتی تھی کاشف سے کیا ہوا کچھ بھی نہیں“ اس کی بات پر نجمہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور اپنی مثال دے کر اسے قائل کرنے لگی، فاطمہ کے کالی اصرار کے بعد بھی جب نجمہ ساتھ چلنے کو راضی نہ ہوئی تو آخر وہ مایوس لوٹ آئی۔

☆.....☆.....☆

میرے لیے۔ کیا ہوگا بھلا؟ پیاری پیاری چوڑیاں، ہار بندے، وہ خوش کن خیالوں میں کھولی ہوئی تھی کہ سیکینہ کی آواز پر چونک گئی جو اسے کسی کام کے لیے پکار رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”نجمہ گھر سے بھاگ گئی“ اگلی صبح یہ خبر پورے محلے میں گردش کر رہی تھی اور محلے کی عورتیں مزے لے لے کر اس خبر پر چٹخارے دار تبصرے کرنے کے ساتھ نجمہ کے بارے میں وہ وہ کہانیاں سنانے میں مصروف تھیں جن کے بارے میں نجمہ نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔

”نجمہ کے ساتھ تیرا بڑا بہنا پان گیا تھا تجھے پتا تھا اس سارے قصے کا؟؟“ سیکینہ کے سخت لہجے پر فاطمہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔

”نہ نہیں تو مجھے تو کچھ نہیں پتا“ اس نے تھوک نکلنے ہوئے بڑی مشکلوں سے جواب دیا۔

”ہوں“ سیکینہ نے اور کچھ نہیں کہا اور شکی نظروں سے دیکھتی باہر چلی گئی تو فاطمہ کی جان میں جان آئی۔

”نہ جانے وہ کہاں گئی ہوگی کیسی ہوگی؟ اسے ڈر بھی نہیں لگا اس طرح جانے سے“ جب سے نجمہ گئی تھی فاطمہ بہت خاموش ہو گئی تھی اور ہر وقت اسی قسم کی سوچوں میں الجھی رہتی، مگر اسے زیادہ دن اس کشمکش میں رہنا نہیں پڑا تھا۔ ابھی دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ ایک صبح وہ سو کر اٹھی تو اسے پتا چلا نجمہ واپس آگئی ہے۔

”نجمہ واپس آگئی..... مگر کیوں؟“ اس نے حیرت سے سوچا، وہ نجمہ سے مل کر ساری کہانی سننے کو بے تاب تھی لیکن ماں کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا، سیکینہ نے اسے سختی سے نجمہ سے ملنے سے منع کیا تھا، لیکن محلے کی جو عورتیں نجمہ کے گھر ہو آئی تھیں ان کی زبانی بہت سی باتیں فاطمہ جان گئی تھی۔ نجمہ نے شادی کر لی تھی اور واپس آ کر ماں باپ سے معافی مانگ لی تھی۔ ماں باپ کیا کرتے اکلوتی اولاد کو کس جی سے دھتکار تے، تھوڑی بہت ڈانٹ پھنکار کے بعد اسے معافی مل گئی تھی، اور نجمہ سے کئی گنا بڑی عمر کے کاشف کو داماد کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ اب اس کے

وہ جلدی آجائے گی۔ اتنی دیر تو اس کا سکول ہے دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔“

”اماں اس کے اسکول کی چھٹی ہوئے پورا ایک گھنٹہ ہونے کو ہے۔ اتنی دیر تو اسے کبھی نہیں ہوتی“ ساس کی بات پر وہ کچھ نئی کچھ پریشانی سے بولی تو وہ بھی دل ہی دل میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئیں۔ اور پھر ایک ایک کر کے کئی گھنٹے گزر گئے، سیکینہ ہر اس گھر میں ہو آئی تھی جن کی بیٹیاں فاطمہ کے سکول میں پڑھتی تھیں، ان میں دو اس کی کلاس فیلو بھی تھیں اور ان کے کہنے کے مطابق فاطمہ آج سکول آئی ہی نہ تھی۔

”اوہ میرے خدا اب زندگی کون سا امتحان لینے والی ہے“ یہ سنتے ہی سیکینہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور وہ چکرا کر وہیں گر گئی۔ شام ڈھلی اور رات دبے قدموں چلی آئی، مگر فاطمہ کی کوئی خبر نہ ملی، ان کے گھر کی حالت ایسی تھی گویا وہاں کوئی موت ہو گئی ہو۔

”میں اس سے ملنا چاہتی ہوں نجو“ بار بار نجمہ کے کانوں میں فاطمہ کی آواز گونجتی، وہ سب کچھ بتانا چاہتی تھی مگر ڈر کی وجہ سے خاموش تھی، لیکن جب رات آدمی ڈھل گئی تو اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا اور اس نے روتے ہوئے سب کچھ بتا دیا۔ پولیس کو خبر کی گئی سب سے پہلے اسٹور والے راشد کو اس کے گھر سے گرفتار کرنے کے بعد اس کی نشاندہی پر اس مکان سے ندیم کو اس کے دوستوں سمیت گرفتار کر لیا گیا، جہاں فاطمہ بھی نیم مردہ حالت میں موجود تھی۔

☆.....☆.....☆

محلے کے بہت سے لوگ ان کے ساتھ اسپتال تک آگئے تھے اور اب ادھر ادھر بیٹھے اپنی اپنی رائے کا اظہار کرنے کے ساتھ افسوس کرتے ہوئے اس جیسے کچھ اور واقعات بھی سن رہے تھے۔ اس حقیقت سے نجمہ بھی بے خبر تھی کہ امجد کے نام سے تحفے دینے والا ندیم تھا، سیکینہ سے ہٹ کر اب اس کی گندی نظریں فاطمہ پر تل گئی تھیں اور اسے پانے کے لیے اس نے کاشف کو نجمہ کے ہاتھ یہ کام کرانے کے لیے مجبور کیا تھا۔ نجمہ کو بھی اس کا احساس جرم بے تحاشا رلا رہا تھا۔ فاطمہ کو اس راہ پر لانے والی، اس کی دبی

”ہاں کیا چاہیے تجھے؟“ اسٹور والے نے جا بختی نظروں سے گھبرائی ہوئی سی فاطمہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا، جس کے کاندھے پر اسکول بیگ لٹک رہا تھا اور کلائیوں میں لال ہری چوڑیاں تھیں جنہیں وہ دوپٹے میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”وہ میں..... مجھے امجد سے ملنا ہے“ وہ اٹک اٹک کر اپنا مدعا بیان کر گئی۔

”اوہ اچھا، تو ادھر بیچ پر بیٹھ ذرا، میں اسے خبر کرتا ہوں“ دکاندار کے چہرہ پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر فاطمہ شرمندہ سی ہو کر نظریں جھکا گئی۔

”سن میں تجھے رکشے میں بٹھا دیتا ہوں۔ اسے پتا بھی سمجھا دوں گا، وہاں تجھے امجد مل جائے گا ٹھیک ہے“ کچھ دیر فون پر مصروف رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے چل دی۔ رکشہ نہ جانے کون کون سے راستوں سے گزر رہا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کبھی کوئی خیال اس کے چہرے پر شرم کی سرخی بکھیر دیتا اور کبھی کچھ غلط ہو جانے کے خیال سے وہ بے چین ہواشتی۔ جب رکشہ آبادی سے نکل کر ذرا ویران علاقے میں داخل ہوا تو اسے کچھ غلط ہو جانے کا یقین ہو گیا، مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی، رکشہ ایک گھر کے آگے جا کر رک گیا۔

”چلو اترو بی بی تمہارا گھر آ گیا۔ یہی پتا بتایا تھا مجھے اس بندے نے“ اس کا دل چاہا رکشے والے سے کہے رکشہ موڑے اور اسے واپس لے چلے لیکن اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک لڑکا باہر آیا۔

”آؤ فاطمہ نیچے اتر آؤ“ وہ اس کے لیے اجنبی تھا لیکن اسے نام لے کر پکار رہا تھا۔

”شاید یہی امجد ہے“ پینٹ شرٹ میں ملبوس بظاہر مہذب نظر آتے نوجوان کو دیکھ کر فاطمہ کو تسلی ہوئی اور وہ نیچے اتر آئی۔

☆.....☆.....☆

سیکینہ جلے پاؤں کی ملی کی مانند اندر باہر کے نہ جانے کتنے چکر لگا چکی تھی۔

”اری اب بیٹھ بھی جا تیرے چکر کاٹنے سے کیا

READING
Section

بھی زیادہ خوبصورت ہے اور کتنی نازک جیسے کوئی کانچ کی گڑیا۔ وہ فاطمہ کو بے تحاشا چومتے ہوئے لاڈ بھرے لہجے میں کہے جا رہا تھا اور اس کے ہر لفظ کے ساتھ سکیئنہ کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو رہا تھا اور دل میں سکون ہی سکون اترتا چلا جا رہا تھا مگر نہ جانے کب زندگی کی تلخیوں اور مسئلوں میں اس گڑیا کی محبت کہیں چھپ گئی اور ایک مسائل میں الجھا باپ پیچھے رہ گیا۔

”کانچ کی گڑیا“ سکیئنہ دین محمد کے دے اس نام کو سوچتے ہوئے فاطمہ کو دیکھنے لگی، سرخ و سفید رنگت، گھنی پلکوں والی بڑی بڑی کالی سیاہ آنکھیں اور بے انتہا دلکش اور نازک نین نقش کے ساتھ وہ واقعی نازک سی گڑیا لگ رہی تھی، جسے چھونے سے ٹوٹ جانے کا خوف ہو، بالکل کانچ کی گڑیا، اور ہماری کانچ کی گڑیا جانے کب ہمارے ہاتھوں سے پھسل کر چکنا چور ہو گئی اور ہم بے خبروں کو خبر تک نہ ہو سکی اس کے تصور میں فاطمہ کا بکھرا بکھرا وجود آتا تو پہلی بار اس کے لبوں سے سسکی نکلی۔ شاید پہلی بار اس نے اس عظیم نقصان اور خوفناک حقیقت کو ذہنی طور پر تسلیم کیا تھا۔

”میں اس کی خواہش پوری نہ کر سکتی تھی تو اسے پیار سے صبر کرنا تو سکھا ہی سکتی تھی۔ آخر میں ماں تھی۔ اس کی خواہش کو جنون بننے سے روک سکتی تھی۔“ ایک ایک کر کے اسے اپنی ہر غلطی یاد آ رہی تھی ہر وہ لمحہ نیزے کی اتنی کی طرح اس کے دل میں گڑا جا رہا تھا جہاں جہاں اس نے حالات کی ستم ظریفی کا غصہ اپنی نازک گڑیا پر اتارا تھا۔

”اے اللہ رحم کرنا میری بچی کو مزید عذابوں سے بچا لیتا“ وہ خشک آنکھوں اور خاموش لبوں کے ساتھ دعا کیے جا رہی تھی۔

”ڈاکٹر صاحب آگے ڈاکٹر صاحب“ بہت سی آوازوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا مگر وہ اپنی جگہ سے اٹھی نہیں تھی۔

”ہم اسے نہیں بچا سکتے“ ڈاکٹر اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ بہت سے لوگوں نے ڈاکٹر کو گھیر رکھا تھا مگر اس کی آواز باخوبی سکیئنہ تک پہنچ گئی تھی، ڈاکٹر کے یہ خبر سناتے ہی وہاں ایک شورا اٹھا۔ کوئی رو رہا تھا تو کوئی

خواہشوں کو ہوا دینے والی وہی تو تھی، مگر اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ سب بھی ہو سکتا ہے۔ وہاں موجود انسانوں میں اگر کوئی چپ تھا تو وہ تھی سکیئنہ جس نے اس وقت سے اب تک ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ نہ اس کی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا تھا۔ بس وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لوگوں کو تکتے جا رہی تھی جو اس سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے حوصلہ کرنے کو کہہ رہے تھے۔ اس کا چہرہ بھی اس کی آنکھوں کی طرح بالکل بے تاثر تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی مگر سمجھ نہ سکتی تھی نہ رہی تھی کیونکہ اس کا ذہن وہاں حاضر ہی نہ تھا، اس کا ذہن تو سالوں کی مسافتیں طے کرتا اپنے گھر کے کچے آنگن میں بھٹک رہا تھا۔

”کیا تو سچ میں خوش ہے دین محمد؟“ بہت دیر اس کے چہرے پر کچھ کھوتے رہنے کے بعد وہ اس سے سوال کر رہی تھی جو اپنی گود میں فاطمہ کو لیے کبھی اس کے ننھے ننھے ہاتھ چوم رہا تھا تو کبھی ماتھے پر بوسے دے رہا تھا۔ اس سوال پر اس نے کچھ حیرت سے سکیئنہ کو دیکھا اور پھر مسکرا دیا یوں جیسے وہ سکیئنہ کے اس سوال کا مطلب اور مقصد باخوبی سمجھ گیا ہو۔

”تو اماں کی باتوں کو دل پر نہ لیا کر۔ وہ پرانی سوچ کی ہے اسے لگتا ہے بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں، سوچنے دے اسے پر تو ایسی باتوں پر پریشان نہ ہوا کر“ وہ دیرے دیرے مسکراتا اسے سمجھانے لگا۔ ”اچھا اور تو کیا سوچتا ہے؟“ سکیئنہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ”میں.....؟“ سکیئنہ کے اس سوال پر وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا ”دیکھ سکیئنہ بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں، مجھے تو ایسا لگتا ہے سکیئنہ کہ خدا نے میرے گھر اپنی رحمت اتاری ہے مجھے ایک ننھی سی بری دے دی ہے جس کی چکار میرے گھر میں رونق کر دے گی، اور جس کی مسکراہٹ میری ساری مسکرت سمیٹ لے گی، اور جب یہ مجھے باہا کہہ کر پکارے گی اور انے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے کام کرنے کی کوشش کرے گی تو کتنا اچھا لگے گا مجھے۔ اور یہ تیرا بھی تو کتنا خیال رکھے گی۔ بس تو اسے تھوڑا بڑا ہونے دے، میری دمی رانی، میری پری، دیکھ تو یہ تو تجھ سے

افسوس کر رہا تھا۔ سیکینہ کو لگا کہ جیسے جس خبر کا اسے انتظار تھا وہ اسے مل گئی تھی۔

”اب مجھے چلنا چاہیے“ اس نے سوچا اور اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر لڑکھڑائی، کسی نے آگے بڑھ کر اسے تھانے کی کوشش کی مگر اس نے نری سے اس ہاتھ کو برے ہٹا دیا اور شکستہ قدموں سے آگے بڑھی یوں جیسے کسی جواری نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا بڑی ہی آسانی سے ہار دیا ہو۔ وہ بھی اپنی عمر بھر کی کمائی گنوا چلی تھی۔

”ارے تم باہر کہاں جا رہی ہو؟“ سب کا خیال تھا کہ وہ فاطمہ کے پاس جانے کے لیے آئی ہے۔ اس کا رخ باہر کی طرف دیکھ کر اس کی ساس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”مجھے جانے دو اماں! میں نے شکرانے کے نفل بڑھنے ہیں“ ساس کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑاتی وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہتی اسپتال کا گیٹ پار کر گئی اور اس دم اس کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ پھر کوئی اسے رکنے کے لیے کچھ نہ کہہ سکا، اس کے پیچھے لوگ تھے، آوازیں تھیں اور ان لوگوں کی بے تحاشا حیرت! کسی کو لگتا تھا کہ اس سخت دل، بد زبان سیکینہ کو بیٹی کے مرنے سے بھی کوئی دکھ نہ پہنچا تھا اور کسی کو لگتا تھا کہ اچانک صدمے اور غم کی شدت نے اسے پاگل کر دیا ہے۔

☆.....☆.....☆

سیکینہ سر جھکائے ارد گرد کی رونقوں سے بے خبر بے نیاز گھر کی طرف چلی جا رہی تھی اور اس سارے وقت میں اس نے ایک بار بھی مسلسل بہتے آنسوؤں کو صاف کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آنسوؤں کی دھند کے پار بھی اسے بہت کچھ بہت صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔

فاطمہ کی پہلی چہکار، اس کی پہلی مسکراہٹ، اس کا پہلا لفظ، پہلا قدم، سارے منظر ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے تھے اور پھر خون میں ڈوبا ہولے ہولے تڑپا بدن..... اسے لگا اس لیے فاطمہ اس کے سامنے موجود ہے اور اس وجود سے ہوتی سیکینہ کی نظریں چارپائی سے لٹکتے فاطمہ کے بے جان ہوتے زرم و نازک کلائیوں پر آن ٹھہریں، جن میں بھی چوڑیوں کا رنگ جانے پہلے کیا تھا مگر اب خون میں ڈوب کر سرخ ہو

گیا تھا ”میری بیٹی!“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اسے لگا جیسے خون میں ڈوبی کالج کی چوڑیاں فاطمہ کی خواہشوں اور حسرتوں کی ساری ان کہی کہانیاں سنار ہی ہوں۔ وہ بے دم ہو کر وہیں بیٹھ گئی یوں جیسے آگے ایک قدم بھی اٹھانا اس کے بس میں نہ رہا ہو۔ جس بیٹی کو دلہن بنا کر گھر سے رخصت کرنے کے خواب اس نے جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھے تھے آج اسی بیٹی کے لیے اس نے کس دل سے موت کی دعا مانگی تھی یہ بس وہی جانتی تھی۔ دنیا کی نظر میں وہ سخت گیر عورت یا غم سے پاگل ہوئی ماں تھی مگر سچ تو یہ تھا کہ ان بڑھ ہونے کے باوجود اس میں اتنی عقل ضرور تھی کہ وہ مستقبل میں لوگوں کے طعنوں اور رویوں سے فاطمہ کو ملنے والی اذیت کو سوچ سکتی کیونکہ وہ باخوبی اس حقیقت کو سمجھ رہی تھی کہ لڑکیاں کالج کی چوڑیوں کی طرح ہوتی ہیں قائم رہیں تو شان بڑھاتی ہیں اور اگر ٹوٹ جائیں تو کوئی بھی انہیں سمیٹ کر ہاتھ زخمی نہیں کرتا اور وہ اپنی بیٹی، اپنی گڑیاری کی ایک بار کی موت تو برداشت کر سکتی تھی لیکن اسے لمحہ لمحہ مرتے ہوئے دیکھنے کی ہمت اس میں بالکل نہیں تھی۔

سیکینہ نے ایک نظر آسمان کو دیکھا یوں جیسے خدا کو اپنی اس تکلیف اور اذیت کا گواہ بنانا چاہتی ہو اور زمین پر ہاتھ جما کر ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک کالج کی گڑیا میں کھو چکی ہوں مگر ایک گڑیا ابھی میرے پاس ہے۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔“ بھی بکھرنے نہیں دوں گی اس کا دامن ساری نعمتوں سے نہ بھی بھر سکی تو اپنے پیار کی گود اور صبر کی دولت سے ضرور روشناس کرادوں گی اس کی آنکھوں میں زہرہ کا معصوم چہرہ آن سما یا تو وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ عزم سے مسکرا دی۔ یوں جیسے اسے ایک بار پھر جینے کو مقصد مل گیا ہو، اس بار سیکینہ نے گھر کی طرف قدم بڑھایا تو اس کی تصویر میں پہلا قدم اٹھا کر نخر اور خوشی سے کھلکھلاتی فاطمہ تھی، اسے لگا بہت بڑی قیمت چکا کر ہی سہی مگر آج وہ بھی زندگی کے اس سفر میں درست راستے پر پہلا قدم اٹھا چکی ہے، اور سفر کوئی بھی ہو پہلا قدم اٹھ جائے تو منزل دور نہیں رہتی۔

☆☆.....☆☆

مصحف



کشاف اقبال

اس نوجوان کی داستان جس کی محبوبہ ساتھ نبھانے کا وعدہ ایک سال بھی پورا نہ کر سکی تھی

صرف انتظار کرتی رہوں گی۔ پلیز مت جائیں
مصحف۔

ہزار بار یہ اعتماد دلانے کے بعد کہ میں اس سے
بہت محبت کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کسی کے بارے
میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ نہیں مانی۔ مگر ایک وقت آیا
کہ وہ بارش بھی تھم گئی۔ وہ دھن جو ماحول میں
رومانیت پیدا کر رہی تھی۔ کہیں کھو گئی اور ہم ایئر پورٹ
پہنچ گئے اور بالآخر رانیہ یہ سوچ کر مان گئی کہ آخر ایک
سال ہی کی تو بات ہے۔ پھر ہماری شادی ہو ہی جانی
ہے۔

وہ رات پانی سے بھری رات تھی۔ پہلے بارش،
پھر سمندر اور اب..... اب رانیہ کے آنسو۔

”تم مجھے بہت یاد آؤ گی رانی..... اپنا بہت خیال
رکھنا اور یہ آنسو اپنے اندر سنبھال کر رکھو۔ جب میں
واپس آ جاؤں گا تب یہ غم کے آنسو خوشی کے دریا میں
بھا دینا۔ اس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پورون سے
پونچھتا میں ٹرینل کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ اگر اب
اس کو پلٹ کر ایک بار بھی دیکھ لیتا تو شاید اس کی
آنکھوں میں نمی پا کر اپنا قصد بھول جاتا۔ مگر یہ سب
صرف میں نے ہمارے لیے ہی تو کیا تھا۔

رات کا سکوت ظاہر کرتا پہرا اور سمندر پر گرتی وہ
بارش..... وہ رات ہماری کراچی میں اخیر رات تھی۔
اس رات کے ٹھیک چار بجے میں رانیہ کو چھوڑ کر سات
سمندر پار جانے والا تھا۔ پورے ایک سال کے لیے
ریسٹورنٹ میں بچتی رومانی دھن اور سمندر کی لہروں کا
پتھروں سے نکرانے کا غل اوپر سے وہ تیز رفتار
برکھا ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں بلکہ ایک
دوسرے سے جدا ہونے کا خوف دلا رہی تھی۔ دلوں کی
سرزمین کو بھگونے کے لیے اس دھن، سمندر اور اس
رم جہم نے کچھ کام نہ کیا، وہ سرزمین تو پہلے سے ہی
آنسوؤں کے دریا کی تہہ میں مقیم تھی۔ میں رانیہ کو بار
بار سمجھا رہا تھا کہ یہ سب میں ہمارے لیے ہی کر رہا
ہوں۔ ہمارے پاس پیسہ ہوگا تب ہی ہماری شادی
اتجھے سے ہو پائے گی، تب ہی ہم ایک بے سکون زندگی
گزار پائیں گے۔ مگر وہ میری اس نوکری کے لیے
خوش تو تھی۔ پر مجھے خود سے دوڑ جانے کے لیے مستعد
نہ تھی۔

”آپ کو وہاں کوئی اور حسین لڑکی مل جائے گی۔
پلیز مت جائیں۔ پیرس میں تو ایک سے ایک لڑکیاں
آپ پر فدا ہو جائیں گی اور میں یہاں بیٹھ کر آپ کا

کہنے کی وجہ اس شہر کے رومانی نظارے اور مقامات اور
مادری زبان فریج جسے محبت کی زبان کہا جاتا ہے۔
پیرس میں ایفل ٹاور دیکھنے کا جنون مجھے اپنی یونیورسٹی
لائف سے تھا۔

میں یہاں آیا تو اپنے خرچے پر تھا پر مجھے یہ خرچہ
کرنا اتنا بھاری نہ لگا اس لیے کیونکہ مجھے یہاں آفس
کی طرف سے دو کمرے کا مکان مل چکا تھا۔ جب تک
میں پیرس میں تھا، تب تک وہاں رہ سکتا تھا۔ میں نے
میٹرڈیکلری اور اس جگہ چل پڑا جہاں میزا گھر تھا۔ کئی
افراد سے پوچھنے کے بعد بالآخر میں اس جگہ پہنچ گیا۔
جہاں میرا گھر تھا۔

مگر یہ کیا ہوا؟ وہ جگہ ایسی تھی جیسے کراچی میں لالو
کھیت۔ اتنی ہیج ہیج، اوپر سے تنگ گلی۔ گھر تھا کہ شروع
ہوتے ہی ختم اور اوپر سے گھٹن زدہ۔ اب مجھے وہاں
رہنا ہی تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ نوکری کی ابتداء
میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔

میری جیب میں اتنے پیسے ضرور تھے کہ میں پیرس

میرے ابو اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اور
گھر میں اپنی ایک بہن اور ماں کو میں نے ہی دیکھنا
تھا۔ انجینئر ہوں اس لیے پیرس میں کافی اچھی جاب
مل گئی۔ پاکستان میں جتنی سیلری ملتی تھی، اس میں
صرف گھر کا خرچ ہی چل پاتا تھا پر اب میری زندگی
کے بند دروازوں پر میری شریک حال کی دستک
ہونے والی تھی۔۔۔ اس لیے میں نے پیرس سے آئے
ہوئے جاب کو پوزیٹور سپولس پر زور دیا اور اب وہاں
کے لیے روانہ ہونے لگا تھا۔ میں صرف یہ سوچ کر
کراچی سے روانہ ہونے لگا تھا کہ ایک سال بعد میں
اپنے پاس سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے استعفیٰ دے
دوں گا اور کراچی ہمیشہ کے لیے واپس آ جاؤں گا۔

☆.....☆.....☆

تقریباً دو دن کے طویل سفر کے بعد جہاز سی ڈی
جی ایئر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ میں اس شہر آچکا تھا
جس کے بارے میں، میں صرف اس حد تک واقف تھا
کہ پیرس کو 'سٹی آف لو' کہا جاتا ہے۔ 'سٹی آف لو'



READING
Section

بعد میں تیسرے سے نمٹ ہی رہا تھا کہ سارے فرار ہو گئے۔ گاڑی کے اندر جھانکا تو وہ لڑکی بے ہوش ہونے ہی والی تھی اور اس کے سر پر تھوڑی چوٹ بھی آئی تھی۔ میں اسے فوراً گاڑی سے نکال کر قریبی اسپتال لے گیا۔

ڈاکٹر فریج زبان میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے انگریزی میں کہا کہ فریج سمجھ نہیں آئی تو اس نے انگریزی کا استعمال کیا۔ ڈاکٹر کے مطابق اس لڑکی کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی اور اس کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

”آپ نے انہیں صحیح وقت پر بچا لیا ورنہ پیرس میں تو اس طرح کی حرکتیں کھلے عام ہوتی ہیں، پر کوئی اس پر ایکشن نہیں لیتا۔“

کچھ دیر بعد جب اس کو ہوش آنے لگا تو میں نے اس کے پاس سے جانا ضروری سمجھا۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اُس کو بچانا میرا فرض تھا اور میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اب وہ ہواسوں میں آنے لگی تھی۔ میں اس کے قریب سے پلٹنے ہی لگا تھا کہ اس لڑکی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھ سے اردو زبان میں بولی۔

”تم کون اجنبی ہو جس نے میری عزت بچائی؟ مجھ سے ایسا کیا رشتہ ہے تمہارا؟“ مجھے اس کے جملے سے زیادہ اس بات نے حیران کیا کہ وہ اردو بول سکتی تھی۔ اور وہ بھی باآسانی شکل و صورت سے تو بالکل فریج لگتی تھی۔ پھر وہ فرائک اور ٹراڈرز پہنی ہوئی تھی۔

”انسانیت کا رشتہ!“ میں نے اسے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر بر جتہ مسکراہٹ اُٹھ آئی اور وہ وہیسی آواز میں اپنی داستان سنانے لگی۔

”میرے ماں باپ تین سال پہلے ایک کار ایکسیڈنٹ میں چل بے۔ پایا کا پیرس میں پر فیمو کا ایک بہت بڑا بزنس تھا۔ اُن کے چلے جانے کے بعد وہ بزنس میں نے سنبھال لیا۔ پیرس میں وہ باتر ہائی نہ رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اب میں بالکل اکیلی رہتی ہوں۔ بہن بھائی نہیں ہیں، اکلوتی اولاد ہوں۔ تم بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو، مسلم بھی ہو گے۔ کیا تم

کے روڈوں پر گھوم پھر سکوں اور اچھا کھاپی سکوں مگر اتنے پیسے نہ تھے کہ روز اچھا کھانا کھا سکوں۔

رات کے ڈھائی بج رہے تھے پر مجھے پہلی رات نیند بالکل بھی نہ آئی۔ میں نے اپنی ٹی شرٹ کے اوپر جیکٹ ڈالی اور پیرس کے روڈ ٹا پنے نکل کھڑا ہوا۔

میں اس جنگ گلی سے نکل کر پندرہ منٹ کے اندر اندر اس لوکھاس جگہ سے کافی دور آچکا تھا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ مجھے اس جگہ کا نام بھی نہ معلوم تھا جہاں میں چل رہا تھا۔ پر مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ پیرس کو ’سٹی آف لو کے ساتھ ساتھ‘ سٹی آف لائسنس بھی کہا جاتا ہے۔ پتھریلی سڑک پر چلتے چلتے اپنی نظریں یونہی ادھر ادھر دوڑا رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک عالی شان گاڑی پر پڑی۔ چونکہ میں میکینکل انجینئر ہوں سو میں نے گاڑی کی ساخت دیکھ کر ہی شناسائی کر لی تھی کہ وہ لیمبورگھی ہے۔ میری نظر اس پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اس قدر شاندار گاڑی تھی۔ وہ سڑک کے ایک کنارے کھڑی تھی، اس جگہ تھوڑا اندھیرا تھا۔ مجھے لگا کہ گاڑی کے اندر کوئی نہیں ہے۔ میں گاڑی کے پاس چلا گیا تاکہ اپنی من پسند گاڑی کا دل بھر کے معائنہ کر سکوں مگر یہ کیا ہوا؟ گاڑی میں چار نوجوان بیٹھے تھے۔ ایک ڈیرائیونگ سیٹ پر اور پیچھے تین ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی جس کے ساتھ وہ لوگ زبردستی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں فوراً آگے بڑھا اور گاڑی کے شیشے پر ہاتھ مارنے لگا۔ دو لڑکے باہر نکلے اور انگریزی میں کچھ کہنے لگے۔ جس کا مطلب تھا ’کیا مسئلہ ہے؟‘

میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا کہ اُس لڑکی کو چھوڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ میں نے بولا ہی تھا کہ وہ دو لڑکے مجھے مارنا پشٹا شروع ہو گئے۔ میں نے بھی انہیں دکھا دیا کہ میں پاکستانی ہو۔ لڑکیوں کی عزت پر ہاتھ اٹھاؤ گے تو چھوڑ دوں گا نہیں۔“ میں نے بھی ہاتھ اور لات اٹھانا شروع کر دی۔ ایک کولات سے مارا تو دوسرے کو ہاتھ سے۔ اتنے میں بقیہ دو افراد گاڑی سے باہر نکلنے لگے اور مجھے مارنے کے لیے میرے نزدیک آنے لگے۔ ان دو کو فارغ کرنے کے

لگا۔ میرا کمرہ آیت کے کمرے کے پاس سے گزرنے کے بعد ہی آتا۔ آیت کے کمرے کا دروازہ اُدھ کھلا تھا اور سامنے سے نظر آنے والا منظر ایک لمحے کے لیے مجھے ساکت کر گیا تھا۔ وہ سر پر نفاست کے ساتھ دوپٹا اوڑھے جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں اُکٹے کے لیے مسکرایا اور سر جھٹک کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں واقعی پاکستان دوبارہ آ پہنچا تھا۔ پہلے وہ پاکستانی کھانا اور اب وہ پاکستانی لڑکی وہ بھی اس قدر پارسا۔

☆.....☆.....☆

اکلی صبح کا سورج شاید میری محبت کو غروب کرنے کے لیے طلوع ہوا تھا۔ مجھے پتا بھی نہ تھا کہ وہ اجنبی سی لڑکی میرے دل کے ایک گوشے میں اپنے لیے جگہ بنا لے گی۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے کہ آیت میرے کمرے کا دروازہ ناک کرنے لگی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اس کا حلیہ دیکھ کر پہچان گیا کہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہوئی ہے۔ بے بی پنک کلر کی گھٹنوں سے نیچے تک جاتی فرائک اور سفید ٹراؤزر کے ساتھ وہ سفید دوپٹا اوڑھے بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ مگر میری رانیہ سے زیادہ نہیں۔ میں اسے دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ چاہے آیت دنیا کی سب سے حسین لڑکی کیوں نہ ہو پر میری رانی ہمیشہ سے رانیہ تھی، بے ادب رہے گی۔

”تم پیرس پہلی دفعہ آئے ہو اور تمہارا مجھ پر قرض بھی ہے۔ وہ قرض تو میں شاید کبھی نہ اُتار پاؤں پر تمہیں پیرس ضرور گھما سکتی ہوں۔“

یقین کرو پیرس ایک ایسی جگہ ہے جس کے دلفریب مقامات دیکھ کر ایک سکون دل میں سرایت کر جاتا ہے۔ میں تمہیں وہ سکون محسوس کروانا چاہتی ہوں۔ جانتی ہوں ابھی چھ دن تک تم بالکل فری ہو۔ اس لیے ان چھ دنوں میں، میں تمہیں پورا پیرس دکھانے کی بھرپور کوشش کروں گی۔ تو پھر تم تیار ہو جاؤ میں نیچے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ (پولیس کی مدد کے ذریعے آیت کو اس کی گاڑی صبح ہی واپس مل گئی تھی) اور ہاں! تمہیں یہاں سب کچھ با آسانی مل جائے گا۔“

میرے گھر میں رہ سکتے ہو اگر تمہیں کوئی مسئلہ نہ ہو؟ مجھے اکیلے بہت ڈر لگتا ہے۔ اپنی عزت کے کھو جانے کا ڈر، تم اگر ساتھ رہو گے تو میں خود کو محفوظ سمجھوں گی۔ پلیز مجھے اُس قسم کی لڑکی مت سمجھنا۔ پیرس میں رہتی ہوں پر پیرس والوں جیسی بالکل نہیں ہوں۔ پرانے پاکستانی خیالات کی مالک ہوں۔ اگر تم نہیں رہنا چاہتے میرے گھر تو کوئی مسئلہ نہیں، میری عزت بچانے کا بہت شکریہ!“

چند ثانیے کے لیے تو میں فکر و تامل میں پڑ گیا۔ پھر سوچتے سوچتے مجھے وہ تنگ کلی اور دو کمرے کا کھوکھلا یاد آیا جو مفت میں مجھے دیا گیا تھا۔ اُس لڑکی کے ساتھ رہتا تو کم از کم اچھا کمرہ اور روز اچھا کھانا پینا تو نصیب ہو سکتا تھا۔ میں فوراً مان گیا۔ میرے ماننے سے اُس لڑکی کے اُداس چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ کہنے لگی۔

”میرا نام آیت ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں؟“ اس کا ہاتھ بے دھیانی میں اب تک میرے ہاتھ میں تھا۔ ”مصحف زبیر۔“ ڈاکٹر صاحب اب روم میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کی ہدایات کے مطابق اب آیت گھر جا سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

میں جب آیت کے گھر پہنچا تو اُس نے مجھے بتایا کہ وہ لیمبورگنی اس کی اپنی ہے۔ اس کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مگر خوبصورت بہت تھا۔ مجھے اس کی دولت سے کوئی سروکار نہ تھا بس جب تک میں یہاں تھا، مجھے ایک طریقے کے گھر میں رہنا ہی تھا۔

میں نے اس کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کس لیے، بس یہ نہیں بتایا کہ میری شادی ہونے والی ہے وہ بھی ایک سال بعد، اس لیے کیونکہ میں نے بتانا ضروری نہیں سمجھا نہ ہی میں اس اجنبی لڑکی سے اتنا کلوز ہونا چاہتا تھا۔ آیت نے مجھے گیسٹ روم دکھایا اور ڈنر کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ڈنر ختم کرتے ہی میں اپنے کمرے میں جانے

”بالکل نہیں! تم پر یہ شرٹ کروڑ سے زیادہ اچھی لگ رہی ہے۔“
 ”کروڑ؟ کون کروڑ؟“ میرے دل میں شک تھا کہ کروڑ آیت کا کوئی پرانا بوائے فرینڈ ہوگا پر وہ تو اس سے بھی بڑھ کر نکلا۔

”میرا شوہر کروڑ! میں تمہیں اس رومانی شہر میں اپنی کہانیاں سنا سنا کر بور نہیں کرنا چاہتی اس لیے“
 ”Change The Topic“

چائے کا ایک گھونٹ گلے میں اتارتے ہوئے اس نے کہا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ اگر شوہر ہے تو ساتھ کیوں نہیں رہتے دونوں؟“ پھر سر جھٹک کر اپنی چائے پر دھیان دیا۔

چائے ناشتے کے بعد وہ مجھے مونٹ مارٹ نای جگہ لے گئی۔ آیت کے مطابق مونٹ مارٹ چیرس کی سب سے خوبصورت ویج تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مجھے واقعی اس کی بات پر یقین آ گیا۔

وہ ایک اونچی پہاڑ کے مشابہہ ویج تھا۔ پر وہ پہاڑ عام پہاڑوں جیسی نہ تھی، ایک پوری دنیا بسی تھی اس ویج میں۔ ویج کے سب سے اوپر والے حصے پر ایک سفید گنبد والا چرچ بنا ہوا تھا۔ آرٹسٹک ویہائٹ چرچ جس کا نام ”باسیلیکا“ تھا۔ ایک منی ٹرین تھی جو لوگوں کو پوری ویج کی سیر کروا رہی تھی۔ ہجوم اتنا تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ آیت نے بھیٹر میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

”ہم دونوں کہیں اس بھیٹر میں جدا ہی نہ ہو جائیں اس لیے میرا ہاتھ تھامے رہنا۔“ اس کی ادا، اس کی باتوں میں ایک مقناطیسی عمل تھا۔ ایک پوری زندگی بھی اس لڑکی میں.....

چرچ کا دل بھر کے معائنہ کرنے کے بعد وہ مجھے ویج کی ایک ایسی جگہ لے گئی جس نے مجھے صحیح معنوں میں اپنی طرف اٹریکٹ کیا تھا۔

”یہ ہے وال آف لو۔ اس دیوار پر تین سو گیارہ مرتبہ دو سو پچاس زبانوں میں ’آئی لو یو لکھا ہوا ہے اور یہ جو تم جگہ جگہ سرخ رنگ کے چھینٹے دیکھ رہے ہو وہ دیوار پر، یہ ٹوٹے ہوئے دل کی نشاندہی کرتے ہیں۔“

سراٹبات میں ہلاتے میں الماری کی طرف بڑھ گیا پر..... سوٹ کیس تو میرا اس کھوکھے میں تھا۔ میں نے سوچا کہ سوٹ کیس تو میں لے ہی آؤں گا۔ میں بنا کچھ سوچے سمجھے وہ الماری کھول چکا تھا اور وہاں پر لائن سے کافی سارے کپڑے ٹنگے تھے، پر کیوں؟ پھر مجھے آیت کی کہی وہ آخری بات یاد آئی۔ ”تمہیں یہاں سب کچھ با آسانی مل جائے گا۔“ اس کی بات پر غور کرنے کے بعد میں ایک انڈیگو مائیکل اینڈ ڈیوڈ ڈیزائنز شرٹ اور بلیک ڈینم جینس نکالے فریش ہونے چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

میں بیرونی دروازہ پار کرنے کے بعد جب اس کے پاس پہنچا تو وہ ایک لمحے کے لیے میری ڈرائیونگ دیکھ کر خاموش مسکراہٹ ظاہر کرنے لگی۔ پھر لبوں پر مسکراہٹ بھجے کہنے لگی۔

”تم تو ٹیکنیکل انجینئر ہو تو یہ گاڑی چلانا بھی آتی ہوگی؟ پولیس کی پرواست کرو، وہ لائسنس نہیں دیکھتی سب کا۔“ میں نے سراٹبات میں ہلایا تو اس نے مجھے گاڑی کی جاہلی تھمادی۔ میری زندگی کی ایک خواہش پوری ہو گئی تھی۔ لیمو رینٹی ڈرائیونگ کرنے کی خواہش۔ اس نے مجھے بتایا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بس راستہ بتانے لگی کہ یہاں سے لیفٹ، یہاں سے رائٹ، پیرس کا موسم بہت دل پسند تھا۔ سورج آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھا مگر گری تھی کہ محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔

سب سے پہلے ہم لی گرینڈ کیفے گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا کیفے تھا۔ جس کے باہر پتھرلی سڑک پر ٹینبل اور کرسیاں ترتیب سے رکھی گئی تھیں۔ ہم ان میں سے ایک میں جا کر بیٹھ گئے۔ چائے آرڈر کرنے کے بعد آیت دوبارہ سے میری ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہوئی۔

پتا نہیں ایسی کیا برائی تھی میری ڈرائیونگ میں! مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔

”تمہیں برا لگا کہ میں نے تم سے بغیر پوچھے یہ کپڑے پہن لیے؟“

نکراتی ہیں تو محبت کی سدا ہر سمت کو نبھنے لگتی ہے اور اس بات پر مجھے یقین تب ہوا جب مجھے یہاں پہلی مرتبہ کروڑ ملا تھا۔ اس کی نظریں دریا پر مرکوز تھیں، رفتہ رفتہ وہاں کپلز کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید وہاں کوئی ایویٹ ہونے والا تھا یا کچھ اور۔ آیت اس بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو ہاتھ میں ریڈیولیا ہوا تھا کہنے لگی۔

”یہاں سن سیٹ کے بعد سے آدمی رات تک ٹینگو ہوا کرتا ہے۔ تمام کپلز ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دنیا سے بے خبر ڈانس کرتے رہتے ہیں جیسے انہیں کسی کی کوئی پروا ہی نہ ہو۔ ایک سال پہلے کی بات ہے میں یہاں ان کپلز کو دیکھنے کے لیے آئی تھی جو یہاں ساری رات ڈانس کرتے ہیں۔ میں واحد ایسی لڑکی نہیں تھی جو یہاں اکیلی آئی تھی اور بھی بہت سے لوگ تھے جو اس بوڑھے کی دھن سننے اور ان کپلز کو دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ میں خوشی خوشی ان کپلز کو دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی کہ اچانک وہ میرے پاس آ گیا اور میرے ساتھ ڈانس کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ دیکھنے میں اتنا حسین تھا کہ میں منع ہی نہ کر سکی۔ وہ فرینچ تھا اور پیرس میں اتنا عرصہ رہنے کے بعد مجھے بھی فرینچ زبان پر عبور حاصل ہو چکا تھا۔ ڈانس کرتے کرتے اس نے مجھے پروپوز کیا اور تب ہی مجھے اعتبار آیا کہ فرینچ لوگ دریائے سین کے بارے میں جو کچھ بھی کہتے ہیں بجا کہتے ہیں۔ مجھے اس دریائے اپنے خمار سے تر کر دیا تھا اور کروڑ نے اپنی گفتگو سے۔ میں نے اس کا پروپوزل قبول کر لیا اور پھر ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ بوڑھا آدمی اب وہ موسیقی چلانا شروع کر چکا تھا اور تمام کپلز ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملائے رقص کرنا شروع ہو گئے تھے۔ کتنا رومانوی شہر تھا پیرس.....

”پھر کیا ہوا؟“ میرا سوال کرنا ضروری نہ تھا وہ ویسے بھی اپنی پوری داستان سنانے کے موڈ میں تھی اور میں سننے کے موڈ میں۔ وہ کہنے لگی۔

”پھر ہم نے شادی کر لی۔ میرا کیلا پن دور ہو گیا تھا۔ جو ڈر مجھے اپنے ماں باپ کے کھونے کے بعد

مطلب یہ کہ محبت غم کی سوغات کے بنا ادھوری ہے۔ محبت میں غم ملنا تو محبت کی اصل ہے۔ پر کچھ لوگ اتنے خوش طالع ہوتے ہیں جنہیں محبت میں عارضی غم ملتا ہے مگر کچھ لوگ اتنے بد قسمت ہوتے ہیں جنہیں ناختم ہونے والا لازوال غم ملتا ہے، جیسے میں!“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو برسنا ہونا شروع ہو گئے۔

”کیا غم ملا ہے تمہیں مجھے بتاؤ تو سہی! ہو سکتا ہے میں تمہاری کوئی بددگر سکوں۔“ میری نظریں اب بھی اس دیوار پر مرکوز تھیں۔

”تم میری مدد نہیں کر سکتے مصحف!“ وہ کہتے کہتے اس ویج سے نیچے اترنے لگی۔ میں جلدی سے اس وال کے ساتھ ایک سیٹھی لیتا اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔ اب وہ سارا راستہ بناکت تھی۔ بس مجھے راستہ بتانے کے علاوہ وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ مونٹ مارٹ میں اتنی دیر ٹھہر گئے تھے کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ سورج غروب ہونے والا تھا کہ ہم دریا پر پہنچ گئے جو کانی لبا تھا۔ کہاں سے شروع ہو رہا تھا۔ اور کہاں پر ختم، کچھ پتا نہ چلا۔

جیسے ہی سورج غروب ہونے کا وقت آیا تب مجھے سمجھ میں آیا کہ آیت مجھے اس وقت ہی یہاں کیوں لائی، وہ منظر دل میں اتر جانے والا منظر تھا۔ سورج آہستہ آہستہ غروب ہونے کی جانب رواں تھا اور تاریخی آسمان سیاہ ہونے کی جانب رواں تھا۔ پرا بھی سیاہ ہوا نہ تھا۔ دریا کے کنارے پتھریلی صاف ستھری لین تھی جس پر ہم چل رہے تھے۔

آیت چلتے چلتے ایک بیچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اور اشارے سے مجھے بھی وہاں بیٹھنے کا کہا۔ وہ ابھی تک خاموش تھی پر ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ اس کی خاموشی ناقص ہوئی۔

”یہ دریائے سین ہے۔ چار سو بیسی میل لبا یعنی سات سو چھتر کلو میٹر لبا ہے۔ پورے فرانس کا دوسرا بڑا دریا۔“

دریائے سین سے پہلے دریائے لوائر کا نمبر آتا ہے کہ اس دنیا کے پاس جب بھی دو نظریں

کچھ کہنے لگا۔ میں آیت کے پاس گیا اور اس لڑکے سے انگریزی میں بس اتنا کہا۔

She,s with Me, Any”
Problem۔“ وہ میری بات سن کر وہاں سے منہ بنائے واپس چل ویا۔ اب میں آیت کے بالکل عین سامنے کھڑا تھا۔ وہ دوبارہ ڈانس کرنا شروع ہو گئی تھی۔ ڈانس کرتے کرتے اس کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ گرنے لگی کہ میں نے اسے سنبھال لیا۔

بارش کی رفتار تیز ہوتی گئی، لوگ بھگتے گئے پر کسی کو بھگنے کا احساس کہاں تھا۔ سب اپنے رقص میں محو تھے۔ ایک بارش کراچی میں ہوئی تھی جب میں رانیہ سے جدا ہونے والا تھا اور اب یہ بارش پیرس میں برس رہی تھی جب..... جب میرے دل میں آیت اترنے لگی تھی، ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ بوندیں دریائے سین میں اتر رہی تھیں، ملنے لگی تھیں، جذب ہونے لگی تھیں۔ کیا برائی تھی اُس میں؟ کچھ بھی تو نہیں! مگر نہیں..... وہ چاہے مجھے کتنی ہی پسند کیوں نہ آجائے میں اپنی رانیہ کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ بارش جہاں دو دلوں کو جدا کرتی ہے وہاں کئی دلوں کو ملاتی بھی ہے۔ کبھی یہ واقعی بارش محبت لگتی ہے تو کبھی صرف آنسوؤں کی بو چھاڑ۔ کیا انسان ایک وقت میں دو لوگوں سے محبت کر سکتا ہے؟ ہاں! میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ایسا ممکن ہے۔ ایک دل کے بھی چار حصے ہوتے ہیں۔ اُن چار میں سے اگر تین میں رانیہ تھی تو چوتھے حصے میں آیت بھی دھڑکنے لگی تھی۔ مجھے وہ اچھی لگنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

ہم گھر واپس آئے تو میں نے اپنے کمرے میں جانے کے بعد یہ حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے رانیہ کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ آیت اچھی ہے پر رانیہ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ میں نے اس رات امی کو کال کرنے کے بعد رانیہ کو کال ملائی۔ اور اسے پیرس کی ساری کہانی سنا دی۔ اس کہانی میں آیت بھی شامل تھی۔ میں رانیہ کو کسی قسم کے اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے اسے بتا دیا تھا کہ میں آیت کے گھر میں رہتا ہوں۔ وہ ایک نمازی اور خوب صورت

ڈرانے لگا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا تھا۔ میں اس طرح کی لڑکی نہ تھی جیسے تم اب مجھے پارے ہو۔ میری ڈرینگ، میرا اسٹائل سب کچھ فرینچ جیسا تھا، ایک آوارہ لڑکی نہ تھی، پر بہت زیادہ اب ٹوڈیٹ رہتی تھی۔ جب میری شادی کروڑ سے ہوئی تو میں نے اپنے بزنس کا چاکیس فیصد شیئر کروڑ کے نام کر دیا۔ چھ سات ماہ تک تو سب ٹھیک رہا۔ پھر اس نے بلاوجہ لڑائی جھگڑے کرنا شروع کر دیے اور انجام یہ ہوا کہ اس نے اپنے شیئر بیچ دیے اور مجھے طلاق دے کر سارے پیسے اپنے ساتھ لے کر بھاگ نکلا۔“ وہ بے ساختہ رونا شروع ہو گئی۔

مجھے اس کی داستان سن کر بہت افسوس ہوا تھا۔ وہ بہت معصوم لڑکی معلوم ہوتی تھی، بہت سیدھی سادھی، میں نے اس کے آنسو پونچھے اور کہنے لگا۔

”تم نے کروڑ سے شادی کا فیصلہ سوچ سمجھ کر نہیں کیا تھا، کیونکہ تم نے محبت کی تھی۔ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی پھر اس طرح کیوں رو رہی ہو؟“

”میرے نصیب میں محبت نہیں لکھی ہوئی مصحف، مجھے سب چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، پہلے ماں باپ اور پھر کروڑ، مجھے ناختم ہونے والی محبت کیوں نہیں ملتی مصحف؟“ میری شرٹ کا کالر پکڑے وہ ملتجیانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ پھر روتے روتے وہ بیچ پر سے کھڑی ہوئی اور تھوڑا دور چلی گئی۔

دریائے سین پر اب ہزاروں قطرے گرنا شروع ہو گئے تھے۔ بارش کے قطرے، بارش کو محسوس کرتے ہی آیت کی آنکھوں سے آنسو غائب ہو گئے تھے۔ کچھ ہی بل میں اس کا موڈ بہتر ہو گیا تھا اور وہ نارمل ہو گئی تھی۔ کپلو کے بیچ جا کر وہ بھی ڈانس کرنا شروع ہو گئی۔ اُن کپلو کی طرح وہ بھی دنیا جہاں سے بے غرض اپنے غم بھلانے کے لیے قدم ہلانے لگی۔ اتنے میں میری نگاہ ایک فرینچ نوجوان پر پڑی جس کی آنکھیں آیت کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ آیت کے پاس آ کر اس سے فرینچ میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگا کہ وہ آیت کے ساتھ ڈانس کرنا چاہ رہا تھا۔ آیت نے نفی میں سر ہلایا تو وہ دوبارہ سے اس سے فرینچ میں

بارہویں مہینے کے دوسرے نختے آیت نے مجھے ایفل ٹاور ملنے کے لیے بلایا۔ وہ مجھے الوداع کہنا چاہتی تھی۔ میں نے آیت سے صحیح طرح ان بارہ مہینوں میں ملاقات کی ہی نہ تھی۔ جاتے جاتے اُس سے آخری بار ضرور ملنا چاہتا تھا۔ اگر خدا نخواستہ رانیہ میری زندگی میں نہ ہوتی تو آیت ہی میرے دل کے چاروں حصوں میں سانس لے رہی ہوتی، وہ تھی ہی اپنی اچھی۔

آیت سے ملنے سے تقریباً دو گھنٹے پہلے میں اپنے دفتر سے ریزائن دے کر آیا تھا۔ میرے قلب و مغز پر وہ ایک پورا دن جو میں نے آیت کے ساتھ گزارا تھا۔ فلیش بیک ہوا۔ (اس ایک دن کے بعد میں نے خود ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ آیت کے ساتھ کہیں گھومنے بھی نہیں جاؤں گا۔ بس جب تک پہلی تنخواہ نہیں مل جاتی اس کے گھر ایک مہمان بن کر رہوں گا، جس نے مجھے اپنی میزبان کی عزت بچائی تھی)۔

آیت کو میں یہ بات بھی بتا چکا تھا کہ میری منگنی ہو چکی ہے اور وہ یہ بات سن کر بہت مسرور ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس دن اُس نے مجھے پیرس کے بارے میں بہت سی معلومات دی تھیں پر آج میں اسے یہ موقع نہیں دوں گا۔ ایفل ٹاور کے بارے میں معلومات اکٹھا کر لوں گا۔ ویسے بھی اب پیرس سے میری کافی اچھی واقفیت ہو گئی تھی۔ پرا ایفل ٹاور جان بوجھ کر کبھی نہ گیا کیونکہ میرے کونٹیکٹ نے کہا تھا کہ اگر غلطی سے بھی وہاں چلے گئے تو تمہارے ساتھ بہت برا ہو جائے گا۔ کیا برا ہو جائے گا یہ میں نے پوچھنا ضروری نہ سمجھا۔

ایفل ٹاور کے بارے میں ضروری علمی لیاقت انٹرنیٹ کے ذریعے معلوم کرنے کے بعد میں ریڈی ہوا اور ایفل ٹاور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اگلے روز میری کراچی کی فلائٹ بھی تھی۔

☆.....☆.....☆

سورج غروب ہونے والا تھا اور میں ایفل ٹاور پہنچ چکا تھا۔ وہ ایفل ٹاور کے ساتھ نئے سفید چمکتے فلور کی سیڑھیوں پر سر پر اسکارف کیے بیٹھی تھی۔ میں

لڑکی ہے۔ اس کے والدین اس دنیا میں اب نہیں ہیں۔ پر شاید میں نے یہ سب بتا کر غلط کیا اور اس بات کا احساس مجھے رانیہ کا جواب سننے کے بعد ہوا۔

”اکیلی لڑکی کے گھر میں رہ رہے ہو، اس کے ساتھ گھومنے جا رہے ہو، اس کی عزت بجا رہے ہو..... تم تو بھول ہی گئے کہ تمہاری ایک عدد منگیتر بھی ہے، جس کا نام رانیہ ہے۔ جاؤ عیش کرو۔“ وہ جانتی بھی تھی کہ مجھے جو کمرہ آفس کی طرف سے ملا تھا وہ کس قسم کا تھا پر وہ میری بات نہ سمجھ سکی۔ اس کی بات میں کچھ غلط بھی نہ تھا۔ ایک اکیلی لڑکی کے ساتھ رہنا ٹھیک نہ تھا۔ لہذا میں نے اسی کال میں رانیہ کو بتا دیا تھا کہ جیسے ہی پہلی تنخواہ ملے گی کرائے کا کمرہ لے لوں گا، رانیہ بھی مان گئی تھی، پردل سے نہیں۔

☆.....☆.....☆

وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے، پر میرے کیس میں ایسا نہ تھا، اک ایک پل صدیوں پر بھاری تھا۔ گیارہ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اب میں ایک امیر آدمی بن چکا تھا۔ (پاکستان کے لحاظ سے پیسہ جو اتنا اکٹھا ہو گیا تھا)۔

میں نے پہلی تنخواہ ملتے ہی آیت کا گھر چھوڑ دیا تھا۔ اس سے ملنا بھی پرانے نام تھا۔ کبھی راستے میں ملاقات ہو جاتی تھی یا کبھی کسی ریسٹورنٹ میں میری آفیشل میٹنگ ہوتی تو وہ بھی نظر آ جاتی۔ آیت اس وقت بہت ناراض ہوئی تھی جب میں اس کا گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔

رانیہ کو ہزار بار بتایا بھی تھا کہ میں اب آیت سے نہیں ملتا، اس کے گھر نہیں جاتا پر وہ حامی تو بھرتی پر مطمئن نہ ہوتی۔ پتا نہیں گیارہ ماہ کے عرصے نے مجھے اس سے کتنا دور کر دیا تھا۔ دوریاں تو محبت میں نزدیکیوں کی نشاندہی کرتی ہیں پر ہمارے درمیان جو دوریاں آئی تھیں، وہ ہمیں اک دوسرے کے قریب نہیں بلکہ اک دوسرے سے بہت دور کرتی جا رہی تھیں۔ مگر میں تو اگلے ماہ ریزائن دے کر واپس جانے ہی والا تھا لہذا میں کوئی غلط سوچ اپنے دماغ میں نہ لایا۔

☆.....☆.....☆

اس کے جسم....." وہ بولے ہی والی تھی کہ میرا ہاتھ اُس پر اٹھ گیا۔ پر وہ ہاتھ اُس کے چہرے پر پڑا نہیں تھا۔ اس کا یار، میرا مطلب اس کا شوہر جو وسط میں آ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آڈ آئے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم نے میرا اعتبار نہ کر کے میری محبت کو گالی دی ہے رانیہ، تم بہت بری ہو۔ شادی کر ہی لی تھی تو فون پر ہی بتا دیتیں۔" وہ مصطفیٰ کا ہاتھ تھامے کہنے لگی۔

"بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ مجھے لگا کہ تم کبھی نہیں آؤ گے، وہیں آیت کے ساتھ سیٹل ہو جاؤ گے۔ پر تم تو آ گئے۔ مگر مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مجھے یہ سوچ کر گھن آتی ہے کہ تم کئی دن کئی رات اس کے ساتھ اکیلے اس کے گھر میں رہے۔"

سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ رانیہ اچھی لڑکی ثابت نہ ہو سکی۔ اچھی لڑکیاں تو انتظار کرتی ہیں۔ بھروسہ کرتی ہیں پر وہ ایسی ہرگز نہ تھی۔ اپنی اصل اس نے دکھا ہی دی تھی۔

☆.....☆.....☆

میں گھر آیا اپنی ماں بہن سے ملا اور سفر کی تھکاوٹ کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرے گھر والوں کو مستثنیٰ کے ٹوٹ جانے کا پتا تھا کیونکہ رانیہ نے خود میرے گھر آ کر انگوٹھی واپس کی تھی۔ پر پتا نہیں کیوں یہ بات مجھے میرے گھر والوں نے کیوں نہ بتائی تھی۔ رات کے کھانے پر انہوں نے یہ بات مجھے بتا ہی دی۔

کھانا کھانے کے بعد جب میں کمرے میں آیا تو میری نظر اس ہینڈ کیڑی پر پڑی جس میں آیت کا گفٹ رکھا تھا۔ اس وقت مجھے آیت بہت یاد آئی تھی۔ جس نے مجھے پرد پوز تو کیا، مجھے کبھی اس طرح چھو اتک نہ تھا پر رانیہ..... وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی تھی۔

روتے روتے میں نے وہ گفٹ کھولا تو دیکھا کہ وہ ایک سکیوڈ ریافیراری پر فیوم کی شیشی ہے اور اس کے ساتھ ایک مڑا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ اس کاغذ کو کھول کر دیکھا تو میں اک لمحے کے لیے دم بخود رہ گیا۔

"جو بات میں تم سے ایفل ٹاور پر نہ کہہ سکی وہ میں ان سرخیوں کے ذریعے تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔"

اس خوبصورت ایفل ٹاور کو دیکھتا آیت کے برابر آ بیٹھا۔ میں جیسے ہی بیٹھا، وہ کہنا شروع ہو گئی۔

"یہ ہے ایفل ٹاور..... یہ تین....." وہ بولنے ہی لگی تھی کہ میں نے اس کے آگے بولنا شروع کر دیا۔

"تین مرحلوں پر مشتمل تین سو چوبیس میٹر بلند ہے، جس پر بیس ہزار گولڈ لائٹس ہر گھنٹے چمکتی ہیں۔" وہ بے ساختہ ہنسی جیسے اُس کو بھی وہ دن یاد آ گیا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے رُکی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"میں تمہیں صرف الوداع کہنے یہاں آئی تھی۔"

میری ایک میننگ ہے اور میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ یہ میری طرف سے تمہارے اور رانیہ کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے اسے قبول کر لو۔ اور ہاں! میری عزت بچانے کا بہت شکر یہ مصحف! تم بہت یاد آؤ گے۔" وہ کہتی ہی چلی گئی اور میرے ہاتھ میں ایک ڈبا تھما گئی جو گفٹ پیپر کے اندر محفوظ تھا۔ آیت چلی گئی تھی، میری زندگی کا سب سے حسین خواب، آیت!

☆.....☆.....☆

جہاز جناح انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ میں CAB لیے اپنے گھر جانے لگا تھا۔ ویسے تو سب جانتے تھے کہ میں ایک سال بعد آ جاؤں گا پر میں نے کسی کو کنفرم ڈیٹ نہیں بتائی تھی۔ بس سب یہی جانتے تھے کہ میں جولائی میں واپس کراچی آ جاؤں گا۔ راستے میں، میں نے رانیہ کو دیکھا تو وحشت زدہ ہو گیا۔ وہ ایک نوجوان کے ساتھ بلوچ آکس کریم پر بیٹھی آکس کریم کھا رہی تھی۔ میں نے CAB وہیں روکنے کو کہا اور اس کے پاس چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ذرا نہیں چونکی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ خود بولنا شروع ہو گئی۔

یہ مصطفیٰ ہے، میرا شوہر! یہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے لمحفف۔" اس کا لہجہ رفتہ رفتہ سخت ہونے لگا۔

"تم آیت کے پاس اکیلے رہے، نہ جانے تم نے اس کے ساتھ کیا کیا کیا ہو۔ میں نے بہت سوچا اس بارے میں پر ایک اکیلی لڑکی کو تم نے چھوا بھی نہ ہو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جب تک تم اس کے پاس رہے... لہجے نے تمہاری پیسوں کی بھوک پوری کی اور تم نے

سے ملا اور اس سے کہا۔
 ”تمہیں ہر کوئی اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے نہ؟“
 ”پر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میرے ساتھ پاکستان
 چلو۔ میری ماں اپنی ہونے والی بہو کا انتظار کر رہی ہے۔“
 میرے جذبات سنتے ہی آیت نے مجھ سے کوئی
 زبانی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ بس جھٹ سے میرے گلے
 لگ گئی۔ اس نے مجھ سے اس وقت یہ تک نہ پوچھا کہ
 میں اس کے پاس اتنی جلدی کیسے آ گیا۔ بس محبت
 ایسی ہی ہوتی ہے۔ یہ وجوہات کے ساتھ آپ کے
 دل پر دستک نہیں دیتی، یہ تو بس ایک احساس ہوتا
 ہے۔ میری آیت سے محبت کرنے کی وجہ رانیہ نہیں تھی،
 رانیہ کا چھوڑ کر چلے جانا وجہ نہ تھی، مجھے تو اس سے محبت
 بہت پہلے ہی ہو گئی تھی۔ بے وجہ، بے سبب۔
 میری ماں نے آیت کو دل سے قبول کر لیا تھا اور
 آج وہ آیت مصحف کے نام سے جانی جاتی ہے اور
 اس حقیقت کا اندازہ مجھے کالی عرصے بعد ہوا تھا کہ
 آیت کی اصل جگہ تو مصحف (قرآن) ہی ہوتی ہے۔
 میری آیت!

☆☆.....☆☆

تمہاری سنگیتر اور تم ہمیشہ خوش رہو یہ میری دعا ہے پر
 آج میں تمہیں ایک سچائی بتانا چاہتی ہوں۔ مصحف!
 مجھے ہر کوئی اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پہلے میرے
 ماں باپ، پھر کروڑا اور اب..... اب تم!
 ہاں مصحف! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ شاید اس
 وقت جب تم نے میری عزت بچائی تھی، شاید اس
 وقت جب ہم دریائے سین کے کنارے کھڑے تھے۔
 یا شاید اس وقت جب تم نے مجھے لڑکھڑانے سے بچایا
 تھا۔ اللہ نہ کرے کبھی تم اور رانیہ ایک دوسرے سے جدا
 ہو پر اگر کبھی ایسا ہوا تو تم مجھے اپنا بنا لینا۔ میں تمہارا
 ساری زندگی بھی انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔
 اور پلیز! یہ کاغذ رانیہ کے ہاتھ نہ لگنے دینا۔“

تمہاری آیت
 آیت کا خط پڑھنے ہی میری آنکھیں نم ہو گئیں،
 پر اس حقیقت کا اندازہ مجھے بھی نہیں ہو پایا تھا کہ وہ
 آنسو خوشی اور امید کے آنسو ہیں۔

☆☆.....☆☆

میں نے اسی رات پیرس کار میٹرن بکٹ کٹوایا اور
 پندرہ دن کے اندر پیرس واپس چلا گیا۔ وہاں آیت

سچی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول 'ناشون' کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ

ان کے ذاتی تجربات اور اصل حقائق و اثرات

سعادت و نحوست کا حساب، حیرت و تجسس پر مبنی ناول

تحریر: شازی سعید مغل

ناشون

۲۵۰ صفحات

برصغیر میں عالم تسخیر کے بانی حضرت کاش البرنی کی

Postage
Rs: 50

عاملیت و کاملیت، روحانیت، محبت، تصوف اور دوسری دنیا

کے تجربات و مشاہدات پر اسراریت کے نت نئے راز کھولنا ایک

سحرانگیز ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش البرنی "بنام"

"ناشون" ہیں

ابھی رابطہ کر کے اپنی کاپی بک کروائیں یا اپنے قریبی بکسٹال پہ اپنا آڈر بک کروائیں۔

Aureq Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74800



قیمت ۱۵۰۰ روپے

قرض



مجید احمد جالبی

اس دوشیزہ نے سہلی کی زندگی کا قرض اس طرح چکایا کہ کوئی جان بھی ناپایا

دردے کو سزا ضرور دینا۔ جس نے۔ تم سے۔ تمھاری دوست چھین لی۔ اُسے ضرور دینا۔ جس نے.....
یہی آخری الفاظ تھے، جو آنچل کے لبوں پر نامکمل رہ گئے تھے اور وہ لڑھیک گئی تھی۔ ہاں اُس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی، اُس کا جسم بے سدھ ہو گیا تھا اور اُس کی مٹھی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ شاید ان آنکھوں میں بہت سے سوال تھے، جن کا آنچل کو جواب چاہیے تھا۔

ہاں آنچل اس بے وفادار دنیا کو الوداع کہہ کر چلی گئی تھی اور اس دنیا کے ناسوروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھڑوا گئی تھی۔
”بزدل بھی وہ۔“

میرے دل سے آواز آئی۔

ہاں بزدل بھی۔ ورنہ۔ یوں خودکشی نہ کرتی۔

انسان ہمت والا ہو تو زمانے سے ٹکرا سکتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھ جاتا ہے۔ نا انصافیوں کا بدلہ لے سکتا ہے۔

مگر یہاں تو چپے چپے پر دُشمنی دردے بستے ہیں۔ بڑے بڑے اژدھے پڑے ہیں جو شکار کی تاک میں رہتے ہیں۔

رات کے ایک بجنے کو تھے، مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ میں جلد از جلد انتقام لینا چاہتی تھی۔ ماما، پاپا کو سونے ہوئے چھوڑ کر مین ٹیرس پر چلی آئی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سارا شہر خاموشی کی چادر اوڑھ چکا تھا۔ کہیں کہیں آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں وقتے وقتے سے سنائی دے رہی تھیں۔

پورا شہر برقی بتیوں سے جگمگا رہا تھا۔ میرے گھر کے ارد گرد کے گھروں میں مکمل سناٹا تھا اور برقی بتیاں روشن تھیں۔ اشرف المخلوقات خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔

میرے خواب تو اُس دن چکنا چور ہو گئے تھے۔ جس دن آنچل میرے بازوؤں میں دم توڑ گئی تھی۔ ہاں۔ میری آنچل! کتنی پیاری، معصوم تھی۔ آخری ہچکی لیتے ہوئے مجھے بہت بڑے امتحان میں ڈال گئی تھی۔

”صائمہ باجی، ایک وعدہ کرو۔“

”ہاں ہاں، بولو آنچل۔ بولو۔“ میں نے جواب دیا تھا۔

صائمہ باجی! آپ کو میری قسم۔ اُس..... اُس



READING
SESSION



شاید تو کوئی دیوانہ ہی تھا جو دروازہ اکھاڑنے پر
ٹٹا ہوا تھا۔

میں کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ صابن
سائیڈ پر رکھا، کپڑے غصے سے پھینکے اور دروازے کی
طرف پھٹی۔

سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے میں نے آواز
دی۔ کون ہے؟“

شاید دروازہ پینے والا اپنے کام میں اتنا مگن تھا
کہ میری آواز سن ہی نہیں پایا تھا۔ میں نے دوبارہ
کہا۔ ”کون ہے؟“

”باجی! دروازہ تو کھولو۔ میں۔۔۔ آئجل
ہوں۔ آپ کی پڑوسن۔“

میرے پڑوس میں تو کوئی آئجل نام کی لڑکی تھی ہی
نہیں۔ ہاں ساتھ والا مکان خالی پڑا تھا۔ مالک مکان
نے کئی بار ابو کو کہا بھی تھا کہ مکان کرائے پر چڑھا
دے۔ شاید کوئی نئے کرائے دار آئے ہیں۔ مغرب
کے بعد یہاں شور شراب بھی تھا۔ سامان اٹھانے، رکھنے
کی آوازیں۔ ادھر رکھو۔ ادھر رکھو۔ الماری وہاں
رکھو۔ کوئی سامان رکھنے والے کو گائیڈ کر رہا تھا اور میں
کچن میں بیٹھی سن رہی تھی۔ میری ای کی طبیعت خراب
تھی اور کچن میں نے سنبھالا ہوا تھا۔

مجھے رات والا خیال در آیا۔

نسوانی آواز پر میں نے دروازے کے چھوٹے
سے سوراخ سے باہر جھانکا۔ معصوم، کول سی لڑکی بے
تاب کھڑی تھی۔ ہاتھ میں بالٹی تھی اور ماتھے پر پسینے
کے موٹے موٹے قطرے آزادانہ گھوم رہے
تھے۔ سورج کی روشنی ماتھے پر پڑتی تو لگتا سنہری
کرنیں ستارہ بن کر ادھر ادھر پھیل رہی ہیں۔

بادل خواستہ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ لڑکی
مجھے معصوم سادگی کا پیکر نظر آئی۔ یہ بھلا کیا دھوکہ دے
گی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ بے تاب، پریشان
لڑکی نے بالٹی آگے کرتے ہوئے سلام کیا اور کہنے
لگی۔

”باجی! ایک بالٹی پانی چاہیے۔ گھر میں تل خراب
ہے۔ اور بجلی کا کنکشن کاٹا ہوا ہے۔“

آئجل معصوم نرم و نازک کلی تھی۔ اور پھر لڑکیاں تو
پھولوں سے بھی زیادہ نازک اور ملائم ہوتی
ہیں۔ چھوتے ہی مرجھا جاتی ہیں۔ یہ کلیاں تو آئجل
میں بھلی لگتی ہیں۔ ظالم ہاتھوں میں آتے ہی مرجھا جاتی
ہیں۔

لیکن جدید زمانے میں ہر گلی، ہر محلے میں وحشی
درندے شکار کی تاک میں مورچے لگائے بیٹھے
ہیں۔ آتی جاتی لڑکیوں پر جملے کسانا، کبھی دولت کی
چال چل کر، کبھی تصویریں ماں باپ کو دکھانے کی دھمکی
تو کبھی ویڈیو اپن کرنے کی دھمکیاں، جسم سے کھلواڑ
کرنے کے حربے تیار کیے ہوتے ہیں۔

میں سوچوں کے نگر میں بہت دُور چلی گئی
تھی۔ پہلی بار آئجل تپ ملی تھی جب میں گھر میں آئی
بیٹھی کپڑے دھور ہی تھی۔ کوئی دروازہ زور زور سے
پیٹے جا رہا تھا۔ ای بازار گئی ہوئی تھی۔ ابو تو صبح ہی
ڈیوبلی پر چلے گئے تھے، علی اور ارسلان اسکول چلے گئے
تھے۔ دن کے دس بجے تھے۔ جب ای بازار سے
اشیائے خوردنوش لینے گئی ہوئی تھی۔ جاتے جاتے
تاکید کرنا نہیں بھولی تھی۔

”صائمہ بیٹی، دروازے پر کوئی بھی آئے دروازہ
مت کھولنا۔ آج کل بہت سے لوٹنے والے شہر میں
گھس آئے ہیں۔ اور سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنا
کر لوٹ جاتے ہیں۔ نقدی زیورات کے ساتھ ساتھ
لڑکیوں کو نوچتے ہیں۔ زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”اچھا ای!“

میں نے ای کی تاکید پر سر خم کرتے ہوئے
کہا۔ ”ای! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔“
ای بازار چلی گئیں۔ اب جانے کون دروازے کو
بار بار پیٹے جا رہا تھا۔

ہمارا گھر شہر کے مغربی کونے میں مین بازار سے
کافی دُور تھا۔ شہر تھانہ گاؤں۔ گاؤں اور شہر کو ملانے
والا ہمارے علاقہ تھا۔ ہمیں دیہاتی کہہ سکتے ہیں یا پھر
شہری۔ دروازہ لکڑی کا تھا اور نیل ڈور کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ لکڑی کے دروازے کو بے دردی سے پیٹا جا
رہا تھا۔

تھا۔ مگر کون اُس سے پوچھتا۔ سارے قانون اُس کے تھے۔ اُس کے حکم سے پرندے بھی پر نہیں مارتے تھے۔ فرعون سے بڑھ کر غرور تھا اُس کا۔

کرمو چاچا۔! کیا کرتا۔ اُس کی فریاد آسمان سے نکل کر واپس پلٹ آئی تھی۔ شاید اوپر والے نے آزمائش میں ڈالا ہوا تھا۔ ورنہ وہ اپنے بندوں کو یوں ذلیل و خوار تو نہیں کرتا۔ اُس کی فریادیں عرش سے لوٹ آئی تھیں اور یہاں تو ظالم کا راج تھا۔ انسان کے رُوپ میں وحشی درندہ تھا۔ اپنی مرضی چلاتا تھا اور وقت کا فرعون بنا بیٹھا تھا۔ رب تعالیٰ نے بھی رسی ڈھیلی چھوڑی ہوئی تھی۔ نافرمانوں کو موقع پہ موقع فراہم کرتا جا رہا تھا۔

قیامت کا سماں تھا۔ کرمو چاچا کی دنیا بٹ گئی تھی۔ ایک طوفان آیا اور اُس بوڑھے کے چھینے کا سہارا چھین کر اُسے روتا، آنسو بارتا چھوڑ گیا تھا۔ آسمان پھٹا نہ زمین لرزی۔ کبھی کبھی اوپر والا بھی کڑے امتحان لیتا ہے۔

کرمو چاچا نے اپنی دنیا کا ماتم کرتے ہوئے ایک فیصلہ کر لیا۔ یہاں سے چلے جانے کا۔ اپنی معصوم، کنواری بیٹی کو محفوظ رکھنے کا۔ اُس کی عزت بچانے کا۔ یہاں اس مگرمی میں وحشی خون خوار درندے بستے تھے۔ وہ مستقبل کو سوچ کر کانپ اٹھا تھا۔ یہاں انسان جانوروں سے سستے تھے۔ یہاں خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ محبتیں ناپید اور وحشت و دہشت کا راج تھا۔ جاگیردار، دن کے اُجالے میں جانے نہ دیتا۔ اسی لیے راتوں رات سانس روکے راہ فرار اختیار کر لی تھی۔ تبھی تو آنچل کو بچانے کے لیے رُوپ بدل کر چھپتے، چھپاتے یہاں تک پہنچے تھے۔

☆.....☆.....☆

آنچل پہلی ہی ملاقات میں دوست بن گئی تھی۔ کتنی مظلوم تھی۔ کبھی کبھی انسان کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی قربان ہو جاتا ہے۔

آنچل جیسے ہی دن کے کاموں سے فارغ ہوتی میرے پاس آ جاتی۔ میں سلائی کڑھائی کرتی تھی، آنچل بھی میرے پاس بیٹھ جاتی اور سلائی

”آنچل! آنچل نام بتایا تھا ناں۔“ میں نے تصدیق کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔ جی۔ ساتھ والا مکان ہمارا ہے۔ ہم رات ہی شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ کے نئے پڑوسی۔“ میں اُسے اندر لے گئی۔ اور وہ بالٹی میں پانی بھرنے لگی۔ اُس دوران ہم نے کافی کپ شپ کر لی تھی۔

آنچل دکھیاری لڑکی تھی۔ سندھ کے چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ بد قسمتی سے وہاں کے ظالم و ڈیرے نے ان کے آشیانے کو مسمار کر دیا تھا۔ اور اجڑا، برباد، لوٹا ہوا گھر انہ رات کے اندھیرے میں اپنا گاؤں، زمین، ڈھور ڈنگر چھوڑ آئے تھے۔ اپنی جان بچ گئی تھی، یہی کافی تھا۔

بوڑھا باپ تھا۔ جس کی ہڈیاں آوازیں دیتی تھیں اور اُس کی شریک حیات بوڑھی حلیمہ۔

آنچل کے دو بھائی تھے۔ دونوں ہی آنچل سے بڑے تھے۔ لیکن ظالم و ڈیرے نے بوڑھے باپ کے سامنے قتل کروا دیا تھا۔ بوڑھا باپ روتا رہا، معافیاں مانگتا رہا۔ فریادیں کرتا رہا۔ لیکن ظالم و ڈیرے نے کارندوں کو اشارہ کیا اور دونوں بھائیوں کی کلباڑی کے وار کر کے گردنیں اڑا دی تھی۔

ان کا قصور صرف اتنا تھا۔ ان کی بھینسیں جاگیردار کے کھیت میں ڈر کر گھس گئی تھیں۔ بے زبان جانور تھے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے طور پر ہر کوشش کی تھی، مگر نا سمجھ جانور تھیا اور پھر فصل کا نقصان زیادہ بھی نہیں ہوا تھا۔

آنچل کے بھائیوں نے معافی بھی مانگی تھی۔ اور ان کے بوڑھے باپ نے معافیاں بھی مانگیں، وڈیرے کے پاؤں پکڑے، گڑ گڑاتا رہا۔ لیکن غرور، تکبر کی چکی میں بسنے والے کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور اُس کے ایک اشارے سے۔ اس کے کارندوں نے کلباڑیوں سے وار کر کے گردنیں اڑا دی تھی۔

کتنا ظالم شخص تھا۔ ان کے جانور قبضے میں کر لیتا

بے گناہ لڑکیوں کا قیل کروانے کا جواز نہیں بنتا

READING
Section

اٹھاتی۔" یوں نہ چاہتے ہوئے بھی ابو نے مجھے جاہ کی اجازت دے دی۔

☆.....☆.....☆

انٹرویو بہت اچھا ہوا تھا۔ مجھے نوکری مل گئی۔ تنخواہ بھی اچھی تھی۔ یک اینڈ ڈراب بھی کمپنی کی ذمہ داری تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی کمپنی کی طرف سے ملنا تھا۔ میں رب رحمان کی نعمتوں، رحمتوں کا شکرانہ ادا کرنے لگی۔ اور خوشی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

رب رحمان نے خاص کرم کیا تھا۔ گھر کا گزر بسر اچھا ہونے لگا۔ صبح سویرے جالی اور شام پانچ بجے گھر لوٹی۔ تھوڑا ستانی اور پھر گھر کے کاموں میں جت جاتی۔ والدین کی خدمت فرض عین تھی اور میں یہ ذمہ داری احسن طریقے سے نبھانا چاہتی تھی۔

یہ اتوار کا دن تھا۔ فیکٹری سے چھٹی تھی۔ میں نے صبح کا ناشتا تیار کر کے برتن دھونے شروع ہی کیے تھے کہ آنچل آگئی۔

چہرے پر اداسی، جیسے کسی پریشانی میں گھری ہوئی ہو۔

"آنچل! کیا ہوا، تیرا سونہا مکھڑا لٹکا ہوا کیوں ہے؟"

پہلے تو خالی نظروں سے وہ مجھے گھورتی رہی پھر کہنے لگی۔

"صائمہ باجی! کیا بتاؤں۔ رب رحمان نے غریب بنا کر دنیا کے حوالے کر دیا اور خود نظر کرم نہیں کرتا۔ وہ اگر نواز دے تو آس کے خزانے میں کون سی سی کمی آجانی تھی۔"

"نہیں۔ آنچل۔ رب تو رحمان ہے۔ وہ کسی کو تکلیف دے کر خوش نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے پیاروں کو آزمائشوں میں ڈال کر امتحان ضرور لیتا ہے اور سرکش لوگوں کو ڈھیل دے کر آزماتا ہے۔ انہیں توبہ کرنے کا موقع دیتا ہے۔ کس لمحے توبہ کر لے۔ میری طرف لوٹ آئے۔ وہ کسی کے ساتھ برا نہیں کرتا۔ یہ انسان بے مروت ہو گیا ہے۔"

میں نے لمبا چوڑا لہجہ پھر دے کر پوچھا۔

"ہوا کیا ہے؟ اتنی مایوس کیوں ہو؟"

کڑھائی سیکھنے لگی۔ اس نے اپنے متے ماضی کا ایک ایک پل مجھے بتایا تھا۔ اس کے آنسو آنکھوں کی زمین سے بغاوت کرتے، رخساروں کو چومتے ہوئے دامن گیر ہو جاتے۔ ننھی سی جان نے کتنے ظلم سہے تھے۔ کتنا درد تھا اس کی آواز میں۔ کس کرب سے گزری تھی۔ اپنی آنکھوں کے سامنے دو بھائیوں کے جنازے اٹھتے دیکھے تھے۔

کرمو چا چا اور حلیہ جو جمع پونجی ساتھ لے آئے تھے ختم ہو چکی تھی۔ فاقوں کی نوبت آنے والی تھی۔ کرمو چا چا نے ہمت کی اور کام ڈھونڈ لیا۔ گھر کا نظام بھی چلانا تھا۔ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کچھ نہیں ہوئے والا تھا۔ آخر زندگی کا پہلے چلانا تو تھا۔ کرمو چا چا اپنے اجڑے خاندان کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔

☆.....☆.....☆

میرے ابو چند دنوں سے بیمار پڑ گئے تھے۔ جاہ جاتی رہی تھی۔ گھر میں فاقے پڑنے لگے تھے۔ بھائی چھوٹے تھے اور امی گھریلو خاتون تھی۔ کوئی سہارا نہیں تھا۔ رشتے دار کب کے راہیں بدل چکے تھے۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ ہمت کرنے کا، گھر کا بیڑا اٹھانے کا۔ جاہ کرنے کا۔

میں گریجویشن کر چکی تھی اور یہ میرے ابو کی مجھ سے بے پناہ محبت تھی۔ میں نے اپنی سہیلی کے توسط ایک کپڑے بنانے والی فرم میں اپلائی کر دیا۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ دو دن بعد مجھے انٹرویو کی کال آگئی۔ اسی ڈر رہی تھی۔ اور ابو کی نظریں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے خود سے شرمندہ سے ہوں۔ مگر اس کے علاوہ کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔ گھر کا چولہا ٹھنڈا بڑا تھا۔ اور آخر پیٹ کا دوزاخ بھرنا تو تھا۔ آج نہیں تو کل مجھے جاہ کرنی پڑتی۔ میں نے ابو کے پاس بیٹھ کر پیارے سے ان کا ماتھے چوم لیا۔ پاپا جانی۔ مجھ سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ کی یہ بیٹی آپ کا پتر بن کر دکھائے گی۔ گھر کا نظام بھی چلانا ہے۔ کسی نہ کسی کو قربانی دینے پڑے گی۔ پھر میں ہی کیوں ناں گھر کا بیڑا اٹھا لوں۔ بھائی چھوٹے ہیں اگر وہ کچھ کرنے کے قابل ہوتے تو میں یہ قدم نہ

خاموش کھڑا خلقت کا پہرہ دے رہا تھا۔ ننھے ننھے ستارے ایک دوسرے کے ساتھ کپکپ رہے تھے۔ چند ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں کر رہے تھے۔

امی کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میں سوچوں کے نگر سے واپس آئی اور سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے کمرے میں گئی۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میرے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ آسمان گھومتا ہوا نظر آیا۔ پاؤں من من وزنی ہو گئے تھے۔ رات کے اس پہرے جب پورا شہر خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ کس کو مدد کے لیے پکاروں۔ کدھر جاؤں۔ میرا دماغ ناؤف ہونے لگا۔ اُف میرے اللہ! تو بھی کیسے کیسے امتحان میں ڈال کر آزماتا رہتا ہے۔

ای! پاپا کے سر کو دبائے جا رہی تھیں اور ابوبی بی سانس لے رہے تھے۔ آنکھیں بول رہی تھیں۔

ابو! چند سالوں سے بیمار پڑے تھے۔ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ سائنسدان ابھی تک اس کا علاج ڈھونڈ نہیں پائے، جب کہ قرآن مجید واضح بتا رہا ہے کہ موت کے علاوہ ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔ نجانے یہ بیماریاں کیوں آتی ہیں۔ لحد لحد تڑپانے کے لیے، رلانے کے لیے، آزمانے کے لیے۔ بیماریاں شاید جسم کا صدقہ ہوتی ہیں۔

الماری میں پڑی دوائی میں نے ابو کو پلائی اور اُمید دلائی کہ سحر ہوتے ہی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔ اس وقت تو گاڑی ملنی ہے نہ ڈاکٹر۔ رات کے دو بجے مدد کے لیے بلاتی بھی تو کس کو؟ گھر بھی شہر سے دُور تھا۔ لیکن میں سوچتی رہی اور میرے ابو۔ آنسوؤں کی سوغات دے گئے۔ ہاں، میرے ابو۔ ظالم دُنیا چھوڑ گئے اور مجھے وحشی زمانے میں تنہا کر گئے۔ میرا سائبان لٹ گیا تھا۔

ابو نے امی کی گود میں آخری ہچکی لی اور ان کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسوؤں نکل کر زخاروں کو چھوتے ہوئے دامن گیر ہو گئے۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

”ابو آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑے جا

صائمہ باجی! بابا کی فیکٹری سے چھٹی کر دی گئی ہے۔ فیکٹری والے کہتے ہیں، بوڑھا ہے کام ٹھیک نہیں کر سکتا۔ بوڑھے کندھوں میں وزن اٹھانے کی سکت نہیں ہے۔ ابو رو کر بلکان ہو رہے ہیں۔ اب گھر میں کمانے والا کون ہے؟ کھل سے کھانا نہیں کھایا۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔“

”ارے بھئی! میرے پاس چلی آتی۔ کس نے روکا تھا۔ تیری دوست کس لیے ہے۔“

میں نے آنچل کو کھانا دیا۔ میرے کندھے سے لگ کر وہ رو دی تھی۔ میں نے اُسے تسکین دی۔ جب گھر جانے لگی تو کرمو چا چا اور ماسی حلیمہ کے لیے بھی کھانا دیا۔

”میں کام دلو آؤں گی۔ تیری دوست کس لیے ہے۔ تو میرے ساتھ چلنا۔ دونوں ایک ساتھ کام کریں گی۔ مگر۔“

”مگر باجی! مجھے تو کچھ کرنا نہیں آتا۔ بھئی! کوئی ماں کے پیٹ سے سیکھ کر تھوڑا آتا ہے۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں، خود جتن کرنے پڑتے ہیں۔ تم صبح بس میرے ساتھ چلنا۔ کرمو چا چا اور آپ کی امی کو میں سمجھا دوں گی۔“ آنچل راضی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

میں نے اُسے نوکری دلوادی۔ آنچل بہت خوش تھی۔ اس کے گھر میں اُمید جاگ اٹھی تھی۔ آنچل کے کمانے سے گھر کا ٹھنڈا چولہا جلنے لگا تھا۔ لیکن۔

کاش! میں آنچل کو نہ لے کر جاتی۔ میری آنچل میرے قریب ہوتی۔ مجھے سے ڈھیروں باتیں کرتی۔ آنچل میرے درمیان نہیں تھی۔ میں خود کو آنچل کا قاتل سمجھ رہی تھی۔ میری وجہ سے اُس نے خودکشی جیسا حرام فعل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں سوچوں کی گرداب میں پھنس گئی تھی۔ سوچوں کے نگر آباد ہو گئے تھے۔

اتنے میں امی کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

”صائمہ بیٹی۔! ارے اوصائمہ۔ کہاں ہو۔“

میں اُس وقت آسمان کو تنکے جا رہی تھی۔ آسمان

رہے ہو۔" میں چلا رہی تھی۔ مگر ابو جانی۔ خاموش تھے۔ ہاں ہمیشہ کے لیے خاموش۔
کاش! انسان کو کبھی موت نہ آتی۔ لیکن اگر موت کا عنصر نہ ہوتا تو انسان زندگی سے بیزار ہو جاتا۔ اور رب رحمان نے اپنے بندوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے اپنے پاس بلانا تو تھا۔ موت کا مزہ تو ہر شے نے چکھنا ہے۔

میرے ابو ہم ماں بیٹی، بیٹوں کو روتا، آنسو بہاتا چھوڑ کر چلے گئے۔ نظام قدرت ہے۔ اپنے ہی پیاروں کو اپنے ہی ہاتھوں منوں مٹی تلے سلا دیتے ہیں۔ بل بھر میں زمین میں دفن کر دیتے ہیں۔ صبر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ اور ہمیں صبر کرنا پڑا۔ رب کی رضا میں راضی ہونا پڑا۔

وقت کا کام ہے گزرنا۔ سو گزرتا چلا گیا۔

کئی دن ماحول سوگوار رہا۔ پھر دھیرے دھیرے سب دنیا داری میں کھو گئے۔ اس دوران آنچل نے میرا بہت ساتھ دیا۔ ہر بل میرے ساتھ چسپی رہی۔ مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ میرے غم میں برابر شریک ہوئی۔ پایا کی بڑی عزت کرتی تھی۔ یوں بچھڑنے کا غم اُسے بھی تھا۔

گھر کی ذمہ داریاں میرے نازک کمزور کندھوں پر آن پڑی تھیں اور ایک کمزور صفت نازک لڑکی مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ بھائیوں کی پڑھائی کا خرچ، ای کی دوائی، گھر کے اخراجات۔ مسائل سانپ کی طرح پھن پھیلانے کھڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا، میری تنخواہ اچھی تھی۔

☆.....☆.....☆

ای جان! میری چڑھتی جوانی دیکھ کر پریشان ہو جاتی تھیں۔
"آخر تمہیں بھی ایک نہ ایک دن پیا گھر سدھارنا ہے، پھر میرا کون ہوگا۔" میں نے امی کو بانہوں میں جکڑ لیا۔

"میری پیاری ای! میں بچ راہ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔" ای جان کو دے لفظوں میں اس

موضوع پر بات کرنے پر روک دیا۔ لیکن کیسے ہو سکتا تھا۔؟ چڑھتی جوانی ہو اور من میں اپنے آشنائے کے خواب نہ ہوں۔ یہی تو عمر ہوتی خواب دیکھنے کی، گنگنائے کی، میری آنکھیں بھی خواب سجاتی رہتی تھیں۔ محبوب کے سپنے ہوتے تھے۔ خوابوں پر کس نے پابندی لگائی ہے۔ ان پر تو کوئی قانون لاگو ہی نہیں ہوتا۔ غریبی، امیری کچھ بھی تو نہیں دیکھتے۔ دولت۔ جائیداد، کاروبار، بزنس، بینک بیلنس کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ خوابوں کا کوئی دین، دھرم نہیں ہوتا۔ ان کی دنیا الگ ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

فیکٹری کی گاڑی صبح سویرے ہمیں اسٹاپ سے لے جاتی اور شام کو واپس اتار جاتی۔ فیکٹری میں میل اور فی میل ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ ایک اینڈ ڈراپ کی سہولت میں دونوں اکٹھے سفر کرتے تھے۔ بظاہر فیکٹری کے قانون سخت تھے۔ موبائل پر پابندی تھی اور ابھی موبائل اتنے متعارف بھی نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھی عشق نامراد کو کون روک پایا ہے۔ اس پر کس کا زور چلا ہے۔ اس کا جادو تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ اور بس۔

ماہ دو سال گزرتے چلے گئے۔ اس دوران آنچل کا باپ (کرمو چاچا) بھی بے وفا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ آنچل کی گل کائنات لٹ گئی تھی۔ لڑکی کے لیے اللہ تعالیٰ کے بعد محافظ باپ ہی ہوتا ہے۔ جب یہ سائبان بھی اٹھ جائے تو دنیا تاریک جنگل کا روپ دھار لیتی ہے۔ جس میں خار دار کانٹے ہی کانٹے ہوتے ہیں۔ زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ اپنے سانپ بن کر ڈسنے لگتے ہیں۔ خیر۔ آنچل کے اپنے تو تھے ہی نہیں۔ بوڑھی ماں تھی۔ ہم کام پہ جاتی تھیں تو ماسی حلیمہ میرے گہر آ جاتی اور میری امی کے ساتھ سارا دن گزارتی تھی۔ سارے دن اکٹھے زندگی کی ڈوریاں سلجھاتی رہتی۔ بس یہی گل کائنات تھی ہماری۔

☆.....☆.....☆

پھر وہ ہو گیا جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ آنچل ابالی عمر میں محبت کر بیٹھی تھی۔ اپنے من

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کہ انتظامیہ کو مطلع کر دوں۔ یا پھر تمہیں۔ مگر وہی نسوانی مجبوریاں۔ وہی رسوائی کا ڈر، وہی بدنامی کا طوق۔ بات کا بھنگڑ نہ بن جائے، سوچ کر خاموش ہو جاتی۔

جلتی پہ تیل کا کام اُس دن کی ہمدردی سے ہوا۔ جس دن گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے میرے آگے ایک آوارہ لڑکا آن کھڑا ہوا۔ وہ بدکلامی کرنے لگا۔ میں ڈر گئی مگر کیا کر سکتی تھی۔ میری آنکھوں نے ساون بھادوں کی طرح برسات شروع کر دی اگر عدنان اُس وقت نہ آتا تو۔ جانے کیا ہوتا۔ عدنان اُس لڑکے کے ساتھ لڑنے لگا، بھلا ہو جو کیدار کا، اگر وہ بروقت وہاں نہ آتا، دونوں ایک دوسرے کو مار مار کر لہولہان کر دیتے اور میں بدنام ہو جاتی۔ میری نوکری بھی جا سکتی تھی۔ جا ب جاتی تو فاقے ہوتے۔ پھر امی کی دوائیاں کہاں سے آتیں۔ گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑ جاتا۔

آنچل مایوس ہونے لگی۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ ”نہیں آنچل! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جس طرح جا ب کرنے کے لیے تو اشد وضو اہل سے گزرنا پڑتا ہے اسی طرح جا ب چھوڑنے، چھڑوانے کے قانون ہوتے ہیں۔ جن کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے آنچل سے کہا اور آنچل سر جھکا کر پھر کہنے لگی۔

”خیر..... اُس دن بات آئی گئی ہو گئی اور دوسری صبح آپ بھی کام پر جانے لگی تو عدنان کو موقع نہ مل سکا۔ اُس کی نظریں میرا طواف ضرور کرتی تھیں اور پھر میں بھی چور نظروں سے اُسے دیکھ لیتی تھی۔ شاید میرے دل میں بھی محبت کی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔ محبت کی چنگاری کو صاعقہ کے ہاتھوں آنے والی چٹھی نے ہوا دی۔ جس میں محبت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر دو دن میں جواب مثبت نہ ملا تو فیکٹری کے گیٹ کے پاس تمہارے سامنے خود کو اڑا دوں گا۔ چٹھی کیا تھی۔ ایٹم بم تھا۔ کھلی دھمکی اور میری رسوائی بھی۔ میں ڈر گئی اور دل کے نہاں خانوں میں اُس نے جگہ بنالی تھی۔ یہ دل

سندر میں شہزادے کے خواب سجا بیٹھی۔ زندگی کو آسان ہوتا دیکھ رہی تھی لیکن اُس نامراد عشق نے زندگی ہی اُجاڑ دی۔ محبت نے اُسے تباہ کر دیا۔

آنچل ابھی بچی عمر میں تھی کہ عشق کے ہتھے چڑھ گئی۔ اور پھر زندگی ہی ویران کر لی۔ عورت تو ایک ہی بار محبت کرتی ہے اور ٹوٹ کر کرتی ہے۔ وہی محبت دھوکہ دے جائے تو عورت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی ہے۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ آنچل صبح سویرے ہی میرے پاس آ گئی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے کہیں کھوسی جاتی۔ باتوں باتوں میں سوچوں میں کھوسی جاتی۔ جب دو لڑکیاں مل بیٹھیں تو من کے شہزادوں کا ذکر کا چھڑ جانا ضروری امر ہے۔ آنچل نے اپنے سپنوں کے راج کمار کے بارے بتایا تو میرے ہوش اڑ گئے۔

”یہ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ بڑی چھپی رستم نکلی ہو یار۔“ بتایا تک نہیں۔ کب سے موصوفہ عشق کی چٹکیں اڑ رہی ہے۔

آنچل پر میں جان دار تھی۔ پھر بھلا یہ راز اپنے سینے میں کیسے چھپائے رکھتی۔ آخر راز فاش ہو ہی گیا۔

”صائمہ باجی! یہ اُس دن کی بات ہے۔ جب آپ کو بخار تھا اور میں اکیلی کام پر گئی تھی۔“

”کب؟ میں نے ذہن پر روز دیا تو مجھے یاد آیا پچھلے سال میں نے چار، پانچ چٹھیاں کی تھیں۔ بخار نے مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔ تب آنچل اکیلی کام پر جاتی رہی تھی۔“

”اد۔ تو۔ میری غیر موجودگی میں شہزادہ ڈھونڈ لیا۔“

”ڈھونڈ کہاں لیا۔ وہ تو میرے گلے پڑ گیا ہے۔“

صبح میں گاڑی میں سوار ہوتی تو وہ پہلے سے موجود ہوتا اور کسی نہ کسی طرح میرے سامنے والی سیٹ پر آن بیٹھتا ہوتا۔ واپسی پر بھی ایسا ہی ہوتا۔ اُس کی نظریں میری جاسوسی کرتی رہتیں۔ مجھے دیکھ کر مسکراتا رہتا۔ کبھی آنکھوں سے عجیب و غریب اشارے کرتا۔ مجھے یہ سب ناگوار گزرتا۔ کئی بار سوچا

ہی تو ہے جو اندر بنا اعتبار کر لیتا ہے۔ ہزار بار ٹوٹتا ہے پھر بھی عکس نہیں آتی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی اور محبت کا اقرار کر دیا۔

محبت کا پودا شجر بننے لگا۔ جس دن آپ چھٹی پہ ہوتیں، ہماری عید ہوتی، ہماری ملاقات ہو جاتی۔ ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پارک میں گھومتے پھرتے، ہوٹل میں سچ ہوتے۔ محبت کا جاوید سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اور میں اس کے سحر میں ڈوب چکی تھی۔ عدنان کی باتیں سرور کرتی تھیں، وہ بہت ہنس مکھ، خوش اخلاق تھا، مجھے زمانے کے لڑکوں سے الگ لگا اور میں نے اُسے من کے اندر چھپا لیا۔ عہد و پیمانہ ہونے لگے، قسمیں وعدے ہونے لگے۔

مجھے سہارا چاہیے تھا۔ اسی اور آپ کے سوا میرا تھا ہی کون۔ پھر آپ بھی ایک نہ ایک دن دلہن بن کر اپنے پیانگھر چلی جاتی۔ میں تہا رہ جاتی۔ مرد کے بغیر زمانہ جینے بھی تو نہیں دیتا۔ مجھے عدنان کے رُوب میں سہارا مل گیا تھا اور میں اُسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اُسے اپنا لیا، اُسے پوجنے لگی، اُسی کے سپنوں میں جینے لگی۔ وہ مجھے گفٹ دیتا تو مجھے خوشی ہوتی۔ کبھی پر فیوم، کبھی کپڑے اور بہت کچھ۔ لیکن.....

☆.....☆.....☆

شام ہو چکی تھی، میں نے کھانا بنانا تھا۔ خوابوں کے تانے بانے بنتے بناتے آنچل رخصت ہوئی اور میں بھی کچن میں مصروف ہو گئی۔ اُس دن کے بعد مصروفیات نے ایسا گھیرا کہ پھر ایسی محفل نہ جم سکی۔ وقت گھوڑے پر سوار ڈورتا رہا۔ کبھی کبھار آنچل کو چیئر لیتی اور اُس کے عدنان کو دیکھنے کی فرمائش کرتی رہتی۔ مگر آنچل نے یہ راز دل ہی چھپائے رکھا۔ کہتی تھی۔

”صائمہ باجی! کسی دن ملاقات کریں گے تو آپ کو ساتھ لے جاؤں گی، پھر دیکھ لینا۔ میرے عدنان کو، یوں سب کے سامنے نہیں۔ اور پھر وہ روز ہمارے آس پاس ہی تو ہوتا ہے۔“

آنچل کا عدنان ہمارے درمیان ہوتا تھا اور میں پہچان نہیں سکتی تھی۔

وقت بے لگام گھوڑے کی طرح صحرانوردی بنا گیا اور ایک روز جیب ہم کام سے واپس آئی تو آنچل کی دنیا لٹ چکی تھی۔ اُس کا باپ یہ دنیا بھول گیا تھا۔ آنچل میری طرح باپ کے سہارا سے نکالی ہو گئی تھی۔ میرے تو بھائی تھے۔ آج تھوڑے دن بڑے، آج نہیں کل میرا ساتھ دیتے، میرا سہارا بن جاتے مگر آنچل کا کوئی نہیں تھا۔ بھائی لٹ ہو گئے، باپ بھی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ بوڑھی ماں اب تک ساتھ بھائی۔ اُس دوران اُسے عدنان کی ضرورت تھی۔ عدنان نے اُسے تنہا نہ ہونے دیا۔

اُس دوران قیامت آئی اور سب کچھ بتا دو برباد ہو گیا۔ مجھے ضروری کام تھا اور میں فیکٹری میں جا رہی تھی۔ میں نے آنچل کو کیا بھیج دیا۔ اُسے پتہ نہ چلے۔

”آج تو اپنے شہزادے سے مل لو گی ناں۔“ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ لیکن کیا خبر تھی، ایک طوفان آئے گا اور سب کچھ بستر جانے لگا۔ یہی میری غلطی تھی۔ کاش اُس دن میں اُس کے ساتھ چلی جاتی۔

☆.....☆.....☆

چھٹی کے بعد آنچل عدنان کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھانے چلی گئی۔ ہوٹل کا روم بک کروایا گیا۔ باتوں باتوں میں عدنان آنچل کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ اور وہ سب ہو گیا جو شادی سے پہلے کسی لڑکی کے لیے باعث شرمندگی ہوتا ہے۔ جذبات کی لہروں نے انہیں ایسا قید کیا کہ آنچل کو خبر بھی نہیں ہوئی اور اپنا سب کچھ عدنان پر قربان کر دیا۔ ہوش تب آیا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ محبت کا نشہ، زہر بھر چکا تھا۔ عدنان سر جھکائے شرمندہ سا بیٹھا تھا۔ آنچل آنسو بہا رہی تھی۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، کے مصداق، آنچل لٹ چکی تھی۔ اب ندامت کے آنسو بہانے سے کیا ہونا تھا۔

عدنان نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”میری جان تم ہی تو میری دلہن ہو۔ ایک نہ ایک دن میرے آنکھ میں آ ہی جاؤ گی۔ ہمیں کوئی جدا نہیں

وقت بے لگام گھوڑے کی طرح سر پینٹا چلا گیا اور ایک روز جب ہم کام سے واپس لوٹی تو آنچل کی دنیا لٹ چکی تھی۔ اُس کا باپ یہ دنیا چھوڑ گیا تھا۔ آنچل میری طرح باپ کے سائبان سے خالی ہو گئی تھی۔ میرے تو بھائی تھے۔ آج چھوٹے، گل بڑے، آج نہیں گل میرا ساتھ دیتے، میرا سہارا بن جاتے مگر آنچل کا کوئی نہیں تھا۔ بھائی قتل ہو گئے، باپ بھی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ بوڑھی ماں کب تک ساتھ بھائی۔ اُس دوران اُسے عدنان کی ضرورت تھی۔ عدنان نے اُسے تہانہ ہونے دیا۔

اُس دوران قیامت آئی اور سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ مجھے ضروری کام تھا اور میں نیکسٹری نہیں جا رہی تھی۔ میں نے آنچل کو اکیلا بھیج دیا۔ اُسے چھیڑا بھی۔

”آج تو اپنے شہزادے سے مل لوگی یاں۔“ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ لیکن کیا خبر تھی، ایک طوفان آئے گا اور سب کچھ بکھر جائے گا۔ یہی میری غلطی تھی۔ کاش اُس دن میں اُس کے ساتھ چلی جاتی۔

☆.....☆.....☆

چھٹی کے بعد آنچل عدنان کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھانے چلی گئی۔ ہوٹل کا روم بک کر دیا گیا۔ باتوں باتوں میں عدنان آنچل کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ اور وہ سب ہو گیا جو شادی سے پہلے کسی لڑکی کے لیے باعث شرمندگی ہوتا ہے۔ جذبات کی لہروں نے انہیں ایسا قید کیا کہ آنچل کو خبر بھی نہیں ہوئی اور اپنا سب کچھ عدنان پر قربان کر دیا۔ ہوش تب آیا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ محبت کا نشہ زجر بھر چکا تھا۔ عدنان سر جھکائے شرمندہ سا بیٹھا تھا۔ آنچل آنسو بہا رہی تھی۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوتے جب چڑیاں چنگ گئیں کھیت، کے مصداق، آنچل لٹ چکی تھی۔ اب ندامت کے آنسو بہانے سے کیا ہوتا تھا۔

عدنان نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”میری جان تم ہی تو میری دلہن ہو۔ ایک نہ ایک دن میرے آئین میں آ ہی جاؤ گی۔ ہمیں کوئی جدا نہیں

ہی تو ہے جو اندھا اعتبار کر لیتا ہے۔ ہزار بار ٹوٹتا ہے پھر بھی غفلت نہیں آتی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی اور محبت کا اقرار کر دیا۔

محبت کا پودا شجر بننے لگا۔ جس دن آپ چھٹی پہ ہوئیں، ہماری عید ہوتی، ہماری ملاقات ہو جاتی۔ ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پارک میں گھومتے پھرتے، ہوٹل میں بیچ ہوتے۔ محبت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اور میں اس کے سحر میں ڈوب چکی تھی۔ عدنان کی باتیں سرور کرتی تھیں، وہ بہت ہنس مکھ، خوش اخلاق تھا، مجھے زمانے کے لڑکوں سے الگ لگا اور میں نے اُسے من کے اندر چھپا لیا۔ عہد و پیمانہ ہونے لگے، قسمیں وعدے ہونے لگے۔

مجھے سہارا چاہیے تھا۔ امی اور آپ کے سوا میرا تھا ہی کون۔ پھر آپ بھی ایک نہ ایک دن دلہن بن کر اپنے پیار گھر چلی جاتی۔ میں تنہا رہ جاتی۔ مرد کے بغیر زمانہ جینے بھی تو نہیں دیتا۔ مجھے عدنان کے رُوب میں سہارا مل گیا تھا اور میں اُسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اُسے اپنا لیا، اُسے پونجے لگی، اُسی کے سپنوں میں جینے لگی۔ وہ مجھے گفٹ دیتا تو مجھے خوش ہوتی۔ بھی پرفیوم، بھی کپڑے اور بہت کچھ۔ لیکن.....“

☆.....☆.....☆

شام ہو چکی تھی، میں نے کھانا بنانا تھا۔ خوابوں کے تانے بانے بچتے بناتے آنچل رخصت ہوئی اور میں بھی کچن میں مصروف ہو گئی۔ اُس دن کے بعد مصروفیات نے ایسا گھیرا کہ پھر ایسی محفل نہ جم سکی۔ وقت گھوڑے پر سوار ڈورتا رہا۔ بھی بکھار آنچل کو چھیڑ لیتی اور اُس کے عدنان کو دیکھنے کی فرمائش کرتی رہتی۔ مگر آنچل نے یہ راز دل ہی چھپائے رکھا۔ کہتی تھی۔

”صائمہ باجی! کسی دن ملاقات کریں گے تو آپ کو ساتھ لے جاؤں گی، پھر دیکھ لینا۔ میرے عدنان کو، یوں سب کے سامنے نہیں۔ اور پھر وہ روز ہمارے آس پاس ہی تو ہوتا ہے۔“

آنچل کا عدنان ہمارے درمیان ہوتا تھا اور میں پہچان نہیں سکتی تھی۔

کر سکتا۔ آنچل ان شیریں باتوں کی زنجیروں میں قید ہوتی چلی گئی۔ پھر جیسے ہی موقع ملتا یہ سلسلہ گا ہے بگا ہے چلتا رہتا اور آنچل نے مجھے خبر تک نہ ہونے دی۔

وہی ہوا جس کا ڈرتھا، آنچل حاملہ ہو گئی۔ جب جسامت میں تبدیلی آنے لگی تو میرے پاس آئی۔ گم صم سی، بچھی بچھی سی۔ مجھے بہت شاک لگا۔
آنچل یہ تو نے کیا کر لیا۔ بگلی! مجھے تو بتایا ہوتا۔“ وہ سر جھکانے بیٹھی تھی۔

”صائمہ باجی! میں شرمندہ ہوں۔ مجھے خبر نہ ہوئی اور انجانے ڈر سے سب کچھ چھپاتی رہی۔ اب کچھ کرو۔ باجی تمہارے سوا میرا کون ہے؟ اس مسئلے کا حل تلاش کروں۔ ورنہ.....“
”ورنہ کیا۔“

”میں مرجاؤں گی۔“ وہ گھبرا رہی تھی۔
”بگلی! مایوس نہ ہو۔ ہمت سے کام لے اور تم نے

عدنان سے بات کی ہے؟“ میں نے پوچھا!
”جی صائمہ باجی۔ میں نے کئی بار شادی کرنے کا کہا لیکن وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں عدنان.....“
”نہیں آنچل، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

”اگر اُس نے انکار کر دیا تو میں مرجاؤں گی۔“
آنچل رونے لگی اور میں اُسے تسلی دیتی رہ گئی۔
”گھبراؤ نہیں۔ حوصلہ رکھو۔ کسی لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں۔“

دوسرے دن میں اُسے لے کر لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ لیکن معاملہ بگڑ چکا تھا۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ ہم مایوس واپس لوٹ آئیں۔ اب ایک ہی حل تھا، کہ عدنان جلد از جلد آنچل سے شادی کر لے۔

”آنچل تم ایسا کرو۔ عدنان پر زور دو۔ اُسے معاملے کی صورت حال سے آگاہ کرو، ممکن ہو تو میری ملاقات کراؤ، میں اسے سمجھاؤں گی۔ ہو سکتا ہے وہ سمجھ جائے اور معاملہ حل ہو جائے۔ اگر تم سے محبت کرتا ہے

تو میرا نہیں خیال کہ اُسے انکار کرنا چاہیے۔“
آنچل نے حای بھری۔ اسی پریشانی میں دن گزر گیا اور آنچل اپنے گھر چلی گئی۔ میں بہت پریشان تھی۔ موبائل ابھی کم کم متعارف ہوئے تھے رابطلوں میں آسانی نہیں تھی۔ کئی دن گزر گئے۔

آنچل نے عدنان سے ملاقات کی اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ عدنان کے تو تیر بدل گئے اور اُس نے آنچل کو بد چلن، آوارہ، گناہوں کی دلدل جیسے القابات سے نوازا دیا۔

”میں تم جیسی غریب لاوارث لڑکی کے ساتھ شادی کیسے کر سکتا ہوں۔؟ تم نے تو اپنی تسکین کے لیے اپنا سب کچھ میرے حوالے کیا تھا۔ تم جیسی ہزاروں روز میرے آگے پیچھے ہوتی ہیں۔ تم لڑکیاں ہوتی بھی اس لیے ہو۔ وقت گزاری کے لیے۔ ہم تو آزاد شکاری ہیں، جہاں سے شکار مل جائے۔ کر لیا۔ تم جیسی آوارہ لڑکی سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا، جو شادی سے پہلے اپنی عزت نیلام کر دے۔“

عدنان کے الفاظ، آنچل برانگاروں کی برسات کر رہے تھے۔ اُسے زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لاوارث یتیم لڑکی تھی۔ کہاں جاتی۔ کس سے انصاف مانگتی، کس کا در کھٹکھٹاتی۔ یہاں تو ہر گلی میں نوچنے والے بیٹھے ہیں۔ کوئی اُس کی فریاد سننے والا نہیں تھا۔

اُس رات مجھے بتاتے ہوئے آنسو بہاتی رہی۔ میں خود پریشان تھی۔ وہ خود کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

”ایسی بے رونق زندگی کا کیا کروں گی باجی!“
اندر تک وہ ٹوٹ چکی تھی۔
ایسے میں جینے کا تصور کون کر سکتا ہے؟
میں اُسے جھوٹی تسلی دیتی رہ گئی۔
آنچل مایوسی گناہ ہے۔

”رب تعالیٰ سے معافی مانگو اور اسی کے آگے سر کو جھکا دو۔ وہی کار ساز ہے۔ وہی کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دے گا۔“

رات کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تو آنچل روتی، بکتی

طرف کر کے مٹھی کھول دی۔ سفید کاغذ تہہ کیا ہوا تھا۔ لیٹر تھا۔ لیٹر میں نے لے لیا تھا کہ آنچل نے بھی لی۔ اُس کے لب گردش میں تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات تھی۔ آنکھوں میں چہیے الفاظ مجھ سے وعدہ لے رہے تھے۔

”صائمہ باجی!“

تم نے اُسے ضرور کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ جس نے میری زندگی اجاڑ دی۔ تم بھی اُس کی زندگی میں زہر گھول دو۔ تمہیں میری قسم۔ میری قسم۔ آنچل کی گردن ایک طرف کوڑھک گئی، اور یوں آنچل مجھ سے ہمیشہ کے لیے بہت دور چلی گئی۔

اُس نے کہیں سے زہریلی گولیاں لے لی تھیں۔ جانے کتنی گولیاں حلق سے نیچے اتاری تھیں۔ زہر اُس کی رگوں میں پھیل گیا تھا۔ پل بھر میں موت نے اُسے اپنی گود میں میٹھی نیند سلا دیا تھا اور وہ بے وفائیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

آنچل کو منوں مٹی تلے دفن کر دیا گیا اور زندگی معمول پر آ گئی۔ لیکن میری زندگی کے شب و روز کرب میں گزر رہے تھے۔ آنچل روز میرے خوابوں میں چلی آتی تھی۔ مجھے پل بھر بھی چین نہیں تھا۔

آنچل کا لکھا ہوا آخری خط میرے پاس رہتا تھا۔ اسی لیٹر میں اُس نے عدنان کی تصویر بھی دی تھی۔ اُس کے بارے میں کافی معلومات لکھ دی گئی تھیں۔

میں آسانی سے اُس تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ راتوں کی نیندیں، دن کا چین اڑ گیا تھا۔ روح بے چین تھی۔ آنچل کا معصوم چہرہ میرے نظروں سے ادھٹل ہی نہیں ہوتا تھا۔

انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے میں نے اپنے پلان کو حتمی شکل دی، جاں بننا شروع کر دیا۔ اسی جاں میں، میں عدنان کو جکڑ کر انتقام لینا چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وقت محو پرواز رہا اور میں فیکٹری جانے لگی

اپنے گھر چلی گئی اور میں اس کے بارے سوچتے سوچتے سوئی۔

☆.....☆.....☆

موزن اذان دے رہا تھا جب ہمارا بیرونی دروازہ کسی نے زور زور سے کھٹکھٹایا۔ یا اللہ خیر۔ میرے لبوں پر یہی کلمات تھے اور میں چارپائی چھوڑ کر وضو کرنے جا رہی تھی۔ صبح صبح کون ہو سکتا ہے؟ ابھی تو رات کا اندھیرا ٹھیک طرح سے گیا نہیں ہے۔ سحر بھوٹے والی تھی۔ چڑیاں حمد و ثنا کی تیاری میں لگی تھیں۔

”کون؟“

میں نے چلتے ہوئے آواز دی۔

بوڑھی عورت روتے ہوئے دروازہ پیٹ رہی تھی اور میں یہ آواز لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ آنچل کی ماں دروازے پر تھی۔ مجھے حیرت کا شاک سا لگا۔ ہونہ ہو، کہیں آنچل۔

ایک خدشہ سا ابھرا۔

”کیا ہوا خالہ؟“

میں نے دروازے کے پٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”وہ۔ وہ۔ وہ۔ وہ۔ آنچل۔“

ماں جی کے الفاظ حلق میں پھنس رہے تھے۔ ”آنچل کو کچھ ہو گیا ہے۔“ خالہ حلیمہ نے بمشکل کہا۔ میں ڈر گئی۔ امی کو مطلع کرتی، آنچل کی طرف دوڑی۔

آنچل بان کی چارپائی پر پڑی تھی۔ منہ سے صابن کی جھاگ طرح سفید غبارے نما بلبلے نکل رہے تھے۔

”آنچل۔“ میں چیخی۔

”ارے آنچل آنکھیں کھولو۔“ اُس کی آنکھوں

میں خماری تھی۔

آنچل! دیکھو میں ہوں۔ صائمہ باجی!

اُس نے آنکھوں کو جنبش سی دی، پوٹے حرکت میں آئے اور بڑی غور سے میرے چہرے کو تنگنے لگی۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ اُس نے ہاتھ میرے

تھا، اب تک جانے کتنی معصوم کلیاں اس بھیڑیے کے ہتھے چڑھ چکی تھیں۔ کتنی زندگیاں وہ برباد کر چکا تھا۔ انسانی روپ میں درندہ تھا۔ شاید کبھی مرد ایسے ہی ہوتے ہیں

☆.....☆.....☆

عید کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ آج فیکٹری میں آخری دن تھا اور میں تیار تھی۔ مجھے شام کو عدنان کے پاس جانا تھا۔ کسی ہوٹل میں نہیں، اُس کے گھر میں۔ ہاں۔ مکمل آزادی۔ یہی تو عدنان چاہتا تھا اور میں بھی۔ عدنان بھی چاہتا تھا کہ میں اکیلی آؤں اور میرا پلان بھی یہی تھا کہ اُس کے پاس اکیلی ہی جاؤں۔ درمیان میں تیسرا کوئی نہ ہو۔ بہترین موقع ہاتھ آیا تھا۔ عدنان نے ڈیرے پر دعوت دی تھی اور میں نے بھی حای بھری تھی۔

☆.....☆.....☆

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور میں عدنان کے پاس جانے کے لیے تیار تھی۔ اس دوران عدنان کی کئی کالیں آچکی تھیں۔ ہاں۔ میں نے موبائل رکھا ہوا تھا اور میرے پاس جو موبائل تھا، عدنان نے گفٹ کیا تھا۔

کال ریسو کر کے میں نے عدنان سے کہا۔

”ہاں۔ میری جان۔ میں گھر سے چل پڑی

ہوں۔ بے صبرے کیوں ہو رہے ہو، بس تھوڑی دیر میں تمہاری بانہوں میں ہوں گی۔“ میں نے اُس کے ارمانوں پر، اس کے جذبوں پر جلتی پرتیل والا کام کیا تھا۔ میں نے اُسے اسٹاپ پر سے لے جانے کا کہہ کر کال ڈراپ کر دی۔

”اوکے۔ اوکے۔“

عدنان نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”میں، امی سے سفید جھوٹ بول کر آئی تھی کہ سہیلی کے گھر جا رہی ہوں، جلدی آ جاؤں گی، پریشان نہ ہونا۔“

”پھر بھی۔ بیٹا۔ جلدی آنا۔ زمانہ بہت خراب

ہے۔“

”امی فکر نہ کریں۔“ میں نے امی کو تسلی دی۔

تھی۔ اب بھی وہی گاڑی ہمیں لے جاتی اور واپس چھوڑ جاتی تھی۔ عدنان۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھا مجھے گھورے جا رہا تھا۔ میں بھی اسی انتظار میں تھی۔ اُس نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا تو میں مسکرا دی۔ اور میں نے قاتلانہ اداؤں سے اپنا جال اُس پر پھینک دیا۔

مرد تو ایک اشارے کے محتاج ہوتے ہیں۔ بھنورے کی طرح لڑکیوں کے ارد گرد منڈلانے لگتے ہیں۔

مجھے عدنان کو زیر کرنے میں دیر نہیں لگی، عدنان میری زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اُسے شاید خبر ہی نہیں تھی کہ میں آنچل کی دوست ہوں۔ آنچل نے بھی کبھی اُس سے میرا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس طرح مجھے اپنے شکار میں آسانی رہی۔ شکاری چالاک ہو تو شکار آسان ہو جاتا ہے۔ جو میں چاہتی تھی، وہی ہو رہا تھا، شکار خود چل کر شکاری کے پاس آ رہا تھا۔

عدنان مجھے موقع دیتا تو میں اور بھی قریب ہو جاتی، میں اُسے یہی تو محسوس کروانا چاہتی تھی کہ میں اُس پر مرثی ہوں، وہ جہاں سے چاہے مجھے حاصل کر لے، میں جان بوجھ کر بے ہودہ لباس زیب تن کر کے اُس کے سامنے جاتی، زلفیں کھلی رکھتی، اور دعوتِ عشق دیتی مسکراہٹ تو ہر وقت سچی رہتی۔ باتوں باتوں میں ہماری گفتگو ایسی ہو جاتی جو میاں، بیوی بھی کرتے ہوئے شرماتے ہوں۔

میری ادا میں، مہربانیاں اتنی بڑھیں کہ عدنان میرا دیوانہ ہو گیا۔ مجھے جان ہی نہیں پایا وہ تو طوطا چشم تھا، کچا پھل کھانے کا عادی تھا۔ میں اُسے جلا رہی تھی، عدنان کو تڑپانا چاہتی تھی۔ وہ مجھ پر قربان ہو چکا تھا، جس طرح لوہار کی بھٹی میں لوہا سرخ لال ہوتا ہے، اُسے جوٹ لگا کر کسی بھی حالت میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ عدنان بھی سرخ لال پھل کی طرح مجھے نوچنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ بس ایک اشارہ کرنے کی ضرورت تھی۔ ابھی تک میں اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ عدنان میری قریب ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی ہوس پوری کرنا چاہتا تھا، مجھے نوچنے کے لیے بے تاب

جائزہ لے رہی تھی کہ عدنان کی بائیک آ کر رکی۔

عدنان آچکا تھا اور میں پل بھر میں اُس کی بائیک پر بیٹھ گئی تھی۔ اُس کے لبوں پر وحشی مسکراہٹ پھیل گئی اور بائیک منزل کی طرف چل پڑی۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس روشن ہو گئی تھیں اور اندھیرے نے چاروں طرف کالی چادر کی بگل مار لی تھی۔ میں نے برقع اتار دیا۔

”اُف اللہ! آج تو جان لے کر ہی چھوڑ دی۔“
”بس ارادے تو کچھ ایسے ہی ہیں۔“ میں نے عدنان کو جواب دیا، پھر دونوں کی شیطانی مسکراہٹ فضا میں سرایت کر گئی۔

”میری جان یہ سب کچھ تیرے لیے ہی تو ہے۔“ عدنان اور کھل اُٹھا۔ ہماری بائیک کھیتوں سے ہوتی ہوئے ڈیرے پر جا رکی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ڈیرے پر دوسرا کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ دور دور پر ترقی بیتاں روشن تھیں جو ستاروں جیسا منظر پیش کر رہی تھیں۔

عدنان نے بائیک سائیڈ پر کھڑی کرتے ہوئے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے عدنان کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ لے لیا اور اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے اندر کی طرف چلے گئے۔

بڑا سا کمرہ تھا، بیڈ روم صاف ستھرا، ایک کونے میں ڈیک، ایل سی ڈی پڑا تھا۔ کمرے کی دیواریں حوا کی بیٹھیاں لٹنے کی صدا میں سن رہی تھی۔ مجھے یہ دیواریں آچل کے لٹنے کی صدا میں سناتی محسوس ہوتی تھیں، اُس کی چیخیں میری سماعتوں کے پردے بھاڑ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا کہ یہی وہ جگہ تھی، جہاں آچل اپنی عصمت گنوا کر گئی تھی۔

آچل کا خیال آتے ہی میرا خون جوش مارنے لگا۔ انتقام کی آگ نے زور پکڑ لیا۔ میں صبر کا دامن تھامے ہوئے تھی۔ میری ذرا سی غفلت سے سارا پلان خاک میں مل جاتا اور میں دوسروں کی طرح ایک بھیڑیے کے ہاتھوں لٹ جاتی۔ مگر میں تو ایسا نہیں چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

میں اپنی ماں کا بیٹا ہی تو تھی۔

”آپ کی صائمہ اب بچی نہیں رہی۔ اچھا بُرا نسب سمجھتی ہے اور اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہے۔“
”جا بیٹی، اللہ تعالیٰ تیری حفاظت کرے۔“

میں ماں جی کی دعاؤں کے نذرانے وصول کرتے گھر کی چوکھٹ پار کر گئی۔

میری منزل عدنان تھا۔ میں اندھیرا چھانے سے پہلے واپس گھر بھی آنا چاہتی تھی۔

میں نے مارکیٹ سے قیمتی تحفے خریدے۔ پرفیوم لیا اور اُس میں بے ہوشی کا محلول ملا دیا۔ اچھی طرح مکس کر کے اپنا رد مال اُس میں بھگو دیا۔ پرفیوم میں بھی محلول تھا، اور میرا ارادہ تھا کہ سب سے پہلے پرفیوم عدنان کو دوں گی اور وہ میری خوشی کے لیے پرفیوم ضرور لگائے گا۔ اس کے استعمال کرنے سے، چند لمحوں میں غنودگی چھانے لگتی۔ بے ہوشی والا محلول میری سہیلی نے مجھے لا کر دیا تھا۔ اس کے بعد سمو سے لیے، کیونکہ عدنان سمو سے بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ ہم جب بھی ملاقات کرتے، سب سے پہلے سمو سے ہماری سہیلی کی زینت بنتے۔ پھر باتوں باتوں میں سمو سے ختم ہو جاتے اور ملاقات بھی ہو جاتی۔

عدنان کو میری پسند اور غیر پسند کی جانکاری تھی۔ میں بھی عدنان کی پسند اور غیر پسند جان چکی تھی۔ عدنان، مجھ پہ فدا ہوا۔ جسم حاصل کرنے کا نشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ خماری، بے قراری زبردست تھی۔ میں اپنے پلان کے مطابق، عدنان کے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔

ٹھیک دس منٹ کے بعد میں عدنان کے بتائے ہوئے اسٹاپ پر کھڑی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے پنک کلرنگی شرٹ اور جینز کی پینٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ اُس کی بناوٹ ایسی تھی کہ جسم کا انگ انگ جھلکتا تھا۔ کالی چادر کا برقع اوڑھ رکھا تھا۔ شریر لڑکے مجھے گھور رہے تھے۔ برقع معاشرے کے لیے، زمانے کے لیے اور پینٹ شرٹ عدنان کو زیر کرنے کے لیے زیب تن کی ہوئی تھی۔ میں اسٹاپ پر کھڑی ارد گرد کا

مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

800/-	ادیم اے راحت	جادو
300/-	شازیہ اعجاز شازی	تیری یادوں کے گلاب
500/-	غزالہ جلیل راؤ	کانچ کے پھول
500/-	غزالہ جلیل راؤ	دیا اور جگنو
500/-	غزالہ جلیل راؤ	انائیل
500/-	فیصیحہ آصف خان	جیون جمیل میں چاند کرنیں
500/-	فیصیحہ آصف خان	عشق کا کوئی انت نہیں
500/-	عطیہ زاہرہ	سلگتی دھوپ کے صحرا
300/-	محمد سلیم اختر	یہ دیا بھجنے نہ پائے
400/-	ادیم اے راحت	واش کنیا
300/-	ادیم اے راحت	ورندہ
200/-	ادیم اے راحت	تتلی
200/-	ادیم اے راحت	بھرم
400/-	خاتون ساجد	چھون
300/-	فاروق انجم	دھواں
300/-	فاروق انجم	دھڑکن
700/-	انوار صدیقی	درخشاں
400/-	اعجاز احمد نواب	آشیانہ
500/-	اعجاز احمد نواب	جزیرہ
999/-	اعجاز احمد نواب	ناگن

نواب سنز پبلی کیشنز

1/92، کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ

کمپنی چوک راولپنڈی 051-5555275 Ph:

لکھاری نیشنل اسٹانڈرڈ شائع

کروانے کے لیے رابطہ کریں

0333-5202706

عدنان اور میں بیڈ پر بیٹھ چکے تھے۔

”عدنان۔۔۔ لو سمو سے میرے ہاتھوں سے کھاؤ۔ خاص تمہارے لیے لائی ہوں۔“ میں نے سمو سے کانوالہ اُس کے منہ میں دیتے ہوئے کہا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے زہر آلودہ سمو سے اُس کے معدے میں اپنی سرگرمیاں دکھانے لگے تھے۔ میں نے کولڈ ڈرنک بھی پلا دی۔ سموں میں نشہ آور گولیاں ملا کر آئی تھی اور میں نے ایک نوالہ بھی نہیں لیا تھا۔ عدنان بارہا کہتا رہا مگر میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ”اُس کا دل رکھنے کے لیے کولڈ ڈرنک پی لی تھی۔ عدنان کہتا ہی رہ گیا۔

”جان تم بھی لوناں سمو۔“

”یار میرا معدہ خراب ہے۔ سمو سے گڑ بڑ کریں گے۔ بس کولڈ ڈرنک بہت ہے۔“ میں نے کہا

”اچھا میں کچھ اور منگواتا ہوں۔“ عدنان بیڈ سے اترنے لگا۔

”نہیں۔ نہیں۔“

میں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پیٹ پر ہاتھ رکھنا صرف اور صرف بہانہ تھا۔ تاکہ عدنان کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ اتنے میں پرس سے پرفیوم نکال چکی تھی۔

”میری جان۔ یہ خاص تمہارے لیے۔“ میں نے پرفیوم اُس کی طرف کی۔

”تم اُسے چیک کرو میری پسند کیسی ہے۔“ عدنان نے پرفیوم لیتے ہوئے بوتل کا ڈھکن کھولا ہی تھا کہ میں نے پیٹ میں درد ہونے کی ڈرامائی انداز اپنایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ عدنان بے چین ہونے لگا۔

”واش روم۔ ادھر۔“

”اچھا! میں آتی ہوں۔ تم پرفیوم چیک کرو۔ کیسی ہے؟ باقی پھر۔“

میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا تاکہ عدنان سمجھیں کہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔

میں واش روم میں کس گئی اور شاور کھول دیا۔

پرفیوم لگانے کی آواز میں نے باسانی سن لی

تھی۔

”عدنان، عدنان.....“ میں نے اس کے بازوؤں پکڑ کر حرکت دینی چاہی۔ اُس کا جسم بے جان تھا، آنکھیں کھلی تھی جیسے ابھی باہر کو اُبل پڑیں گی۔ پھر دیکھتے دیکھتے عدنان نے آخری دو لمبی لمبی ہچکیاں بھری اور بے سدھ ہو گیا۔

عدنان مر گیا۔ میں نے اُس کے کانوں میں کہا۔ ”اتنی جلدی مر گئے۔ درندے کی یہی سزا ہوتی چاہیے۔ کم از کم آج کے بعد کوئی حوا کی بیٹی تیری ہوس کا نشانہ تو نہیں بنے گی۔“

میرے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور میں نے نفرت سے گھورتے ہوئے۔ حقارت سے عدنان کے مردہ جسم کو پرے کیا اور بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے ہوئے شراب کی بوتل اُس کے ہاتھ میں تھما دی، تاکہ شراب نوشی کی کثرت سے موت واقع ہونے کا سندیہل سکے۔

میں نے اپنا برس اٹھایا اور دروازہ کراس کر گئی۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد میں اپنے گھر موجود تھی۔ رات کا ندھیرا ہر سو پھیل چکا تھا اور میں پُرسکون تھی۔ میری روح کو چین مل گیا۔ اور آنچل بھی خوش ہو رہی تھی۔ میں نے کھلے آسمان پر سفید بادلوں میں آنچل کو ہاتھ ہلاتے، مسکراتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے دوستی کا قرض اُتار دیا تھا۔

دوسرے روز میں فیکٹری گئی۔ اخبار میرے آفس میں پڑا تھا۔ سرسری جائزہ لینے کے لیے اٹھایا تو نظریں ایک کونے میں لگی انسانی تصویر پر ٹک گئیں۔

عبارت یوں تھی، زہریلی شراب نے ایک اور نوجوان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

اور میری فیکٹری میں اظہارِ افسوس کے لیے کام روک دیا گیا۔ عدنان ہماری فیکٹری کا ورکر تھا۔ سبھی کے لبوں پر عدنان کے لیے تعریفی کلمات تھے مگر اصلیت سے ہر کوئی عاری تھا۔ پاک دھرتی سے ایک کمینہ، انسان کے روپ میں شیطانی درندہ کم ہو گیا تھا، اور میں واحد تھی جو اس کی موت پر خوشیاں منا رہی تھی۔

☆☆.....☆☆

عدنان نے پرفیوم اپنے کپڑوں اور بغلوں میں لگائی تھی۔ میں واش روم میں کھڑی ٹائم گزارنے لگی۔ کانی دیر کے بعد میں باہر آئی۔ عدنان۔ بیڈ پر بیٹھا ڈرنک گلاسوں میں انڈیل رہا تھا۔

”آؤ، آؤ ڈارلنگ ڈرنک ہو۔ اس سے پیٹ کی خرابی ٹھیک ہو جائے گی۔“

”یہ کون سی ڈرنک ہے۔“ میں نے اُس سے اٹھنے والی بدبو سے بیزار ہو کر پوچھا۔

”یہ خاص اسپیشل منگوائی ہے۔ اس کو شراب کہتے ہیں۔ کیا نشہ ہے اس کا۔ محفلوں میں رنگ بھر دیتی ہے۔“

”نشہ! نشہ تو میں نے تمہیں دے دیا ہے۔ میرے دل میں چھپے انسان نے جواب دیا۔“

عدنان نے شراب سے بھرا گلاس میری طرف بڑھایا ہی تھا کہ جھٹکے سے بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں ہنسنے لگی۔

”یار ابھی تو پی نہیں اور نشہ پہلے ہی چڑھ گیا۔“ عدنان کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اُسے لٹا دیا اور اپنی شرٹ کے بٹن کھول دیے۔

عدنان بے قابو ہو گیا اور میرے قریب ہوتا گیا، اُس کی سانسوں کی آواز میں سن رہی تھی۔ عدنان نے میرے سینے کی طرف ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ جھٹکے سے ہاتھ لڑھک گئے۔

زہر نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ عدنان میری بانہوں میں جھول گیا۔

کتنی آسانی سے۔ میں کامیاب ہو گئی تھی۔ درندوں کی اس طرح موت نہیں ہوتی چاہیے۔ انہیں تو چوراہوں پر لٹکا کر پتھر مار مار کر ہلاک کرنا چاہیے۔ ایسی عبرت ناک سزا ہونی چاہیے کہ بعد میں کوئی بھی ایسی غلطی نہ کرے۔

میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ عورت ذات تھی اور اپنی بدنامی سے ڈرتی تھی۔ میں نے یہی طریقہ ڈھونڈا تھا۔

READING SECTION

120

ہم شکل

Downloaded From
Paksociety.com

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

قسط نمبر: 14

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ ان کے قصوں اور ٹونکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے ساتھ "ہم شکل" بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلا اور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلا اور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کر لیتی ہے۔ دلا اور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلا اور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو "عالی" کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے ساتھ ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور "ہم شکل" اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ "عالی" جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط نہیں کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط نہیں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے مشابہ ہے۔ بہر کیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس



Downloaded From
Paksociety.com

READING
SECTION

کے احسان مند ہو گئے اور شکر یہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاورا اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گہروا لے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور ایشار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آ جاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنہلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی لکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈیٹیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے **Downloaded From Paksociety.com**

سونارا نے اپنا ہاتھ شاہ زیب کے ہاتھ میں رہنے دیا اور وہ اس کی کیفیات کا جائزہ لیتا رہا، اس وقت شاہ زیب کے ذہن میں کوئی شیطانی تصور نہیں ابھرا تھا۔ یہ ہی سونارا کی اس حرکت سے میں نے کسی اور کیفیت کا احساس کیا تھا، بس رحم کا ایک جذبہ غالباً انیسیت میں بدلتا جا رہا تھا۔

”ہم دونوں دوست ہیں اور میں آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں ڈیر سونارا۔“

شاہ زیب کافی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا اور وہ سنتی رہی، اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں، لیکن ہاتھ شاہ زیب کے ہاتھ سے نہیں ہٹایا تھا، غالباً یہ اس بات کا اظہار تھا کہ اسے نیند آرہی ہے، شاہ زیب نے خود ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی، معصوم لڑکی تھی اس کی اس حرکت پر مجھے بے حد پار آیا تھا، دیر تک شاہ زیب اسے دیکھتا رہا، اس نے کروٹ بدل لی تھی اور پھر نیند کی دیوی نے شاہ زیب کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا، پھر اس وقت آنکھ کھلی جب صبح ہو چکی تھی۔

رات کے مناظر یاد کر کے شاہ زیب نے دوسری جگہ نگاہ دوڑائی، لیکن سونارا اب وہاں موجود نہیں تھی، ایرا کی مصیبت سر پر نازل ہو چکی تھی۔

دوسرے دن کے سفر میں بھی شاہ زیب نے جان بوجھ کر ایرا سے اجتناب برتا۔ جب وہ ایک گاڑی میں داخل ہوئی تو شاہ زیب فوراً ہی دوسری گاڑی میں جا بیٹھا اور یقیناً یہ صرف اتفاق تھا کہ اس گاڑی میں مسٹر گرج اور سونارا کے علاوہ دوسرے چند افراد بھی تھے، شاہ زیب کو سونارا کے قریب جگہ ملی اور اس نے بڑی اپنائیت سے تھوڑا سا کھسک کر اسے آرام سے بیٹھنے کی سہولت فراہم کی تھی، شاہ زیب شکر یہ ادا کر کے بیٹھ گیا، مسٹر گرج نے شاہ زیب سے ایسی کوئی خاص بات نہیں کی تھی بس رسی سی چند باتیں ہوتی رہی تھیں اور سفر جاری رہا۔

یہ رات بھی عارضی قیام کی رات تھی اور اس کے بعد دوسرے دن سفر اور تیسری رات عارضی قیام، ہم لوگ بہت زیادہ فاصلہ طے نہیں کر پائے تھے کیونکہ دشوار گزار راستوں سے ٹرکوں اور گاڑیوں کا گزرنا آسان کام نہیں تھا۔ چوتھی رات ایک خوبصورت علاقہ نظر آیا جہاں پانی وغیرہ بھی تھا اور پھر یہاں قیام کر لیا گیا۔

جنگل وسیع نہیں تھا، بہت چھوٹے سے ٹکڑے میں درخت اگ آئے تھے۔ باقی اطراف میں گہری گہری کھائیاں اور خشک و بے آب و گیاہ چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں سے ان لوگوں کو آگے کا فاصلہ طے کرنے کے لیے ان کھائیوں میں سے کسی ایک کھائی میں اترنا تھا، اسٹون برادرز سے اتنی قربت نہیں تھی کہ شاہ زیب ان سے ان کے سفر کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا دوسرے لوگوں کو بھی کوئی تفصیل معلوم نہیں تھی۔ اس رات مسٹر گرج اور اسٹون برادرز کسی خاص میٹنگ میں مصروف رہے اور سونارا شاہ زیب کے پاس آگئی۔

ایرا کے بارے میں کچھ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ اس دن ہالک کے واقعے کے بعد وہ کچھ ڈرسی گئی تھی، پتا نہیں کیا

خیالات تھے اس کے، لیکن کافی سکون محسوس ہوا تھا، مجبوراً تو پالی جاسکتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اگر رقیب بھی حصے میں آجائے تو بات خطرناک ہو جاتی ہے، ویسے سونارا کی آمد سے شاہ زیب کو خوشی ہوئی تھی کیونکہ یہاں یہ مسئلہ نہیں تھا، وہ شاہ زیب کے نزدیک بیٹھ گئی، اس کے ہاتھ میں ایک قلم تراش تھا اور وہ لکڑی کے ایک ٹکڑے کو اس سے آہستہ آہستہ چھیل رہی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ سونارا کی آپ مجھ سے بھی کوئی گفتگو نہیں کرتیں۔“ وہ ہاتھ روک کر شاہ زیب کو دیکھنے لگی، اس کی آنکھیں واقعی بے حد شفاف تھیں اور ان میں ایک انوکھی جاذبیت نظر آتی تھی، یوں لگا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شاہ زیب سے کچھ کہا ہو۔ لیکن اب اتنا زیرک نہیں تھا کہ اس کہے کو ہا آسانی سمجھ لیتا وہ چند لمحات خاموشی سے شاہ زیب کو دیکھتی رہی اور اس کے بعد پھر لکڑی کے کنارے کو چھیلنے لگی۔

”آپ کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کو متاثر کیا ہو اور جو آپ کی اس خاموشی کا سبب بنا ہو؟“ اس نے ایک بار پھر شاہ زیب کو دیکھا اور نفی میں گردن ہلا دی، شاہ زیب کو خوشی ہوئی کہ کم از کم اس نے اس کی بات کو سمجھا تو تھا۔

”نہ بولنے والے مجھے دو افراد ملے ہیں، میں نے دوسرے کے لیے بھی کوشش نہیں کی لیکن وہ بھی آپ کی ہی مانند تھی۔“

شاہ زیب کو یوں لگا جیسے سونارا کے ہونٹوں پر لفظ کون آتے آتے رک گیا ہو، اس کی سوالیہ نگاہیں ایک لمحے کے لیے شاہ زیب کی طرف اٹھی تھیں اور اسی وقت شاہ زیب کے دل میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہوا۔ ہو سکتا ہے سونارا خود ہی نہ بولنا چاہتی ہو۔

یہ بے اختیار نہ انداز اس بات کا اظہار کرتا تھا کہ وہ اچانک ہی بولنا چاہتی تھی، لیکن اس نے اپنی زبان بند رکھی تھی، اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی، ہو سکتا ہے یہ سب مسٹر گرج کی کارروائی ہو اور انہوں نے خود ہی اپنی بیٹی کو بولنے سے منع کر دیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس سلسلے میں انہوں نے یہ احتیاطی کارروائی اسٹون برادرز کے لیے کی ہو۔ بہر طور شاہ زیب اب اتنی زیادہ دلچسپی بھی نہیں لے رہا تھا ان معاملات میں کہ سونارا کے بولنے کے لیے کوئی خاص طریقہ کار اختیار کرنے کی کوشش کرتا۔

یہ لوگ ویرنگ اس جگہ بیٹھے رہے۔ شاہ زیب نے سونارا سے بہت سی باتیں کیں لیکن جواب میں مکمل خاموشی چھائی رہی، اس کے بعد یہ لوگ اپنے خیموں میں واپس آ گئے۔

آج موسیقی کی محفل نہیں جی تھی کیونکہ کئی دن کے سفر سے لوگ تھکے ہوئے تھے۔ رات کو چاند نکل آیا اور پراسرار پہاڑیاں چاندنی میں عجیب سا منظر پیش کرنے لگیں۔ شاہ زیب اپنی آرام گاہ میں لیٹا اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً ہی چیخ و پکار کی کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور ساتھ ہی عجیب افراتفری مچ گئی۔ چند ہی لمحات کے بعد اس افراتفری میں فائرنگ کا شور بھی شامل ہو گیا اور شاہ زیب بوکھلا کر اپنی جگہ سمٹ گیا، کوئی بھی گولی اس کی طرف رخ کر سکتی تھی، رات کے اندھیرے میں نشانے تو نہیں لگائے جاسکتے، لیکن یہ اچانک ہنگامہ کیا نوعیت رکھتا ہے۔ پھر اچانک ہی اسے وہ لڑکی یاد آئی۔ کیا اس نے حملہ کیا ہے، اسٹون برادرز اس سے خوفزدہ تھے، ایک پورا گروہ اور ایک لڑکی، لیکن وہ ایک لڑکی بھی پورا گروہ تھی، اس نے ان لوگوں کو نجا کر رکھ دیا تھا۔ باہر فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی۔ مسامات پسینہ چھوڑ رہے تھے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ خود باہر نکلنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا، رات کی تاریکی میں نجانے کس طرف سے کوئی گولی بھٹکتی ہوئی اسے تلاش کر لے، چیخ و پکار کی ان آوازوں میں کئی بار اسے اسٹون برادرز کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ ہنگامہ ختم ہوا اور جب اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ دوسرے لوگ آزادانہ باہر نکل آئے ہیں تو پھر میں بھی اپنے خیمے سے باہر نکل آیا۔ تقریباً تمام ہی لوگ خیموں سے باہر کھڑے طرح طرح کی باتیں

کر رہے تھے، تیز روشنیاں تیار کی جا رہی تھیں۔ پھر سب افراد ایک سمت چل پڑے اور اُس نے بھی اس آخری وقت میں اپنی بہادری دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔

زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا تھا، تھوڑی ہی دیر بعد انہیں تیز روشنی میں انسانی بدن اوندھے سیدھے بڑے نظر آئے۔ روشنیاں ان پر مرکوز کر دی گئیں اور ان کے جسموں کو ٹٹول کر دیکھا جانے لگا، لوگ اس سلسلے میں گفتگو بھی کر رہے تھے، شاہ زیب کی نگاہ مسٹر گرج پر پڑی اور وہ ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ مسٹر گرج نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا، چند لمحات کے بعد وہ بولے۔

”اس کا مطلب ہے وہ سیاہ فام افریقی نہیں ہیں۔“

”کچھ سمجھ میں آیا مسٹر گرج، یہ سارا واقعہ کیا ہے؟“

”ادہ اچانک ہی ان میں سے چند افراد نے خیموں میں گھس کر حملہ کر دیا تھا۔ کسی نے دیکھ لیا اور اس کے بعد ان پر گولیوں کی بارش کر دی گئی۔ وہ خیموں سے نکل بھاگے۔ غالباً نہتے تھے، پہلے تو ہم نے یہی سمجھا تھا کہ ان کا تعلق افریقہ کے کسی وحشی قبیلے سے ہے اور یہی سوچ کر ان پر بے دریغ گولیاں چلائی گئیں، لیکن کچھ غلطی ہو گئی ان میں سے تو ایک بھی افریقی نہیں ہے۔“

شاہ زیب نے ایک لاش کی جانب دیکھا اس کے بدن پر چیتھڑے جھول رہے تھے، ننگے پاؤں تھا، ایک شدید زخمی تھا اور یہ زخم گولیوں کے نہیں تھے، غالباً درختوں اور جھاڑیوں کی خراشیں تھیں جن سے خون نکل نکل کر جم گیا تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون لوگ ہیں، روشنیوں میں ان کے چہرے بھی دیکھے گئے اور وہ کسی سفید نسل کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ اسٹون برادرز بھی اب متاثر نظر آ رہے تھے۔ اسٹون برادرز میں سے ایک نے کہا۔

”آہ شاید غلط نہیں ہو گئی، یہ کسی قسم کے مصیبت زدگان میں سے ہیں اور کسی سفید نسل ہی سے ان کا تعلق ہے۔“

تلاشی لینے والے چاروں طرف انہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے، بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، ظاہر ہے یہ اسٹون برادرز گروپ کی گولیوں کا شکار ہوئے تھے۔ پھر ایسے دو افراد ملے جو زندہ تھے اور زخمی بھی نہیں تھے، لیکن بے ہوش تھے۔

اسٹون برادرز کے ایما پر انہیں ایک خیمے میں پہنچا کر فوری طور پر ان کی نگہداشت کی جانے لگی، بھلا اتنا بڑا پروگرام ہو اور ڈاکٹر موجود نہ ہو، کئی ڈاکٹر ان کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ باقی لوگوں کی حفاظت کے لیے بندوبست کر دیا گیا تھا، لیکن اب اسٹون برادرز نے یہ ہدایت نشر کر دی تھی کہ ان میں سے اور کوئی نظر آ جائے۔ تو اسے قتل نہ کیا جائے اور اگر وہ وحشت خیزی کریں تو انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے زیادہ سے زیادہ ہلکا پھلکا زخمی کر دیا جائے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

یہ غالباً نسلی احساس تھا، میں خود بھی ان کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا پایا تھا، لیکن بہر حال ان سارے معاملات سے واقف رہا تھا، ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ لوگ شدید فاقہ کشی کا شکار تھے اور یہ بے ہوشی بھی فاقہ کشی کے نتیجے میں ہی ہے۔ اسٹون برادرز نے بہت افسوس کا اظہار کیا تھا اور اب صورت حال بہت حد تک واضح ہو گئی تھی، یعنی طور پر سیاہوں کا کوئی گروہ تھا جو بدترین حالات کا شکار ہو گیا تھا۔ بھوک اور صعوبتوں نے انہیں وحشی بنا دیا تھا اور لازمی طور پر خوراک کی تلاش میں یہ لوگ خیموں پر حملہ آور ہوئے تھے، لیکن ان کی بد قسمتی تھی کہ انہوں نے رات کے اس لمحے کا انتخاب کیا اور اس انداز میں کیا اور اسٹون برادرز نے انہیں خطرناک سمجھ کر گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

تمام لاشوں کو دن کی روشنی میں جمع کر لیا گیا تھا، کل تیرہ لاشیں تھیں اور صرف یہ دو افراد زندہ بچے تھے، ان میں زیادہ تر جوان لوگ تھے، دو تین عمر رسیدہ بوڑھے بھی نظر آئے تھے۔ وورڈور تک اسٹون برادرز کے ساتھیوں کی ٹولیاں پھیل گئی تھیں اور ان لوگوں کے ساز و سامان کو تلاش کیا جانے لگا تاکہ ان کے بارے میں اندازہ ہو سکے، بدن کے جھولتے چیتھڑوں سے کچھ کاغذات بھی برآمد ہوئے تھے، لیکن ان کی تفصیلات عام لوگوں کو نہیں معلوم

ہو سکیں، اسٹون برادرز نے ان کا مذاق کو اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔

شام کو نصف گھنٹہ تک اسٹون برادرز کو ان لوگوں کی اس طرح موت کا بہت دکھ تھا اور وہ بار بار تاسف کا اظہار کر رہے تھے، آج بھی رخصت و موسیقی کا پروگرام نہیں بنایا گیا تھا اور برجگہ اسی موضوع پر بات ہوتی رہی، ان دونوں کو ہوش میں لے آیا گیا تھا اور انہیں اس طرح خوراک دی گئی تھی کہ اتنے عرصے کے بعد ملنے والی خوراک ان کے بدن کو کوئی نقصان نہ پہنچائے، ابھی تک ان کے بارے میں کوئی تفصیلات نہیں معلوم ہو سکی تھیں اور نہ ہی ان لوگوں سے کوئی سوال کیا گیا تھا۔ اس سوال کے پیش نگاہ کہ کہیں ان پر دیوانگی نہ طاری ہو انہیں باندھ کر بھی رکھا گیا تھا، تاکہ وہ کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ ان دونوں کی زبردست تیار داری کی جارہی تھی۔

رات کو گیارہ بجے تک یہ لوگ ان کے بارے میں گفتگو میں مصروف رہے۔ ابراہیم نے بار نظر آئی تھی، لیکن خدا نے اسے قتل دے دی تھی۔ وہ شاہ زیب سے ناراض تھی، بہر طور شاہ زیب کی جان بخشی کر دی تھی اس نے اور وہ بہت پرسکون تھا۔ اس دوران شاہ زیب کو ہالک بھی نظر آیا تھا یہ شخص ہمیشہ ہی عجیب سا لگتا تھا جیسے وہ صحیح الدماغ نہ ہو۔

رات گزر گئی، دوسرے دن ان لوگوں کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو گئیں، بلاشبہ وہی کہانی تھی جو ہم سب نے سوچنی تھی، یعنی وہ سیاح تھے اور اپنا راستہ بھٹک کر طویل عرصے سے صحرائے اعظم میں چکرارہے تھے۔ خوراک کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا، اسلحہ وغیرہ بھی ان کے پاس نہیں تھا جس سے شکار کرتے۔

ان کے ساتھیوں کی تعداد میں بھی جن میں سے پندرہ مختلف حادثات کا شکار ہو گئے تھے اور باقیوں کا جو غول تھا وہ اسٹون برادرز کے آدمیوں کی گولیوں کا شکار ہو گیا تھا۔ انہوں نے خوراک کے حصول کے لیے ہی یہ کارروائی کی تھی، لیکن چونکہ سوچنے سمجھنے کی قوتیں کھو بیٹھے تھے اس لیے کارروائی کا انداز وحشیانہ تھا، دونوں کے نام بھی معلوم ہو گئے تھے، ان میں سے ایک اینڈی اور دوسرا مارن تھا دونوں ہی برٹش تھے اور مہم جوئی کے لیے نکلے تھے۔ بہر طور اسٹون برادرز کو اپنی اس کارروائی پر تاسف تھا، لیکن اب کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا البتہ ان دونوں کو ہر طرح کی سہولتیں اور مراعات فراہم کی گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

پانچ دن گزر گئے تھے اور اسٹون برادرز کی طرف سے ابھی تک آگے بڑھنے کا حکم نہیں ملا تھا، پھر اس شام جب شاہ زیب اپنے خیمے میں بیٹھا تھا اور باہر نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک شخص اس کے پاس آیا اور بولا۔

”مسٹر شاہ زیب، باس آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

شاہ زیب بھونچکے انداز میں کھڑا ہو گیا، باس یقیناً اسٹون برادرز ہی کو کہا جا رہا تھا، پھر اس کے ساتھ ہی شاہ زیب اسٹون برادرز کے خیمے کی طرف چل پڑا تھا، اپنے خیمے میں صرف وہ دونوں ہی تھے، دونوں نے پرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا، پھر ان میں سے ایک بولا۔

”مسٹر شاہ زیب، ہم نے آپ کو بھی بتایا تھا کہ ہمارے مشن کی تکمیل سے ہر شخص کا فائدہ ہے اور جب آپ کو ہم نے اپنے درمیان قبول کر لیا تو پھر اس فائدے میں آپ بھی شریک ہو گئے، لیکن مسٹر شاہ زیب ایک بات خاص طور سے آپ کو ذہن نشین کرانا ضروری ہے کہ اچھے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں اور وہ اپنی ذات سے کسی کو کوئی نقصان پہنچانا پسند نہیں کرتے، لیکن اگر کسی کی ذات سے انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پھر یہ حق انہیں بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنا انتقام لیں اور ہماری عادت بھی یہی ہے۔ ہم سب لوگ اچھے دوستوں کی مانند یہ مہم سر کر رہے ہیں اور ہمارے ساتھ جو کوئی بھی ہے ہم اس سے محبت اور اس دلچسپی کی توقع رکھتے ہیں ان سب میں آپ بھی شامل ہیں۔“

”اگر آپ لوگ کوئی ذمہ داری میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ زبانی کہہ دینا کافی ہوگا کہ جو ذمہ داری آپ میرے سپرد کریں گے اس میں کسی قسم کی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں ہوگا۔“ اسٹون برادرز نے

ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور پھر دونوں نے بیک وقت گرون ہلائی پھر ان میں سے ایک نے کہا۔
”جس وقت آپ ہمارے درمیان آئے تھے تو ہمارے ذہن میں قطعی یہ خیال نہیں تھا کہ اچانک ہی آپ
ہمارے لیے اہم ترین بن جائیں گے، آپ بس ہماری نگاہوں میں ایک انسان تھے اور صرف انسانی بنیادوں پر ہم
نے آپ کی خدمت کی۔“

”اعلیٰ سلسل کے لوگوں سے اعلیٰ ظرفی کی توقع کی جاسکتی ہے معزز اسٹون برادرز۔“ نے کہا کیونکہ اُسے اندازہ
ہو چکا تھا کہ اسٹون برادرز کس بات سے خوش ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے شاہی خون کی پلبٹی کا خاص طور سے شوق تھا
اور یہ بات بار بار اُس کے سامنے آچکی تھی، اس وقت بھی اُس نے اسی کا سہارا لیا تھا اور حسب توقع ان کے چہروں
پر فخر کے تاثرات پائے تھے، ان کا لہجہ مزید نرم ہو گیا۔

”اور اب آپ کو ہمارے لیے ایک اہم کام کرنے کا موقع ملا ہے۔“

”اگر میں اپنی شکرگزاری کا اظہار کر سکتا تو مجھے خوشی ہوگی۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”تو مسٹر شاہ زیب، بد نصیب ٹولی کے دونوں افراد اب نارمل ہو چکے ہیں اور انہوں نے ہماری ضرورت کا
ایک انکشاف کیا ہے۔“

”کیا؟“ شاہ زیب نے سوال کیا۔

”وہ لڑکی اب بھی ہمارے آس پاس بھٹک رہی ہے۔“

”اوہ! وہ وحشی لڑکی۔“

”ہاں ظاہر ہے وہ ہم سے دور نہیں جاسکتی، جس طرح ہمیں اس کے پاس موجود آدھے نقشے کی تلاش ہے اسی
طرح وہ بھی ہمارے پاس موجود باقی آدھے نقشے کی خواہش مند ہے۔ ہر چند کہ باقی آدھے نقشے کا حصول اس کے
لیے ممکن نہیں ہے لیکن ہم بھی اس باقی آدھے نقشے کے بغیر اپنے مشن میں ادھورے ہیں اور اب اس باقی آدھے
نقشے کے حصول کے لیے ہمیں آپ کی مدد درکار ہے اور اس کے عوض آپ کو خزانے کے مزید دو حصے ملیں گے، کیونکہ
یہ کام اہم ترین نوعیت کا حامل ہے۔“

”آپ مجھے بتائیے۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”آپ یہاں سے فرار ہو جائیں گے اور اس کے لیے باقاعدہ ڈرامہ کیا جائے گا، اس خیال کے پیش نگاہ کہ وہ
آس پاس موجود ہے اور ممکن ہے ہم پر نگاہ رکھ رہی ہو، پھر آپ اسے تلاش کریں گے، وہ چونکہ آپ سے متاثر ہے
اور آپ پہلے فرد ہیں جسے اس نے اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے اس ڈرامے کے بعد وہ دوبارہ
آپ تک پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ آپ اس کے ساتھ شامل ہو جائیں اور اس کا اعتماد حاصل کر لیں۔“

”فرض سمجھیے اگر ایسا ہو جائے تو؟“ شاہ زیب نے کہا۔

”باقی نقشے کا حصول آپ کی ذمہ داری ہوگی۔“

”کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟“

”آپ موقع پا کر اسے ہلاک کر دیں۔“

”ہلاک؟“ شاہ زیب نے تھوک ننگلتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ ضروری ہے۔“ اسٹون برادرز نے شاہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شاہ زیب نے چند لمحات خاموشی اختیار کیے رکھی پھر کسی قدر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”دراصل اسٹون برادرز نے بارے میں میں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا تھا آپ سے، میں صرف آوارہ
گرد ہوں اور میرے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی خزانہ نہیں ہے اور نہ ہی میں صحرائے اعظم میں اتنی دور تک آنے کا
ارادہ رکھتا تھا۔ یہ تو صرف اتفاقات تھے جنہوں نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا، مگر اب ایک لڑکی کا مل....“

”اس پوائنٹ کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے مسٹر شاہ زیب اور اس سے آپ کی نیک نیتی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہ بات صاف صاف کہہ دی، آپ اسے قتل نہیں کریں گے۔“

”باقی میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”وہی باقی سب کچھ آپ کی ذمہ داری ہے، ہم آپ کو ٹرانسمیٹر دیں گے جس پر آپ ہم سے رابطہ کر کے اپنی سمت سے آگاہ رکھیں گے اور پھر کوئی مناسب موقع پا کر آپ اسے بے ہوش کر دیں گے، ہمارے اور آپ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوگا باقی کام ہمارا ہوگا۔“

”بہتر ہے، میں تیار ہوں۔“ شاہ زیب نے حتمی لہجے میں کہا اور اسٹون برادرز نے اس طرح گہری سانس لیں جیسے اس گفتگو سے مطمئن ہوں۔ اس کے بعد شاہ زیب کو جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

شاہ زیب سوچنے لگا کہ یہ تو فطری بات تھی کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ وہ کوئی عام آدمی تو نہیں ہے، چلو خزانہ جائے بھاڑ میں، کم از کم ان لوگوں کے ساتھ صحرائے اعظم افریقہ سے آسانی سے نکلنا تو نصیب ہو سکتا تھا، یا کسی اور پریشانی کے بغیر زندگی تو گزر رہی تھی، لیکن تقدیر کو یہ سکون بھی پسند نہیں آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کو تمام معمولات سے فارغ ہو کر وہ اپنے خیمے میں واپس آ گیا اور پھر وہی ماضی کی یادیں، وہی یادوں کے کھلے درتے... جانے کون کون ان درپچوں سے اندر آ گیا۔ لیکن مسٹر گرج کسی درتے سے نہیں بلکہ پہلے کی مانند خیمے کے بیچ سے آئے تھے۔

”اوہ... تم جاگ رہے ہو؟“

”ہاں مسٹر گرج۔“

”کیا تمہیں یہ خیال تھا کہ میں آؤں گا۔“ مسٹر گرج نے کہا اور شاہ زیب چونک کر انہیں دیکھنے لگا، پھر اسے غصہ آ گیا تھا اس سفید ریچھ کو یہ غلط فہمی کیسے ہو گئی یہ کسی محبوبہ دلنواز کا روپ رکھتا ہے کہ شاہ زیب اس کا انتظار کرے۔ بہر حال شاہ زیب خاموش رہا تھا، مسٹر گرج نے پھر کہنا شروع کیا۔

”میں کبھی ان کی طرف سے غافل نہیں رہتا، چنانچہ میں نے ان کے اور تمہارے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن لی ہے اور تمہاری آمادگی پر مجھے خوشی ہوئی۔ تم نے نہایت ذہانت سے انہیں کسی طرح شک کا موقع دے بغیر ان کی پیشکش قبول کر لی، مجھے اندازہ ہو گیا تھا مسٹر شاہ زیب کہ تم ایک ذہین نوجوان ہو۔“

”آہ کاش مجھے بھی اس کا اندازہ ہوتا۔“ شاہ زیب نے کراہتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری کسر نفسی ہے۔“

”کیا آپ کو یقین ہے مسٹر گرج کہ جس طرح آپ نے ان لوگوں کی گفتگو سن لی تھی اسی طرح وہ میری اور آپ کی گفتگو سننے کی کوشش نہیں کریں گے۔“

”ہرگز نہیں، میں ان کی یہ کمزوری جانتا ہوں۔“

”کمزوری۔“

”خود پر نازاں ہو جانے والے زندگی میں کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے، وقت کہتا ہے جس قدر طاقت حاصل کرتے ہو محتاط ہوتے جاؤ کیونکہ تمہارا دشمن تمہاری طاقت کا اندازہ لگانے کے بعد ہی تم پر وار کرتا ہے۔“

”عمدہ بات ہے۔“

”اور اب تم اس ڈرامے سے پورا فائدہ اٹھا لو۔“

”وہ کس طرح؟“

”وہ نہایت آسان ہے، اس طرح تو انہوں نے ہماری وہ مشکل حل کر دی ہے جس کا حل بہت کوشش کے

باوجود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”مجھے بھی کچھ سمجھا دیں مسٹر گرج۔“

”اوہ ڈیئر شاہ زیب، یہ لوگ تمہیں تمام تیاریوں کے ساتھ فرار کا موقع دیں گے اور تم یہاں سے چلے جاؤ گے، ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم اسے تلاش کرو، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم اسے تلاش کرو اور پھر اسے اس کی منزل تک لے جاؤ۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے، لیکن کیا مسٹر گرج....“

”ہاں میں تمہیں وہاں تک کا پورا نقشہ ذہن نشین کر سکتا ہوں اور اسے اپنے تحفظ میں اس قبیلے شکال تک لے جاؤ اور وہاں میرا انتظار کرو۔“

”قبیلے شکال۔“

”ہاں شکال میں، میں ان لوگوں کو لے کر وہاں آ رہا ہوں، اس وقت تک میں ان کا قیدی ہوں جب تک یہ شکال تک نہیں پہنچ جاتے اور اس کے بعد یہ ہمارے قیدی ہوں گے۔“

شاہ زیب حیرت سے مسٹر گرج کو دیکھ رہا تھا۔ برفانی بوڑھا پہلے بھی پراسرار نظر آتا تھا، لیکن اس گفتگو کے بعد وہ اور بھی پراسرار ہو گیا تھا، بہر حال اس کی تجویز بھی بری نہیں تھی۔ شاہ زیب نے اس پر بھی آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ مسٹر گرج شاہ زیب کو شکال تک کا راستہ سمجھانے لگا اور شاہ زیب اس کے بتائے ہوئے نقشے کو ذہن نشین کرنے لگا، پھر شاہ زیب نے کہا۔

”قبیلے شکال میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟“

”اس قبیلے کے لوگ غیر مہذب نہیں ہیں، کم از کم ان میں وحشت خیزی نہیں ہے۔ وہ اگر بہت زیادہ کریں گے تو تمہیں قید کر لیں گے، لیکن میں بہت مختصر وقت میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”کیا وہ لوگ اپنے قبیلے کی لڑکی کو پہچان سکیں گے؟“ شاہ زیب نے سوال کیا۔

”یہ ہرگز نہیں کرنا، شورا کہ اگر خود وہاں ایسی کوئی کوشش کرے تو دوسری بات ہے، تم اپنے طور پر اس کی کوشش مت کرنا۔ طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ حالات کیسے ہیں، ہمیں اس کا جائزہ لینا ہوگا اور پھر آسانی سے شورا کو ان کے حوالے نہیں کریں گے۔ اسی کے نام پر تو ہم ان سے سودے بازی کریں گے۔“

”سودے بازی۔“

”ہاں خزانے کے سلسلے میں۔ میرے دوست اسٹون برادرز اس خزانے کے حصول کے لیے چلے تو پڑے ہیں لیکن انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ شکال پہنچ جانا ہی سب کچھ نہیں ہے“ مسٹر گرج نے پراسرار انداز میں کہا۔

”اور اگر شورا خود اپنا تعارف کرادے تو“

”تب بھی تم محفوظ رہو گے، کیونکہ تم اس کے ساتھی ہو گے۔“

”ٹھیک ہے مسٹر گرج، سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ہوگا۔“

”تم ساری صورت حال سمجھ گئے ہو، اب میں جاؤں۔“

”کھل اطمینان کے ساتھ۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہو سکتا ہے دوبارہ تم میری تم سے ملاقات نہ ہو سکے، اس لیے شکال میں ملاقات تک کے لیے خدا حافظ۔“

”اوکے مسٹر گرج۔“ شاہ زیب نے کہا اور گرج اسی طرح باہر چلا گیا، شاہ زیب اب اس کے بارے میں اور کچھ نہیں سوچتا چاہتا تھا، جتنا سوچتا ذہن الجھنے لگتا تھا، اس لیے صرف شکال تک کا سفر ذہن میں دہرانے لگا اور اسے دہراتے دہراتے سو گیا۔

☆.....☆.....☆

⋮

READING
Section

130

اسٹون برادرز نے اس بارے میں کوئی تعین نہیں کیا تھا کہ شاہ زیب کو کب روانہ ہونا ہے۔ دوسرے دن بھی یہاں سفر کے آثار نظر نہیں آرہے تھے، جس کا مطلب تھا کہ آج بھی یہیں قیام ہوگا۔ شاہ زیب بھی سست روی سے اپنے کاموں میں مصروف رہا تھا۔

پورا دن گزر گیا، شام کو محفل طرب جم گئی، درمیانی جگہ کو میزوں سے سجایا گیا اور پھر مدہم موسیقی ابھرنے لگی، شاہ زیب بھی تیاریاں کرنے لگا، لیکن پھر اچانک ہی دو افراد خیمے میں داخل ہو گئے۔

”مسٹر شاہ زیب، اسٹون برادرز آپ کو طلب کرتے ہیں۔“

اس کا دل دھک سے رہ گیا، تاہم شاہ زیب نے کہا ”میں ابھی آتا ہوں۔“

”معاف کیجیے! آپ جس حالت میں ہیں ہمارے ساتھ چل پڑیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”اچھا چلو۔“ شاہ زیب نے کہا اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ روانگی کا وقت آ گیا ہے، بہر حال اگر ایسی بات ہے تو پریشان نہیں ہونا چاہیے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چنانچہ شاہ زیب ان کے ساتھ چل پڑا۔

دونوں جڑواں بھائیوں نے شاہ زیب کا خیر مقدم کیا تھا، ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، پھر ان میں سے ایک نے کہا ”آپ کی روانگی کا وقت آ گیا ہے مسٹر شاہ زیب۔“

”میں تیار ہوں اسٹون برادرز۔“ شاہ زیب نے پرسکون انداز میں کہا، ظاہر ہے جو کرنا تھا اس کا فیصلہ تو ہو ہی چکا تھا، اب کسی تردد کا کیا سوال؟

”ہم آپ پر مکمل اعتماد کر رہے ہیں مسٹر شاہ زیب، اور یہ جانتے ہیں کہ ہمارا یہ اعتماد کبھی مجروح نہیں ہوگا۔ آپ ہمارے لیے جو کچھ کر رہے ہیں ہم بھی کوشش کریں گے کہ آپ کو اس کا بھرپور صلہ دیں۔“

”یہ گفتگو ختم ہو چکی ہے مسٹر اسٹون برادرز۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”ہاں بالکل، اب اس سلسلے میں کوئی گفتگو بے معنی ہے، ہم آپ کو آپ کے سفر کے بارے میں تفصیلات بتادیں۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ شاہ زیب نے جواب دیا۔

”یہ انگوشی آپ اپنی انگلی میں پہن لیجیے اس میں خواب آور سنوف ہے جو کسی بھی شخص کو کئی گھنٹوں کے لیے بے ہوش کر سکتا ہے، اس سلسلے میں آپ سے باقی گفتگو تو ہو چکی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اسے کب اور کس موقع پر استعمال کیا جائے گا۔“

”یقیناً....“

”تو پھر آئیے، آپ کو وہ جیب دکھادی جائے جو آپ کو لے کر یہاں سے روانہ ہوگی۔ ہم نے اس سلسلے میں جو پروگرام ترتیب دیا ہے اس کے لیے ہمارے آدی تیار ہیں اور جیب میں آپ کے لیے مکمل انتظامات کر دیے گئے ہیں، درحقیقت اس وقت کا انتخاب خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ زیادہ لوگ اس ہنگامے میں ملوث ہوں، انہیں اپنے کام میں مصروف رہنا چاہیے اور اس کے لیے ہم نے یہ وقت منتخب کیا ہے۔“

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، اسٹون برادرز شاہ زیب کو ساتھ لیے باہر نکل آئے اور پھر تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں تین چیمپیں کھڑی تھیں اور انہی میں سے ایک جیب شاہ زیب کے لیے تیار کی گئی تھی۔ اسٹون برادرز نے شاہ زیب کو اس جیب کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے، اس میں تین بیرل پیٹرول سے بھرے ہوئے ہیں، جیب کی ٹینگی فل ہے، بیرل گولیوں کا نشانہ نہیں بن سکتے، ان کے تحفظ کا بندوبست کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی جاری کر دی گئی ہے کہ کوئی بھی گولی جیب کی طرف نہ چلائی جائے۔“

”گولی...“ شاہ زیب نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

”ہاں آپ کو ابھی اس سلسلے میں تمام حقیقتیں بتادی جائیں گی، جیب کا اندر سے جائزہ لے لیجئے۔ ویسے بہترین حالت میں ہے اور اس کا انجن کہیں بھی آپ کو دھوکہ نہیں دے گا، اب اس کے اندرونی سامان کی سمت آجائیے، کھانے پینے کی یہ اشیاء پیکٹوں کی شکل میں محفوظ کر دی گئی ہیں، یہ پانی ہے، یہ کوئی کا تھرماں اور ایسی ہی چیزیں جو آپ کے کام آسکتی ہیں، درحقیقت ان تمام چیزوں کا بندوبست اس کے لیے کیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے شوراہ کی تلاش میں آپ کو کافی وقتوں کا سامنا کرنا پڑے اور اس میں وقت لگ جائے، اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ وہ آپ کو ہمارا آدمی سمجھ کر پوشیدہ رہنے کی کوشش کرے، یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ ابتداء میں وہ آپ پر کرشمہ کرے، حالانکہ اس کے امکانات ذرا کم ہیں کیونکہ بہر طور آپ کو اس کے ساتھ ہی دیکھا گیا تھا اور اسی وقت آپ قیدی بنے تھے۔ آپ اسے اپنے بارے میں تفصیلات بتا سکتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں تا مسٹر شاہ زیب کہ صورت حال کیا ہے، ہمیں دونوں سمتوں کا خیال رکھنا ہے، اس کی توجہ اور اس کا شک دونوں ہی سامنے آسکتے ہیں، اب یہ آپ کی ذہانت ہے کہ آپ اسے کیسے مطمئن کر سکیں گے۔“

”ٹھیک ہے، یہ آپ میری ذہانت پر چھوڑ دیجئے۔“

”اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے، یہ پستول اور یہ ننھا سا ٹرانسمیٹر۔“

اسٹون برادرز نے شاہ زیب کو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سائز کا ایک پتلا اور چھٹا سا چوکور بکس دے دیا اور پھر وہ اس کے آپریٹ کرنے کا طریقہ بتانے لگے، شاہ زیب نے تمام چیزیں ذہن نشین کر لی تھیں۔ شاہ زیب اس وقت بالکل پرسکون تھا، کیفیت وہی تھی کہ آپھنسے ہیں تو بجبوری ہے، ضرورت نہ ہوتی تو اس سارے پروگرام پر تھوکتے بھی نہیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، اس کے بعد اسٹون برادرز نے آخری پروگرام بتایا اور شاہ زیب ایک لمحے کے لیے شپٹا گیا۔

”جیبوں میں چھ افراد ہوں گے۔ ایک جیب ڈرائیو کرے گا اور باقی اس سلسلے کی دوسری کارروائی، لیکن وہ سب بہترین تربیت یافتہ ہیں آپ بالکل مطمئن رہیں۔“

شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس لے کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، نہ کرتا تو کیا کرتا، کوئی ترکیب بھی تو نہیں تھی۔ آخری کام مکمل ہو گیا اور اس کے بعد شاہ زیب نے اس جیب کا اسٹیمرنگ سنبھال لیا جسے لے کر اسے فرار ہونا تھا، اب مسئلہ یہ بھی تھا کہ جیب کو صحیح طور پر ڈرائیو بھی کیا جاسکتا ہے یا نہیں، ظاہر ہے فرار ہونا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہوتی، اور فرار بھی اس طرح کہ عقب سے گولیاں چلائی جا رہی ہوں۔

شوراہ اگر احمق نہیں ہے تو اسے اندازہ بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ آس پاس موجود ہو۔

بہر صورت اس ڈرامے کا آغاز ہو گیا۔ جب شاہ زیب جیب لے کر تقریباً ایک فرلانگ دور تک نکل گیا تو عقب سے جیبیں اشارت ہوئیں اور اس کے بعد ہنگامہ شروع ہو گیا، گولیاں چلانے کے لیے اتنا فاصلہ طے کر لیا گیا تھا کہ رقص و موسیقی میں مشغول لوگوں کی آوازیں سنائی دے سکیں، اس کے دانت بچھے ہوئے تھے گولیوں کے سلسلے میں تو اسے مطمئن کر دیا گیا تھا، لیکن صحرائے اعظم کے اس ہولناک علاقے میں جیب چلانا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور اسے دوڑانا تو اور بھی خطرناک تھا، لیکن بہر طور ابھی شاہ زیب ان کی ریج میں تھا اور انہی کی پسند کے مطابق اداکاری کرنی تھی۔

جیبیں اس کا تعاقب کرتی رہیں اور واقعی تھوڑی دیر کے بعد مزہ آنے لگا، اتفاق سے بھاگنے کا راستہ بھی کچھ زیادہ ہی عمدہ تھا، سیدھا اور سپاٹ، چنانچہ جیب دوڑانے میں بھی کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی، البتہ یہ احساس ضرور کیا جاسکتا تھا کہ دیکھنے والا اس سے مشکوک بھی ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ بالکل ہی احمق نہ ہو۔ بہر طور یہ بھاگ دوڑ جاری رہی، پتا نہیں ان لوگوں کو کتنا وقت دیا گیا تھا۔ گہری تاریکی میں اب روشنیاں جلائی پڑی تھیں اور ذرا محتاط ہونا پڑا تھا تاکہ کہیں جیب کسی چھوٹی سی چیز پر چڑھ کر الٹ نہ جائے۔ یوں یہ ہنگامہ خیزی تقریباً دو یا ڈھائی گھنٹے تک جاری رہی اور اس کے بعد پچھلی جیبیں زیادہ فاصلہ پیدا کرنے لگیں، گویا اب وہ اپنی کوششیں ترک کر دینا چاہتے تھے۔

شاہ زیب نے بھی اپنی رفتار سست کر دی، لیکن اسے چلتے رہنا تھا، ایک خوف بھی دامن گیر تھا، ان علاقوں کے

بارے میں شاہ زیب کچھ نہیں جانتا تھا، دن کی روشنی ہوتی تو کم از کم سمتوں کا تعین کرنے کی کوشش کی جاتی، رات میں بھٹک کر کہیں سے کہیں جا نکلتا تو کیا ہوگا۔ ضروری تو نہیں ہے کہ شورا ک سے فوراً ہی ملاقات ہو جائے۔ بہت سے مسئلے تھے۔ بہت سی الجھنیں۔ اپنے ہم شکل تلاش کرنے نکلتا تھا اور دنیا کا سفر کرتا ہوا یہاں آپھنسا تھا، کسی سمت سے کوئی وحشی جانور چھلانگ لگا دے تو قصہ پاک ہو جائے۔

دفترا ہی پورے بدن میں سنسنی کا احساس ہوا تھا، واقعی اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا، اسکے آدمی کو پا کر کوئی بھی شیر ہو سکتا ہے، خواہ وہ شیر ہو یا نہ ہو، شاہ زیب کو اپنے چاروں طرف شیروں کی دھاڑیں محسوس ہونے لگیں، جیب بھی کھلی ہوئی تھی، یہ نہیں کہ دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ دوسرے لمحے ایک عجیب سی وحشت کا احساس ہوا کہیں یہ شاہ زیب کے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہے۔ کہیں اسٹون برادرز اس طرح شاہ زیب سے نجات تو نہیں حاصل کرنا چاہتے تھے۔

☆.....☆.....☆

تا حد نگاہ ہولناک تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور شاہ زیب کا بدن پسینہ اگل رہا تھا، بڑے بڑے خوفناک واقعات پیش آئے تھے، مگر ایسی صورت حال بھی نہ ہوئی تھی، تعاقب کرنے والی جیبوں کا کہیں نشان نہیں تھا، اپنا فرض پورا کر کے وہ لوگ واپس جا چکے تھے۔ خوف کی وجہ سے بدن میں بھی کچھ ایٹھن سی ہونے لگی تھی، بھلا اس عالم میں جیب بھی آگے کس طرح بڑھائی جا سکتی تھی اور کوئی منزل تو نہیں تھی، جہاں پہنچ کر سکون حاصل ہو۔ بہر حال ڈرائیونگ سیٹ پر ہی دروازہ ہو گیا، پھر کسی خیال کے تحت سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر دیکھا، سیٹ فولڈنگ تھی، شاہ زیب نے اس کا ہک ہٹایا اور سیٹ پیچھے جھک گئی لیکن ساتھ ہی آواز سنائی دی، آواز کی نوعیت تو وہ سمجھ نہ پایا تھا، لیکن بس وہ آواز تھی، شاہ زیب کے حلق سے دھاڑ نکل گئی تھی اور وہ بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا، دوسری آواز بھی مسلسل ابھر رہی تھی اور میں شاہ زیب کی چیخیں بھی شامل تھیں، مگر یہ آواز....

پہلی بات اس کے دل میں خیال آیا کہ یہ کیسی آواز ہے، تب اس نے خاموش ہو کر غور کیا اور یہ انسانی آواز محسوس ہوئی کوئی کہہ رہا تھا،

”اوہ سنتے کیوں نہیں ہو تم، سیٹ سیدھی کرو، میرے شانے ٹوٹے جا رہے ہیں
”انسانی آواز۔“ شاہ زیب نے کہا۔

دفترا شاہ زیب کی کمر میں چٹکی بھری گئی اور شاہ زیب پھر چیخ پڑا ساتھ ہی وہ آواز پھرا بھری۔
”خدا کے لیے سیٹ سیدھی کرو میں مری جا رہی ہوں۔“

اس بار آواز زیادہ نمایاں ہو گئی تھی اور الفاظ سمجھ میں آنے لگے تھے، شاہ زیب نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا، الفاظ پر غور کرتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ کون سی سیٹ کے بارے میں بات ہو رہی ہے اور آواز کس کی ہے، پھر اسے خیال آیا کہ ابھی ایک لمحے قبل اس نے اپنی سیٹ پیچھے کی ہے، ایک بار پھر شاہ زیب پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی، اس نے جلدی سے کھلی ہوئی سیٹ کا ہک اس کی جگہ سے نکال دیا اور پچھلے حصے نے شاہ زیب کو زور کا دھکا مار کر آگے ڈھکیل دیا، شاہ زیب سامنے کے حصے سے ٹکرایا تھا اور اسی وقت عقب سے آہٹیں ابھریں اور شاہ زیب کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پچھلی سیٹ پر اٹھ کر بیٹھا ہو، شاہ زیب نے وحشت بھرے انداز میں گردن گھمائی رات کی تاریکی کی وجہ سے ایک لمحے میں تو خدو خال نمایاں ہوئے تھے، لیکن دوسرے لمحے شاہ زیب کو یہ احساس ہوا کہ وہ کوئی لڑکی ہے، آواز بھی نسوانی ہی تھی۔

”خدا تمہیں غارت کرے، میرے شانے توڑ کر رکھ دیے۔“

”کک۔ کون کون؟“ شاہ زیب نے وحشت بھرے انداز میں کہا۔

”درندہ ہوں، شیرنی ہوں، کھا جاؤں گی تمہیں۔“ غصے اور جھلاہٹ بھری آواز تھی اور اس بار اس آواز میں

شہنائی بھی محسوس ہوئی، شاہ زیب نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں وہ ایرامی، سو فیصدی ایرا جو اپنے شانے کو

دبائے جا رہی تھی، شاہ زیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔
”اے... اے... اے تم...“ شاہ زیب کے منہ سے پورا جملہ نہ نکل سکا۔

ایرانے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”لغت ہے تم پر، خوف سے مرے جا رہے ہو۔“

شاہ زیب پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا، ناقابل یقین بات تھی، ایرا اور یہاں، لیکن دوسرے لمحے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، کسی بھی طرح سہی ایک ذی روح اس ہولناک ویرانے میں اس کے ساتھ ہے، اگر واقعی کوئی جنگلی درندہ حملہ آور ہو جائے تو کم از کم اسے ڈھال تو بنا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے درندہ ایک ہی پر اکتفا کرے اور شاہ زیب کی جان بچ جائے، ایرانے دو تین گہری گہری سانسیں لیں اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”مجھے تم نے سیٹ کے نیچے دبا ہی دیا تھا۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”ایرا کیا واقعی یہ تم ہی ہو؟“

”نہیں میری روح ہے جو ان ویرانوں میں بھٹک رہی ہے۔“

”رہ... روح روح...“ شاہ زیب نے کہا۔

”اوہ شاہ زیب تم مذاق کیے جا رہے ہو۔ یقین کرو میرے شانے میں بہت چوٹ لگی ہے۔ میں تمہاری سیٹ کے نیچے چھپی ہوئی تھی اور تم نے میرے شانے پر پورا وزن ڈال دیا۔“

”چھپی ہوئی تمہیں مگر کیسے؟“

”بس... ہٹو مجھے راستہ دو۔“ اس نے کہا اور شاہ زیب ایک طرف جھک گیا۔ ایرا سیٹ پھلانگ کر شاہ زیب کے برابر والی سیٹ پر آگئی تھی اور پھر اس نے بن کھول کر اپنا شانہ شاہ زیب کے سامنے کر دیا۔

”زرادیکھو اس پر زخم آیا ہے۔“ اس نے کہا اور شاہ زیب یاد دل خواستہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑنے لگا اور واقعی اس کے شانے پر ایک سیاہ لکیر موجود تھی جو یقیناً سرخ ہو گئی تھی۔ شاہ زیب نے آہستہ سے اس لکیر پر ہاتھ رکھا تو خون کی چھچھپاہٹ محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایرا کی سسکی نکل گئی۔

”زخم ہے نا۔“

”سوری ایرا، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ تم۔“

”زیادہ زخم ہے لو اس رومال سے صاف کر دو۔“

شاہ زیب نے ہمدردانہ انداز میں اس کے زخم کو صاف کیا اور پھر وہی رومال اس کے زخم پر رکھ دیا۔ ایرانے اپنا لباس برابر کر لیا تھا اور پھر دفعتاً ہی اس کے حلق سے قبہبہ آزاد ہو گیا، یہ قبہبہ بھی اس ہولناک ویرانے میں بڑا خوفناک لگ رہا تھا، لیکن شاہ زیب نے اس کا اظہار نہ کیا۔ ایرا ہستی رہی پھر بولی۔

”میری آواز سن کر تو تمہاری حالت بری ہو گئی تھی۔“

شاہ زیب جھینپے ہوئے انداز میں مسکرانے لگا پھر اس نے کہا۔

”ظاہر ہے میں تمہارے یہاں ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، کیا واقعی یہ کسی روح کا کارنامہ تو نہیں معلوم ہوتا؟“

ایرانے سیاہ چمکدار آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”روح کا کارنامہ ہی سمجھ لیں۔ یہ روحوں کے رشتے ہی ہوتے ہیں جو زندگی کا خطرہ مول لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“

شاہ زیب ان الفاظ کی گہرائی پر غور کرتا رہا، وہ مسلسل شاہ زیب کو دیکھے جا رہی تھی۔ پھر بولی۔

”تمہارا کیا خیال تھا میں نے تمہیں چھوڑ دیا؟“ شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، کچھ دیر تک وہ شاہ زیب کو دیکھتی رہی پھر بولی۔

”ہاں مجھے اپنی ملکیت سمجھتا تھا، نفرت ہو گئی تھی مجھے اس سے۔ بہتر ہوا کہ تم وہاں سے چل پڑے، ورنہ وہ

میرے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔ میں موقع کی تلاش میں تھی۔“
”مگر تم، ایرا تم۔“

”ہاں مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ تم یہاں سے روانہ ہو رہے ہو۔“
”کیسے معلوم ہو گیا؟“

”ولیم کی زبانی۔“

”ولیم کون ہے؟“

”دوسرا گدھا جو مجھ سے عشق کرتا ہے۔“

”کیا کہا اس نے؟“

”تفصیل تو اسے بھی نہیں معلوم، بس اس نے بتایا کہ تمہیں یہاں سے فرار کرایا جا رہا ہے۔ وہ ان لوگوں میں

شامل تھا جو تم پر گولیاں برسارے تھے۔“

”تمہیں اس پر حیرت نہیں ہوئی ایرا؟“

”کس پر؟“

”اسی پروگرام پر، ایک طرف تو مجھے وہاں سے نکالا جا رہا تھا اور دوسری طرف مجھ پر گولیاں بھی برسائی جا رہی

تھیں۔“

”میں الجھنوں سے سخت اکتا گئی ہوں، انہیں اپنے ذہن میں جگہ نہیں دیتی۔ جانتی ہوں کہ اسٹون برادرز کسی

خزانے کے چکر میں یہاں آئے ہیں، مگر سچ بات ہے کہ مجھے خزانوں سے اتنی دلچسپی بھی نہیں ہے۔ میں تو زندگی کو

سکون سے گزارنے کی خواہش مند ہوں۔ بس اتنا مال متاع ہونا چاہیے کہ ضرورتیں پوری ہو جائیں۔“

”تو پھر اسٹون برادرز کے ساتھ کیوں چلی آئیں؟“

”میں ان کی کمپنی کی مستقل ملازم ہوں، انہوں نے حکم دیا اور مجھے آنا پڑا۔ پھر اس فلم میں بھی میرا کافی رول

ہے جو وہ صحرائے اعظم میں تیار کر رہے ہیں۔“

”مگر ایرا تم اس طرح کیوں آگئیں؟“

”صرف تمہارے لیے۔“

”اسٹون برادرز اس کے لیے تمہیں معاف کر دیں گے۔“

”اب ان کے پاس جائے گا کون۔ میں نے خزانے اور اسٹون برادرز دونوں پر لعنت بھیج دی ہے۔ ہم لوگ

یہاں سے واپس چلیں گے اور پھر کسی پرسکون گوشے کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیں گے۔“

”ہم لوگ۔“ شاہ زیب نے گھبرا کر کہا۔

”ہاں میں اور تم۔“ اس نے بدستور اطمینان سے کہا پھر چونک کر بولی۔ ”کیوں کیا تم میرا ساتھ نہ دو گے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ کیا تمہیں صحرائے اعظم سے نکلنے کے راستے معلوم ہیں؟“

”راستے تلاش کر لیں گے۔“

”اور اگر نہ ملے تو؟“

”کیسے نہ ملیں گے، ہم تلاش کریں گے، پہلے کسی بستی کی تلاش کی جائے گی اور وہاں سے ہم کوئی نہ کوئی

بندوبست کر لیں گے۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ اسٹون برادرز نے مجھے وہاں سے کیوں نکالا ہے؟“

”شہزادوں نے کوئی سازش بھی کی ہوگی، مگر ہمیں کیا ضرورت ہے۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنے کے راستے

معلوم کرنے ہوں گے اور اس کے بعد کچھ نہیں، یہ لوگ تو جانے کب تک بھٹکتے رہیں گے، جب تک وہ لوگ ہماری

READING
Section

تلاش کے لیے نکلیں گے ہم ان سے بہت دُور جا چکے ہوں گے۔
 شاہ زیب نے سوچا کہ درحقیقت اسے بھی خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، نہ ہی شورا کے ملاقات ضروری تھی۔ ایرا کو بھی ایک حد تک برداشت کیا جاسکتا تھا، اگر واقعی نکلنے کا راستہ مل جائے تو مزہ آجائے گا۔ ویسے ایرا بیوقوف تھی اور اس کی حیاتیاتیں مصیبت بھی نازل کر سکتی تھیں، یہ احمقانہ خود اعتمادی نہیں تھی تو کیا تھا کہ وہ بس یہ جان کر وہاں سے چل پڑی تھی کہ شاہ زیب کہیں جا رہا ہے۔ کیا ضروری تھا کہ وہ اسے قبول کر لیتا اور پھر یہ سوچتا کہ جو کچھ وہ کہے گی وہ اسے مان لے گا۔ وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے اس طرح آجانے سے خوشی بھی ہوئی تھی کہ تنہائی دور ہو گئی تھی اور اب اتنا زیادہ خوف نہیں تھا، لیکن یہ احساس بھی تھا کہ اب کیا ہوگا، صحرائے اعظم سے نکلنے کا تصور اس کے لیے دل خوش کن تھا، لیکن اس کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا اور پھر جیسا کہ اسٹون برار نے کہا تھا کہ وہ شاہ زیب سے زیادہ دور نہ ہوں گے۔ یقیناً اس کے لیے بھی بندوبست کر لیا ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ کسی طور برداشت نہیں کیا جائے گا کہ ایرا شاہ زیب کے ساتھ ہو، اس کا اس طرح وہاں سے نکل آنا اسٹون برادرز کے غصے کو بھڑکا سکتا ہے اور اس طرح وہ ان کے عتاب کا شکار ہو جائے گی۔
 دوسری بات یہ تھی کہ شاہ زیب کے پاس ٹرانسمیٹر موجود تھا اور اصول کے مطابق شاہ زیب کو فوراً اس کے بارے میں اطلاع دینی چاہیے۔ اطلاع نہ دیتا تو شاہ زیب پر بھی شک کیا جاسکتا تھا۔ وہ آ تو گئی ہے لیکن شاہ زیب تو اس کا ذمے دار نہیں ہے، اس سے باز پرس ہوئی تو وہ صاف کہہ دے گا کہ اس کے ذمے دار وہ خود ہیں۔
 ”کیا سوچنے لگے ڈیر شاہ زیب؟“ ایرا کی آواز ابھری۔
 ”کوئی خاص بات نہیں۔“
 ”پھر بھی۔“

”رات کس طرح گزاری جائے گی؟“ شاہ زیب نے سوال کیا۔

”اس خوبصورت، خاموش اور پرسکون ماحول میں۔ آہ میں تو اس تصور سے ہی مسرور ہوں۔ ہاں وہاں تو کبخت ہالک کی طرف سے دھڑکا ہی لگا رہتا تھا۔“ اس نے جواب دیا اور شاہ زیب اس عجیب و غریب لڑکی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا، مخبوط الحواس معلوم ہوتی تھی، شاہ زیب کی جان نکلی جا رہی تھی اور اسے یہ ہولناک رات خوبصورت خاموش اور پرسکون محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ زیب نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔
 ”اور اگر اس خوبصورت خاموش اور پرسکون رات میں کوئی وحشی درندہ جیب پر چھلانگ لگا کر ہم دونوں کو دبوچ لے تو.....“

”درندہ۔“ ایرا کی آواز میں خوف جھلکنے لگا۔

”جی ہاں... درندہ کیا خیال سے ڈیر کیا درندے ہمیں دیکھ کر روپوش ہو جائیں گے۔“
 ”اوہ نہیں نہیں.. تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو، یہاں درندے تو نہیں معلوم ہوتے۔“
 ”یہاں نہیں ہیں، لیکن آگے تو ہو سکتے ہیں۔“

”تت... تو پھر؟“

”کچھ نہیں.. انتظار فرمائیے کہ کس وقت کسی گوشے سے شیر کی دھاڑ سنائی دیتی ہے اور اس کے بعد وہ ہماری بو سونگھتا ہوا ہم تک پہنچ جاتا ہے۔“

”اوہ...“ ایرا اب واقعی خوفزدہ نظر آنے لگی تھی ”اب کیا کروں۔“

”کچھ نہیں... بس انتظار فرمائیے گا۔“

”کوئی ہے، مجھے کچھ خوشبو محسوس ہوئی ہے؟“

”ہاں تمہاراں میں ہے۔“ شاہ زیب نے کہا اور ایرا کوئی تلاش کرنے لگی، اس کے بعد وہ دونوں دیر تک کوئی

کی چسکیاں لیتے رہے۔

یہ خاموش اور پرسکون رات تو ایرا کے لیے ہولناک بن گئی تھی، کم از کم یہی فائدہ ہوا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی اور اب اس کی جولانیاں ختم ہو گئی تھیں۔ کئی بار ہواؤں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹیں سنائی دیں اور وہ وحشت زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، پھر اس نے کہا۔

”مجھے تو نیند آرہی ہے شاہ زیب۔ اگر تم اجازت دو تو میں پچھلی سیٹوں کے درمیان سو جاؤں“
 ”ہاں وہ محفوظ جگہ ہے اور بہتر ہے تم سو جاؤ، میں جاگ رہا ہوں۔“ شاہ زیب نے جواب دیا اور وہ پچھلی سیٹوں کے درمیان گھس کر لیٹ گئی۔

رات دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ ہوائیں سرد ہو گئی تھیں لیکن خشکی پیدا نہیں ہو سکی تھی، یہ گرم ترین علاقہ معلوم ہوتا تھا۔

دیر تک ایرا کی آواز نہ سنائی دی، شاہ زیب نے پلٹ کر دیکھا تو وہ گہری نیند سو چکی تھی۔ عجیب مصیبت تھی اب وہ سیٹ کھول کر لیٹ بھی نہیں سکتا تھا، کیا کرے اور کیا نہ کرے، کیا اسی طرح بیٹھے بیٹھے رات گزار دے۔ سخت بیزاری کے عالم میں تھا، وہ جاگ رہی تھی تو عجیب سے احساسات کا شکار ہو گیا تھا اور اب وہ سو گئی تھی تب بھی بوریت ہو رہی تھی۔ اگر اس عالم میں شورا ک مل جائے تو کیا ہوگا؟ کیا ایرا کی موجودگی میں بھی وہ سب کچھ ہو سکے گا جس کے لیے اسے روانہ کیا گیا تھا۔

شاہ زیب نے سیٹ سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ تھک کر چور ہو گیا تھا اور یہ فارمولا بے حد کارآمد رہا، نجانے کب پلکیں جھٹکیں اور صبح ہو گئی، ایرا ہی نے اسے جگایا تھا وہ خوشی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

”اوہ ڈیر شاہ زیب بڑے زبردست انتظامات کیے ہیں اسٹون برادرز نے تمہارے لیے۔ دیکھو ہر طرح کی خوراک کے ڈبے موجود ہیں کوئی بھی ہے اور پیپر وغیرہ بھی، چلو ہاتھ منہ دھولو، میں ناشتا تیار کر رہی ہوں۔“

شاہ زیب کو ہنسی آگئی تھی اس نے سوچا کہ ایرا کی موجودگی نعمت ہے، اگر وہ نہ ہوتی تو اس وقت عالم ہی دوسرا ہوتا، اسی وقت شاہ زیب نے فیصلہ کیا کہ آنے والے وقت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہو اس لیے اس کے بارے میں اسٹون برادرز کو اطلاع نہیں دی جاسکتی۔ اولیت اسی بات کو دی جائے کہ یہاں سے کسی طرح نکل جانے کی کوشش کرے بشرطیکہ اس کا موقع مل جائے، نہ نکل سکا تو اس بات کا اظہار کر دوں گا کہ شورا ک کو تلاش کر رہا تھا، ایرا کا مسئلہ وہ خود حل کریں گے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

ایرانے ناشتا تیار کر لیا تھا، دونوں نے نہایت خوشگوار فضا میں ناشتا کیا تھا اور اس کے بعد شاہ زیب نے جیب کی دیکھ بھال کی پھر اسے اشارت کر کے آگے بڑھا دیا، اس وقت اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

صحرائے اعظم کا ایک وسیع و عریض علاقہ آج بھی براسرار کہانیوں کا حامل ہے، لیکن زیادہ تر علاقہ اب جدیدیت کی طرف مائل بہ پرواز ہے اور وہاں کی زندگی بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ تو جناب شاہ زیب صاحب ان دنوں وحشت خیز صحراؤں میں سفر کر رہے ہیں جو ان قصے کہانیوں میں بار بار استعمال کیا گیا ہے۔ آنکھیں جھٹک جھٹک کر بدن میں چٹکیاں لے لے کر یہ سوچا جاتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ عالم خواب ہی نہ ہو، لیکن پھر گوں گوں مصائب اور اطراف میں بکھرے ہوئے کردار ہوش دلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جناب عالی! آپ کسی کہانی کا سفر نہیں کر رہے ذرا بھی چوکے تو کسی درندے کے پیٹ میں پہنچ جائیں گے اس لیے ہوش و حواس کی دنیا میں رہیں اور اپنے آپ کو کسی کہانی کا ہیرو نہ سمجھیں۔ سمجھنا چاہیں تو سمجھ بھی نہیں سکتے کیونکہ آپ کے ساتھ کسی نہ کسی کردار کا نزول رہا ہے اور اس وقت شاہ زیب کی شریک سفر مس ایرا تھیں جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر پیادیں آگئی تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود ان کے پیادوں کوئی دیس نہیں تھا، وہ خود بیچارے دیس بدیس بھٹک رہے تھے۔

READING
Section

ایرانے شاہ زیب کی صحت کی ذمہ داری سنبھال لی تھی اور وہ چھوٹی سی جیب میں بہت خوش تھی جسے اس نے اپنا ہوم سویٹ ہوم سمجھ لیا تھا۔ اس کے اور شاہ زیب کے درمیان ہر طرح کی گفتگو ہوتی تھی، ایرانے کہا تھا کہ اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ دنیا میں کہیں بھی رہا جائے لیکن صحرائے اعظم سے جلد از جلد نکل جایا جائے۔ لیکن شاہ زیب اسٹون برادرز کی ہدایت کے مطابق شورا ک کو تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور اس تلاش میں اب ایرا اس کے ساتھ تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ شاہ زیب نے اسے اب تک اپنے دل کی بات نہیں بتائی تھی۔ ایک صورت یہ تھی کہ صحرائے اعظم سے باہر نکلنے کا راستہ مل جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ شورا ک مل جاتی اور اسٹون برادرز کا کام ہو جاتا۔ تیسری صورت یہ تھی کہ مسٹر گرج کے پروگرام کے مطابق شورا ک کو اس کے قبیلے تک لے جایا جائے۔ شاہ زیب اس وقت مثلث بن کر رہ گیا تھا۔

رات ہوئی تو پھر ایک جگہ قیام کر لیا گیا، اس رات موسم ذرا خنک تھا اور فضا میں کہر کی کیفیت چھائی ہوئی تھی، رات گزارنے کے لیے جیب کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا، ویسے بھی یہ خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا کہ کوئی اور ذریعہ تلاش کیا جائے۔ ایرانے اس رات اپنی تمام شخصیت شاہ زیب پر نچھاور کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن وہ دونوں اس فیصلے سے مستفید نہ ہو سکے جس کی وجہ سے ایرا بدولی کا شکار ہو گئی تھی اور دوسری صبح جب ان لوگوں نے سفر کا آغاز کیا تو ایرا کا موڈ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔

دوسرا دن بھی بغیر کسی وقت کے گزر گیا اور کوئی ایسا قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا، لیکن ایرا کا موڈ دن بھر خراب رہا تھا اور جب یہ رات بھی بغیر کسی خاص واقعے کے گزر گئی تو ایرا بدول ہو گئی اور دوران سفر اس نے شاہ زیب سے اس بات کی شکایت بھی کی۔

”میں محسوس کرتی ہوں کہ تمہیں میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور شاید تم میرے اس طرح نازل ہو جانے سے اخلاقاً تو خاموش ہو گئے، لیکن ذہنی طور پر کچھ الجھے ہوئے سے ہو“

”نہیں ذییر، تمہارا خیال غلط ہے تم خود مو جو، ہم جس ہولناک ماحول میں سفر کر رہے ہیں۔ کیا اس میں رنگینوں کی کوئی گنجائش ہے۔ تمہاری وجہ سے مجھے یہ مسرت ہوئی کہ میں تنہا نہیں رہا، لیکن زندگی کے بیشتر مراحل سکون سے تعلق رکھتے ہیں اور بے سکونی کبھی لطیف جذبات کو جنم نہیں دے سکتی۔“

شاید ایرانے یہ منطوق قبول کر لی تھی کیونکہ اس کے بعد اس نے شاہ زیب سے مکمل تعاون شروع کر دیا، یہ لوگ ابھی تک ادھر سے ادھر بھٹک رہے تھے، اسٹون برادرز سے بھی کوئی رابطہ نہیں قائم ہو سکا تھا، ظاہر ہے کوشش کرتے تو ایسا ممکن تھا اور نہ ان لوگوں کو بھی اس کی ضرورت نہ پیش آئی ہوگی، بہر حال ان سے دوری ہی اچھی تھی اور پھر کچھ ہو بھی تو نہیں سکا تھا، جس کی انہیں اطلاع دی جاتی۔ ایرا کے بارے میں بھی انہیں بتانا مناسب نہیں تھا، چنانچہ یہ سفر جاری رہا، صحرائے اعظم کے مناظر بدلتے رہے اور پھر یہ لوگ ایک ایسے علاقے میں جانکے جسے اب تک کے سفر کا سب سے دہشت ناک علاقہ کہا جاسکتا تھا۔

یہاں روئیدگی کا نام و نشان تک نہیں تھا، زمین کا رنگ سیاہ تھا اور دور دور تک سیاہ رنگ کی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ علاقہ کیسا ہے۔

رات کو انہی چٹانوں کے درمیان قیام کیا گیا۔ فضا میں ایک عجیب سا جس طاری تھا، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ماحول پر ایک گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی، ایرا بھی خاموش تھی، ویسے بھی شاہ زیب نے محسوس کیا تھا کہ وہ ان باتوں کے بعد کسی قسم کے اظہار سے تو باز رہی تھی لیکن اس کی کیفیت میں ایک پڑمردگی سی پیدا ہو گئی تھی اور شاہ زیب اسے دور کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی گئی اور پھر اس وقت یہ لوگ تقریباً نیند کی آغوش میں پہنچ گئے تھے کہ فضا میں ایک سنبھٹ سنائی دینے لگی۔ ایک عجیب سی گونج ان چٹانوں سے بلند ہو رہی تھی، شاہ زیب چونک کر اٹھ بیٹھا اور اس

نے دیکھا کہ ایرا کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ یہ دونوں پریشانی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ دفعتاً یہ سنناہٹ ایک خوفناک گڑگڑاہٹ میں تبدیل ہو گئی، جیپ کو شدید جھٹکے لگے تھے، ایرا کے حلق سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور وہ شاہ زیب سے لپٹ گئی۔

”یہ... یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”زلزلہ... شاید زلزلہ ہے۔“ شاہ زیب نے سہمے ہوئے انداز میں کہا، پھر اچانک ہی شاہ زیب نے دور فضا میں پھلجھڑیاں سی چھوٹی ہوئی دیکھیں، یہ فاصلہ چار پانچ فرلانگ سے کم نہیں ہوگا، بس یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا انار جل رہا ہو۔ دھماکوں کے ساتھ ساتھ زمین بھی لرز رہی تھی، شاہ زیب نے ذہن پر زور دیا اور یہ اندازہ ہو گیا کہ شاید کوئی آتش فشاں پھٹا ہے۔

فضا میں آتش بازی چل رہی تھی سرخ جھلے ہوئے پتھر گیس کے دباؤ کے ساتھ آتشیں لکیریں بناتے ہوئے آسمان کی جانب جا رہے تھے، پھر ایک سماعت شکن دھماکہ ہوا اور آسمان پر سیاہ دھوئیں کے مرغولوں اور چمکتے ہوئے آتشیں پتھر بلند سے بلند تر ہو گئے، زمین اور زور سے ملنے لگی اور یہ خدشہ ہو گیا کہ جیپ الٹ جائے گی، ایرا کی چیخیں اب مسلسل بلند ہو رہی تھیں اور اس نے مضبوطی سے شاہ زیب کو جکڑ رکھا تھا۔ شاہ زیب ایرا کے ساتھ جیپ سے نیچے اتر آیا، لیکن زمین پر قدم رکھا ہی تھا کہ بڑی زور سے گرے۔ ہلتی ہوئی زمین پر قدم جمانے کی کوشش احمقانہ ہی تھی، ایرا شاہ زیب سے چپٹی ہوئی چیخ رہی تھی اور اس میں دوبارہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں رہی تھی، پتھروں کے فضا میں بلند ہو کر گرنے کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں، گڑگڑاہٹ سے کان پھٹے جا رہے تھے، درجہ حرارت ایک دم بڑھ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ جیپ کے پاس سے ہٹ کر جاتے بھی تو کہاں جاتے، پناہ کے لیے کوئی جگہ تھی، بہر طور وہ دونوں کسی ایسی پناہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگے جس کے پاس پہنچ کر اوپر سے برسنے والے پتھروں سے نجات مل جائے، ورنہ کوئی بھی پتھر کسی بھی وقت ان کی قبر بنا سکتا تھا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر ایک چٹان نظر آئی اور شاہ زیب ایرا کو ساتھ گھسیٹتا ہوا اس چٹان کی آڑ میں پہنچ گیا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں پہنچ کر انہیں برستے ہوئے پتھروں سے نجات مل گئی تھی۔

تاریک رات، بھیا تک ماحول، جس میں صرف پتھروں سے بلند ہونے والی چنگاریاں روشنی پیدا کر رہی تھیں، ورنہ گہری تاریکی چاروں طرف مسلط تھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں، گرم ماحول سے زبان خشک ہو کر تالو سے چپک گئی۔ پھر ایک اور تبدیلی رونما ہوئی۔ کافی فاصلے پر عظیم الشان چٹانوں کے سلسلے کے دوسری جانب سے سرخ روشنی بلند ہو کر پورے ماحول پر مسلط ہوئی جا رہی تھی، ابتداء میں تو یہ لوگ اسے بھی آتش فشاں سے بلند ہونے والے لاوے کی روشنی سمجھتے رہے، لیکن فیضا میں دم بہ دم بڑھتے ہوئے شعلوں کی لپک یہ احساس دلارہی تھی کہ کچھ اور ہوا ہے۔ حدت تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی، پھر دفعتاً ہی صورت حال منکشف ہو گئی۔

غالباً اس طرف کوئی گھنا جنگل تھا جس کے درختوں نے آگ پکڑ لی تھی، یہ لوگ خوف و وحشت سے آنکھیں پھاڑے اس ہولناک منظر کو دیکھتے رہے، جنگل میں آگ لگتے ہی ایک اور مصیبت کا آغاز ہو گیا تھا۔ وہ یہ کہ جنگلی جانوروں نے آگ سے گھبرا کر میدانوں کی طرف دوڑ لگا دی تھی، ان کے چیخنے چلانے کی آوازوں نے فضا کو اور بھی وحشت ناک بنا دیا تھا۔

قیامت کی اس رات میں شاہ زیب اور ایرا اپنے اعمالوں کو یاد کر رہے تھے، نجانے کس کا دل دکھانے کے نتیجے میں یہ سزا ملی تھی، زمین مسلسل کروٹیں بدل رہی تھی، ابھی ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا جاتی اور پھر دھماکوں کا مسلسل طوفان شروع ہو جاتا، نجانے کیا ہونے والا تھا۔

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے
شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہوگی.....؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

محبت اور نفرت کی دہشتی دہشتی آج میں لوہی ہوئی شعلہ سا مالِ تحریریں

پہلا شعلہ

کمپنی
پہلی



انجمنِ اہل فکر و مال

دیار غیر میں انصاف کا پرچار کرنے والوں کے منہ پر ایک لہجہ نچوڑا، دور سے ایک مہرت سا مالِ کہاں

کی طرح مالِ آف، آن لوڈ کرنا پڑتا۔ کئی بار بلازمین
ضدی بن کر تو تکرار پر اتر آتے اور لڑ پڑتے اور ایک
دوسرے کے گریبان پکڑ لیتے۔ لڑکیوں کی لڑائی زبان
درازی تک ہی محدود رہتی یا لڑکوں کی طرف سے جنسی طور
پر حراسان کرنے پر۔ لیکن وہ خدا کا شکر ادا کرتا کہ ان
سب میں لیزا انٹوروشال نہیں۔ اس طرف سے وہ
مطمئن تھا۔

لیزا انٹوروشال کا تعلق کینیا سے تھا۔ وہ کمپنی ملازمین کی
فیمیلی ویزا انچارج اور سینئر مینیجر کی انجمن تھی۔ انتہا درجے
کی بگڑی ہوئی چھ فٹ کی عورت تھی۔ گھسن بھینسوں جیسا
جسم تھا اس کا۔ بہت ہی تند و تیز شیطانی مزاج رکھتی تھی۔
اپنے سامنے کسی کو کھانسنے پر بھی ڈانٹ پلا دیتی تھی۔ وہ
خود کو ملازم کم اور مالک زیادہ سمجھتی تھی۔ کیونکہ فیمیلی ویزا
جاری کرنا اس کے اختیار میں تھا اور یہ اتنے بڑے اعزاز
کی بات تھی جیسے کسی عام شخص کو فنانس مینسٹر کی طرح بجٹ
خرچ کرنے کے کلی اختیار حاصل ہو جائیں۔ لہذا
رومانویت کے ستارے ہوئے مزدور اپنی بیویوں کے
ویزے حاصل کرنے کے لیے اس کی چاہوسی کرتے
رہتے یا ایک دوسرے کو سیکسی لطیفے سنا کر جنسی تسکین
حاصل کرتے رہتے۔ اول تو آفتاب کو اس کی شکل سے

یہ ایک ایسی کمپنی کی کہانی ہے جس میں پانچ ہزار
ملازم تھے۔ جو کئی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چوبیس
ملکوں کے چوبیس ڈرائیور جو کہ چوبیس زبانیں بولتے
تھے۔ لیکن مشترکہ طور پر سب عربی زبان بولتے تھے۔
سب آوارہ ذہن جیسا ہوادار مزاج رکھتے تھے۔ علاوہ
ازیں لڑکیاں تھیں جو کہ کارٹن اٹھانے اور پیکنگ پر معمور
تھیں۔ زیادہ تر لڑکیوں کا تعلق فلپائن انڈونیشیا، بھارت
اور چند ایک کا افریقہ ممالک سے تھا۔ سب آفتاب کے
ما تحت کر دیے گئے۔ سب نے اس کے ناک میں ایسے دم
کر رکھا تھا جیسے کسی ریسی اونٹ کو نکیل ڈالی جاتی ہے۔
جس کو دائیں بھینجا دہ بائیں چلا جاتا۔ جس کو رات کو کام
کرنے کے لیے کہتا وہ جواب دیتا صبح کروں گا۔ جس کو
دن کو کام کرنے کے لیے کہتا وہ بھی الٹا ہی جواب دیتا۔
یعنی اگر کسی کو بھینس کے نیچے چھوڑتا تو وہ پھٹنے کے
نیچے پہنچ جاتا۔ کام ہی ایسا تھا کہ موت اور گاہک کی طرح
کسی بھی وقت فیکس پر آرڈر آ جاتا جس کی تعمیل کرنا پڑتی
کہ فلاں مال کو فلاں جگہ پہنچادیں۔ کیونکہ اسٹوروں پر
مال کو دن کو پہنچانا ہوتا تھا اور بغض اسٹوروں پر مال بازار
تک نہ ہونے کی وجہ سے رات کو۔ تاکہ ٹریفک میں خلل نہ
پڑے۔ ایسی صورت حال میں کئی بار اسے خود بھی گدھوں

گاڑیوں پر ہاتھ رکھ کر یا ان کی آواز سن کر نقص بتا دیتی تھی۔ اس کی ٹھیک کی ہوئی گاڑیاں حیرت انگیز حد تک بہت کم خراب ہوتی تھیں اور بہت کم پٹرول خرچ کرتی تھیں۔ کیونکہ اس کو کام سے جنون کی حد تک عشق تھا اور گاڑیوں کی ٹیکنالوجی پر مکمل عبور حاصل تھا۔ لیکن ملازمین اس سے تنگ ہی رہتے تھے۔ کیونکہ وہ آسانی سے فیملی ویزا جاری نہیں کرتی تھی۔ دس سالوں میں ایک بار بھی پر چھٹی نہیں گئی تھی۔ کئی مزدور اس چھٹی کی حرکتوں کی وجہ سے تنگ آ کر اپنا نقصان کر دیا کہ کمپنی چھوڑ کر واپس اپنے ملکوں میں چلے گئے تھے۔ کیونکہ کسی افسر سے لڑنے کی صورت میں کمپنی مزدور کو نکال دیتی تھی اور واجبات بھی ضبط کر لیے جاتے تھے۔

آفتاب جب جو نیر ملازمین سے زیادہ تنگ ہوتا تو ان کو ڈراتا کہ ”تم کمپنی کے فلاں رول کی خلاف ورزی کر رہے ہو، کمپنی تم کو نکال دے گی۔“ وہ انتہائی لالچی سے جواب دیتے، ”کوئی ایک رول تو بتاؤ جو مزدوروں کے حق میں جاتا ہو یا کمپنی نکالتی ہے تو

ہی خوف آتا تھا۔ یہ موٹے موٹے کالے ہونٹ، بیگن اور اس کے رنگ جیسی شکل تھی۔ بغیر ضرورت کے بڑھا ہوا پیٹ۔ بلخ جیسی پیٹھ۔ گنجلد اردار گھنگھریالے بال، ناک اس قدر چوڑا کہ ہونٹوں تک پھیلا ہوا۔ ٹھوڑی کے نیچے بھی گوشت کی بھرمار۔ بقیہ جسم بھی بے حد بے ڈھنگا اور عادات بھی بے انتہا گندی۔ رات بارہ بجے گھوم پھر کر آتی تھی۔ آتے ہی برآمدے، کمرے، کچن کی لائٹیں جلا دیتی تھی۔ اونچی آواز میں میوزک لگا دیتی، ساتھ کچن میں کھانا بنانا شروع کر دیتی۔ سناٹے میں دن بھر کے تھکے ہوئے مزدور اس کی خود سر حرکات کی وجہ سے بے آرام ہو جاتے اور تو تکرار شروع ہو جاتی۔ آخر ان کو بھی آرام کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کسی کے اعتراض پر کان دھرنے والی نہ تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر کبھی کبھی وہ شراب پیتی اور دن بارہ بجے تک شراب پی کر نشے میں ڈھت سوئی رہتی۔ اس کے بعد وہ ڈیوٹی پر پہنچ کر گاڑیوں کی دیکھ بھال کرتی۔ اس کی تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی۔ کمپنی اس کی قدر دان تھی۔ وہ گاڑیوں کی نبض شناس تھی۔ اشارت



READING
Section

نکال دے، رزق من جانب اللہ۔ ایک فنٹ جگہ پر کھڑے ہیں، کرہ ارض بہت بڑا ہے، کہیں اور کام کرنے چلے جائیں گے۔“

بڑی ہنگامی قسم کی ڈیوٹی تھی جس نے سب کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ آفتاب کا ان سب سے زیادہ برا حال تھا۔ شیڈول سیٹ ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہیڈ آفس والے احتجاج کرنے والوں کو نشان عبرت بنا دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے مزدور غربت اور بے روزگاری سے بچنے کے لیے سر جھکا کر کام کرنے کو ہی ترجیح دیتے رہتے تھے۔ اگر آفتاب سے کوئی شکایت کرتا تو وہ جواب دیتا۔

”ہیڈ آفس والوں سے شیڈول مرتب کرنے کے لیے کہا ہوا ہے۔ ذرا صبر کرو۔“ لیکن کتنا صبر کیا جائے، آخر صبر کرنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ صبر اور انتظار ہی تو مزدور کی غربت ختم نہیں ہونے دیتے۔ ان سب کے لیے آفتاب کے دل میں ہمدردانہ سوچ تھی۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ بعض اوقات اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا، ملکوں، خاندانوں اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ان سے دور رہ کر اور جنسی طور پر استحصال سے ذہنی مریض بن گئے ہیں۔ بعض اوقات وہ ان سے اس قدر عاجز آ جاتا کہ اپنی بے بسی کو دیکھ تہنائی میں بیٹھ کر روتا۔ لہذا، اس نے زندہ رہتے ہوئے انسانوں سے اپنی زندگی سے توبہ کرنی۔ کیونکہ کبھی کبھی ان کو ٹھیک کرنے کے لیے اس کی سوچیں بھی بے انتہا قبیح، انتقامی اور غلیظ ہو جاتی تھیں۔ آخر دل کو تسلی دیتا کہ ان سے بیٹھا بن کر کام لینا ہی مناسب ہے۔ کیونکہ وہ بھی اپنے ملک میں غربت کی وجہ سے قرض اور سود کے نیچے پھنسا ہوا تھا۔

وہ ہیڈ آفس کسی کی شکایتی رپورٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے تنخواہ ہی اس بات کی دی جاتی تھی کہ ملازمین سے احسن طریقے سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر کمپنی کی پرافٹ شیٹ میں اضافہ کرے اور ان کے لیے اس قدر کام پیدا کرے کہ ان کو دائیں بائیں ہر طرف دن رات کام ہی کام نظر آتا رہے اور ان کو آرام کرنے کا ہوش نہ آنے دے۔

کمپنی نے ان سب پر نظر رکھنے کے لیے اسے ایک عدد ڈاکٹر بھی دی ہوئی تھی۔ وہ ان سب کو کنٹرول کرنے

کے لیے نل فائٹر کی طرح دائیں بائیں بھاگتا رہتا تھا۔ کوئی اس کے قابو میں نہیں آتا تھا۔ سب اس کے خلاف شکایتیں لکھ کر ہیڈ آفس بھیجتے رہتے تھے کہ نہ وہ رہائش کی صفائی کرواتا ہے۔ نہ اور ٹائم دیتا ہے۔ نہ بیماری کی چھٹی دیتا ہے۔ نہ آبائی ملک جانے کے لیے چھٹی منظور کرتا ہے۔ نہ صحیح علاج کرواتا ہے نہ گاڑیوں کی ٹھیک طرح سے دیکھ بھال کرتا ہے، وغیرہ۔ بلکہ جب جی چاہتا ہے ڈیوٹی پر بلا لیتا ہے۔ پٹرول، بجلی ضائع کرتا ہے۔ ڈیوٹی زیادہ لیتا ہے۔ بد تمیزی کرتا ہے، وغیرہ۔ اس بات کا کوئی ذکر نہیں کرتا تھا کہ ان کے آرام کا خیال رکھتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ دولت کی فراوانی کی بناء پر مقامی لوگوں کے آرام پرست ہونے کی وجہ سے ان ہنرمندوں کو ان کے ملکوں سے کم مزدوری پر بلایا ہی اس لیے جاتا ہے۔ تاکہ ان سے صرف اور صرف گدھوں کی طرح کام لیا جائے۔ باقی سب کچھ بھول جائیں۔ فرق صرف اتنا ہے ان کے ملکوں میں کام نہیں ہوتا اور یہاں کام کی فراوانی ہے۔ ہیڈ آفس کا عملہ ان کی شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا بلکہ کام بڑھانے کے نئے نئے طریقے دریافت کرتا رہتا تھا۔

مسائل تھے کہ ہر ایک کا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ کمپنی میں کوئی میس نہیں تھی۔ ہر ایک کو کھانا خود ہی بنانا پڑتا تھا اور بچا ہوا کھانا سنبھالنے کے لیے فریج نہیں تھے بلکہ ضائع ہو جاتا تھا اور تنخواہ وقت پر نہیں ملتی تھی۔ جس کی وجہ سے ملازمین اسٹوروں سے واپس آئی ہوئی ایکسپائری ڈیٹ اشیاء جن میں اکثر کیڑے اور سنڈیاں پڑی ہوتی تھیں اور بے انتہا باسی ہوتی تھیں، کھا کر گزارہ کرتے رہتے تھے۔ جو کہ ان کی صحت کے لیے مہلک تھیں اور ان کے کھانے سے اکثر کے پیٹ خراب رہتے تھے۔

ان سب ڈرائیوروں میں ایک بات مشترک تھی۔ ہر ایک کی گاڑی میں، ان کے بستروں کے پاس، تیل، گریس اور زنگ آلودہ بوؤں سے انی ہوئی پہلے چند اور آخری صفحوں سے پھٹی ہوئی مختلف ملکوں کی ماڈل گرنز کی تصویروں کی کتابیں پڑی رہتی تھیں اور وہ تصویروں کو دیکھ کر دل بہلاتے اور آپس میں محسوس کلام کرتے ہوئے نظر آتے رہتے تھے۔ وہ کتابوں کا تبادلہ بھی کرتے رہتے

اسے گھر تک کالکٹ دے کر سفر کرا دے گی۔ مگر حساب الٹا ہو گیا۔

ایک گھنٹے بعد سلیفین نے اسے سب کے سامنے معاف کر کے اسے شرمندہ کر دیا۔ آفتاب پانی پانی ہو کر شام کو ایک ٹریلر کے سائے میں جا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا سلیفین نے اسے معاف نہیں کیا بلکہ کسی ٹیکنیکل طریقے سے بدلہ لے گا اور آج سے اس کے عذاب کی دوسری قسط شروع ہو رہی ہے۔

سلیفین آفتاب کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا مغموم چہرہ اور آبدیدہ آنکھیں دیکھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”غلطی میری تھی میں نے تمہیں خواہ مخواہ کام کہا، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

آفتاب نے جواباً کہا، ”سلیفین بھائی آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کا دل بھی بڑا ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ غلط رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”یار عجیب مصیبت ہے، یہاں ہم دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے مزدور اپنے مسئلے کی کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتے۔ اگر شکایت کرنے جائیں تو نوکری سے فارغ۔ زندہ رہنے کے لیے پیسے ختم، اور خداتوں میں کیس لڑنے کے لیے پیسے کہاں سے لائیں۔“ سلیفین نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

بعد ازاں، سلیفین اسے ریستورنٹ سے کھانا کھلا کر اپنے گھر لے گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں مرد اور عورتوں کے عجیب سے رومانوی انداز میں کارٹون بنائے ہوئے تھے۔ کمرے میں ایک شیلف کتابوں کی بھی تھی۔ شیلف میں کلیری وائن، دوستوفسکی، ایڈم سمٹھ، میکاؤلی گبریل گارشیا، چیری جیمز اور کئی دوسرے مشہور مصنفین کی کتابیں بھی پڑی تھیں۔

”اس شہر میں میں نے کوئی کتابوں کی دوکان نہیں دیکھی، ہاں! چند دوکانوں پر یونانی رسائل مل جاتے ہیں۔ آپ نے یہ کتابیں کہاں سے حاصل کی ہیں۔“ آفتاب نے کتابوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

یہ کتابیں میں نے انگلینڈ سے منگوائی ہیں۔ یہاں کہاں ملتی ہیں۔ مجھے بیوی بچوں سے زیادہ محبت کتابوں

تھے۔ شاید ایسا اس لیے تھا وہ نفسانی خواہشات مٹانے کے لیے خواتین کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

ان خود سر مزدوروں کو کنٹرول کرتے کرتے چند مہینوں میں ہی اس کا چوالیس پاؤنڈ وزن کم ہو گیا تھا اور آئینہ رخسار چہرہ چوہے کی کھال جیسا۔ ہونٹ کالے، بال میلوں سے مشکئی، پونٹے سو بچے ہوئے، آنکھیں ویلڈروں کی طرح سرخ اور چہرے کا رنگ بگڑ کر پرانے لوہے جیسی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ہاتھوں پر چنڈیاں پڑ گئی تھیں اور پاؤں بھاگتے بھاگتے، ڈانس کرنے والی ٹانگہ کی طرح پھیل گئے تھے۔ جسم سے زنگ آلود پسینوں کی بوئیں چھوٹی رہتی تھیں اور ذہن میں ہمیشہ ایسی خانہ جنگی جاری رہتی جیسے کوئی غریب آدمی دوسری شادی کروا کے دوزخی چڑیلوں کے درمیان پھنسن جاتا ہے۔

اسی دوران زیادہ مشقت کی وجہ سے وہ ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا جو ڈاکٹروں کی سمجھ سے بھی باہر تھی۔ کبھی اوپر کا آدھا دھڑسو جاتا کبھی نیچے کا۔ کبھی دائیں ٹانگ سے سر تک اور کبھی سر سے بائیں ٹانگ تک۔

☆.....☆.....☆

ایک دن ایک آفیسر سلیفین اس کے پاس آیا اور اس کی میز پر چابی پھینک کر کہنے لگا، ”جاؤ میری گاڑی سے بریف کیس اٹھا کر لاؤ۔“

آفتاب نے جواباً پیشانی پر ناگواری کے بل نمودار کر کے کہا۔

”یہ میری ڈیوٹی میں شامل نہیں۔ آپ خود جاؤ اور اپنا سامان اٹھا کر لاؤ۔ میں تمہارا ذاتی ملازم نہیں۔“

اس نے آفتاب کو خوب ڈانٹا اور جی بھر کر گالیاں بھی دے دیں۔ اس کی کسی سینئر آفیسر نے سرزنش کی تھی۔ اس نے بھڑاس آفتاب پر نکال دی۔ آفتاب نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جواب میں ایک افسر کی بے عزتی کر کے اس کی شخصیت تہس نہس کر دی کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ مداری کے ساتھ رہنے والے ریچھ کی طرح وہ مار بھی کھائے اور ہر وقت کھانا کھائے بندر یا یعنی وہ بگڑے ہوئے اشاف کو بھی سنبھالے اور افسروں کے ذاتی کام بھی کرے۔ آفتاب کو پورا یقین تھا کہ اب اس کی جان چھوٹ جائے گی اور کبھی اس کا حساب بے باق کر کے

READING
Section

سے ہے۔ میں بیوی بچوں سے تو دور رہ سکتا ہوں کتابوں سے نہیں۔ ان ہی کی وجہ سے میں نے دنیا میں عزت پائی ہے۔ تم چاہو تو پڑھنے کے لیے کتابیں لے سکتے ہو۔ کتاب پڑھ کر آگے پڑھنے والے کے سپرد کر دینی چاہیے۔ تاکہ علم پھیلتا جائے۔“ سٹیفن نے بڑا مدبرانہ جواب دیا۔

سٹیفن نے آفتاب کو پڑھنے کے لیے کتابیں لینے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی اس نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا، ”یار میں نے لیزا انتورو سے کئی بار فیملی ویزا کے لیے درخواست کی ہے مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ کوئی ایسا طریقہ نکالو کہ وہ مجھے فیملی ویزا جاری کر دے۔ میں اکیلا رہ رہ کر تنگ آ گیا ہوں، وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے بیوی کی ضرورت ہے۔“

آفتاب تھوڑا سا ٹھنکا کہ سٹیفن میرے ساتھ لیزا انتورو سے فیملی ویزا حاصل کرنے کا ذکر کیوں کر رہا ہے۔ آفتاب نے ہمت کر کے کہا۔

”سٹیفن بھائی میں تو خود اس سے بہت دور رہتا ہوں۔ بڑی خبثی عورت ہے۔ مالک کی بیٹی بنی ہوئی ہے۔ آپ اس کام کے لیے کوئی اور بندہ تلاش کریں۔“

”اتنا کہہ کر آفتاب اپنی رہائش گاہ میں واپس آ گیا۔“

☆.....☆.....☆

اس کی بیوتونی کی خبر ہیڈ آفس پہنچ چکی تھی کہ سپر وائزر نے ڈپٹی مینیجر کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔ ہیڈ آفس کے اسٹاف کا اگر بس چلتا تو وہ اسے زہر کا ٹیکہ لگا دیتے۔ کیونکہ مالک کو ملازمین کے مسائل سے چڑھی۔ اس کی نظر میں اس طرح کے کاموں سے خواہ مخواہ کمپنی کے وقت اور پیسہ کا زیاں تھا۔ بہر حال غلطی کی کچھ سزا تو اسے ملنا ہی تھی۔ چند دن بعد اس کے ساتھ والا کمرہ خالی ہو رہا تھا۔ مزدور سامان اٹھا کر کسی دوسری جگہ شفٹ ہو رہے تھے۔ آفتاب نے ایک سے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ دوسرے سے پوچھا تو اس نے بھی بھرپور ہتھیہ لگایا۔ پھر سب نے اس کا سخر اڑانے والے تہقہ لگاتے ہوئے مل کر کہا، ”آپ کو نہیں پتا۔“

آفتاب نے انجان بن کر جواب دیا، ”مجھے نہیں معلوم۔“

ایک نے حیرانی سے پوچھا، ”واقعی۔“

آفتاب نے یقین کے ساتھ جواب دیا، ”ہاں واقعی میں نہیں جانتا یہ کمرہ کیوں خالی ہو رہا ہے۔“

پھر دوسرے نے مسکرا کر کہا، ”لیزا انتورو اس کمرے میں آرہی ہے، آپ کا بوریا بستر گول کرنے۔“

یکدم اس کا سر چکرا گیا، وہ گرنے کے قریب تھا اور چہرے کا رنگ ایسے اڑ گیا جیسے دھماکے کی آواز سے کمزور دل سہم جاتے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے چٹان سے دھکا دیا ہو۔ اس کی آمد کے خوف سے آہستہ آہستہ اس کا جسم ایسے ہو گیا جیسے نیم سلگتا ہوا کونکہ۔

وہ پریشانی کی کیفیت میں آنے والے حالات میں الجھا ہوا برا آمدے سے نکل کر کھجور کے درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ شام کے سائے پھلتے جا رہے تھے۔

تھکاوٹ سے چور چور دن سورج کے آگے سجدہ ریز ہو رہا تھا۔ زمین گھومتی جا رہی تھی اور اس کا دل ڈب ڈب رہا تھا۔

آخر سرخی مائل سورج خدا حافظ کہہ کر ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپ چکا اور چاروں طرف سناٹے کی حکمرانی پیدا ہو گئی۔ وہ بھاری قدموں کے ساتھ واپس اپنے کمرے کی طرف پلٹا اور کندھی لگا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر

گھمبیر خیالات اور انجانے دوسوں نے اسے سونے نہ دیا۔ لیزا کی بد مزاجی کی وجہ سے آفتاب کا اس کے ساتھ جھگڑا یعنی تھا یا لیزا نے اس کے اوپر کوئی بیہودہ الزام لگا دینا تھا۔ وہ تو پہلے ہی مسائل میں پھنسنے ہوئے چوبیس جنگلی بیلوں سے نالاں تھا۔ جنھوں نے اس کا جینا دو بھر کیا ہوا تھا۔

اچانک سناٹے میں اس کے کمرے کا دروازہ زور زور سے بجایا گیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ غیر متوقع بات تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھا، دروازہ کھولا تو سامنے لیزا انتورو کھڑی تھی۔ اس نے انتہائی کھردری آواز میں بڑے رعب دارانہ انداز میں آفتاب کو حکم دیا۔

”باہر گاڑی کھڑی ہے، میرے ساتھ اس میں سے سامان اٹھا کر لاؤ۔“

آفتاب کے لیے اس کے حکم کا انکار کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ آفتاب نے اس کے ساتھ سامان اٹھانا شروع

بن کر رہو، مالک بننے کی کوشش نہ کرو۔“ لیزا نے بے
دید بن کر برجستہ جواب دیا۔

”کیا مصحکہ خیز باتیں کر رہی ہو، کام تو میں ہی
سب سے زیادہ کرتا ہوں۔ یہاں بھی ٹرالروں سے
مال اترواتا ہوں اور دن رات شہر کے اسٹوروں میں
بھی پہنچواتا ہوں۔ ایکسپازری ڈیٹ مال کو بھی ٹھکانے
لگانا ہوتا ہے۔ ملازمین کے مسائل بھی حل کرتا ہوں
اور کیا کروں۔ لیکن کام کرنا ہے تو مکمل آرام بھی
ضروری ہے۔“ آفتاب نے خوشامدانہ لہجے میں
جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں، اب تم کام کرو، باتیں کر کے
کمپنی کا وقت ضائع نہ کرو، میں احتیاط کروں گی۔“
اس نے جھجکتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ جس سے اس
کے سفید دانتوں کی بتیسی نظر آنے لگی۔ آفتاب پھر
غلامی کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

دوسری رات پھر اس نے پہلی رات والی حرکتیں
کیں۔ آج اس نے نہانا بھی شروع کر دیا۔ گھنٹہ
ڈیڑھ نہاتی رہی۔ جسم سے اترنے والی میلوں کی
بو میں آفتاب کے بیڈ تک پہنچ رہی تھیں۔ نہانے کے
بعد بال کھلے چھوڑ کر برآمدے میں شہلتے ہوئے کنگھا
کرنے لگی۔ آدھے سے زیادہ چہرے پر ماتھے نے
جگہ بنائی ہوئی تھی۔ شاید طویل مدت بعد نہائی تھی۔
اس کا کالا جسم ایسے چمکنے لگا جیسے طویل مدت بعد جوتا
پالش کیا گیا ہو۔ بہر کیف! وہ سب کچھ نظر انداز کر کے
سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ آنے والے دنوں میں
بھی وہ ایسا ہی کرتی رہی اور آفتاب مسلسل پریشان
رہا۔ ہیڈ آفس شکایت بھی کی مگر کسی نے کان نہ
دھرے۔

ایک رات آفتاب نے سوچا یہ عورت باز آنے والی
نہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ کوئی زیادتی کرے اور عزت
برباد ہو۔ بہتر یہی ہے یہ ملک چھوڑ دینا چاہیے۔ لہذا، وہ
پچاس ہزار روپے کے ٹکٹ کا ایک کڑوا گھونٹ پلے سے
بھر کر واپس اپنے ملک جانے کے لیے تیار ہو گیا کہ اگر
کچھ خرچہ کر کے جان چھوٹی ہے تو کیا حرج ہے۔ ابھی وہ

کر دیا۔ چند بھاری بیگ، واشنگ مشین، برتن، بستر اور
چارپائی۔ آفتاب سامان اس کے کمرے میں رکھ کر واپس
اپنی رہائش گاہ میں آ گیا اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر کمپ میں
گھبیں اور اپنے کینین و دستوں کے پاس چلی گئی۔

رات بارہ بجے اس نے واپس آ کر ویسا ہی رویہ
اختیار کیا جو اس کی عادت تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل
کر کے عبایا پہن لیا۔ سر پر سکارف باندھا اور ایڑی
والا جوتا پہن کر برآمدے میں ٹپ ٹپ کی آواز پیدا
کرتی ہوئی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اس کے
صرف و انت اور آنکھوں کی سفیدی نمایاں تھی۔ باقی
جلد کالی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوا اور ساری رات
جاگتا رہا۔ کیونکہ سوتے ہوئے اسے روشنی اور وال
کلاک کی ٹک ٹک سے بھی شدید نفرت تھی اور مکمل
سکون کا طلبگار رہتا تھا۔ وہ شدید اضطرابی کیفیت میں
پھنس چکا تھا۔

صبح دبے پاؤں اٹھ کر ناشتا کیا اور تیار ہو کر آفس
پہنچ گیا۔ دوپہر بارہ ایک بجے کے قریب لیزا بھی
ورکشاپ میں داخل ہوئی اور سیدھی آفتاب کے پاس
آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے لیے وقت کی کوئی پابندی
نہیں تھی۔ یہ رعایت اس کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں
تھی۔

آفتاب نے اس سے التجائی انداز میں کہا، ”لیزا
تم رات بارہ بجے آئیں، تمام لائٹیں آن کر دیں، کھانا
بنانا شروع کر دیا، ساتھ میوزک بھی لگا دیا، رات بھر
شور کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا۔ لہذا
بے آرامی کی وجہ سے اب مجھ سے ٹھیک طرح سے کام
نہیں ہو رہا۔“

”اس کا مطلب ہے تم فارغ بیٹھے رہتے ہو، کام
نہیں کرتے۔“ لیزا نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
جواب دیا۔

”میں کام نہیں کرتا تو اس پروجیکٹ کو کون چلا رہا
ہے۔“ آگے سے آفتاب نے ہنس کر جواب دیا۔

”جس نے کام کیا ہوتا ہے وہ تھکا ہوتا ہے۔ اس
کو کانٹوں پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ سب سوئے ہوئے
تھے، صرف تمہیں تکلیف ہوئی۔ نوکر بن کر آئے ہو نوکر

READING
Section

میں رہوں گی یا تم۔“ وہ دھاڑ رہی تھی، آفتاب کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس پر پتھراؤ کر رہی ہو۔ اتنا کہہ کر اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گاڑی کا پانا اس کے سر پر غصے سے دے مارا۔ آفتاب کے سر سے خون کا نوارہ پھوٹ پڑا۔ وہ اس کے بہتے ہوئے خون کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چلتی واشنگ مشین چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ کر کہیں چلی گئی۔ آفتاب کو اس سے اچانک حملے کی توقع نہیں تھی۔ اس وقت اس نے کسی کو دوا دارو کے لیے بلانا بھی مناسب نہ سمجھا۔ وہ ڈرتے ہوئے سوچنے لگا، پتا نہیں اب کیا ہوگا؟ وہ ابھی دوبارہ مالک کے ساتھ واپس آئے گی اور ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا یا لیزا انٹوروا اس وقت کسی مصیبت میں پھنس جائے۔ کانی رات بیت چکی ہے۔ کیونکہ عورت اپنے حسن سے مرد کو اسیر تو کر سکتی ہے مگر اپنی حفاظت نہیں کر سکتی۔ سردرد کی تکلیف کی وجہ سے صبح وہ آفس بھی نہ گیا بلکہ عملے کا ایک شخص اسے لینے آ گیا۔ اس کا پھٹا ہوا سر دیکھ کر آنے والے شخص نے پوچھا، ”یہ کیا ہوا؟“

آفتاب نے اس کو رات والا قصہ کہہ سنایا۔ آنے والے شخص نے کہا، ”تم نے اس سے جھگڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اب تمہارا بچنا کسی صورت بھی ممکن نہیں۔ کئی مصیبتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ آفتاب نے جواباً ایسے کہا جیسے معمولی بات ہو، ”صرف ایک مصیبت ہے کمپنی ٹکٹ دے کر نکال دے گی، میں گھر واپس چلا جاؤں گا اور اس کام کے لیے میں تیار ہوں۔ اپنے بچوں میں رہ کر دو کی بجائے ایک روٹی کھالیا کروں گا۔“

آنے والے شخص نے کہا، ”مگر لیزا کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔ اگر وہ کمپ میں ہوتی تو اب تک تم دونوں کے جھگڑے کی خبر پھیل چکی ہوتی۔“ آفتاب نے کہا، ”ابھی واپس آ جائے گی، اس نے کہاں جانا ہے، اس کمپ کے علاوہ اس کا کوئی ٹھکانہ ہے ہی نہیں۔“

بہر حال بات نکل چکی تھی۔ شام کے وقت دونوں کے جھگڑے اور لیزا کی غیر موجودگی کی بناء پر پولیس نے آ کر آفتاب کو گرفتار کر لیا اور تعیش شروع کر دی۔ آنے والے کئی دنوں بعد بھی اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ کڑی

یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ لیزا آگئی۔ آج اس نے واشنگ مشین چلا کر اس میں کام کے سارے کپڑے ڈال دیے۔ ساتھ کینیا کے کسی نوک گلوکار کی بلند آواز میں موسیقی بھی لگا دی اور گاڑی اشارت کر کے اس کی خرابیاں دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس وقت گاڑی اور موسیقی کا شور سنانے میں پورے عروج پر تھا۔ آفتاب مطالعہ کرتے ہوئے وقت گزارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”کب سے آوازیں دے رہی ہوں، تم باہر کیوں نہیں آ رہے؟“

جواب میں آفتاب نے اپنی ایک لکھی ہوئی کتاب اس کی طرف بڑھادی۔

کتاب دیکھ کر وہ خیرت سے پوچھنے لگی، ”یہ کیا ہے؟“

”مس لیزا میں ایک مزدور ہونے کے ساتھ ساتھ لکھاری بھی ہوں اور یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ کب سونا چاہیے اور کب لکھنا چاہیے۔ تم کیسی عورت ہو جو دوسروں کو پریشان کرتی رہتی ہو۔“ آفتاب نے اسے قائل کرنے والا لہجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اب میں بھی تم ڈسٹرب کیوں ہوتے ہو۔ تم لکھتے اور سوچتے رہتے ہو۔ اس لیے تم کو نیند نہیں آتی اور اسی وجہ سے سارا پر وجیکٹ متاثر ہو رہا ہے اور تمام عملہ بھی تم سے تنگ ہے۔ اسی لیے سب ہیڈ آفس تمہاری شکایتیں کرتے رہتے ہیں۔ تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے بلکہ کسی لائبریری میں ہونا چاہیے۔ جہاں خاموشی ہو۔ میں ہیڈ آفس تمہاری شکایت کرتی ہوں اور تم کو فارغ کرائی ہوں۔“ اس نے ایک طنزیہ جواب دے کر آفتاب کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو، میں نے تو یہ کتاب تمہیں صرف اس لیے دکھائی ہے۔ تاکہ تمہارے دل میں دوسروں کے آرام کا خیال رکھنے کے لیے ہمدردی پیدا ہو۔ آگے سے تم خود مطلب نکال رہی ہو؟“ آفتاب نے اسے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں ٹھیک کرتی ہوں، اب اس کمپنی میں

اشارہ کیا اور پاس بلا کر انسانی ہاتھ کی نشاندہی کی۔ ڈرائیور نے چھڑی سے ہاتھ کو ہلایا تو دونوں ششدر رہ گئے۔ سوپرنے کہا، ”چند دن قبل کی واردات لگتی ہے۔“ ”ہاں ایہ تازہ کام نہیں لگتا، ہو سکتا ہے ڈسٹ بن میں پوری لاش موجود ہو۔ تم رکو میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔ تاکہ کاروائی آگے بڑھے۔“ ڈرائیور نے ہاتھ دیکھنے کے بعد جواب دیا۔

چند منٹوں میں پولیس کی گاڑیاں، ایسبولینس، لیڈیز پولیس جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ ڈرائیور اور سوپرنے پولیس انسپکٹر کو ڈسٹ بن کے پاس لے گئے۔ سوپرنے کٹا ہوا ہاتھ ڈسٹ بن سے پکڑ کر سڑک پر رکھ دیا۔ پھر دونوں نے کچرے کو ٹٹولتے ہوئے آہستہ آہستہ لاش کے دیگر حصے برآمد کر کے ایک عورت کی مکمل برہنہ لاش بنا دی۔ لاش کے کئی ٹکڑوں کو سٹریچر پر ڈال کر ایسبولینس میں رکھا گیا۔ لاش کو لڈ اسٹورج میں جمع ہو گئی۔ پولیس نے از سر نو تفتیش کا آغاز کیا۔ آفتاب صفائی پیش کرتا رہا مگر کسی نے یقین نہ کیا اور ایک دن قانون کے مطابق قتل کا بدلہ قتل کے جرم کے تحت آفتاب کا سر قلم کرنے کے انتظامات مکمل کر لیے گئے اور اسے چند سانسوں کے فاصلے پر قاضی کے سامنے تختہ دار پر لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ جلاد نے اپنا ایک ہی وار کر کے اس کا سرتن سے جدا کر کے اس کی زندگی کا سانسوں کے ساتھ رشتے کا خاتمہ کر دیا۔

کچھ دن بعد چند مزدور ایک جگہ عمارت کی تعمیر کے لیے کھدائی کر رہے تھے کہ انھیں ایک خون آلود کپڑوں کا شاپر ملا۔ شاپر کو جب کھولا گیا تو اس میں زنا نہ سوٹ کے ایک بازو پر ایک گاڑی کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ انھوں نے وہ شاپر پولیس اسٹیشن میں جمع کروا دیا۔ پولیس نے اس نمبر کی تفتیش کی تو وہ نمبر سٹیفن کی گاڑی کا تھا۔ سٹیفن ملک چھوڑ کر جا چکا تھا۔ مگر اب..... قتل کا بدلہ قتل والا فیصلہ، اپنی موت آپ ہی مر چکا تھا۔ بے حس لوگوں کی کہنی نے آفتاب کو ہمیشہ کے لیے غروب کر کے انصاف کا بول بالا اور انسانیت کو زوال سے دو چار کر دیا تھا۔

☆☆.....☆☆

تفتیش سے آفتاب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور پولیس کی مار سے کئی جگہ سے کھال ادھر چکی تھی۔ اس کا تصور اتنا تھا لیزا کی آخری ملاقات آفتاب سے ہوئی تھی، دونوں کا جھگڑا بھی ہوا تھا، آفتاب کے کپڑے بھی خون سے رنگے ہوئے تھے اور یانا بھی اس سے برآمد ہوا تھا۔ آفتاب سے کڑی تفتیش کے ذریعے اگلو انے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ وہ کہاں ہے، مگر.....

تمام شواہد اس کے خلاف جا رہے تھے۔ اس کے پاس پولیس کے تمام سوالوں کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ ”اس نے صرف میرا سر پھاڑا ہے اور چلی گئی۔ اس کے علاوہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ مگر اس کے کسی بیان کو سچ نہیں مانا جا رہا تھا۔ تمام چیخ و پکار بے اثر رہی۔ موت اس کے آس پاس منڈلانے لگی۔ اس کے جسم کا خون دن بدن خشک ہوتا چلا گیا۔ اسے تختہ دار پر پہنچانے کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ وہ موت سے چند سانسوں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ نیند تو اس کی اڑ چکی تھی۔ خیالوں میں اسے اپنا سر قلم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

کچھ دن بعد لیزا کی لاش کئی ٹکڑوں کی صورت میں ملی۔ ملکی قانون کے مطابق اب اس کا سر قلم ہونا یقینی ہو چکا تھا۔ کیونکہ لیزا کی آخری ملاقات آفتاب سے ہوئی تھی۔ کہنی اسے تختہ دار پر پہنچانے کے لیے بھرپور طریقے سے کیس کی پیروی کر رہی تھی۔ تاکہ چھوٹے ملازمین پر قانون کی حکمرانی اور افسران بالا کا خوف قائم رہے۔

ہوایوں کہ کسی نے اس کے ساتھ جھنسی زیادتی کرنے کے بعد لاش کے کئی ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دیے۔

ایک دن دوپہر کے قریب بلدیہ کا ٹرک کچرا اٹھانے پہنچا تو سوپرنے رسہ سے ڈسٹ بن کو آن لوڈ کرنا شروع کیا۔ کچرا بلدیہ کے ٹرک میں داخل ہونے لگا۔ سوپرنے کچرے کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی قیمتی چیز ہاتھ لگ جائے۔

کچرے کو مشین آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور بوئے خون اٹھ رہی تھی۔ اچانک سوپرنے کو کچرے میں ایک انسانی ہاتھ نظر آیا۔ سوپرنے ڈرائیور کو مشین روکنے کا



دھندلا

ملک عاشق حسین ساجد

غربت کی کوکھ سے نکلی انسانیت کو روندتی ایک حقیقت

مگر یہ سارے دکھ یہ سارے عذاب میں کہاں تک برداشت کروں؟ بچوں کے پیٹ کی آگ نہ اس کی محبت سے بجھ سکتی ہے۔ نہ میرے پیار سے۔

بچوں کو تو دودھ چاہیے، روٹی چاہیے تن ڈھانپنے کو کپڑا چاہیے۔ میں تو جیسے تیسے گزارہ بھی کر لیتی مگر اب تو مسائل بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ چھوٹے بچے کے پاؤں میں جو تانہ نہیں ہے اور بڑے کو فیس ادا نہ کر سکنے کے باعث اسکول سے اٹھالیا گیا۔

گھر داری کا معاملہ تو کبھی نمٹتا ہی نہیں۔ کبھی دال نہیں ہوتی تو کبھی آٹے کا ٹین بجنے لگتا ہے۔ گلی کی ٹکڑ پر جو پیر چوں والا ہے اس نے بھی ادھار دینا بند کر دیا۔ گلہ گس سے کروں؟ شکایت لبوں تک آئے بھی تو کیا ہوگا۔ اس کے پاس کچھ ہوتا تو مجھے بھی دیتا۔ اپنے بچوں کی خواہش پوری کرنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ سچی سجائی دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے میزے بچوں نے بھی ہاتھ پھیلا پھیلا کر ضدیں کی ہیں۔

مگر ہم دونوں ہی مجبور ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ کہنے کو رکھا بھی کیا ہے ہمارے پاس؟

اس دنیا میں غریب ہونا ایک جرم ہے۔ اللہ کسی کو بھی غریب پیدا نہ کرے۔ غربت سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی مصیبت نہیں ہے۔ جو اس دنیا میں غریب پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس جرم کی سزا ساری زندگی بھگتا ہے۔ آہ! غربت انسان کو ایسی بیماری دے جاتی ہے۔ جو ناقابل علاج ہوتی ہے۔

ہم دونوں بھی ایسی ہی بیماری میں مبتلا تھے۔ ہر طرف غربت اور مایوسی کے مہیب سائے تھے۔ کبھی ایک وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ اور کبھی فاقہ..... کبھی گھر کا چولہا نہیں جلتا تھا، تو کبھی کسی بیماری کے لیے دوا نہ تھی۔ کبھی نمک مرچ سے روٹی کھائی جاتی تھی۔ اور کبھی دودن فاقے..... کس قدر مفلسی اور بے چارگی تھی ہمارے گھر میں۔ ہم دونوں ہی زندگی کے عجیب دورا ہے پر کھڑے تھے۔

جہاں سے راستے الگ الگ منزلوں کو جاتے تھے۔ ہم دونوں اپنے آئندہ سفر کے عذابوں سے آگاہ تھے۔ اور شاید خوف زدہ بھی، یہی وجہ تھی کہ رات جگے میں نے کانٹے تھے۔ تو کروٹیں وہ بھی بدلتا تھا۔ فیصلے کی دشواری ہماری راہ میں حائل تھی۔ نہ اسے کچھ سوچنا اور نہ میں کچھ کر سکتی۔ بچے..... بچے..... بچے.....

READING

148

اس روزنچ ہی صبح بشیر نے جیرو کو تیار کرنے کو کہا۔
تو میں جل کر بولی۔

”کیا سوٹ بوٹ لائے ہو اس کے لیے کہ اس کو
تیار کروں؟“
”نہیں نا، ہید! آج جیرو میرے ساتھ جائے گا،
نئے دھندے پر جانا ہے۔“

”اچھا تو یوں کہو کہ مستری نے چھٹی کراڈنی۔
ہائے کتنی مشکل سے یہ کام ملا تھا۔ وہ بھی دیہاڑی ملنے
سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ اب کون سا ایسا دھندہ ہے جس
کے لیے تمہیں جیرو کی مدد درکار ہے۔“ میرے لہجے
میں زہر گھلا ہوا تھا۔

”ناہید بندو کرو یہ بکو اس۔“ بشیر نے جیرو کو بازو
سے پکڑ کر گلی میں دھکیلتے ہوئے کہا۔

”جاد کیہ نکلا آ رہا ہے تو ہاتھ منہ دھو آ۔“ جیرو
حیرت سے باپ کا منہ دیکھنے لگا۔ جو چند لمحے قبل اسے
پیارے چمکار رہا تھا۔

”جاد دھو آ منہ..... دیکھتا کیا ہے، کالک اتر جائے
گی تیری اس سے۔“ میں نے بھی کہا تو جیرو باہر چلا گیا

اور بشیر منہ پھیلائے بیٹھا رہا۔

میں گلی کے نلکے سے چائے والی دیکھی مانجھ کر
اندر آئی تو بشیر جیرو کے بال سنوار رہا تھا۔

”یار! تو تو میرے جتنا ہو گیا۔ ہاتھ بٹایا کر باپ
کا۔ جوان آدی ہے۔ دیکھ آج ہم نئے دھندے پر
جائیں گے۔ جیسے میں کہوں تم ویسا ہی کرنا۔“

جیرو خوش تھا۔ بہت خوش، سارا دن گولیاں کھیتے
کھیتے جیرو کا جی بھی بھر گیا تھا۔ بشیر نے پیار سے اس
کے گال تھپ تھپائے تو وہ بولا۔

”ابا آگس کریم کھلائے گا نا؟“
”چل تو سہی۔“ بشیر نے جیرو کی انگلی پکڑی اور
چلا گیا۔

سارا دن میرے دل میں ہول اٹھتے رہے، بار
بار یہی خیال آتا کہ بھوک اور پریشانی سے تنگ آ گیا

ہوگا، بشیر بھی تو بچے کو لے کر چل دیا۔ نہ چائے پی نہ
کچھ کھنایا جیرو کو بیچ ہی نہ دے کم بخت..... میرا جیرو
بہت ہی چھوٹا ہے، بھوکا پیاسا بچہ دن بھر کہاں مارا مارا
پھرے گا۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں نم ہو جاتیں۔ میں

پھرے گا۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں نم ہو جاتیں۔ میں



READING
Section

میں لڑتی بھی تو کس بات پر۔

بس یہ زہر تو میرے اندر ہی اندر پھیلتا رہا۔ پھر ایک سال ہی گزرا ہوگا۔ کہ شیر و نے دنیا میں آ کر ہمارے گھر میں ایک اور ناخوشگوار اضافہ کر دیا۔ پہلے قرضے ابھی باقی تھے کہ خدا نے ایک اور چیتا چلاتا وجود بھیج دیا۔

بشیر گھر سے دور ہوتا گیا۔ گھر سنبھالنا اس کے بس میں نہ تھا۔ شیر و کا تو بس نام شیر و تھا۔ پھٹے چیتھڑوں میں کلکاریاں مارتا رہتا۔

میں بشیر کو احساس دلاتی کہ اب وہ گھر بار والا ہے۔ شادی کے بعد کی اضافی ذمہ داریاں نبھانا اب اس کا فرض ہے۔ مگر یہ سب یاد دلانے پر میں بشیر کی صورت دیکھنے کو بھی ترسے لگی۔ اس کی بہن سے کہا کہ بشیر اب گھر میں دلچسپی ختم کر بیٹھا ہے۔ تو اس نے بھی مورد الزام میرے مقدر کو ہی ٹھہرایا۔

”ہاں بھابی! یہ بات نہ تمہارے سوچنے کی ہے نہ میرے..... دیکھو ناہید! روزی تو تمہارے مقدر کی ہے۔ اور بچے..... بچے اپنا مقدر ساتھ لاتے ہیں۔“

”باجی! کیا یہ بشیر کے بچے نہیں ہیں۔ بشیر کو ان کا خیال کرنا چاہیے۔“

”اولاد تو مرد کی قسمت ہوتی ہے۔ اب اللہ نے بھائی کے مقدر میں لڑکے دیے ہیں۔ تو روزی رساں بھی اللہ ہے۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔“

اے لو..... بات ہی ختم کر دی باجی نے۔ میں فکر نہ کروں۔ میں جو ماں ہوں۔ میرے بچے بھوکے سوئیں۔ ان کے جسموں پر چیتھڑے جمولیں۔ میں ان کو تعلیم بھی نہ دلا سکوں۔ ان کے پاؤں ننگے ہوں اور مجھے فکر نہ ہو؟

”اللہ میرے..... کرم فرما..... رحم فرما۔“ میں سسک پڑی۔

باجی کی ناگہانی موت نے میری کمر ہی توڑ دی تھی۔ بشیر کو اطلاع پہنچائی تو وہ گھر آیا۔ اونے پونے دوسری بھینس بھی بیچ دی۔ باجی کا کفن دفن ہوا۔ باجی کیا گئی۔ سب کچھ ہی لے گئی اور مجھے سوچنا پڑا۔ واقعی یہ اب تک باجی کا مقدر تھا۔ جو دال روٹی مل رہی تھی۔

دل ہی دل میں سوچتی اور اپنی ماں سے سوال کرتی کہ آخر کیا جلدی پڑی تھی۔

مجھے میرے بیاہ کی، جو یوں آگے دیکھا نہ پیچھے، اور بشیر سے بیاہ دیا۔ پھر خیال آتا کہ وہ چھ لڑکیوں کا کیا اچار مر رہا نہیں۔ جب بشیر کی بہن اماں سے میرا رشتہ لینے آئی تھی تو یہی بتایا تھا کہ گاؤں میں ان کا گھر اور زمین ہے۔

مگر بشیر گاؤں میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے زمین بیچ کر بھینسیں خریدی ہیں، اللہ رکھے دودھ کا کاروبار چل رہا ہے۔ تمہاری لڑکی عیش کرے گی۔ قسمت اچھی ہو بس دعا کرنا۔“ اور میری ماں دعا میں مانگتی رہ گئی۔ مگر قسمت میں جو لکھا تھا وہ میری ماں کی دعا میں بھی نہ بدل سکیں۔

بشیر سے شادی ہوئی تو میں دسویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ اسکول سے گھر آئی تو شام کو لال جوڑا پہنا کر سسرال بھیج دی گئی۔ نہ سکھیوں، سہیلیوں کو پتا چلا۔ نہ ڈھولک کی تھاپ پر گیت گائے گئے۔ بس یوں ہی بشیر اپنی بہن کے ہمراہ آیا، میں نے چائے بنائی، اماں روٹی رہیں۔ بشیر کی بہن نے گھٹیا سا سرخ ساٹن کا سوٹ اماں کو دیا کہ مجھے پہنا دیں۔ پھر میرا نکاح پڑھوادیا گیا، اس رات بشیر نے مجھے بتایا کہ پورے ٹین سوکا بنا ہے میرا سوٹ۔“ اور میں لرز گئی۔

”اتنا بڑا خرچہ.....“ زبان دانٹوں میں دبائے میں اس گھر میں اُجالے بکھیرنے کی کوشش کرتی رہی۔ دودھ تو ہر روز ہی بکتا تھا مگر اس کی چاندنی کبھی بھی ہمارے گھر نہ چمکی۔ بشیر کی دوستیاں یاریاں اتنی گہری تھیں کہ سب کچھ ان میں ہی جا ڈوبتا تھا۔

☆.....☆.....☆

جب میرا جیرو پیدا ہوا تو گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں تھا۔ بشیر نے بھینس بیچ دی۔ کچھ پھپھلا قرضہ اُترا۔ کچھ رسموں رواجوں کی بھینٹ چڑھا۔ چند دن بشیر کے چہرے پر رونق رہی۔ وہ رات بھر دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا۔

مگر یہ کون سی شکایت کی بات تھی۔ نہ وہ جوا کھیلتا نہ بیڑی پیتا۔ نہ اسے حرام خوری کی عادت تھی۔ اب

بشیر کو نہ ہٹا سکی گیا اس کا دوست بہارنی بھوک مٹانے آیا تھا۔ بہارنی غیرت کا سودا کرنے آیا تھا۔ اور آج بشیر جیرو کو ساتھ لے گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون سا کام تھا۔ جس پر میرا جذبہ۔

اس کے آنے کی سوچی ہوئی جواب دے جاتی۔ شام ڈھلے جب بشیر گھر آیا تو اس نے جیرو کو کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ میرا دل جھک سے رہ گیا۔ ”کیا ہوا میرے بچے کو؟“ میرے حلق سے پھنسی پھنسی چیخ نما آواز گئی۔ بشیر نے جیرو کو چار پائی پر ڈال دیا۔ جیرو کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں جو میرا دل چیرے جارہا تھا۔

”ہائے میرا بچہ۔“ میرا دل۔ ”میں نے جیرو کی بلائیں لے ڈالیں۔“ کہاں لے کر گیا تھا تو میرے بچے کو؟ کچھ کھلایا بھی تھا اسے یا سارا دن پیدل اور بھوکا پیاسا پھراتا رہا۔“ بشیر تڑپ گیا اور بولا۔

”ہاں سارا دن پیدل ہی پھرایا ہے میں نے۔۔۔۔۔ بھوکا رکھا ہے اسے۔۔۔۔۔ لیکن ہوں ناں میں اس کا۔۔۔۔۔ بس ایک ٹوٹی گئی ہے ناں اس کی۔ ہاں نہیں کیا مقدر ہے میرا۔“

بشیر بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب وہ رات بھر واپس نہیں آئے گا۔ اسے نہ میری عزت کا اور نہ گھر کا خیال تھا۔ میں نے جیرو سے پوچھا۔

”کیوں رے! کہاں کہاں گھوما تو اپنے ابا کے ساتھ؟“

”ابا تو بس سارا دن بازار میں ہی پھرتا رہا۔ نہ کچھ بولا۔ نہ میری کسی بات کا جواب دیا اور نہ ہی کسی سے کوئی بات کی۔ بس لوگوں کو ہی دیکھتا رہا۔“

”تجھے آکس کریم بھی نہیں کھلائی؟“ میں نے جیرو کو یاد دلایا۔

”نہیں اماں۔۔۔۔۔ ابا کے پاس پیسے جو نہیں تھے۔

اور میں نے بالکل بھی ضد نہیں کی تھی۔ ابا نے پانی پلایا تھا ایک گلی کے ننگے سے۔ اماں ویسے مجھے بہت بھوک لگی تھی۔ مگر میں نے ابا کو نہیں بتایا۔“

بشیر تو باجی کے غم میں جیب ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ غم غلط کرنے کو گھر سے نکلتا تو گئی گئی دن بعد گھر واپس لوٹتا۔ رفتہ رفتہ غم غلط کرنے کے یہ دورے طویل ہوتے گئے۔ میں جو پہلے استحصان پر بندھی بھینس دیکھ کر اپنی ڈھارس بندھائی رہتی تھی۔ اب استحصان خالی دیکھ کر ٹوٹ ٹوٹ جاتی۔ بشیر کا اور ہمارا تعلق بس اتنا ہی رہ گیا تھا کہ بچے اپنے باپ کا نام جانتے۔ محلہ میں میں بشیر کی بیوی کبھی جاتی تھی۔ مگر بشیر ہمارے لیے تسکین اور تحفظ کی ضمانت کبھی نہ بنا۔

☆.....☆.....☆

ایک دن بشیر اچانک گھر آیا اور کہنے لگا۔ ”تاہیدن!“ سامنے والے فلیٹوں پر مزدوری مل گئی ہے۔ پچاس روپے دیہاڑی ملے گی۔ اینٹیں ڈھونے کا کام ہے دیکھو۔ ناں روزی کا مالک اللہ ہے۔ مقدر ہی کی بات ہے۔“

میں سجدے میں گر پڑی۔ اللہ نے ہماری دعائیں سن لی تھیں۔ بے شک اس کے گھر دیر ہے، اندھیر نہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ خوشی کے آنسو۔۔۔۔۔ مگر دو دن بعد ہی بشیر کا چہرہ لٹک گیا۔ بے زاری اس کے ہر عضو سے پگھلتی پڑتی گئی۔

اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اینٹیں ڈھونے کا کام نہیں کر سکتا۔ یہ اس کے بس کا کام نہیں ہے۔ اور پھر وہی بے کاری۔۔۔۔۔ وہی بھوک، وہی فالتے اور تنگدستی۔

بشیر کی لا پرواہی اور غیر ذمہ داری دیکھ کر اس کے ایک مطلب پرست دوست نے ایک دن اس کی غیر حاضری میں آ کر میرے حسن کی تعریفیں کیں اور پھر دعوتِ گناہ بھی دے ڈالی کہ میں اس کی بھوک مٹا دوں تو وہ میری اور میرے بچوں کی بھوک مٹا دے گا۔

اس کے الفاظ میرا سینہ چھلنی کر گئے۔ میں بھوکی شیرینی کی طرح اس پر چھٹی اور اسے گھر سے بے عزت کر کے نکال دیا۔

اس روز میں بہت روئی تھی۔ بلک بلک کر۔۔۔۔۔

تڑپ تڑپ کر کہ غربت اور شوہر کی بے پرواہی نے آج یہ دن بھی دکھا دیا ہے۔ میں باوجود کوشش کے بھی

READING
Section

اوسر دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے بچوں کی بھوک کے خیال نے پریشان کر رکھا تھا۔ جیرو نے بڑی حسرت سے پکوڑوں اور روٹی والی ریڑھی کی طرف دیکھا۔

”ای! پکوڑے آلو والے بھی ہوتے ہیں ناں؟“ میں نے جیرو کی آنکھوں میں بھوک کی تڑپ اور حسرت کی پرچھائیاں دیکھیں تو میرے منہ سے بے اختیار ہو کر ایک دلہوز آہ نکل گئی۔

اُسی لمحے ایک کالج کی بس وہاں آ کر رُک کر اس میں سے لڑکیاں اترنی شروع ہو گئیں۔ جب وہ اکٹھی ہو کر میرے قریب سے گزریں تو بے اختیار ہو کر میرے دونوں ہاتھ پھیل گئے۔ بھوک نے مجھے بھکارن بنا دیا اور پھر میرے ہونٹ بھی الفاظ اُگلنے لگے۔

”اللہ کے نام پر کچھ دے جاؤ بیسیو! میرے معصوم بچے کل سے بھوکے ہیں۔ ان پر رحم کھاؤ۔ اللہ تمہیں پاس و کامیاب کرے گا۔“

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے..... میرے سامنے سکے گرنے لگے۔ دس اور بیس روپے کے نوٹ بھی تھے جو دوسرے لوگوں نے دیے تھے۔

مگر اُن کی نگاہیں میرے بچوں کی طرف نہیں تھیں۔ بلکہ مجھ پر تھیں۔ کچھ آوارہ قسم کے لوگوں نے مجھ پر فقرے بھی کسے تھے۔ نہایت ہی بے ہودہ سے لیکن میں ہر چیز سے بے نیاز ہو کر بھیک مانگتی رہی۔

سڑک کے پاس بشیر بیٹھا بے غیرتی سے ہماری طرف دیکھتا رہا اور جب میں نے اپنے بچوں کو پکوڑے اور کچھ روٹیاں لے کر دیں تو اس کے لیے بھی لے لیں کہ وہ بھی تو کل سے بھوکا تھا۔

اب ہمیں ایک نیا دھندا مل گیا تھا۔ اس رات عرصے بعد ہم نے پیٹ بھر کر روٹی کھائی تھی۔

انگلی صبح ناشتا کرنے کے بعد میں دھندے پر جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ بشیر کے چہرے سے بھی خوشی پھوٹ رہی تھی۔

اس نئے دھندے نے ہمارے مردہ جسموں کو نئی زندگی دے دی تھی۔

☆☆.....☆☆

”ہونہہ..... ابا کو بتایا نہیں۔“ میں اٹھی اور روکھی سوکھی روٹی اسے چائے کے پیالے کے ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

”ارے! پھر تجھے تو بہت بھوک لگی ہوگی۔ لے چل یہ کھالے۔“

”ابا بھی تو صبح کا بھوکا ہی ہے..... کہتا تھا جیرو! کل تجھے اور تیری اماں کو بھی سیر کراؤں گا۔ تو چلے گی نا..... اماں ہمارے ساتھ؟“

جیرو نے بھولے پن میں جانے مجھے کیا کہہ دیا تھا۔ مگر میں سوچوں میں گم تھی۔

☆.....☆.....☆

بشیر انگلی صبح کو آیا تو جیرو بولا۔

”ابا آج اماں بھی چلے گی نا، ہمارے ساتھ۔“

بشیر نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور بولا۔

”چل ناہیدن!“

بہت کچھ اس ’چل ناہیدن‘ میں تھا.....

کیا واقعی؟“ میں نے جلدی سے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ بشیر واقعی سچ کہہ رہا تھا۔

”ہاں ناہیدن! اس بد نصیب کا بوجھل کراٹھانا پڑے گا۔“

میں نے جلدی جلدی برقع اوڑھ لیا۔ شیر و کو بغل میں دبایا اور جیرو باپ کی انگلی پکڑے آگے آگے چل پڑا۔ لاری اڈہ کے قریب پہنچے تو جیرو تھک گیا۔

”ابا میں تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جاؤں؟“

”ہاں بیٹا! بیٹھ جاؤ۔“ بشیر نے کہا۔ جیرو بیٹھ گیا تو میں نے شیر و کو بھی اس کے پاس بٹھا دیا۔ شیر و نے زمین پر بیٹھتے ہی مٹی کھرچ کر کھانی شروع کر دی تو مجھے یاد آیا کہ آج تو ہم چاروں ہی صبح سے بھوکے ہیں۔

میں نے اپنے بچوں پر حسرت بھری اور بیچارگی سے نظر ڈالی اور شیر و کے ہاتھ جھاڑنے لگی جو مٹی سے بھر گئے تھے۔ بشیر نے ہماری تھکن اور بے چارگی کا اندازہ کر لیا۔

وہ ہم سے نظریں جراتا ہوا سامنے سڑک پار گزرنے کے ایک سگریٹ کے کھوکھے پر جا بیٹھا۔ اور ادھر

گرب

نمارہ خان

اب چولہا پھٹنے سے ہی حوا کی بیٹی نہیں ماری جا رہی بلکہ رویوں سے سنگسار کی جا رہی ہے

بچہ جتنے ہوئے جھیلا ہوتا ہے۔ مجھے تو آج تک وہ نام نہیں بھولا شاید اسی لیے میں ابھی تک اپنے بیٹے سے وہ محبت نہیں کر پائی ہوں یا شاید اسی لیے ابھی کہ اس

نجانے لوگ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ماں بننا دنیا کا سب سے پیارا یا انوکھا کام ہے۔ اپنے بچے کی شکل دیکھ کے ماں اپنا سب درد بھول جاتی ہے جو اس نے



READING
Section

تھی میرے تادان کی۔

جیسے تیسے کر کے میرے ماں باپ نے شادی تو کر ہی دی۔ لیکن آگے کا سفر بھی آسان نہ تھا۔ دوسری قسط میں نے اپنی گنی جنی منہ دکھائی سے اپنے ہاتھ روم کے لیے بالٹی لا کے پوری کی۔ جس میں مجھے اپنے اور فاروق کے کپڑے دھونے ہوتے تھے۔ اس کے بعد اس اقساط کا نہ رکنے والا سلسلہ چل دوڑا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں تو فاروق اچھے رہے لیکن بس وہ چند دن میرے لیے آب حیات نہ بن سکے۔

☆.....☆.....☆

میری شادی کے فوراً بعد میرے دیور کی شادی تھی۔ کیا میں نے بتایا تھا کہ میرا ایک دیور بھی ہے، نہیں بتایا شاید بس عادت نہیں رہی مجھے بات کرنے کی تو میں سلیقہ ہی بھول گئی۔ بات کرنے یا بتانے کا۔ خیر میرے دیور کی شادی میں مجھے معلوم ہوا شادی کس طرح ہوتی ہے۔

ایک ہفتے تک تو صرف بارات کے سوٹ کا کلر فائنل ہوتا رہا۔ پھر ولیمہ اور مایوں مہندی کی باری آئی۔ سارا کام ظاہر ہے میرے سپرد تھا۔

اور ان ہی دنوں مجھے اللٹیاں لگی ہوئی تھی۔ سمجھ گئے ہوں گے آپ لوگ کہ میں ماں بننے والی تھی۔ پہلے تو معلوم نہیں ہوا کہ آخر یہ اللٹیاں کیونکر لگ گئیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے میری ان پڑوین کا جو شادی میں ساس کی ہیلپ کے لیے آتی جاتی تھیں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ ہو سکتا ہے کوئی خوشخبری ہو۔“

اب یہ بات میں کس طرح بولوں اور کس سے بولوں۔ شرم سے زبان کٹے جا رہی تھی پر میں بے حال ہو چکی تھی اللٹیاں کر کے۔

شادی کا گھر تھا 100 کام تھے۔ جس میں سر فہرست کھانا ہی تھا۔ کیا آپ اس اذیت اور اکیلے پن کا احساس کر سکتے ہیں کہ ایک 18 سال کی لڑکی جو کہ پہلی بار ماں بننے کے عمل سے گزر رہی ہو اور منہ چہ دوپٹہ رکھ کے کھانا بھون رہی ہو کیونکہ سالن کی

نے میرا دودھ ہی نہیں پیا۔ اگر پیا ہوتا تو لازمی میرے قریب ہوتا۔ میں اس کے ننھے ننھے ہاتھوں سے کھیلتی وہ مجھے اپنی معصومیت بھری آنکھوں سے پٹ پٹ کر کے دیکھتا تو شاید میرے سینے میں دمن ممتا کے سوائے سوتے پھوٹے لیکن صرف 4 دن بعد ہی میرے بیٹے نے اپنا حق چھوڑ دیا اور مجھے ایک بار پھر تکلیف کے سپرد کر دیا۔ قدرت تو باضد رہی کہ بچہ اپنی خوراک لے لیکن میری قسمت میں ہی تکلیف لکھی تھی۔ جب تک میرے بیٹے کے لیے قدرت نے اس کی غذا سکھا نہیں دی میں ایک شدید اذیت میں رہی اور اس تکلیف کا کھانا بھی میں نے اپنے بیٹے کے سر کر دیا۔

پھر اچانک ایک دن میرے بیٹے نے صبح آنکھ نہیں کھولی۔ فاروق بھاگ بھاگ اسپتال لے گئے تو معلوم ہوا۔ رات کسی وقت اس کا دم گھٹنے سے انتقال ہو گیا ہے۔

6 ماہ کے بچے کا دم کیسے گھٹ سکتا ہے آخر..... بے یقینی سی بے یقینی تھی چاروں طرف، لیکن میرا بچہ مجھ سے شکوہ کیے بغیر جا چکا تھا۔

اچھا رکھیں آپ کو میری باتیں ایسے سمجھ نہیں آئیں گی میں شروع سے بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔ گو کہ یہ زرا مشکل ہے لیکن آپ لوگوں کو مجھے ایک جھکی عورت سمجھ کر درگزر سے کام لینا ہوگا۔

کہنے کو تو میں ایک فیملی میں رہتی ہوں لیکن جب میرے شوہر کو ہی مجھ سے بات کرنے کی توفیق نہیں تو باقی لوگوں کو میں کیوں نظر آؤں گی۔

اوہو..... ایک منٹ میں بتاتی ہوں، کیوں میرے میاں کو میں نظر نہیں آتی۔

میرے سر نے فاروق سے پوچھے بنا ان سے میری شادی طے کر دی تھی۔ یہ میرا ایسا گناہ تھا جس کی مجھے خبر نہ تھی۔ کیونکہ برادری کی بات تھی اسی لیے میری ساس اور شوہر مجبور تھے اس شادی کو کرنے کے لیے۔

لیکن اس کا تادان میں نے پوری زندگی بھرا۔ زندگی ہی کیا میری شادی بھی ایک طرح کی سزا تھی۔ میری ساس نے صاف منع کر دیا تھا بارات ولیمہ کے سوٹ

READING

1154

ساس اپنے بیٹے کی شادی میں مصروف، میرے پاس صرف منہ دکھائی کے پیسے تھے جو میں ہاتھ روم کی بالٹی اور ایسی ہی چھوٹی موٹی چیزوں پہ لگا چکی تھی۔ کس طرح آتی اسپتال۔

خیر جیسے تیسے کر کے وہ ٹائم نکل گیا۔ شاید عورتیں ایک ایک بات محسوس کرتی ہوں، انجوائے کرتی ہوں، میرے ساتھ یہ سب ایک ڈراڈنا خواب سا رہا۔ فاروق کا موڈ خراب سے خراب ہوتا گیا۔ میں اب ان کے کام جوگی جو نہیں رہی تھی لی الحال، دل مٹلاتا، عجیب عجیب قسم کی بو آتا، چکر آتا، یہ تو معمول کی باتیں تھیں۔ جب بچے کی حرکت شروع ہوئی تو کچھ الگ سا محسوس ہوا۔ دل چاہا کہ کسی سے اپنے احساسات شیئر کروں۔ مگر کس سے، میں نے اللہ سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔

مجھے معلوم تھا صرف وہ ہے جو کچھ بولے بغیر میری سن لیتا ہے اور میرا خیال بھی کرتا ہے۔ اب مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں جب دل کرتا اللہ سے اپنا آپ شیئر کرتی اپنا دکھ اپنی فیلنگ اپنی خوشی سب کچھ اور سکون پاتی۔ ان ہی دنوں میری دیورانی بھی امید سے ہو گئی۔ اور ایک اور خود اذیتی کا سفر چل پڑا۔ جب ہر ہفتے وہ ڈاکٹر کے جاتی۔ ساس خود اپنے ہاتھوں سے روز دودھ کا گلاس دیتیں اور تو اور فاروق تک نے بھائی کو مبارک دی باپ بننے کی اور اپنی بیوی کا خیال رکھنے کو بولا۔ وہ شاید خود بھول گئے کی وہ بھی باپ ہی بن رہے ہیں۔ اور ان کی بھی ایک بیوی ہے جو انسان بھی ہے۔

ایک دن میرا دیور بہت زیادہ شاپنگ کر کے آیا۔ معلوم ہوا اپنے ہونے والے بچے کے کپڑے لایا ہے۔ مجھے خیال آیا میرا بچہ جو 10، 15 دن میں دنیا میں آنا متوقع ہے۔ وہ کیا پہنے گا۔ ایک شکوہ آمیز نگاہ سے فاروق کو دیکھا۔ شاید ان کو بھی کچھ احساس ہوا ہوگا۔ اگلے دن پورے 5 ہزار نکال کے دیے۔

”جاؤ ای کے ساتھ کچھ کپڑے لے آؤ۔ یہ مردوں کا کام نہیں، عورتیں خود خیال رکھتی ہیں۔“
جواب میں میرے پاس بہت باتیں تھی بولنے

خوشبو سے نمی ستلا رہا تھا۔ اس پہ اس کی ساس یہ بولے کھا کھا کے بیٹہ ہو جائے گا، کم کھاؤ۔ بھوکے خاندان کی ہونہ زیادہ دیکھ کے رہا نہیں جاتا بھی تو المیایں لگی ہیں۔“

اور سب سے بڑھ کے تکلیف یہ کہ کوئی ایسا نہیں جس سے بات کر سکے۔ آدہ کیا اکلا یا تھا۔ خوشی تو ایک طرف نری، جھنجھا بہت ہی، جھنجھا بہت تھی۔

ایک دن جب دیور کے سسرال والے آئے ہوئے تھے میں پنن میں بے ہوش ہو گئی۔ ان ہی مہمانوں میں کوئی ڈاکٹر تھا جس نے سب کو یہ خوشخبری دی کہ اس گھر میں ایک ننھا مہمان آنے والا ہے۔“
لیکن یہ خبر میرے لیے مزید اذیت کا باعث بن چکی تھی۔ ساس کے طعنے مزید بڑھ گئے اور کھانا پکانا تو ایک طرف کھانے کا سوچ کر بھی دل مٹلا جاتا تھا۔

فاروق سے بولا تو جواب ملا۔ ”آدمیوں کو کیا معلوم بھئی امی سے معلوم کرو۔ چلی جاؤ ان کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس۔ آخر انہوں نے بھی تو 2 بچے پیدا کیے ہیں۔“ ای سے مدد مانگنی چاہی تو جواب ملا۔
”میں کوئی ڈاکٹر ہوں، ڈاکٹر سے پوچھو۔ جاؤ اپنے میاں کے ہاتھ۔ شادی والا گھر ہے کدھر تم کو لے لے کے پھروں گی۔“

تو میں بھی چپ کر گئی۔ واقعی شادی ہو جائے پھر ڈاکٹر کے جاؤں گی۔

اب نیا سلسلہ چل پڑا۔ آنا گوند ہوں بھاگ کے الٹی کر آؤں۔ پیڑا بناؤں پھر بھاگوں، بس اسی آوت جاہت میں شادی بھی ہوگی۔

قسمت سے دیورانی اچھی تھی یا مجھ پہ ترس آ گیا تھا۔ ساتھ والے اسپتال لے جا کے نام لکھوا آئی۔ اس پہ مجھے نام ملا بے شرم، بے حیا، خود جا کے نام لکھوا آئی۔ یہ الگ بات ہے ادھر موجود ڈاکٹر نے مجھے لفظوں سے مارنے کی جو کئی تھی پوری کر دی تھی کہ 4 مہینے میں پہلی بار اسپتال کیوں آئی۔

اب میں کیسے بتاتی میرا میاں بس رات کو شوہر ہوتا ہے دن میں میری طرف دیکھتا بھی نہیں اور یہ عورتوں والے ٹاپک ڈسکس کرنا پسند نہیں کرتا۔

ستارے

انگلستان کے مشہور زمانہ سراغ رساں
شرلاک ہومز اپنے معاون اور دوست ڈاکٹر
وائسن کے ساتھ بستر پر محو استراحت تھے کہ
اچانک اُٹھے، اور ڈاکٹر وائسن سے کہا
”ڈاکٹر! تم جانتے ہو کہ آسمان میں کتنے
ستارے ہیں؟“

وائسن نے آسمان کی طرف بہ غور دیکھا،
اور کہا کہ آسمان میں کھربوں ستارے ہیں،
اور لاتعداد کہکشاں ہیں.....“
ہومز نے بات کالی ”بے وقوف.....!“
اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا، ”کوئی ہمارا خیمہ
چوری کر کے لے گیا ہے۔“
مرسلہ ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

ہسپتال کے اسٹاف نے، اندر میرے ساتھ میری
ساس کئیں۔ میں رورو کے بولتی رہی میری ماں کو
بلا دو۔ لیکن، کیونکہ میں چیخیں نہیں مار رہی تھی تو میری
ساس ماننے پہ تیار نہیں کئیں کہ ڈیلیوری ہونے والی
ہے۔

کوئی مجھ سے پوچھتا میں کیسے وہ کرب کا سفر طے
کر رہی تھی۔ ہر پل مرنا ہر پل جینا جیسا تھا۔ اللہ اللہ
کر کے جب ڈاکٹر نے مہر لگادی کہ ابھی 2 یا 3 گھنٹے
باقی ہیں۔ تو میری ساس چپ ہوئیں۔ اس وقت مجھے
شدید سہارے کی ضرورت تھی۔

میرے اللہ نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن
مجھے کسی انسانی دلا سے، انسانی کس کی ضرورت تھی جو
بد قسمتی سے مجھے میسر نہیں تھی۔ شاید میری ماں ہوتی
میرے پاس تو یہ تنہائی اور محرومی اتنی محسوس نہ ہوتی۔

میرے کرب کا یہ سفر رات 12 بجے سے صبح 5
بجے تک جاری رہا اور میں ایک خوبصورت بیٹے کی ماں
بن گئی۔ لیکن کاش یہ کرب کا سفر ادھر ختم ہو جاتا۔
جب مجھے ہوش آیا اور میں نے فاروق سے ملنا

کو۔ مگر میں نے فاروق کا موڈ خراب کرنا مناسب نہ
جانا۔ اور ساس کے پاس آ کے بتایا۔ جواب کیا ملا۔ آہ
ایک اور تیر جگر کے پار ہوا۔

”دیدوں کا پانی ہی سوکھ گیا کیا۔ بے شرم کیسے
اپنے منہ سے بول رہی ہے بچے کے کپڑے لینے
ہیں۔ اللہ کی مار آج کل کی بے حیا لڑکیوں پہ۔“

میں کٹ کے رہ گئی اور سر جھکا کر واپس اپنے
کمرے میں اپنے اللہ سے شکوے شکایتیں کرنے لگی۔
اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر آنے والی لڑکی ایک
جو اکھیلتی ہے۔ شادی کے نام پہ اور جس لڑکی کی شادی
میں ساس یا شوہر کی رضامندی ہی شامل نہ ہو وہ تو
شادی سے پہلے ہی ہار جاتی ہے جیسے یہ جو میں ہار گئی
لیکن مجھے صبر نہیں آتا تھا اس پہ آخر کیوں۔ میری کیا
غلطی اس پورے قصے میں۔

خیر قصہ مختصر مجھے وہ جان لیوا درد شروع ہو گئے
جس کا انعام اللہ نے پاؤں کے نیچے جنت رکھی ہے۔

اُف!! ایسا لگ رہا تھا۔ کوئی خنجر سے کمر سے
پیٹ تک چیرے جا رہا ہے۔ یا اللہ شاید میرا آخری ٹائم
آ گیا۔ برداشت جب ختم ہو گئی تو میں نے فاروق کو
جگایا۔ وہ میرا پسینہ پسینہ چہرہ دیکھ کے خود ہی کچھ سمجھ
گئے۔ اور مجھے لے کر امی کے کمرے کی طرف چل
پڑے۔ وہ 5 قدم یا اللہ وہ تلوار کی نوک پہ چلنا جیسا
تھا۔ میرا پیٹ جیسے کوئی اندر سے چھریاں چلا رہا تھا۔
ساس کا بگڑا منہ دیکھتے ہی میری چیخ منہ کے اندر
ہی کہیں دب گئی۔

اسی شور شرابے میں دیورانی بھی اٹھ گئی اور فوراً
فاروق سے بولی۔

”کہا کر رہے ہیں بھائی جلدی جائیں۔ بھابی کی
حالت تو دیکھیں۔“ میں اس وقت تک دیوار کا سہارا
لے کر نیچے بیٹھ گئی تھی۔ فاروق نے مجھے اٹھایا اور امی
کی طرف دیکھا۔ منہ بسور کے میری ساس بھی چل
پڑیں۔ ان کے ڈر سے میری چیخیں میرے اندر ہی
ایک اور طوفان مچاتی رہیں۔

☆.....☆.....☆

READING کو باہر ویننگ روم میں ہی روک دیا

مزید اکیلی ہوگئی یا یوں کہیے کہ میں مزید اللہ سے باتیں کرنے لگی۔

ایک دن میری آنکھ کھلی تو میں اپنے کمرے کی جگہ کسی کلینک میں تھی۔ معلوم نہیں میرے سسرال والے مجھے ادھر کیوں لے آئے۔ اور فاروق کو فون کر کے بلاتے رہے۔ ویسے مجھے کوئی خاص تکلیف تو نہیں تھی ادھر مگر یہ لوگ میرے پاؤں کو زنجیر سے باندھ کے رکھنے لگے تھے۔ خیر مجھے کیا اچھا ہے میری جان چھوٹی۔ تھک گئی تھی کام کر کے، اب میں تھی اور میرا اللہ میں جتنی مرضی باتیں کرتی اس سے۔ لیکن آج کل میں بہت سونے لگی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے میرے ساتھ۔

کل مجھے میرا بیٹا نظر آیا وہ مجھے بلا رہا تھا۔ میرا بیٹا..... آہ..... میرے جگر کا ٹکڑا..... اب احساس ہوتا ہے اپنے نقصان کا مجھے۔

میں نے کتنی بڑی نعمت کھودی۔ وہ ہوتا تو خالص میرا ہوتا۔ بارتا ان لوگوں کو جو مجھ سے بات نہیں کرتے۔ حساب لیتا ان لوگوں سے بھی جو مجھے کڑوی کڑوی ددائی دیتے ہیں۔ لیکن میں تو اکیلی ہی ہوں۔ جب میرا بیٹا تھا تو اس کی شکل دیکھ کر مجھے غصہ آتا تھا کہ اسی کی وجہ سے میں اتنی تکلیف میں تھی اور اکیلی بھی۔ اسی لیے تو میں اس کے منہ پہ اپنا تکیہ رکھ دیتی تھی۔ وہ دیکھو آگیا میرا بیٹا پھر بلا رہا ہے مجھے..... اب میں تھک بھی گئی ہوں اکیلے رہ رہ کے..... بہت لمبا سونا چاہتی ہوں، اپنے بیٹے سے لپٹ کے۔

”سر سر.....“ فاروق نے آواز پر لپٹ کے دیکھا تھا۔

”جی؟.....“

”سر یہ ڈائری..... آپ یہ بھول کر جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا تھا آپ کو پڑھتے ہوئے۔ آپ پشٹ نمبر 19 کے شوہر ہیں نا۔“ کوئی بات تو نی نرس تھی شاید اور فاروق ہلکے سے سر ہلاتا ہوا بالکل خانے سے وہ ڈائری لے کر شکستہ قدموں باہر نکل گیا تھا۔

☆☆.....☆☆

چاہا تو معلوم ہوا میری ساس نے ان کو ناشتا کرنے گھر بھیجا ہے کہ رات بھر کے جاگے تھک گئے تھے وہ، دوپہر تک میری ای آگئیں تو کچھ جینے کے اسباب ہوئے۔ بیٹا نرسری میں تھا اور میرا دل بھی نہیں کر رہا تھا اس کو دیکھوں۔ رہ رہ کر اپنی اس ایک سالہ زندگی کا موازنہ کیے جا رہی تھی۔ جس کا نتیجہ میرا بیٹا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن مجھے گھر آنے کی اجازت ملی تو امی ادھر سے ہی اپنے گھر چلی گئیں۔ میری ساس کا رویہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ گھر میں وہی معمول تھا۔ فاروق مجھے کمرے تک پہنچانے کے گناگار ہوئے بس۔ پھر وہی میں تھی اور اکیلا گھر۔

میں نے ایک بار پھر اسی خالی کمرے کو اللہ سے آباد کر لیا۔ اپنی ساری فینلنگز اس سے شیئر کی۔ اور بیٹے کے ساتھ ٹائم گزارنے لگی۔

سوا مہینہ کیا پورے 6 مہینے ایسے ہی گزرے۔ چھ مہینوں بعد میرا بیٹا بھی مجھ سے منہ موڑ کر، مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ چلا۔ بلکہ دیورانی بھی اپنے میکے جا چکی تھی۔ ڈیوری کے بعد آئی۔ دیور آفس سے ادھر ہی جاتا تھا رات گئے آتا۔

فاروق آج کل باہر جانے کی تنگ دو دو میں لگے ہوئے تھے۔ ساس سسر اپنے کمرے میں اور میں، میں پورا دن پتا نہیں کیا کرتی رہتی تھی۔ آخر فاروق کامیاب ہو گئے اور کسی کمپنی سے 5 سالہ معاہدہ کر کے باہر چلے گئے۔

دیورانی کے جڑواں بچے ہوئے اس کے ماں باپ نے اس کو اپنے گھر کی انٹیکسی دے دی رہنے کے لیے، کہ جب تک بچے کچھ بڑے نہ ہو جائیں ادھر ہی رہے۔ نہ ساس سر کو کوئی شکایت نہ دیور کو، معاملہ خوش اسلوبی سے منٹ گیا۔

☆.....☆.....☆

فاروق 5 سال بعد بھی نہیں آئے۔ جس کی مجھے پوری امید تھی۔ اور ایک دن ساس جب کسی سے فون پہ باتیں کر رہی تھیں تو معلوم ہوا۔ فاروق نے ادھر دوسری شادی کر لی۔ گرین کارڈ کے چکر میں اور میں

READING
Section

یادگار کرداروں کی ملکہ، ایک بے مثال اداکارہ

صنم بلوچ!

تعارف اور

وہ آئی، اُس نے دیکھا اور فتح کر لیا، ناظرین کے دلوں میں
آج بھی راج سنگھاسن پر بیٹھی وہ اپنا فسوں چھوٹک رہی ہے

صنم بلوچ کو دیکھ کر مجھے پھر سے منی اسکرین کا چارم اپنی جانب کھینچتا محسوس ہوتا ہے۔ معصومہ در شہوار کا کردار ہو یا داستان کی بانو..... یا جڑواں کردار ادا کرتی معصوم لڑکی اور طرار لڑکی..... مارننگ شو ہوسٹ کرتی صنم بلوچ آج بھی روزِ اول ہی کی طرح مقبولیت میں سرفہرست ہیں۔ صنم کی شادی سے پہلے کی ایک یادگار ملاقات میں اپنے قارئین کے روبرو پیش کرنا چاہوں گا۔ پڑھیے اور ضرور بتائیں کہ آپ کو یہ ملاقات کیسی لگی۔

سیرین ہسبانی کا انٹرویو میں نے اس وقت کیا
جب ان کا تعارف شوہزنس کی دنیا سے جڑنے کی
ابتدا ہوئی تھی۔ اقبال انصاری نے
ARY سے سیرین کو اداکاری کی
ایک مختلف مگر مشکل دنیا دکھائی
اور ان کی آنکھوں میں
اتار دئے سمجھا پائل اور
شانہ اعظمی جیسے سینے.....
لیکن سیرین سے گفتگو
کر کے معلوم ہوا کہ وہ کرنا تو
سب کچھ چاہتی ہے مگر اس
کے پاس وقت بڑا محدود ہوتا
ہے اور اس کی وجہ ہے اس کی پی آئی
اے کی ملازمت، جہاں وہ ایئر ہوسٹس تھیں
اور پی آئی اے والوں سے یہ بات چھپا کے رکھنے کی
بڑی اشد ضرورت تھی لہذا اس وقت مجھے بڑی دردناک
حیرانی ہوئی جب سیرین سے بہت اچھی دوستی
ہو جانے کے بعد بھی ان کی تصویروں کا
حصول کسی صورت ممکن نہ ہوا۔ وہ
آنا کانی کرتی رہی ررجوش اور
خواہش مند تو تھی مگر کچھ ایسا
تھا کہ جس کی وجہ سے خوف
دامن گیر تھا۔ اس میں یہ
ایک درخواست بھی شامل
تھی کہ یہ انٹرویو سندھ یعنی
(اندرون سندھ) میں تو نہیں
پڑھا جائے گا؟ لیکن اس کی
تفصیل میں جانے سے گریزاں
سیرین نے بعد میں اس بات کو کوئی اہمیت
نہیں دی مگر بہت سی ایسی باتیں جو صنم بلوچ اپنی



یہ سبرین ہسبانی سے ہوئی گفتگو کی چند سطریں تھیں۔ صنم بلوچ، سبرین کی بہن ہیں اور اپنے چھ بہن بھائیوں میں وہ پانچویں نمبر پر ہیں۔ صنم کو سبرین کو دیکھ کر ہی شوق ہوا اس فیلڈ میں آنے کا، خصوصاً ایکٹنگ کا۔

﴿ آغاز تو آپ نے بھی سندھی چینل سے ہی کیا تھا؟
☆ جی ہاں، میں نے کے ٹی این سے کافی عرصے تک شوز کی میزبانی کرتی رہی اور سندھ میں تو شاید میری شہرت سبرین سے بھی زیادہ ہوئی ہے کیونکہ میں نے کے ٹی این پر زیادہ کام کیا ہے۔

﴿ آپ دونوں سبھی نہیں ہیں؟
☆ بالکل 100 فیصد آپ کو شک کیوں ہے؟

معصومیت میں کہہ نہیں پائیں، وہ سبرین کہہ بھی دیتی ہیں جیسے یہ کہہ آ کر سبرین آپ کو شو بزنس میں آنے کی راہ گزری کیسے؟ یہ تو بڑے بھاری پتھروں سے ڈھانپ دی جاتی ہے۔ نئے لوگوں کے لیے پاؤں لہولہان ہوتے ہیں صرف اسے ڈھونڈ نکالنے میں۔

”اماں کو گانے کا شوق تھا مگر وہ صرف گھر میں گاتی تھیں، محفلوں میں نہیں۔ تو اماں کی کوششوں اور حوصلہ افزائی سے ہمیں اس شعبے میں آنے کی راہ ملی۔ ویسے اماں جب موڈ میں ہوتی ہیں تو ہم سب بہن بھائیوں کو گانا سناتی ہیں۔“

﴿ اتنی اچھی آواز ہے ان کی یا انہیں ماں ہونے کی

جب میں نے سبرین کو ایکٹنگ کرتے دیکھا تو مجھے لگا، وہ زیادہ اچھی طرح

لوگوں میں اپنی شناخت بھی بنا رہی تھیں اور ایک اداکارہ ایک میزبانی کرنے

والی سے زیادہ ذمہ دار اور زیادہ بہتر طور پر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکتی ہے،

اداکاری میں گنجائش زیادہ ہے۔ سبرین نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے

ایک ڈرامے ”کالک“ سے کافی شہرت ملی جو میرا پہلا ڈراما تھا

﴿ آپ بلوچ ہیں وہ ہسبانی؟

☆ بھئی، ہم ہسبانی بلوچ ہیں۔ سبرین کا پورا نام سبرین ہسبانی بلوچ ہے اور میرا بھی صنم ہسبانی بلوچ ہے تو میں نے بلوچ لگایا، انہوں نے ہسبانی لگایا، بس اتنی سی بات ہے۔

﴿ آپ کو ڈر نہیں لگتا؟

☆ ڈر تو بہت لگتا ہے مگر آپ کس ڈر کی بات کر رہے ہیں؟

﴿ بلوچی میں کوئی فلم بھی نہیں آئی اور اب تک کوئی قابل ذکر ہیروئن بلوچ نہیں ہے شو بزنس کی تاریخ میں۔

☆ ہاں مگر اب کچھ سوچوں میں تبدیلی کا عمل شروع تو ہوا ہے۔ بلوچی چینل آ گیا ہے، بلوچی فلمیں ڈی وی

وجہ سے رعایت مل جاتی ہے؟

☆ (ہنستے ہوئے) آپ بھی نا، بال کی کھال نکالتے ہیں۔ آواز واقعی بہت اچھی ہے۔

﴿ کسی سے سیکھا؟

☆ ”ارے کہاں، وہ ہاؤس سگر ہیں۔ بس گھر ہی گھر میں گاتی ہیں۔ شاید ہم ان کی ناتمام خواہشوں کو پورا کر رہے ہیں۔

﴿ مگر آپ دونوں بہنوں میں سے گانا تو کوئی بھی نہیں؟

☆ ہاں، ممکن ہے، کبھی ایسا ہو گا، گانے بھی لگیں، تی الحال تو یہ ہے نا کہ اماں کی فن سے وابستگی کا خواب

اور حورار ہا تو اسے ہم پورا کر رہے ہیں۔

READING
Section

میں سنجی نظر ضرور آئی تھی مگر وہ سب میک اپ کا کمال تھا، اتنی جلدی میں اتنی بڑی قربانی دینے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی لیکن مجھے اس ڈرامے سے بہت حوصلہ ملا لوگوں نے میری ایکٹنگ کو بہت سراہا تو میں باقاعدہ ایکٹنگ کی طرف آگئی۔

مگر آپ کی ڈراما سیریل تو غالباً پہلا چاند تھی؟

☆ جی اصل میں یہی میرا

پہلا ڈراما ہے۔ یہ آفر اور

کردار دونوں مجھے پسند

آئے تھے مگر سنکل

ڈراما کالک ہی تھا جو آن ایئر

بھی پہلے گیا۔ سیریل بننے

میں تو ٹائم زیادہ لگتا ہے تو

کالک میں زیادہ وقت نہیں

لگا اور یوں میرا پہلا ڈراما

سیریل انجم شہزاد صاحب کا

'پہلا چاند' تھا جو مجھے

اداکاری سے جوڑ گیا۔ میرا

لیڈنگ رول تھا میرے

ساتھ طوبی بھی تھی۔ ہم

دونوں کے مرکزی روز

تھے۔

مگر آپ کی معصومیت کا اکثر

ذکر ہوتا ہے تو کوئی ایسا رول

بھی کبھی ملا جس میں معصومیت کو سامنے آنے کی زیادہ

گنجائش رہی ہو؟

☆ جی ہاں یہ بہت مشکل رول بھی تھا۔ سب سے

پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں جس وقت کے ٹی

این پر آئی تو صرف 16 برس کی تھی ایک شاید یہ وجہ بھی

رہی ہو مگر مجھے شاید ایسے ہی روز زیادہ ملے ہیں جن میں

معصومیت سے کام لیا گیا، خصوصاً ہلکے ہلکے مزاحیہ روز،

جن میں چہرے کی ساخت بڑی مددگار ثابت ہوتی

ہے۔ پھر بھی مجھے ایک ڈری سہمی اور مصیبت زدہ لڑکی کا

رول ملا تھا جو بہت مشکل اور واقعی ایکٹنگ کی پہاں

ڈی پر تو بن رہی ہیں۔ لڑکیوں پر کچھ پابندیاں نہیں مگر میرے لیے سب نے اچھے جذبات کا مظاہرہ کیا۔

کے ٹی این سے آپ اچانک غائب ہو گئی تھیں اور جب واپسی ہوئی تو اداکاری میں ہوئی ایسا کیوں؟

☆ اصل میں ہمیں گھر کے ماحول سے بھی یہ بات بہت اچھی طرح سمجھائی گئی تھی کہ پہلے پڑھائی مکمل کرو

پھر کچھ کرنا، تو میں اس وقت انٹر میں تھی اور ڈر رہی تھی کہ پڑھائی کہیں ادھوری نہ رہ جائے۔ مصروفیات کے

بڑھنے سے یہ ممکن بھی تھا، تو میں نے پہلے پڑھائی ختم کی پھر میں واپس آئی۔

کہاں تک پڑھ لیا؟

☆ جی میں نے بی اے کیا ہے۔

اداکاری کا سلسلہ کیسے اور کہاں سے شروع ہوا؟ سوال اب پرانا ہو چکا ہے مگر ہمارے قارئین کے

لیے نیا ہے؟

☆ جی ہوا یوں کہ جب کرتے دیکھا تو مجھے لگا وہ زیادہ اچھی طرح لوگوں میں

اپنی شناخت بھی بنا رہی تھیں اور ایک اداکارہ ایک میزبانی کرنے والی سے

زیادہ ذمہ دار اور زیادہ بہتر طور پر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکتی ہے اداکاری میں گنجائش زیادہ

ہے۔ سبرین نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے ایک ڈرامے "کالک" سے کافی شہرت ملی جو میرا پہلا ڈراما

تھا۔

جس میں آپ کو گنجا ہونا پڑا تھا بقول اس ڈرامے کے ڈائریکٹر عاطف حسین کہ آپ سچ سچ سنجی ہو گئی تھیں۔ آپ نے اداکاری کے لیے پہلے ہی مرحلے

میں بڑی غضب کی قربانی دی؟

☆ ہنستے ہوئے، نہیں یہ سچ نہیں ہے میں ڈرامے

"اماں کو گانے کا شوق تھا مگر وہ

صرف گھر میں گاتی تھیں، محفلوں

میں نہیں۔ تو اماں کی کوششوں اور

حوصلہ افزائی سے ہمیں اس شعبے

میں آنے کی راہ ملی۔ ویسے اماں

جب موڈ میں ہوتی ہیں تو ہم سب

بہن بھائیوں کو گانا سناتی ہیں۔"

صلاحیتوں کا امتحان تھا۔

کہہ اور یہ بھی کہ آپ کے مد مقابل ایک خاتون تھیں وہ بھی بلوچ تھیں یعنی ماہ نور بلوچ؟ ڈرامے کا زیادہ لوڈان کے کاندھوں پر نہیں تھا؟

☆ وہ..... اصل میں وہ ٹائٹل رول کر رہی تھیں مگر مجھے لگتا ہے کہ کردار میرا زیادہ مشکل تھا۔

کہ ”داستان“ ایک ایسا سیریل تھا جہاں آپ کو ہندوستان کی تقسیم سے قبل کا کردار ملا اور رضیہ بٹ کے ناول ”بانو“ کی ڈرامائی داستان میں آپ ہی بانو بنیں؟

☆ جی ہاں مجھے اس رول پر بہت محنت کرنا پڑی۔ میں ویسے بھی محنت سے نہیں بھاگتی اور شکر ہے کہ میری محنت وصول ہوئی، میری ایکٹنگ کو کافی پسندیدگی سے نوازا گیا۔

کہ کسی بھی کردار میں اس کا میٹرازم بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ آپ نے کسی بھی کردار کے اندر باہر کو سمجھنے میں کبھی مدد لی؟

☆ جی ہاں ایک اداکارہ اگر اپنے کردار کو پوری طرح تاثرات کے ساتھ ادا کرنا چاہتی ہے تو اسے مدد لینا ہی پڑتی ہے۔ داستان زیادہ تر لاہور میں شوٹ ہوا تو وہاں اس لیے زیادہ مدد ملی کہ اس طرح کے لوگ بھی کافی تھے پھر ڈائریکٹر نے اسے بڑی گہرائی اور کیرائی سے اسٹڈی کیا ہوا تھا یقیناً یہ ایک مشکل

سجیکٹ تھا۔

کہ اور یہ بھی

Downloaded From
Paksociety.com

ایک سیٹ ہے اور اس پر پہلا۔ دسواں اور بیسواں سین ہے تو سیٹ اور وقت اور بجٹ کنٹرول میں رکھنے سے کردار کے الگ الگ موڈز کو ایک ہی وقت میں شوٹ کیا جاتا ہے۔ ایک اداکار کے لیے زیادہ مشکل حالات ہیں، اس لیے شاید سب اچھی طرح نہیں نمٹ پاتے۔ اور اس سے یہ ایک بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک اداکار کے بسا اوقات چار چار ڈراما سیریلز ایک ساتھ چل رہے ہوتے ہیں۔ ناظرین بے چارے سخت مشکل میں ہیں کہ یہی لڑکی ابھی رو رہی تھی ابھی ہنس رہی ہے؟ ان کا ذہن زیادہ دیر تک کسی کردار کے ساتھ رہ ہی نہیں پاتا۔ اشتہارات تو چونکہ بار بار

عجیب بات تھی کہ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کی اس کہانی میں دونوں مرکزی اداکاروں کا تعلق سندھ سے تھا یعنی صبا قر اور آپ؟
☆ ایک اداکار کہیں سے بھی تعلق رکھے اس نے کردار کس طرح اور کیسا نبھایا، اصل بات یہ ہے اسی سے فیصلہ ہوتا ہے۔

کچھ مگر آج کل تو یہ خرابیاں بہت ہیں کہ کردار کچھ ہوتا ہے اور لب و لہجہ کچھ اس امر کا دھیان کچھ زیادہ نہیں رہا اب؟

☆ نہیں رہا یہ میں مانتی ہوں ڈرامے بن بھی بہت رہے ہیں شاید اس لیے ایسا ہوتا ہے مگر میں سمجھتی

پاکستان میں نہ ماحول ایسا ہے نہ ہی لوگوں میں اتنی برداشت ہے۔ وہ فوراً بات کا بٹنگر بنا صرف بنا لیتے ہیں بلکہ ایک مدت تک اس انسان کو جو صفائی دے بھی چکا ہو اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو یہاں سب بہت احتیاط کرتے ہیں۔ ہر معاشرے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔

دکھائے جاتے ہیں تو ناظرین میں ڈرامے سے زیادہ اشتہارات مشہور ہو جاتے ہیں؟

☆ میرا خیال ہے پوری طرح ایسا نہیں ہے۔ اگر اداکار نے اس مشکل صورت حال سے مقابلہ کیا ہے، تو ناظرین کی بھی ایسی تربیت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی اداکار کو ایک ہی دن یا ایک ہی وقت میں ردنا اور ہنستا ہوا دیکھیں اور دونوں چیزوں کو انجوائے کریں مگر اس معاملے کو ابھی بہر حال کسی نہ کسی صورت میں طے ہوتا ہے۔ مجھے بھی یہ آئیڈیل نہیں لگتا اور زیادہ گہرے اطمینان کے لیے سوچ و بچار جاری رہنا چاہیے۔

☆ آپ کو ملک سے باہر شوٹ ہونے والے ڈراما سیریلز میں غالباً سب سے کم دیکھا گیا ہے بلکہ مجھے تو یاد ہی نہیں کہ میں نے آپ کا ایسا کوئی ڈراما دیکھا ہو اس کی وجہ، آپ جانا نہیں جانتیں؟
☆ میں تو جانے کو ہر وقت تیار ہوں، اصل

ہوں ایسا ہونا نہیں چاہیے، دھیان رکھنا چاہیے یہی کسی اچھے ڈرامے کی خوبی بھی ہوتی ہے اور خرابی بھی۔

☆ آپ اپنے کرداروں کو مطلوبہ محنت اور توجہ دیتی ہیں؟

☆ پوری کوشش کرتی ہوں اسی لیے پہلے میں ایک وقت میں ایک ہی رول کرتی تھی اب ایسا نہیں رہا مگر میں نے اب بھی بہت خیال رکھا ہوا ہے۔

☆ یعنی آپ نے یہ صلاحیت حاصل کر لی کہ ایک کردار میں گھسوا اور دوسرے میں سے نکل جاؤ حالانکہ پہلے وقتوں کے لوگ ایک کردار سے باہر آنے میں کافی دقت لیتے تھے؟

☆ مجبوری ہے پہلے کام کم تھا اب بہت بڑھ گیا ہے۔ پہلے قسط وار کہانی کی اٹھان کے مطابق کردار ادا کیا جاتا تھا یعنی ایک قسط ریکارڈ ہو گئی پوری، پھر دوسری مجبوری ہے اب صورت حال فلموں جیسی بن گئی ہے کہ

☆ بہت مشکل سوال ہے پھر بھی پہلا جواب تو میں
یہی دوں گی کہ ایکٹنگ کسی معمولی رول کو بھی اتنا یادگار
بنا سکتی ہے کہ لوگ اسے کسی بہت اہم یعنی شکل رول پر
فوقیت دے دیں پھر بھی میں اندھی لڑکی کا 'گوئی' بہری
اور ایک ٹو اولڈ کیریئر کرنے کی خواہش رکھتی ہوں۔

یعنی ملکہ، جذبات، اماں وغیرہ سے رولز؟

☆ (ہنستے ہوئے کہا۔) لی وی ڈرامے میں ملکہ،
جذبات وغیرہ کہاں ہوتی ہیں؟ مگر زندگی میں کوئی بھی
ایسا کردار، جو آپ کے دائرہ کار سے یکسر باہر ذرہ
کر کے میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اس میں میرے اندر کی
ادا کارہ کیا کچھ کر پاتی ہے؟

ان دنوں شادیاں بڑی سرعت سے ہو جاتی
ہیں اور ان عمروں میں، جس سے آپ گزر رہی ہیں
خواب بھی دشمن کی فوج کی طرح سمٹے چلے آتے ہیں



کا بڑا شوق ہے مگر جب انہوں نے آپ کے ساتھ ڈراما
بنایا 'کیمسٹری' تو وہ پاکستان میں ہی رہے؟

پتہ چتا نہیں مگر میرا خیال ہے یہ معاملہ کردار پر
انحصار کرتا ہے۔ جس کردار کا بیرونی ممالک میں کسی
لوکیشنز پر کام ہی نہ ہو تو اسے کیوں لے جایا جائے؟ ایسا
تو فلموں میں ہوتا ہے کہ رہتے جھونپڑی میں ہوں مگر
خواب میں گانا سونگ لائنڈ میں فلما لیا تو ڈرامے میں
فلموں جیسی سبوتاہیں ڈرامہ ہی ہوتی ہیں۔

رولز کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟ رول
از خود جاندار ہوتا ہے یا ایکٹنگ اسے جاندار بنا دیتی ہے؟



آپ ہمیں گزر رہی ہیں اس کیفیت سے؟
ہلکا دیسے تو میں ابھی بہت کام کرنا چاہتی ہوں مگر
جو قسمت میں ہوا تو ہو بھی سکتی ہے۔ میں نصیب پر بہت
یقین کرتی ہوں اور اسی لیے اس مرحلے پر میں یہ بھی
کہنے اور بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ یہ شادی
ارٹج ہوگی یا لومیرج؟

یعنی آپ کو کسی سے محبت نہیں؟

☆ پتا نہیں مجھتیں بھی اختیار سے باہر کی چیز ہوتی
ہیں مجھے تو فی الحال ایسی کیفیتوں کا سامنا نہیں ہے۔

اور وہ جو اسکیڈل بنتے ہیں سنا ہے آپ نے
ادا کارہ نور کا پٹا صاف کر دیا؟

READING
Section

ادا کارہ ہے، سنجیدہ کرداروں میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ بہت دیکھ بھال کے رول منتخب کرتی ہے، اس لیے اس کا کام کم نظر آتا ہے۔

زندگی اترتے چڑھتے دریاؤں کی سی کہانی ہے۔ آج بہت اوپر، کل بہت نیچے۔ کیا کوئی بھی فنکار اپنے عروج میں زوال کو سوچ کر اپنا موڈ خراب کرنے کی صلاحیت رکھ سکتا ہے؟ پوچھو تو جواب روایتی ہی ملے گا کہ جی ہاں، ہم سمجھتے ہیں، وقت ایک سا نہیں رہتا۔ حالانکہ وقت نے کہاں جانا ہے؟ صدیوں سے وہیں کھڑا ہے، اگر بدلتا ہے تو انسان اور انسان بے شک خسارے میں ہے، کیوں؟ یہ سوچنے کی فرصت کسے ہے؟ بس یہیں سے شروع ہوتا ہے خسارہ۔ جو منافع کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہیں، وہ یہ اکثر بھول جاتے ہیں کہ زندگی سب کو ایک مرتبہ ہل کے بیچ میں کھڑا ضرور کرتی ہے اور یہ موقع دیتی ہے کہ اسے کہاں سے اترنا ہے؟

صنم بلوچ ابھی رعنائیوں میں پرداز کرتی ہیں، عمر ہی ایسی ہے، تقاضوں کو نبھانا ہی پڑتا ہے۔ ہستی بولتی معصوم سی صنم بلوچ جو 14 جولائی کو نواب شاہ میں پیدا ہوئیں، ان کا اشار کینسر ہے اور ان کا قد پانچ فٹ ساڑھے پانچ انچ ہے۔ وہ گھر میں ”صنو“ کے نیک نیم سے پکاری جاتی ہیں۔ گھر کو بھی اپنی جائے پناہ و سکون و عافیت سے تعبیر کرتی ہیں۔ بقول صنم، گھر آ کر بڑے غضب کا سکون ملتا ہے پھر بھی دنیا کا بھیڑ بھڑکا نہیں برا نہیں لگتا۔ اچھی اچھی تقریبات میں جانے کا شوق ہے اور خوش گپیاں کرنے میں مزا آتا ہے۔ اب یہ عجب معاملہ ہے، بندہ ایک جیسے ماحول میں تو کبھی ہمیشہ کے لیے نہیں رہ سکتا۔ قید تو ایسی بھی ہوتی ہے کہ ہجوم ہو اور آپ اس میں زور زبردستی گھرے بیٹھے ہوں۔ من سے کرنے کو ملتے سب کام، تو انسان روز آسمانوں اور نامعلوم جزیروں کی سیر کرتا صورتیں کتنا بھی دھوکا دیں، ان پر اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے اور صنم تو کافی سے زیادہ لائق اعتبار ہیں۔ بڑی پیاری سی انسان ہیں، بس لوگوں کی نظریں میل سے بھری نہ ہوں تو زندگی جینے کی چیز ہے۔ صنم بے خبری سے جی تو رہی ہیں، یہ بھی رمز ہے زندگی کا۔

☆☆.....☆☆

☆ خدا نہ کرے کہ میں کسی کا بھی پتا صاف کروں۔ بڑی فلمی زبان میں کیا آپ نے یہ سوال؟
(بات کاٹ کر۔) ادا کارہ فلمی تھی مقابل آپ کے اس لیے، نور فلمی ادا کارہ کی شہرت سے مالا مال ہیں؟
☆ اس کا جواب میں دے چکی ہوں، میں اس معاملے سے کوسوں دور ہوں۔ رہی کسی کا پتا صاف کرنے والی بات تو میں فاروق مینگل سے ملی لیکن اس طرح جیسے کوئی بہن اپنے بھائی سے ملتی ہو، مجھے امید ہے کہ اس موضوع پر اب مجھ سے کبھی کوئی سوال نہیں کرے گا۔

☆ شو بزنس میں اسکیڈلز تو اس پر دیشن کا حصہ ہیں، یہ تو بڑے نصیب کی بات ہے کہ پاکستان میں بہت کچھ منظر عام پر نہیں آتا ورنہ انڈیا میں تو سب کی خبر سب کو پتا ہوتی ہے؟

☆ آپ صحیح کہتے ہیں مگر پاکستان میں نہ ماحول ایسا ہے نہ ہی لوگوں میں اتنی برداشت ہے۔ وہ فوراً بات کا ہنگامہ بنا لیتے ہیں بلکہ ایک مدت تک اس انسان کو جو صفائی دے بھی چکا ہو، اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو یہاں سب بہت احتیاط کرتے ہیں۔ ہر معاشرے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔

☆ فلم میں سب سے زیادہ ہی ٹی وی ادا کاروں کا خواب ہوتا ہے، آپ دیکھتی ہیں ایسے خواب؟

☆ پاکستان میں معیاری فلمیں نہ ہونے کے برابر ہیں جیسے شعیب منصور کی فلمیں۔ انڈیا میں فلمیں زیادہ ہوتی ہیں مگر وہاں دلگہری کے بغیر فلم مکمل ہی نہیں ہوتی اور میں کوئی دلگہری دار تو کیا، دلگہری فلم بھی نہیں کر سکتی۔ میں چاہتی ہوں، کوئی ایسی فلم ہو جسے نہ صرف لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر دیکھ سکتے ہوں بلکہ وہ پوری طرح صاف ستھری ہو جیسے ”خدا کے لیے“۔

☆ کام زیادہ آپ کرتی ہیں مگر ایکٹنگ میں اب بھی لوگ سبرین کو زیادہ اچھی ادا کارہ مانتے ہیں۔ آپ کو کیسا لگتا ہے یہ سن کر؟

☆ بہت اچھا، سبرین بہت ہی مہنتی ادا کارہ ہے، ان میں خدا داد غیر معمولی حساسیت ہے، میں خود بھی سبرین سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔ وہ واقعی بڑی کمال

توشہ خاص، خوان ہفت رنگ حکایتیں

مختصر مختصر، خوش بیاں، فرحت سراں، زہر کار، عبرت اثر حکایتیں

کراچی سے پہلی حکایت

دوسری بیوی

کنول عمران خان

شاید سحرش سے دیوانگی کی حد تک پیار کرنا ہی میرا گناہ بن گیا تھا جو وہ.....

بہن شادی شدہ اور خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ ہماری والدہ بہت سادہ اور نیک طبیعت کی مالک تھیں۔ انہوں نے ہر بیٹے کی شادی اس کی پسند سے کی کیونکہ بیٹے خوش تو ماں خوش، اس لیے تمام بیٹے اور بہنیں بھی ماں پر جان چھڑکتے تھے۔ میرا بصر آخری تھا اس لیے سحرش میری زندگی میں آسانی سے آگئی۔

سحرش کو پا کر میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھنے لگا۔ جس نے محبت کو پالیا ہمیں پیار کے جھولے میں جھولتے نہ جانے کسے جو وہ سال گزر گئے۔ اور اس دوران ہماری ایک ہی بیٹی ہوئی جو کہ ہمارے دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ سحرش جا ب کرتی تھی ٹیچنگ کی جو کہ اس نے شادی کے بعد بھی جاری رکھی۔ اور ساتھ ہی وہ ہول سیل ریٹ پر کپڑے اٹھاتی اور ارد گرد کی بلڈنگز اور جانے والوں میں سیل کرتی تو اس کا یہ کام بھی اچھا چل پڑا۔

میں بھی ایک نجی ہاسٹل میں کام کرتا تھا، ہماری گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ گھر بھی ہمارا اپنا تھا۔ یوں سمجھیں کہ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ مگر کہتے ہیں نا کہ خوشیاں بھی قسمت والوں کو اس آتی ہیں تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے پتا بھی نہ چلا اور میرا خوشیوں بھرا آشیانہ پل بھر میں ختم ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ عورت گھر بناتی بھی ہے اور گھر بگاڑتی بھی ہے۔ یہ جملہ ہم نے زندگی میں کافی دفعہ سنا مگر کبھی غور نہ کیا اور آج میری زندگی اسی جملے کی عکاسی کرتی ہے۔ جی ہاں آج میں بھی یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میرا گھر بگاڑنے والی ایک عورت تھی۔ اور وہ کوئی غیر نہیں میری اپنی بیوی، میری جان، میری محبوبہ اور میرا پہلا پیار تھی۔ آپ کو حیرت ہو رہی ہوگی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے مگر میرے ساتھ ہوا۔ ہر بار مرد ہی ظالم اور پتھر دل نہیں ہوتے بعض عورتیں بھی کبھی کبھی ایسا کام کر جاتی ہیں کہ مرد جسے کافی بہادر سمجھا جاتا ہے، مضبوط اعصاب کا مالک اس کو بھی رونے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ چلیں میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔

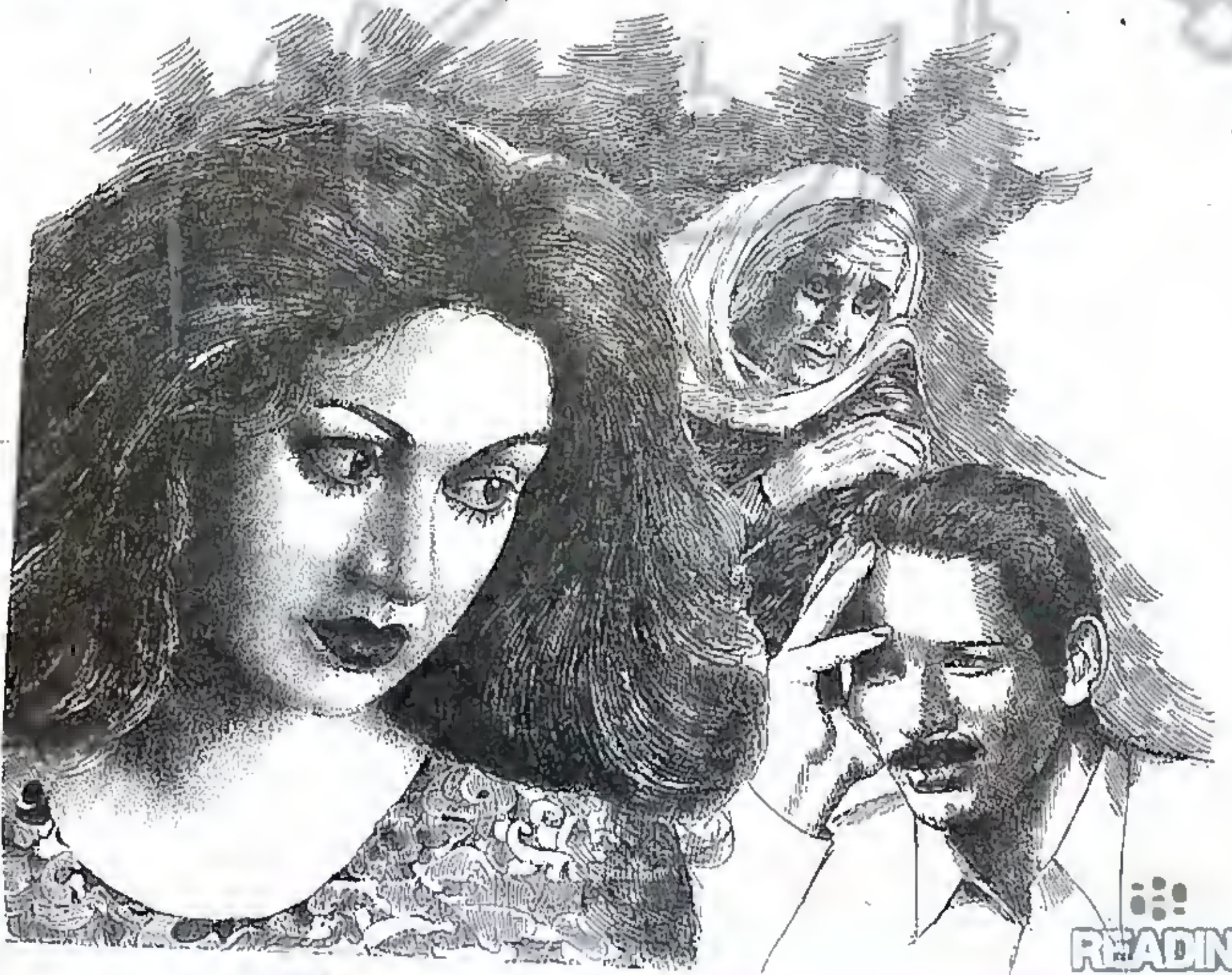
سحرش میرا پہلا پیار تھی ہمارا پیار ایسے ہی ہوا جیسے ساری دنیا کو ہو جاتا ہے۔ مگر ایک دوسرے کو سمجھنے اور جاننے میں اور پھر شادی تک آٹھ سال کا عرصہ بیت گیا، یعنی ہمارا افسیر آٹھ سال چلا اور ان 8 سالوں میں ہم ایک جان دو قالب ہو گئے۔ ایک دوسرے کے بغیر رہنے کا تصور محال تھا۔ اور پھر بغیر کسی ظالم سماج کے ہماری شادی بھی آسانی سے ہو گئی۔ کیونکہ ہم سات بھائی اور ایک بہن تھے۔ والد وفات پا چکے تھے۔ تمام بھائی اور

کپڑے باہر کو ابل رہے تھے۔ کچھ بھی ہو سحرش کم از کم اپنی الماریوں کو اس طرح نہیں رکھتی تھی۔ میں کپڑے الماری میں رکھنے لگا مجھے لگا۔ شاید جلدی میں گئی ہوگی تو ایسے ہی چھوڑ گئی ہوگی۔ بہر حال میں نے جیسے ہی کپڑے الماری میں رکھے تو وہاں سے ایک لفافہ نیچے گر پڑا۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا اٹھایا اور وہ کھلا ہوا تھا۔ مارے تجسس کے اُسے کھول کر پڑھا تو میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ وہ ایک عدالتی نوٹس تھا۔ بلکہ ایک بم تھا جو کہ پھٹا اور میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔

وہ ایک عدالتی خلع نامہ تھا۔ میرا تو دماغ گھوم گیا یہ سب کیا ہے؟ سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ کچھ سمجھ نہ آئی تو جیسے تیسے گھر کو لاک کر کے اپنی ای کی طرف بھاگا۔ وہاں جا کر بہن کو فون کیا تو وہ بھی آگئی۔ مجھے تو ہوش ہی نہ تھا بلکہ میں تو ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ بہن نے نوٹس سے نمبر دیکھ کر فون کیا تو پتا چلا کہ سحرش نے عدالت میں خلع کا نوٹس دے رکھا تھا۔ اور الٹا سیدھا

ہوا کچھ یوں کہ کچھ وقت سے سحرش کی طبیعت چڑچڑی سی رہنے لگی۔ وہ اب اکثر مجھ سے ذرا ذرا سی بات پر اُلجھ جاتی۔ میں کافی پریشان ہوتا اور یہ سوچ کر کہ کام کی پریشانی ہوگی نظر انداز کر دیتا۔ مگر آئے دن یہی حال رہنے لگا اور ایسا لگنے لگا کہ جیسے اُس کے دل میں میری محبت ختم ہو گئی ہے۔ نہ وہ مجھ سے زیادہ بات کرتی اور نہ گھر پر توجہ دیتی۔ اور اگر میں کوئی سوال کرتا تو کام کی زیادتی یا پھر کوئی اور بہانہ بنا کر وہ جلدی ختم کر دیتی مگر میرے دل کو سکون نہ ملتا۔ اور دل میں دعا کرتا کہ کاش ایسا ہی ہو اور سب ٹھیک ہو جائے۔ مگر اب سب ٹھیک ہونے والا نہ تھا۔

ایک دن جب میں گھر آیا تو سحرش اور انمول (ہماری بیٹی) دونوں گھر پر نہ تھیں، میں سمجھا سحرش کسی کام سے گئی ہوگی آجائے گی۔ مگر حیرت کا جھٹکا مجھے تب لگا جب میں اندر بیڈروم میں لیٹنے کی غرض سے گیا۔ کمرے کی حالت ابترا تھی۔ الماریوں کے دروازے کھلے تھے اور



READING
Section

پروانہ تھا میری موت کا لکھا تھا۔

”تمہیں پا کر مجھے لگا کہ شاید میں نے سب پایا۔ مگر شاید وہ میری غلطی تھی۔ کیونکہ جب میں نے اُسے دیکھا تو لگا کہ اصل منزل تو یہ ہے ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے تم کو پیار کیا تھا مگر اُسے تو مجھے دیکھتے ہی عشق ہو گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی اُس میں کہ اُس کے آگے تمہارا پیار اور سب کچھ بے معنی لگنے لگا۔ اور میں بے اختیار اُس کی طرف کھینچنے لگی۔ میں نے کافی مرتبہ چاہا کہ تمہیں بتا کر تمہاری زندگی سے علیحدہ ہو جاؤں مگر تمہاری محبت دیکھ کر ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ مگر یہ سچ ہے کہ اب میں تمہارے ساتھ اور نہیں رہ سکتی اس لیے میں نے عدالت میں حلع کا مقدمہ دائر کر دیا کیونکہ مجھے اُس سے شادی کرنی تھی اور اس کے لیے طلاق یا حلع چاہیے تھا۔ عدالت کی طرف سے تمہارے نام جو بھی نوٹس آیا پیشی کا وہ میں پھاڑ کر پھینک دیتی تھی کیونکہ میں جانتی تھی تم کسی بھی قیمت پر مجھے چھوڑو گے نہیں۔ اور اس طرح تمہاری طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہونے کی بنا پر عدالت نے فیصلہ میرے حق میں دے دیا۔ اور ہاں یہ گھر بھی میں نے سچ دیا ہے۔ کیونکہ تمہیں یاد ہو گا کہ تم نے یہ میرے نام کر دیا تھا۔ اور سب پیرز بھی میرے پاس تھے۔ ایک ماہ بعد اس کے اصل مالک آ کر قبضہ لے لیں گے۔ کیونکہ آگے زندگی گزارنے کے لیے مجھے پیسے چاہیں۔ انسان پیار میں خود غرض ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں بھی ہو گئی اور زیور سب میری بیٹی کا ہے اور مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ جب تم یہ خط پڑھ رہے ہو گے میں اس ملک سے دور جا چکی ہوں گی۔ اور ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

خط سن کر سب ہکا بکا رہ گئے۔ میرا دل پھٹ رہا تھا۔ زیور پیسہ مجھے کسی چیز کی فکر نہ تھی مجھے اپنی بیٹی یاد آنے لگی اور میں رونے لگا۔ سب مجھے سنبھالنے لگے مگر وہ تسلی بھی کیا دیتے کہ یہ غم بھی کوئی کم نہ تھا۔ سب اُسے برا بھلا بول رہے تھے کہ اُس نے تمہاری قدر نہ کی۔ مگر میں کیا کروں۔ یہ سب جاننے کے بعد بھی نہ جانے کیوں دل میں اُس کے لیے نفرت نہ تھی پتا نہیں کیوں۔ شاید یہ میرے پیار کی انتہا تھی۔

امی اور آپا سب کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

بول کر خود کو مظلوم بنا کر پیش کیا تو عدالت نے اُن کے خاوند کو پیشی پر بلوایا مگر اُن کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے پر عدالت نے سحش کو آ خر حلع دے دی۔

یہ سب سن کر تو ہمارے پیروں سے زمین نکل گئی کہ اتنا سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا۔ مگر نہیں یہ سب اتنی جلدی نہیں ہو سکتا۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ سحش کو میں نے تمام شدتوں سے چاہا تھا۔ وہ میرے ساتھ ایسا کرے گی کیوں؟“

میں غم و غصے میں کانپنے لگا پھر مجھے اُس کی بے پروائی یاد آئی کہ کافی ٹائم سے وہ مجھ سے اُجھسی اُجھسی رہنے لگی تھی۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں۔ کہاں جا کر اُسے ڈھونڈوں اور پوچھوں کہ اے ظالم عورت! آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تصور تھا میرا؟“

مجھے ایک دم سے بیٹی کی یاد آ گئی تو میں بے اختیار رونے لگا۔ اُس وقت میری بہن نے ہمت سے کام لیا اور بولی۔

”اٹھو یہ وقت رونے کا نہیں۔ ہمیں تمہارے گھر جانا ہے۔ وہاں جا کر دیکھیں شاید کوئی سرائل جائے اُس قیامت کا۔“

میں گرفتہ دل اٹھا ہی اور بہن کے ساتھ واپس اپنے گھر آ گیا۔ گھر ویسا ہی ویران پڑا تھا۔ میں تو جا کر صوفے پر گر سا گیا۔ مگر بہن نے ہمت کی اور تمام الماریاں اور درازیں چیک کیں کیونکہ اُن کا کہنا تھا کہ سحش کچھ نہ کچھ ایسا ضرور چھوڑ گئی ہوگی۔ کوئی خط وغیرہ پھر زیور والی دراز کھولی تو سب خالی تھا۔ تمام پیسہ اور زیور کچھ بھی وہاں نہیں تھا۔ سحش کا کافی زیور تھا۔ اور پھر میری نظر ٹی وی پر پڑی وہاں ایک صفحہ پڑا تھا۔

میں فوراً وہ پڑھنے لگا جیسے جیسے خط پڑھتا گیا میری آنکھوں میں آنسوؤں کی چادر تن گئی اور آخری سطر پڑھتے ہی خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور ساتھ ہی میں بھی گر کر بیہوش ہو گیا۔ امی اور آپا نے مجھے بڑی مشکل سے اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ آپا نے تمام بھائیوں کو فون کر کے بلا لیا کیونکہ یہاں تو قیامت آ کر گزر گئی تھی۔ اور حالات اب امی اور آپا کے بس سے باہر تھے۔ بھائی مجھے ہوش میں لانے لگے۔ میرے دماغ کو گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ آپا نے فوراً خط اٹھایا اور پڑھنے لگی۔ خط کیا تھا

ہمت نہیں۔“
مگر میرا دل نہ مانتا تھا۔ جسے میں نے دل کی
گہرائیوں سے چاہا وہی میری نہ بن سکی تو پھر؟ بس یہ ہی
بات بار بار سوچتا تو وہ سمجھاتیں۔

”بیٹا پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔“
مگر پھر بھی میرا دل نہ مانتا۔ اسی طرح ای کوٹالتے
ٹالتے ایک سال اور گزر گیا۔

اب امی بالکل بستر پر پڑ گئی تھیں۔ انہیں میرا ہی غم
کھا رہا تھا، اندر ہی اندر۔ اولاد کا غم بھی بہت عجیب ہے
اولاد ماں کی وجہ سے اپنا غم دل میں چھپا کے رکھتی ہے مگر
ماں اپنی اولاد کے غم میں ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اب امی بار
بار یہی کہتی رہتی تھیں کہ شادی کر لو بیٹا۔“

امی کھانا بھی نہیں بنا سکتی تھیں کمزوری کی وجہ سے تو
بھابھیاں بنا کر بھیجتی تھیں۔
”بیٹا بھوگھر آ جائے تو کھانے پینے کی محتاجی بھی ختم
ہو جائے گی۔“

بس امی کی وجہ سے میں نے ہاں کر دی اور میری ہاں
نے گویا امی کے مردہ بدن میں جیسے جان ڈال دی ہو۔

☆.....☆.....☆

بہن کی کوشش اور امی کی دعاؤں سے مجھے ایک اچھی
لڑکی مل گئی۔ بہت سادگی سے نکاح کی رسم ہوئی۔ اُسے
سب کچھ پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ کیونکہ میں اس رشتے کی
بنیاد جھوٹ پر نہیں رکھنا چاہتا تھا۔
وہ بہت سمجھدار اور سنگھڑ لڑکی تھی۔ اُس نے مجھ سے
اس بارے میں کوئی سوال جواب نہ کیا اور آتے ہی گھر کو
سنجھال لیا۔

میری دوسری بیوی سعدیہ جتنی خوبصورت ہے۔
اُس سے کہیں زیادہ نیک میرت ہے۔ اُسے پا کر میں
سحرش کو بھول گیا۔ مگر بیٹی تو آج بھی یاد آتی ہے کیونکہ وہ
میرا خون تھی تو آنکھیں بھر جاتی ہیں۔ سعدیہ نے آ کر
میری بکھری زندگی کو سمیٹ لیا۔

بس اب اللہ سے یہی دعا ہے کہ میری بیٹی جہاں ہو
ہمیشہ خوش آباد رہے اور اللہ میرے اس آشیانے کو
آندھیوں سے محفوظ رکھنا (آمین)۔

☆☆.....☆☆

الماری سے گھر کے سیل کے پیپرز بھی مل گئے۔ میں گھر کو
دیکھنے لگا۔ جہاں آج سے پہلے خوشیوں کی بازگشت سناکی
دیتی تھی آج وہی دیواریں میری بربادی کا تماشا دیکھ رہی
تھیں۔ امی مجھے اپنے گھر لے آئیں کہ تم میرے ساتھ رہو۔“
ویسے بھی امی اکیلی تھیں اور تمام بھائی الگ الگ
تھے مگر قریب ہی کے گھروں میں رہتے تھے اور ہر روز
آتے جاتے تھے۔

☆.....☆.....☆

میں اب امی کے ساتھ رہنے لگا۔ مگر میں یکسر بدل
گیا۔ ہر وقت اداس چپ چاپ گھنٹوں بیٹھا سوچتا رہتا
کہ کہاں مجھ سے کوئی غلط ہوئی۔ کہاں کوئی کمی رہ گئی
میرے پیار میں۔ یا اللہ! مجھے کس بات کی سزا دی۔ شاید
سحرش کو بے دریغ پیار کرنا ہی میرا جرم بن گیا۔ سحرش نے
مجھے میری بیٹی سے دور کر دیا۔ اُس شخص نے ایسا کیا جادو
کر دیا کہ تم 15 سالہ رفاقت کو چھوڑ چھاڑ کر چلتی بنیں۔“
امی مجھے دیکھ دیکھ کر گڑھتی رہتیں اور روتے ہوئے
سحرش کو بددعا میں دیتیں کہ اُس نے میرے بیٹے کو نکال
کر دیا۔ اس کا گھر برباد کر دیا۔“

امی کی طبیعت آئے دن خراب رہنے لگی۔ تمام بھائی
آتے میری دل جوئی کرتے مگر میرا دل نہیں لگتا تھا۔ بھائیوں کو
اُن کے بچوں اور بیویوں کے ساتھ خوش دیکھتا۔ سحرش اور انمول
شدت سے یاد آتے۔ بیٹی کو یاد کر کے پوری پوری رات روتا
رہتا۔ پتا نہیں کیسی ہوگی میری بیٹی۔ کس حال میں ہوگی؟ میں
نے اپنے تعلقات چلا کر کالی پتالگا مگر دونوں کا کوئی پتا نہیں
چلا کہ انہیں آسمان کھا گیا یا زمین نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ روتے دھوتے ایک
سال گزر گیا۔ میں بھی معمول کی زندگی میں آ گیا۔ جاب
پر جاتا تھا۔ کام میں لگا رہتا تھا مگر دل میں جو آتش فشاں
پھٹا تھا اس کا لاوا ابھی بھی اپنی تپش سے مجھے جلاتا تھا مگر
امی کے سامنے خود کو نارمل رکھتا۔ اب امی مجھے دوسری
شادی کا کہتی رہتی تھیں۔

”بیٹا میری زندگی کا کیا بھروسا ہے۔ تم اپنا گھر
سالو۔ جب تک اکیلے رہو گے یادیں پیچھا پیچھا چھوڑیں
گی۔ میری بوڑھی آنکھوں میں اب اور دکھ دیکھنے کی

میشا

رضیہ خالد

جوشی کی بات سچ ثابت ہوئی اور میشا.....

اوپرچی بیچی گل پوش پہاڑیوں کے دامن میں پھیلے ہوئے طویل و عریض میدان میں یہ عمارت اک وقار سے ایستادہ تھی۔ چاروں طرف قدرت نے حسین انمول خزانے لٹائے ہوئے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں اس رہائشی عمارت کی تعمیر کسی حسن پسند ہی کا انتخاب ہو سکتی تھی۔ چاروں طرف حسن ہی حسن تھا۔ یہ نطہ زمین، قدرت کی خوبصورتی کا ایک حسین نمونہ تھی۔ آس پاس دور دور تک کوئی دوسری عمارت نہ تھی۔ اس پہاڑ کا نام ٹیگور بل تھا۔ کیونکہ اس پہاڑ پر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنا ایک بنگلہ بنوایا تھا اور ایک مندر بھی، جو کچھ اونچائی پر تھا۔ سبزے کا خمیلیں فرش رنگ برنگے پھول، لہلہاتی بئلیں، جھومتے درخت ہر طرف رعنائی ہی رعنائی تھی۔ عمارت کے چاروں طرف بہت زمین تھی۔ بلکہ اسے فارم ہاؤس کہنا بجا ہوگا۔ طرح طرح کے پیڑ پودوں سے ڈھکی زمین پر ہر طرح کے پھل دار درخت تھے۔ موسم کا ہر پھل گھر سے مل جاتا تھا۔ کپاؤنڈ کے اندر ایک بڑا تالاب بھی تھا۔ جہاں سے مچھلیاں نکالی جاتیں۔

اکبر صاحب اس عمارت کے مالک تھے۔ گاؤں میں بھی ان کی بہت زمینیں تھیں۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ انہیں وفات پائے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ لیکن ان کی بیوہ رضیہ بانو ابھی حیات تھیں۔ ان کی عمر

تقریباً 70 سے تجاوز کر چکی تھی۔ سرخ سفید چہرے اور سفید بالوں نے ان کے دبدبے اور وقار میں اضافہ کر دیا تھا۔ اکبر صاحب اور ان کی بیگم دونوں ہی پرانی روایات کے حامل تھے۔ زمانہ بدل چکا تھا، ڈھنگ بدل چکے تھے، ذہن بدل چکے تھے لیکن ان کے سوچنے کے ڈھنگ اب تک وہی پرانے تھے۔ ان کے تین بیٹے اور سات بیٹیاں تھیں۔

رضیہ بیگم کی پھلاواری بہت شاداب تھی۔ سب کی شادیوں سے فارغ ہو چکی تھیں۔ پھولوں اور کھلتی کلیوں اور پھوٹے شگوفوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی رہتیں۔ بچوں کی اولادیں انہیں جان سے پیاری تھیں۔ لیکن بڑی بیٹی جو زیادہ دور نہیں رہتی تھی۔ ان کے بچے انہیں بہت زیادہ عزیز تھے۔ ان کے بچے بھی اسکول جانے کی عمر سے پہلے زیادہ تر انہی کے پاس ہوتے تھے۔ اس لیے بھی انہیں زیادہ عزیز تھے۔ اس ماحول میں ہر دن عید اور ہر رات شب برأت تھی۔ ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ چاروں طرف حسن ہی حسن تھا۔ اس ماحول میں جہاں خوشیوں کے جھرنے ٹھاٹھیں مارتے تھے۔ جہاں قہقہے طوفانوں کی صورت میں اٹھتے تھے۔ جہاں خوشیوں کے سوا کوئی نئی سایہ فلکن نہ تھی۔ آج اسی گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ رشتہ دار شہر سے اور دوسرے شہروں میں سے آ رہے تھے۔ ہر تھوڑی دیر بعد ایک سواری اترتی۔ گھر

کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

”اس بچی کے پاس تو سے (وقت) ہی نہیں۔“ وہ یہ سن کر کچھ پریشان ہوئی تو میرا نے کہا۔ ”جو کسی بچہ رہا ہے۔ تم ایک مسلمان لڑکی ہو۔ جیسے ہی تمہاری تعلیم مکمل ہوگی گھر والے تمہاری شادی کر دیں گے۔ پھر تمہارے پاس وقت کہاں ہوگا۔ تم تو اپنے پیارے گھر سے جاؤ گی۔“

جوئی کا کہنا صحیح ثابت ہوا۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کی شادی کے بارے میں سوچا جانے لگا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جانے والا تھا۔ اس کے والدین بھی امریکہ میں تھے۔ یہ دونوں کی پسند کی شادی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو یونیورسٹی سے جانتے تھے اور پسند کرتے تھے۔ میٹھا کے والدین کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ کیونکہ دونوں کے والدین بھی ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ امر خود بھی لہذا لڑکا و جیہہ، خوبصورت اور بہت ہی پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ جتنا خوبصورت تھا، اتنا ہی خوب سیرت بھی تھا۔ وہ جس سے بھی ملتا اس کو اپنا گرویدہ کر لیتا۔ اس کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔

ڈاکٹر کے گھر والے اس شادی سے خوش نہ تھے۔ اس کی بوجہ کچھ اور نہیں بلکہ ’تاک‘ کی وہ رسم تھی جو ہندوستان میں

میں پیر رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ ہر طرف سے رونے اور آہ و بکا کی آواز آرہی تھی۔ لوگ دو ماہ قبل کی خوشیوں کو یاد کر کے رو رہے تھے۔ کون جانتا تھا کہ جہاں دو ماہ پہلے اتنی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ آج وہ گھر ماتم کدہ بن جائے گا۔ وہ بچی جو دو ماہ قبل یہاں سے رخصت ہو کر امریکہ گئی تھی۔ اتنی جلد وہ میت کی شکل میں واپس آ جائے گی۔

یہ تین بھائیوں کے بیچ اکلوتی بہن سب کی آنکھ کا تارا، میٹھا تھی۔ یہ اکبر صاحب کی سب سے بڑی بیٹی کی اولاد تھی۔ بڑی بڑی غلابی آنکھیں گلابی رنگت اور چمکدار کالے بالوں والی چہل اور معصوم میٹھا گھر بھر کی آنکھ کا تارا تھی۔ ابھی دو ماہ پہلے وہ یہاں سے رخصت ہو کر گئی تھی اس دن بھی ایسی چہل پہل اس گھر میں تھی۔ اور اسے خوشی خوشی رخصت کیا گیا تھا۔

وہ امریکہ کو خوابوں کا شہر کہتی تھی۔ وہاں دو ماہ بھی رہنے نہ پائی۔ اور حادثے کا شکار ہو گئی۔ جب وہ اور اس کا شوہر ہنسی مون منانے نکلے۔ تھوڑی دیر جاتے ہی ایک ٹرالر سے ان کی گاڑی کی ٹکر ہو گئی اور وہیں اس نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اس کا شوہر بھی زخمی ہوا لیکن اس کی جان بچ گئی۔

بڑی بیٹی کے چاروں بچے ہی بہت ذہین اور پڑھا کو تھے۔ میٹھا ایک بھائی سے چھوٹی اور دو بھائیوں سے بڑی تھی۔ یوں تو اس کے سب بھائی بھی بہت ذہین تھے۔ لیکن میٹھا سب سے زیادہ پڑھنے لکھنے کی شوقین تھی۔ کھیل میں بھی وہ ہمیشہ اول آتی۔ جس کھیل میں حصہ لیتی پہلا انعام اس کا منتظر ہوتا۔ اس نے بہت جلد اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی۔

اس کی ایک سہیلی جو ہندو تھی۔ اسے بہت عزیز تھی۔ دونوں ساتھ کالج اور یونیورسٹی جاتی تھیں۔ اس کا نام ’میرا‘ تھا۔ وہ اس کی کالج کی سہیلی تھی۔ دونوں میں بہت پیار تھا۔

ایک دن یونیورسٹی سے واپسی پر میرا نے خواہش ظاہر کی کہ کیوں نہ آج اپنا ہاتھ جوئی کو دکھایا جائے۔“

وہ چنانہ نہیں چاہ رہی تھی لیکن میرا کی خاطر اسے جانا پڑا۔ جوئی کا ٹھکانہ یونیورسٹی کے راستے پر ہی تھا۔

میرا نے پہلے اپنا ہاتھ دکھایا۔ جوئی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تم بہت ترقی کر رہی اور بہت بڑی آدمی بن گئی۔ جب میٹھا کی باری آئی تو اس کا ہاتھ دیکھتے ہی وہ



READING
Section

تاکہ احمر اسے جلد سے جلد بھول جائے۔ لیکن اس کی محبت لازوال تھی۔ اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ سوائے یاووں کے اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔

یہ کیسی بات ہے کہ جس سے ہم بے پناہ محبت کرتے ہیں جسے ایک پل نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ بے رحم وقت اسے ہمیشہ کے لیے چھین کر لے جاتا ہے اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ میٹھا کی موت نے ہمیں ہی نہیں بلکہ احمر کو بھی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ تو سکون کے ساتھ اس دنیا چلی گئی۔ خدا نے بس اسے اتنے ہی دنوں کے لیے احمر کا ہم سفر بنایا تھا۔ اس کی موت کے بعد وہ بکھر کر رہ گیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس۔

ہم جیسے انسانوں کی زندگی کے اٹانے ہی کیا ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ اس طرح چھین لیے جاتے ہیں۔ اب تو اسے لیکن کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ ہم سب بھی اور اس کے گھر والے بھی اسے سمجھایا کرتے لیکن میٹھا کو بھلانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی محبت لازوال تھی۔ اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ جب بھی وہ ہندوستان آتا میٹھا کے والدین کے پاس ہی ٹھہرتا۔ وہ لوگ بھی بہت اصرار کرتے کہ بیٹا تم شادی کر لو۔ ہم اسے میٹھا کی طرح ہی پیار دیں گے۔

”لیکن وہ ہر بار یہی جواب دیتا کہ ایک بار شادی کر لی۔ اب دوسری شادی نہیں کرنا۔“

وہ گھنٹوں میٹھا کی قبر پر بیٹھتا رہتا اور روتا رہتا۔ وہ امریکہ میں ایک بڑا سرجن تھا۔ بہت سے گھرانے اور خود اس کے والدین شادی کے لیے اصرار کرتے لیکن وہ ہمیشہ انکار ہی کرتا رہا۔ لیکن دکھ کی بات یہ تھی کہ پچیس سال بعد اس کے ساتھ بھی ویسا ہی حادثہ پیش آیا، جیسا میٹھا کا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کا حادثہ بھی تقریباً اسی روڈ پر اور اسی طرح ہوا۔ اور اُس حادثے میں اس کی جان بھی چلی گئی۔ واقعی ان دونوں میں بہت سچا پیار تھا۔

اس کی دوست ’میرا‘ آج بھی اس کے والدین سے ملتی ہے اور انہیں والدین کا درجہ دیتی ہے۔ جوٹی نے اس کے بارے میں جو کہا تھا۔ وہ سچ ہوا آج وہ گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدے فائز ہوتے ہوئے بھی وہ میٹھا کے گھر والوں سے اُسی طرح پیار کرتی ہے۔ میٹھا اور احمر مر کر بھی سب کے دلوں میں زندہ ہیں۔

☆☆.....☆☆

راج تھی یہ رسم مسلمانوں نے ہندوؤں سے اختیار کی تھی۔ یہ رقم لڑکے کی تعلیم، جاب اور حیثیت دیکھ کر دی جاتی ہے، لڑکا جتنا تعلیم یافتہ ہوگا یہ رقم اسی طرح بڑھتی جائے گی۔ وہاں ڈاکٹر انجینئر کے لیے تو لاکھوں کی ڈیمانڈ کی جاتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر اس کا مخالف تھا اور اس چیز کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کے والدین اس لیے اُس سے سخت ناراض تھے۔ لاکھوں کی رقم چھوڑنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے انہوں نے شادی میں شرکت بھی نہیں کی۔

شادی کے کچھ دن بعد وہ امریکہ چلے گئے۔ وہاں وہ بہت خوش تھے۔ میٹھا امریکہ میں دنیا دماغیہا سے بے خبر محبت میں سرشار زندگی گزار رہی تھی۔ اس کا جب بھی فون آتا وہ یہی ظاہر کرتی کہ وہ بہت خوش ہے۔ احمر کے والدین اس سے بہت خوش ہیں۔ ”لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ وہ کبھی اس سے خوشی نہیں رہے۔“

ابھی اُسے گئے دو ہی ماہ ہوئے تھے کہ احمر نے ہنی مومن کا پروگرام بنایا۔ میٹھا نے اس کی اطلاع بھی اپنے والدین دے تھی۔ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ وہ لوگ By Car ہی جا رہے تھے۔ ڈرائیو احمر خود کر رہا تھا۔ شاید ایک گھنٹے کی مسافت طے ہونے والی تھی کہ اچانک سامنے سے ایک زلزلہ آ گیا۔ شاید ڈرائیو رشتے میں تھا۔ اس نے اسی طرف ہٹ کیا جدھر میٹھا تھی۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ میٹھا نے اسی جگہ دم توڑ دیا۔ احمر کو بھی شدید چوٹیں آئی لیکن وہ بچ گیا۔

احمر اسے بہت چاہتا تھا۔ اسے کبھی کوئی ایسی بات نہ کہتا جس سے اس کی دل آزاری ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ دنیا جہاں کی خوشیاں میٹھا کی جھولی میں ڈال دے۔ وہ بھی بہت خوش تھی اور اپنے احمر کی دیوانی تھی۔ لیکن یہ خوشی اس کے لیے صرف دو ماہ تک محیط تھی۔ امریکہ اس کے لیے خوابوں کا شہر تھا۔ کسی کو کیا پتا تھا کہ وہ اس قدر جلد اپنے دیس واپس آ جائے گی۔ شاید جوٹی نے سچ کہا تھا کہ اس کے پاس تو وقت نہیں ہے۔ یہ 1984ء کی بات ہے۔ جب یہ حادثہ ہوا۔ اُس کی میت کے ساتھ احمر کے علاوہ اس کے ساس سسر بھی آئے۔ وہ اس کے سامان کے ساتھ اس کا جو کچھ بھی تھا۔ یہاں تک کہ ایکسڈنٹ کے بعد کا خون سے بھرا لباس تک لے آئے۔ انہوں نے وہاں اُس کی کوئی بھی چیز نہ رہنے دی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کراچی سے تیسری دکایت

دیر سے اندھیر نہیں

اہم نکتہ

خدا جب دینے پر آتا ہے تو پتھر پھاڑ کر دیتا ہے

سخت و زندگی کی دعا میں مانگ رہا تھا۔ تقریباً ایک
گھنٹے بعد آپریشن تھپڑ کا دروازہ کھلا اور آیا نے آواز
لگائی۔

آپریشن تھپڑ کے سامنے امجد علی آنکھیں بند کیے
خضوع خشوع کے ساتھ اپنے پروردگار سے مدتوں
بعد اپنے گھر آنے والی خوشی اور اپنی شریک حیات کی



READING
Section

ہوتی تو وہ ہرگز اپنی مریضہ کا لٹراساؤنڈ نہ کروا تیں۔ آصفہ کے کیس میں بھی کوئی پیچیدگی نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحبہ نے لٹراساؤنڈ کروانا مناسب نہ سمجھا تھا۔

مگر اپنے تجربے کی روشنی میں خیال ظاہر کیا تھا کہ بے بی ایک سے زیادہ شاید دو یا پھر تین بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کے اسی خیال کے تحت آصفہ نے سچے کے چار جوڑے کپڑے نوکری میں رکھ لیے تھے۔ آیا کی زبانی چار بچوں کی پیدائش کا سن کر امجد کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اب وہ جلد از جلد اپنے بچوں اور آصفہ کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ اور سوچ رہا تھا بلکہ اپنے اللہ سے ہم کلام تھا۔

”واہ خدا تیری بھی شان نزالی ہے، تو بے نیاز ہے اور جس کام کا تو نے جو وقت مقرر کر رکھا ہے، وہ اسی وقت انجام پائے گا۔ اس سے قبل ہرگز نہیں۔ انسان تو ویسے ہی ازل سے جلد باز واقع ہوا ہے۔ ہر بات میں جلدی کرتا ہے۔ مگر یہ کالتق کائنات ہی بہتر جانتا ہے کہ اپنے بندے کی کوئی ضرورت پوری کرنے کا کب بہتر وقت ہے۔ کہاں تو پچھلے دس سالوں سے وہ اس کی بیوی اور اس کی مرحومہ ماں اپنے سونے گھر میں بچوں کی آواز اور ہنسی کو ترس رہے تھے۔

اس کی والدہ نیعمہ بیگم اپنے اکلوتے بیٹے کے بچوں کو گود میں کھلانے کی آرزو کرتے کرتے اس دارفانی سے کوچ کر گئی تھیں۔ مرنے سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے دے الفاظ سے اپنے بیٹے امجد علی کو دوسری شادی کے بارے میں کہنا شروع کر دیا تھا۔ مگر امجد علی کے لیے یہ مرحلہ انتہائی تکلیف دہ تھا۔

آصفہ امجد کی چچا زاد تھی اور سب سے بڑھ کر اس کی محبت تھی اور اولاد نہ ہونے کے باوجود دس سال بعد بھی امجد علی کے دل میں آصفہ کی محبت برقرار تھی۔ وہ نہایت ادب سے اپنی والدہ کو سمجھاتا۔

”اماں جان ذرا سوچیں جس طرح میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اسی طرح آصفہ بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے اور پھر اب آصفہ کا ہمارے علاوہ دنیا

”آصفہ کے ساتھ کون ہے؟“ امجد علی جلدی سے آگے بڑھا۔ آیا نے خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

”تم آصفہ کے شوہر ہو؟“

”جی.....“ امجد نے مختصر جواب دیا۔ وہ آیا سے کسی اچھی خبر سننے کو بے قرار تھا۔ آیا نے چپکتے ہوئے کہا۔

”تمہارے لیے بہت اچھی خبر ہے، مبارک ہو اللہ نے تمہیں.....“ اتنا کہہ کر آیا جان بوجھ کر رُک گئی۔

”اللہ نے؟“ امجد علی نے بے قراری سے آیا کا ادھورا جملہ دہرایا۔

”آگے بتاؤ۔“

”ہوں بتاتی ہوں پہلے ہرے رنگ کا پاپا دو پھر بتاتی ہوں۔“ آیا اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

”اوفو بھئی ہر اپا پاپا بھی لے لینا پہلے بتاؤ سب خیریت ہے نا۔“ امجد علی نے الجھ کر پوچھا۔

”ہاں ہاں بہت ہی خیریت ہے اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ میں تم سے ہر اپا پاپا ہی لوں گی۔ تو تمہارے لیے اچھی خبر یہ ہے کہ تمہیں اللہ نے ایک ساتھ چار چار بچوں سے نوازا ہے۔

وہ بھی دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ اب لاؤ جلدی سے بچوں کے کپڑے دے دو۔ کہیں ڈاکٹر صاحبہ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔“

امجد نے جلدی سے نوکری سے بچوں کے کپڑے نکال کر دیے۔ اسے آیا کی بات اور اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کی بیوی آصفہ کی ڈاکٹر صاحبہ جو مذہبی خیالات کی حامل تھیں۔

وہ اپنے زیر علاج مریضہ کا لٹراساؤنڈ کرنا اس وقت تک ضروری خیال نہیں کرتی تھیں جب تک کوئی پیچیدہ صورت حال نہ ہو۔ ان کا خیال تھا کہ وقت سے پہلے لٹراساؤنڈ کے ذریعے بچوں کی تعداد اور جنس معلوم کرنا خدا کے کاموں میں مداخلت کرنے کے مترادف ہے۔

اس لیے اگر کیس نارٹل ہوتا اور کوئی پیچیدگی نہ

سے ہی ملے گی، صرف تم سے۔ کیا تم نے سنا نہیں خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں اُس ذات پاک نے ہر کام کے لیے وقت مقرر رکھا ہے۔ انسان ہی اپنی جلد باز فطرت کی وجہ سے! دھرا دھرا ہاتھ پیر مارنے لگتا ہے ہمیں اگر بڑھاپے تک کی عمر کو پہنچنے تک اولاد نہ ملی تو یہ ہمارا نصیب ہوگا۔ اور خدا کے بنائے نصیب میں انسان رد و بدل کر سکے یہ اُس کی مجال نہیں اور ویسے بھی ہمارے علاوہ دنیا میں بے شمار جوڑے بے اولاد ہیں۔ اور اپنے رب کی رضا میں راضی اور شاکر رہیں۔“

امجد علی نے تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

”مگر علی نو سال کافی وقت ہوتا ہے۔ آپ اماں جان کی بات مان لیں۔ میری فکر نہ کریں، میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔ میں آپ کو صاحب اولاد دیکھنا چاہتی ہوں اس کے لیے میں دوسری عورت کو بھی ہنس کر برداشت کر لوں گی۔ میں کسی بھی وقت یہ قربانی دینے کو تیار ہوں۔“ اتنا کہہ کر آصفہ امجد کا جواب سنے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ کیونکہ عورت کتنی ہی بہادر، وفا پرست، ایثار کرنے والی کیوں نہ ہو۔ اپنی جنت میں شراکت برداشت کرنا اُس کی زندگی کا سب سے گھٹن موڑ ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

کچھ ہی عرصے بعد وہی ہوا جس کا نعیمہ بیگم کو دھڑکا بلکہ یقین تھا۔ پچھلے سال وہ ایک رات ایسی سوئیں کہ صبح اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

آصفہ اور امجد ماں کے یوں اچانک دنیا سے چلے جانے سے بہت پریشان ہوئے مگر خدا جہاں دکھ دیتا ہے ساتھ ہی خوشی سے بھی نواز دیتا ہے نعیمہ بیگم کی وفات کے چار ماہ بعد ہی آصفہ کی طبیعت خراب ہوئی۔ اُس کی ڈاکٹر کو شبہ ہوا اور ٹیسٹ رپورٹ آنے پر تصدیق ہو گئی کہ آخر شادی کے دسویں سال خدا نے اُن پر مہربانی کر کے انہیں والدین بننے کی نوید دے دی۔

☆☆.....☆☆

میں اور کون ہے چچا چچی تو اُسے ہمارے حوالے کر کے کب کی ابدی بند سوچکے ہیں۔“

”ہاں بیٹا میں یہ سب جانتی ہوں۔ بیٹا میں نے تمہیں آصفہ کو چھوڑ دینے کو کب کہا ہے۔ مجھے بھی آصفہ عزیز ہے۔“

مگر بیٹا انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تمہاری شادی کو نو سال ہو چلے ہیں۔ مجھے تو یہ فکر ہے کہ تمہاری نسل آگے کیسے چلے گی۔“ نعیمہ بیگم فکر مندی سے جواب دہتیں۔

”ارے اماں جان نسل چلے گی انشاء اللہ ضرور چلے گی۔ مجھے اپنے رب سے پوری پوری امید ہے کہ وہ ہمارے گلشن میں پھول ضرور کھلائے گا۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق ہم دونوں فٹ ہیں۔“

دونوں میں کوئی جسمانی نقص نہیں۔ پھر یہ تو ضرور قدرت کی آزمائش ہے جس سے بہر حال ہمیں گزرنا ہے۔“

”مگر کب بیٹا! نو سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں تمہارے بچوں کو کھلانے کی حسرت لیے ہی قبر میں اتر جاؤں گی۔“

”نہیں اماں جان ایسا نہ سوچیں۔ آپ ہمیں بھی حوصلہ دیں، اللہ سے دعا کریں اور مایوس نہ ہوں۔“ یہ کہہ کر امجد علی تھکتے قدموں سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ماں کو اور زیادہ اداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بچن میں مصروف آصفہ ماں بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو اکثر چپ چاپ سنتی رہتی مگر آج اُس کی سوچیں بھی اماں جان کی بات سے متفق ہو رہی تھیں اور کمرے میں آ کر اُس نے اپنے محبوب شوہر کو اماں جان کی بات مان لینے پر جب راضی کرنے کی کوشش کی تو امجد نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔

”ایسا ناممکن ہے! اولاد کی خاطر میں دو کشتیوں میں سوار ہو کر گھر کے پرسکون ماحول کو جہنم نہیں بنا سکتا۔“

میں اپنے خدا سے ناامید ہرگز نہیں تم بھی اچھی طرح جان لو اگر اولاد میرے نصیب میں ہے تو وہ تم

READING
Section

پہلی

اول حسین پٹھان

اس امیر لڑکی نے ثواب کمانے کے لیے اُسے پختا جو پہلے ہی.....

آتے جتنے رنگوں کے اس کے پاس کپڑے تھے۔ اور میں ایک سیاہ پینٹ اور ایک بدرنگی گھسی ہوئی جینز کا مالک، پچھلے چھ مہینوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ کچھ میسے پس انداز کر کے ایک خوشنمائی جینز ہی خرید لوں لیکن میسے تھے کہ جمع ہی نہیں ہو رہے تھے۔ یونیورسٹی کے چار سال تو جیسے تیسے گزر گئے لیکن اب میں چاہتا تھا الوداعی تقریب پر تو کچھ اچھا سا پہن کر جاؤں۔

کلاس کے آخری دن چل رہے تھے۔ کلاس میں ایک دوسرے سے پچھڑنے کی باتیں زبان زد عام تھیں۔

بہت اچھے دن گزرے، اب تو شاید زندگی میں بعض ساتھیوں سے کبھی نہ مل سکیں۔ ایسی باتیں ہر وقت ہوتی رہتیں۔ فولنگ کے قہے ہنس ہنس کر دہرائے جاتے۔ نہ ہنسنے والی باتوں پر خواہ مخواہ ہنسا جاتا۔ اور پھر ایک دن وہ پریوش ایک ٹیس سی ڈائری لیے میری بیچ کے سامنے کھڑی تھی۔

”عدیل تم کلاس کے سب سے ریزرو رہنے والے لڑکے ہو۔ یہ ڈائری میری ہے، ان چار سالوں میں تم نے میرے بارے میں کیا محسوس کیا، مجھے کیسا پایا، سچ لکھنا اور اچھا لکھنا، دیکھو سب سے پہلے تم

مازہ کلاس کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ سرخ سفید، دہلی پتی، طرح دار، لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے اور میں کلاس کا شاید سب سے بدصورت لڑکا۔ شکل ٹھیک تھی لیکن غربت نے میری مت مار دی تھی۔ رات دن کی لوڈ شیڈنگ میری آنکھوں کے نیچے چلتے لے آئی تھی۔ ابو کے ساتھ کبھی کبھار کے ٹھیلے لگانے نے ہاتھ پیر کھر درے کر دیے۔

منہ پر دانے جو بارہ تیرہ سال کی عمر میں نکلنے شروع ہوئے تھے اب چوبیس سال کا ہونے والا ہوں تب بھی ختم نہیں ہوئے۔ دائیں گال پر تو بد نما گڑھا بن چکا ہے۔ رہی سہی کسر جوانی میں ہی بالوں میں اترتی سفیدی نے پوری کر دی۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں سفر کرنے والی اور میں چنگ جی رکشوں اور رنگ برنگی بسوں میں دھکے کھانے والا۔ بھلا ہم دونوں کا کیا جوڑ.....

لیکن اس محبت کا کیا کرتا جو اس کے لیے میرے دل میں پنپ رہی تھی۔ مٹائے نہیں مٹی تھی۔ بار بار میں نے اپنے آپ کو اپنی حیثیت باور کروائی، لیکن دل ہے کہ سمجھتا ہی نہیں، لال، گلابی، پیلا، نیلا، آسمانی، نارنگی، پشٹی، بھورا مجھے تو اتنے رنگوں کے نام نہیں

سے ہی لکھوار ہی ہوں۔“

”مائرہ کلاس کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔“

شگفتہ انداز میں بولتی ہے۔

میری طرف سے مائرہ کے لیے مستقبل کی اچھی

دعا میں۔“

لکھنے کے بعد میں نے اپنا نام لکھا اور تاریخ لکھ

دی۔ مائرہ اپنی ایک دوست کے ساتھ لان میں بیٹھی

شاید کچھ کھا رہی تھی۔ ان دونوں کی میری طرف پشت

تھی اسی لیے انہیں نہ پتا چلا کہ میں ان کی طرف آ رہا

ہوں۔

”یار! عدیل سے ڈائری میں کمنٹس لکھوانے کی

کیا ضرورت تھی۔ کیسا مفلوک الحال لڑکا ہے۔ بہننے کو

کپڑے بھی نہیں۔ اسے کیا پتا ڈائری میں کسی کو کس

طرح و شز لکھ کر دیتے ہیں۔“ میرے قدم دھبے

پڑ گئے۔

”غریب لڑکا ہے، اسی لیے تو لکھوار ہی ہوں۔“

میں گم صم سا مائرہ کو دیکھتا رہا اور وہ مجھے ڈائری تھما

کر چلی گئی۔

”کیا لکھوں؟“ میں نے ڈائری کو الٹ پلٹ کر

دیکھا۔ وہ ڈائری اس قدر نہیں تھی کہ مجھے لگنے لگا کہ میرے

کھر درے ہاتھ ڈائری کی نفاست کو ہکا بکا ہی نہ دیں۔

ڈائری لیے میں نسبتاً پرسکون گوشے میں آیا اور

سوچنے لگا کیا لکھوں، کیا لکھوں، دل تو بس ایک ہی بات

کہہ رہا تھا۔ اس کی تو بس ایک ہی رٹ تھی کہ لکھ دوں۔

”مائرہ میں تم سے محبت کرتا ہوں کیا تم مجھ سے

شادی کرو گی؟ چاہے غریب سہی لیکن میں وعدہ کرتا

ہوں تمہیں خوش رکھوں گا۔“

کتی دیر میں سوچتا رہا ذہن و دل میں اور کوئی

بات آتی ہی نہ تھی۔ لیکن دل و دماغ پر قابو پا کر میں

نے لکھنا شروع کیا۔



READING
Section

”شکر یہ ابو، یہ سوٹ بہت خوبصورت ہے لیکن میں الوداعی تقریب میں نہیں جا رہا۔“
 ”کیوں؟“ ابو کے ساتھ امی بھی حیران ہو رہی تھیں۔
 ”میرا پیٹ کل رات سے ٹھیک نہیں اب تو کافی درد بھی ہو رہا ہے۔“

”ادہ تو رات کو بتانا تھا، پیٹ درد کی پھکی پڑی ہے گھر میں۔“
 ”ابھی کھا لیتا ہوں، پہلے بیت الخلاء سے ہوں۔“

بیت الخلاء جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا کچھ دیر دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ آنکھیں نم ہوئیں تو رگڑ ڈالیں۔ باہر آ کر ہاتھ دھوئے۔ اماں کو دکھانے کے لیے طاق سے پھکی اٹھائی۔ کچھ دیر دوسری طرف منہ کیے یہ تاثر دیتا رہا کہ پھکی کھا رہا ہوں۔ ڈبیرا رکھ کر پلٹا تو ابو پیچھے ہی کھڑے تھے۔

”کھائی پھکی۔“ ابو کا لہجہ بے تاثر تھا۔ بھر م رکھنے کے لیے بے تاثر رہنا ابو کی پرانی عادت تھی۔
 ”جی کھائی، بڑی پُراثر ہے جب کبھی یہ پھکی کھائی ہے شام تک ٹھیک ہو جاتا ہوں۔“

☆☆.....☆☆

دیکھو کلاس میں کبھی کسی لڑکے تک نے اُسے لفٹ نہیں کروائی۔ میں نے ڈائری اُسے کنٹینر لکھنے کے لیے دی، اس کا دل بڑھا۔ ساتھ اپنی اہمیت کا احساس بھی ہوا ہوگا کہ میں سب سے پہلے اس سے ڈائری لکھوا رہی ہوں۔ یہ بھی ثواب کا کام ہے۔“

میں نے ایک نظر ثواب کے کام کرنے والی خوبصورت امیر لڑکی کو دیکھا اور واپس مڑ گیا۔ راستے میں نظر آنے والی ایک کلاس فیلو کو ڈائری پکڑائی کہ مائرہ کو دے دینا۔

☆.....☆.....☆

رات کو ابو نے مجھ سے پوچھا۔
 ”تمہاری یونیورسٹی کی الوداعی تقریب کب ہے؟“
 ”جی کل۔“

”ام م..... ٹھیک، میرے پاس تمہیں دینے کو ایک تحفہ ہے۔ صبح دوں گا۔“ ابو کر دٹ بدل کر سو گئے۔ اور صبح نماز کے بعد انہوں نے ایک خوشنما جینز بمعدہ شرٹ ایک خوبصورت سے شاپر میں مجھے پکڑائی۔
 ”یہ لو عدیل بیٹا، غریب باپ کی طرف سے چھوٹا سا تحفہ، الوداعی تقریب میں نیا سوٹ پہن کر جانا۔“



رضوانہ پرنس کا نیا شاہکار ناول

اک نئے مورچے شائع ہو گیا ہے

محبت کے خوبصورت احساس میں جب شک اور بدگمانی کی آگ بھڑک اٹھے تو سب کچھ جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی نئے نئے بکھرتے رشتوں کی یہ کہانی آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی اور اس کا اینڈ آپ کو ششدر کر دے گا۔

قیمت صرف 350 روپے

ناول ملنے کے پتے: (ویکم بک پورٹ، مین اردو بازار کراچی) (فرید پبلشرز، مین اردو بازار کراچی)

(اشرف بک اینجنسی، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی) (خزینہ علم و ادب، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور)

(علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور) (علی میاں پبلیکیشنز، عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور)

READING

178

مفاد

چہرہ بے لک

اُسے ہر شخص مفاد پرست ملا تھا لیکن وہ لڑکی.....

اُس کے خاندان کے ذہین اور حسین لڑکوں میں ہوتا تھا۔
نسرین اس کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔
قدرت نے نسرین کو بلا کا حسن دیا تھا۔ حسن کے ساتھ
ساتھ وہ نہایت ہی امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتی

طارق نہ صرف میرا کلاس فیلو تھا۔ بلکہ لنگوٹیا بھی
تھا۔ وہ اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کر لیتا تھا۔ لائق
اور محنتی تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بڑا بننے کا جذبہ اس
میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ذہانت، خوش مزاجی اور
انکساری کی بنا پر ہر شخص اس کا گردیدہ تھا۔ اُس کا شمار



READING
Section

تھا۔

اخلاق و دفا کے سجدوں کی جس در پر واد نہیں ملتی
اے غیرتِ دل اے عزمِ خودی اس در پر سجدہ کیا معنی
اس کی سوچ میں اس اچانک تبدیلی سے میں
بہت حیران ہوا۔ لیکن یہ حیرانی اس وقت اور بڑھ گئی۔
جب اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکال کر
دکھائی۔ جس پر یہ شعر لکھا ہوا تھا اور اس شعر کے نیچے
نسرین کا نام لکھا تھا۔ کہنے لگا۔

”کل بہت دنوں بعد نسرین ہمارے گھر آئی
تھی۔ اس کی امی بھی اس کے ساتھ تھیں۔ میں الگ
تھلگ ہی رہا۔ یہ شعر اس نے کس وقت میری ڈائری
پر لکھا مجھے خبر نہیں۔ اس سے مل بھی آیا ہوں میں۔ ہر
بات واضح ہو گئی ہے۔ وہ بھی اندر ہی اندر تنگ رہی
تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اُسے سمجھ نہ سکا۔“ اس
کے بعد میں نے دیکھا۔ طارق خوش و خرم رہنے لگا۔
اور اس کی زبان ان واقعات سے لبریز رہتی۔ جن
میں نسرین کی طرف سے اُس کے لیے بھرپور دلچسپی کا
اظہار ہوتا۔ پھر طارق بیمار ہو گیا اور نسرین بیماری میں
بھی اس کے پاس آتی رہی۔

طارق اچھا ہوا تو ایف اے کے امتحان نزدیک
تھے۔ اس نے محنت تو کی مگر نتیجہ ناکامی کی صورت میں
نکلا، جبکہ نسرین ایف ای میں ٹاپ کرنے کے بعد
میڈیکل کالج میں چلی گئی۔ طارق اب تعلیم میں اس
کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اور نسرین آگے آگے اسی
طرح ان کی محبت بھی آگے پیچھے ہوتی رہی۔

☆.....☆.....☆

گر میوں کی چھٹیاں ہوئیں تو نسرین کراچی چلی
گئی۔ واپس آئی تو وہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔ طارق کو
دیکھ کر اُس سے کترانے کی کوشش کرتی۔ اور ناکامی کی
صورت میں طارق سے اس کی باتیں بالکل سیاٹ اور
کاروباری قسم کی ہوتیں۔ طارق کے لیے بالکل بے
جان، اور محبت کے وہ غیر مرئی خطوط جو کبھی نسرین کی
نگاہوں سے نکل کر طارق کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیا
کرتے تھے۔ اب معدوم ہو گئے تھے۔ طارق حساس
تھا۔ اور محبت نے اسے کچھ زیادہ ہی حساس بنا دیا تھا۔

تھی۔ شاید اسی لیے نسرین خاندان والوں کے لیے بھر
ممنوعہ سے کم نہ تھی۔ اسی دولت کی کمی نے طارق کو
نسرین کے گھرانے سے اس کی ساری رشتہ داریاں
دھندلی اور کر کر کر کر دی تھیں۔ یہی وہ احساس تھا
جس نے اُسے نسرین سے بہت دور کر دیا تھا۔ اس کے
باوجود نسرین اس کے دل میں بسی تھی۔

یہ نہیں کہ طارق سے کسی نے محبت نہیں کی تھی۔ کئی
لڑکیاں اس کی محبت کا دم بھر چکی تھیں، لیکن ہر لڑکی
اسے میلی قمیض سمجھ کر اُسے اپنے گلے سے اتار چکی تھی۔
یہ تو لڑکیوں کا شیوہ ہے کہ فیشن کے جنون میں بعض
اوقات اُجلی چیزیں بھی انہیں میلی نظر آنے لگتی ہیں اور
نئی طرز کے جن اُجالوں سے وہ دل لگاتی ہیں۔ اُن کی
مفاد پرستی اور موقع پرستی شاید انہیں اس بات کی خبر ہی
نہیں ہونے دیتی کہ ان اُجالوں کی روح کے
پچھواڑے کتنا اندھیرا بھرا ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

نسرین کا نام وہ جب بھی سنتا، اُس کا دل سمٹ کر
دوہرا ہو جاتا۔ یہ طارق کا قصور نہیں بلکہ انسان کی
فطرت ہے کہ دور افتادہ چیزیں جو اس کی پہنچ سے باہر
ہوتی ہیں، اسے زیادہ جاذب اور پُرکشش نظر آتی
ہیں۔ اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ انہیں حاصل
نہیں کر سکتا۔ اس امید پر کہ شاید وہ انہیں ایک روز
حاصل کر لے گا۔ پاس پڑی ہوئی چیزوں سے بھی ہاتھ
دھو بیٹھتا ہے، طارق بھی کچھ ایسی ہی ڈگر پر چل نکال
تھا۔ اس کا خیال تھا۔ نسرین کی نگاہوں میں اس کی
حیثیت ایک ابھرتے ہوئے سائے سے زیادہ نہیں
ہو سکتی۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا..... نسرین ذہین اور
سمجھدار ہے۔ وہ ایسی روشنی کی طرف کبھی نہیں بڑھے
گی۔“

طارق کبھی کبھی اس قدر جذباتی ہو جاتا کہ اس کو
دیکھ کر مجھے حیرانی ہونے لگتی۔ وہ ہر دو تین دن بعد
میرے پاس آتا اور دل کا غبار ہلکا کر کے چلا جاتا۔
ایک روز جب وہ میرے پاس آیا تو اس کا چہرہ
پُر سکون تھا، پھر اس نے ایک شعر پڑھا جو کچھ یوں

اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ وہ شادی کیا کرنے گی بلکہ اب کوئی بھی اس سے شادی کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اس نے شادی کیوں نہیں کی؟ وہ کچھ نہ کچھ کہہ سکتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور اس کی سمجھ میں آتا کہ یہ ساری قربانی شاید اس نے چھوٹی کی خاطر دی ہے۔

اسی وجہ سے اس کا بے حد احترام کرتا تھا اور وہ بھی اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتی تھی، لیکن لڑکی پر اسے اب بھی اعتماد نہ تھا۔ ہر لمحے یہی خیال رہتا کہ کہیں یہ بھی بحالت مجبوری اسے اپنے مفاد یا غرض کا کوئی چیتھڑا تو نہیں سمجھ رہی۔ مفاد کا مکمل حصول کہیں اسے بھی ایک دن اس چیتھڑے کو پھینکنے پر مجبور نہ کر دے، لیکن جون ہی اسے پتا چلا کہ لڑکی ایک بڑے رشتے کو صرف اس کی خاطر ٹھکرا چکی ہے۔ تو وہ اس کے خلوص پر پوری طرح ایمان لے آیا۔ اس کے چہرے کی ساری رونقیں لوٹ آئیں۔ شاید اس کی خوشی کا سب سے بڑا دن تھا۔ طارق مسکراہٹوں میں ڈوبا ہوا کہہ رہا تھا۔

”بالآخر مجھے میرے مطلب کی لڑکی مل گئی تا۔ کتنا خوش قسمت ہوں یار۔ ذرا غور تو کرو۔ بڑا خلوص ہے اس لڑکی میں، میرے لیے بہت موزوں ہے۔ پچھر شپ بھی اُسے مل گئی ہے اور اس طرح فکر معاش سے مجھے دستبرداری اور ہاں سنو.....“ اس نے چونک کر میرا ہاتھ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”بھلا اس کی بڑی بہن کی وہ ساری کمائی کہاں جائے گی؟“ اس طرح جیسے اس کے ذہن کا کوئی خوابیدہ گوشہ ابھی جاگا ہو۔

مفاد پرستی کا وہ ترازو جس میں آج تک طارق ان لڑکیوں کو تولتا آیا تھا۔ شاید اپنے لیے استعمال نہ کر سکا جو خوشی سے بے ساختہ یہ الفاظ اس کی زبان سے ادا ہو گئے اور اسے پتا بھی نہ چل سکا کہ اُس نے کیا کہا ہے ان الفاظ کی روح کے پچھواڑے کتنا اندھیرا بھرا ہے۔ غرض کے کتنے چیتھڑے اور مفاد کے کتنے چھلکے اُس اندھیرے نے چھپا رکھے ہیں۔ اُسے کچھ خبر نہ تھی۔

☆☆.....☆☆

نسرین کی بے التفاتی اور برہمی اسے خوب تڑپا رہی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا مگر نسرین اس کے دل سے نہ نکلتی۔ دل کی بستی اجاڑنے پر وہ کسی قیمت پر تیار نہ تھا۔ یہی کہتا۔

”نسرین میرا امتحان لے رہی ہے۔ میں اس پر پورا اُتروں گا۔ اُس نے مجھے دل سے چاہا ہے۔“ لیکن ایک روز نسرین کی کراچی کے ایک ڈاکٹر سے مستثنیٰ کی خبر نے طارق کے ہوش و حواس ٹیل کر دیے۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی اور ایک اُلجھی ہوئی تمنا اور دل میں کر دیش لیتی ہوئی ایک خواہش کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ..... صرف ان الفاظ کے ساتھ کہ ”نسرین بڑی مفاد پرست نکلی یار۔“

نسرین کے بعد طارق کی زندگی میں کئی لڑکیاں ایسی آئیں۔ جنہوں نے طارق کو چاہا اپنے خلوص کا یقین دلایا۔ اس سے محبت کے پیمان باندھے، لیکن بد قسمتی سے ہر فدا ہونے والی لڑکی آخر میں طارق سے زیادہ دولت اور مرتبہ رکھنے والے انسان ہی کی ہو کر رہ گئی۔ طارق نے بڑے خلوص سے اُن پر اعتماد کیا، لیکن اُن میں سے ہر ایک نے بڑے وثوق سے طارق کو فریب دیا۔

☆.....☆.....☆

مفاد پرستی اور موقع پرستی کی ان زندہ مثالوں نے طارق کا ذہنی سکون چھین لیا تھا۔ محبت کر کے زندگی کا ساتھی چننے کا ارادہ اس نے قطعی طور پر ترک کر دیا۔ اُس کی عمر تیس سال ہو گئی تھی۔ بی کام کرنے کے بعد ایم اے اور پھر ایل ایل بی کی ڈگری بھی اُس نے لے لی تھی۔ اُس کے والدین کی تشویش بجائیں۔ ایک جگہ رشتہ لگا۔ طارق بھی وہاں گیا۔ ان لوگوں نے بھی خوب خاطر مدارات کی۔ لڑکی جو ایم اے تھی اور پچھر لگنے کی منتظر تھی۔ کئی بار اس کے سامنے آئی اور مزد کنائے میں طارق پر نثار ہونے لگی۔ طارق بھی کھلتا گیا۔ بڑی بہن جو اس کی واحد سرپرست تھی۔ وہ پہلے ہی شہر کے گورنمنٹ کالج میں پڑھا رہی تھی۔ غیر شادی شدہ تھی۔ اُس کی آنکھوں پر لگی ہوئی عینک اور ماتھے اور رخساروں پر بل کھاتی ہوئی بڑھاپے کی جھریاں

READING
Section

قصور کس کا؟

حاجہ وقاص

اوپر والے کو الزام مت دوسارا قصور ان نیچے والوں ہی کا ہے.....

مجھے دیا کرتے تھے۔ گویا معصوم بچے کو خوش کرنے کے وہ داتا کو خوش کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ لیکن میں اس وقت بھی جانتا تھا کہ میں اندر سے کتنا معصوم بچہ ہوں۔

☆.....☆.....☆

پھر وہ دور آیا کہ جوانی دیوانی کا آغاز ہوا۔ میں اتنا شوریدہ سر، جوشیلا نکلا کہ میں دس جگہوں پر کام کرنے لگا اور ہر جگہ جھگڑا لینا میرا معمول بن گیا۔ لوگ کہتے۔ ”ابھی سے اتنا چلتا پرزہ ہے بڑا ہو کر خدا جانے کیا کرے گا۔“ (اور میں بڑا ہو کر سوائے بڑا ہونے کے اور کچھ نہ کر سکا۔)

اُس زمانے میں مجھے یہ جملے بے معنی لگتے تھے۔ میں اس حقیقت سے نا آشنا تھا کہ وقت مجھ پر وقت سے پہلے گزر رہا ہے۔ اسی زمانے میں ’نوری‘ سے میری ملاقات ہو گئی۔

وہ اکثر سڑکوں پر ادھر ادھر ردی کے کاغذ اکٹھے کرتی نظر آتی اور میں وقت سے پہلے ہی اس پر عاشق ہو گیا۔ (مگر میری نگاہ میں وہ بھی اس قابل کہ وقت سے پہلے ہی اس سے عشق کیا جائے)

نوری نہ صرف نوری تھی مگر زبان کی بہت ہی کڑوی تھی۔ بات کرتی تو یوں لگتا کہ ابھی جنگلی بلی کی طرح منہ

کچھ لوگ بد بختی کے کفن میں لپٹ کر پیدا ہوتے ہیں اور مرتے دم تک اس کفن کو اپنے آپ سے جدا نہیں کر پاتے۔ میرا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ میری زندگی کا ہر اچھا پرالحمہ ہمیشہ وقت سے پہلے ہی تیزی سے گزر گیا۔ لیکن جو وقت تیزی سے گزرنا چاہیے تھا وہ تو گویا ٹھہر ہی گیا۔ بچپن سے لے کر جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک ہر زمانہ مجھ پر وقت سے پہلے آیا اور ہر حادثہ وقت سے پہلے ہی رونما ہوا۔

میں نے جنم داتا کی نگری میں لیا۔ مگر ساری عمر میرا کاسہ سواں خالی رہا۔ داتا کی نگری میں کچھ ایسی کشش ضروری تھی کہ کہیں اور جانے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ دل نے کبھی شکوہ کیا نہ شکایت۔ بچپن تو چند سال ہی رہا پھر تلاش رزق کا بوجھ کندھوں پر ایسا پڑا کہ اسے ڈھوتے ڈھوتے بچپن کا وقت بھی..... وقت سے پہلے ہی گزر گیا۔

میں آٹھ دس سال کی عمر میں ایسا سانا ہو گیا کہ جو باتیں لوگ بوڑھے ہو کر نہیں سمجھ پاتے میں بچپن میں نہ صرف سمجھ جاتا بلکہ اس کی تہ تک پہنچ جاتا۔ شاید سر پر رکھا بھاری بوجھ، عقل کی آنکھیں وقت سے پہلے کھول دیتا ہے۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ میرا بچپن کیسا تھا۔ ہاں اس قدر ضرور یاد ہے کہ اکثر لوگ بچہ سمجھ کر دیگ کے چاول پہلے

بہت سی بارشیں برسیں تو نختے لگا کہ وقت ایک بار پھر وقت سے پہلے گزر گیا ہے۔

میں خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگا۔ افراد خانہ زیادہ ہو گئے تو روٹیاں کم پڑنے لگیں۔ تب نوری پہلے کی طرح کڑوی کسلی ہو گئی۔ (مگر اب کیا فائدہ، اب تو بہت سے ساون آچکے تھے اور بہت سی گھٹائیں برس چکی تھیں۔ میں پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگا۔ مگر پیٹ کی ابوری خالی ہوتی کمر بھٹی بوری اٹھانے سے انکار کر دیتی ہے۔ پھر جیسے وقت کو پر لگ گئے۔ میری بیٹیاں میرے برابر ہو گئیں اور بیٹے سینما ہالوں میں بیٹھنے لگے۔ میں نہ تو بیٹیوں کو جوان ہونے سے روک سکا اور نہ بیٹیوں کو آوارگی سے..... پیٹ میں روٹی بوٹی نہ پہنچے تو سینما عیاشی بن جاتا ہے۔ وہ جو کچھ کھاتے اپنی عیاشیوں پر اڑا دیتے۔

بیٹیاں جوان ہوئیں تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے رشتے جلدی اور اچھی جگہ ہو جائیں تاکہ میرا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ مگر جو اللہ کی رضا، جو مولا کی

نوج لے گی۔ بہر حال مجھے اس کا یہ انداز بھی بہت پیارا لگتا تھا۔ حد یہ کہ میں اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کے پیچھے ہو لیتا۔ وہ اکثر کہیں بیٹھ جاتی اور میں اس کے لیے ردی اکٹھی کرتا پھرتا۔ پھر ایسا ہوتا کہ اس کے لیے ردی چختے چلتے میں اپنا بوجھ اٹھانا بھول جاتا اور یوں اس رات فاتہ کرنا پڑتا۔ پھر بوجھ ڈھوتے اور فاتے کرتے کرتے نوری میری ہو گئی۔ پھر شاید میں ہی اس کا ہو گیا۔ ساری عمر بوجھ ڈھویا تھا۔ ایک دم سے دامن میں پھول برسے تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا..... اور جب ہوش آیا تو وقت ایک بار پھر وقت سے پہلے گزر چکا تھا۔

نوری..... پرانی ہو گئی۔ مگر ہماری محبت اب بھی نئی تھی۔ تب ہماری محبت کی زنجیر میں ایک کڑی کا اضافہ ہوا۔ ہمارا بیٹا ساون..... بالکل ساون کی طرح ٹھنڈا بیٹھا تھا۔ کم از کم مجھے تو یہی لگتا تھا کہ پتی دو پہروں میں نوری میرے لیے بادل کا ٹکڑا اور میرا بیٹا رام بھم برستا ساون ہے۔ پھر جب یکے بعد دیگرے بہت سے ساون اور



READING
Section

”اصل میں دین محمد خود شادی کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے مجھ سے آنکھیں ملانے بغیر جواب دیا۔ اب حوصلہ کرنے کی باری میری تھی۔ نوری میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ کچھ اور قریب ہوتے ہوئے مجھے حوصلہ دینے لگی۔

”دیکھو اس طرح تو ہوتا ہی ہے۔ غریب کی بیٹی ایسے ہی اُلٹے سیدھے بیاہی جاتی ہے۔ آج دینول رہا ہے کل یہ بھی نہ رہا تو سوچو پھر کیا ہوگا؟ اگر یہ رشتہ ہو گیا تو ایک بیٹی کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ پھر دوسرے دیکھ بھال کے کرتے رہیں گے اور ویسے بھی رضیہ کوئی پندرہ سولہ سال کی بچی نہیں رہی کہ دو تین برس اور انتظار کرتے پھریں۔“

وہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے بول رہی تھی اور میری گردن مزید جھکتی جا رہی تھی۔ شاید یہ وقت کا بوجھ تھا جو مجھے سر اٹھانے نہیں دے رہا تھا۔ ہر گزرنے والا پل مجھے پس رہا تھا۔ پہلی بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ نامراد وقت جو ہمیشہ وقت سے پہلے گزر جایا کرتا تھا۔ اب گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

”جو مولا کی مرضی۔“ میں نے شکست تسلیم کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

”آسمان والے کو الزام مت دو۔“ نوری حسب عادت زبان کے تیر برس بولنے لگی۔

”جو لوگ زمین کے خدا بنے بیٹھے ہیں سارا قصور ان کا ہے۔“ اچانک نوری دامن پھیلا کر بدو عا میں دینے لگی۔

”کیڑے پڑیں، ان پر علم ٹوٹے، ان کی اولادوں کو کل مار ڈالو، خانہ خراب ہو چھٹکی جو گے۔ حرام کے جنے ادھل ہو جائیں۔ ان کی بیٹیاں..... قصور اور والے کا نہیں۔ ان نیچے والوں کا ہے۔“ وہ واہی تباہی سننے لگی۔

”نوری! اونوری! باؤلی ہو گئی ہے۔ کفر کی باتیں کیوں کرتی ہے۔“

میں اسے حوصلہ دے رہا تھا مگر وہ تو مانو آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ اور مجھے ایسا لگا کہ یہ وقت کا بوجھ کبھی نہیں اتر سکتا۔ اس کی منزل صرف اور صرف قبر ہے۔ دو گز زمین کا ٹکڑا..... جب بدبختی کا کفن پہنے اس دو گز کے ٹکڑے میں جاتے ہیں تو وقت کا بوجھ بھی آپ ہی آپ سر سے اتر کر دھواں بن جاتا ہے۔

☆☆.....☆☆

مرضی، بندہ ناتواں تو راضی برضا ہونا چاہیے صاحب..... بندہ جب اور جس کا چاہے بوجھ اُتار دے اور جس کا چاہے بڑھا دے۔ میں تو ویسے بھی بوجھ اٹھانے کا عادی تھا۔ تب میں نے زندگی میں پہلی بار لوگوں کے گھردن میں جھانکنا شروع کیا۔

رشید تانگے والے کے تین بیٹے تھے۔ میں اکثر اس کے گھر آنے جانے لگا۔ میری ہر بات مہنگائی سے شروع ہوتی اور تان بچوں کی شادی پر ٹوٹتی۔ مگر رشید نے اس موضوع میں کوئی دلچسپی نہ لی تو میں یونس کے گھر جانے لگا۔ وہ خیر سے دو بیٹوں کا باپ تھا۔ جب وہ بھی مفہوم سمجھ کر نہ سمجھنے کی اذکار ہی کرنے لگا تو میں ایک بار پھر نا اُمید ہو گیا۔ آخر نوری سے مشورے کے بعد میں نے یہ کام اُسے سونپ دیا۔

☆☆.....☆☆

نوری کچی بستنی میں ہر اُس گھر گئی جہاں لڑکے موجود تھے۔ اسی تلاش میں لوگوں کے گھروں میں جھانکتے جھانکتے تین برس بیت گئے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ یہ وقت کبھی نہیں گزرے گا۔ غریب کا بوجھ بوری کا ہو یا بیٹی کا..... غریب بھی اتارنا پسند نہیں کرتا۔ پھر ایک شام نوری نے مجھ سے سرگوشی کی۔

”دینو آیا تھا۔“ دینو کا نام بستے ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے میرا آدھا بوجھ بانٹ لیا ہو۔

”وہی دینو..... جس کے تین جوان بیٹے ہیں اور دو ماہ پہلے جس کی بیوی کا انتقال ہوا ہے۔“ میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ دوست کی بیوی کے انتقال پر خوش ہونے والی بات مجھے اچھی نہ لگی۔ میں نے اپنی خود غرضی اور سنجیدگی کو دباتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

”بیوی کے بغیر بے چارے کی کیا زندگی ہے۔ اب بچوں کے رشتے بھی اسے خود ہی کرنا پڑیں گے۔“ میری خوشی کو نوری نے بھی بھانپ لیا۔ مگر اس کا چہرہ کچھ اتر سا گیا وہ کمال حوصلے سے بولی۔

”اصل میں بات کچھ اور ہے۔“ نوری کی بات سن کر مجھے لگا جیسے میرا بوجھ آہستہ آہستہ پھر میرے کندھوں پر آ رہا ہے۔

”تو پھر کیا بات ہے؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

پوچھا۔

پوچھا۔

پوچھا۔

احتیاط ضروری ہے

حکایتیں

میں آج تک نہ سمجھ پائی کہ کلاس میں سر مجھ ایسی عام سی لڑکی سے کیا چاہتے تھے

بعض اوقات زندگی میں آنے والے عام واقعات بھی ذہن میں رہ جاتے ہیں۔ اور آسانی سے بھلائے نہیں جاتے۔ مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے۔ جب پنجاب



READING
Section

ایک مرتبہ سر احمد حسن ہماری کلاس لے رہے تھے۔ اعتماد کی کمی کی وجہ سے میں کلاس کے دوران کچھ پریشان سی رہتی ہوں کہ اگر سر نے کوئی سوال کر لیا اور میں جواب نہ دے سکی تو لڑکیاں میرا مذاق اڑائیں گی۔ اُس دن مجھے یہی فکر لاحق تھی۔ سر کے لیکچر کے بعد ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے میں اور میری دوست ثوبیہ بھی اسی پریشانی میں تھے کہ سر نے دن بائے ون ہر لڑکی سے سوال کرنا شروع کر دیا۔ میرے تو مانوٹوٹے اڑ گئے اور میں نے شدت سے دعا مانگی شروع کر دی کہ میری باری نہ آئے۔ اچانک ہی سر نے ثوبیہ کو کھڑا کیا۔ اور سوال جواب شروع کئے۔ ثوبیہ کے بعد میرا نمبر تھا مگر سر نے مجھے چھوڑ کر اگلی لڑکی سے سوال کر دیا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ میں بچ گئی۔

نظاہر یہ ایک عام سا واقعہ تھا، میں نے کوئی عذر بھی نہیں کیا تھا مگر اس کے بعد کے واقعات نے میری توجہ اس طرف مبذول کر دی تھی۔ جن پر مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ اس دن کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ غیر محسوس انداز میں میری طرف متوجہ ہوتے تھے۔ جب میری نظر پڑتی تھی تو میری نظر بدل لیتے تھے۔ میں حیران بھی تھی اور پریشان بھی تھی۔

پھر میں نے سوچا کہ شاید میری شکل کسی سے ملتی ہے جو سر اس قدر غور کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی میرا خیال تھا۔ اللہ جانے معاملہ کیا تھا۔

سر اُس واقعہ کے بعد سے کلاس میں مجھے مخاطب بھی نہیں کرتے تھے۔ میرے لیے یہی کافی تھا۔ واقعات اتنے غیر واضح تھے کہ میں کسی سے ذکر بھی نہیں کر سکتی تھی۔

گھر میں اپنی چھوٹی بہن سے ذکر کیا تھا۔ مگر اُس نے کہا کہ سارینہ یہ تمہارا وہم ہے۔ "کیونکہ میں نے خود ہی تو بتایا تھا کہ سر بہت اچھے ہیں اور غیر ضروری بات چیت بھی نہیں کرتے تھے۔ میں بھی مطمئن ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

پھر ایک دن کلاس کے دوران میں دروازے کے بالکل ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ سر وہاں آ کر

یونیورسٹی میں میرا داخل ہوا تھا۔ سابقہ کلاس کی کامیابی کے بعد یونیورسٹی میں داخلے پر میں رب تعالیٰ کی مشکور تھی۔ اور نئی کلاسز کا جوش و خروش بھی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں تعلیم کے معاملے میں ہمیشہ نارٹل سی رہی ہوں۔ مگر محنت اور کوشش ضرور کرتی ہوں۔ یہاں میں ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ میں بالکل عام سی لڑکی ہوں۔ قبول صورت نین نقش اور گہری سانولی رنگت کے ساتھ میری شخصیت میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

اعتماد نام کی چیز نہیں ہے میرے اندر۔ حالانکہ میری امی اور میری بہنیں خاصی خوش شکل ہیں۔ شاید اسی وجہ سے میں احساس کمتری کا بھی شکار ہوں۔ بات کہاں سے کہاں چلی گئی تو میں کہہ رہی تھی کہ نئی کلاسز کا آغاز تھا۔ میں نے چونکہ ایم اے ایجوکیشن میں داخلہ لیا تھا۔ تو مختلف کلاسز میں ہمیں میل اور نی میل اساتذہ پڑھاتے تھے۔

میں نے کہا نا میں عام سی لڑکی ہوں اسی لیے عام لڑکیوں کی طرح بناؤ سنگھیا کرنے کی بجائے میں سادگی سے یونیورسٹی جاتی تھی۔ سادہ سے لباس میں میک اپ کے بغیر چہرہ۔

نفسیات کی کلاس ہماری سر احمد حسن لے رہے تھے۔ ساری کلاس کو سر احمد حسن بہت بھاتے تھے۔ سر تھے بھی بہت خوش اخلاق اور شفیق۔ ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے نہایت نرمی سے بات کرتے تھے۔

ایک اور بات جو مجھے اچھی لگی تھی کہ لڑکیوں کے ساتھ فری نہیں ہوتے تھے۔ مجھے بے تکلف ہونے والے اساتذہ بالکل پسند نہیں تھے۔ استاد میں ایک وقار ہونا چاہیے۔ استاد چونکہ روحانی باپ کا درجہ رکھتے ہیں، اس چیز کا انہیں خود بھی خیال رکھنا چاہیے۔ اور میں تو خواتین اساتذہ کی نسبت، میل ٹیچر سے بات کرنا تو دوران کی طرف دیکھتی بھی نہیں ہوں۔ کچھ گھر کے ماحول اور اندرونی طور پر میں کسی حد تک مذہبی ہوں۔ اسی لیے بغیر ضرورت اساتذہ پر غیر ضروری نظر نہیں ڈالتی کہ وہ نظر بھی تھنہ نہ بن جائے۔

☆.....☆.....☆

ایک اور بات جو ضروری ہے کہ میں نے محسوس کیا تھا کہ سر کہیں جاتے جاتے مجھے مڑ کر ضرور دیکھتے تھے اور میرے دیکھنے پر جلدی سے نظر چرا لیتے تھے۔ جو کہ مجھے بہت عجیب لگتا تھا۔

حالانکہ میرے خیال میں عام طور پر اساتذہ ایسا نہیں کرتے کہ اپنے اسٹوڈنٹ کو آتے جاتے غیر ضروری طور پر دیکھتے رہیں۔ حالانکہ باقی پیچرز بھی تھے جو سلام کا جواب دے کر گزر جاتے تھے۔ نہ جانے یہ کیا مسئلہ تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک مرتبہ میرا پیپر بہت بُرا ہوا تھا کہ اُمید نہیں تھی کہ پاس بھی ہوں کہ نہیں مگر حیرت انگیز طور پر میرے نمبر سب سے زیادہ تھے اور یہ پیپر بھی سراج احمد حسن کا ہی تھا۔ میں نہیں جانتی کہ سب کیا تھا۔ غور بھی کروں تو جواب نہیں ملتا۔ کسی دوست سے بھی ذکر کروں تو وہ کوئی جواب تلاش کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میرے اور سیر کے درمیان شیطان تھا۔

آپ کو حیرت تو ہونی ہوگی مگر غور کریں تو آپ بھی متفق ہوں گے۔ کہ بظاہر سیر نے کچھ ایسا نہیں کیا جو قابل اعتراض ہوتا۔ میری حس شاید بہت تیز تھی۔ پھر یہ سب صرف شیطانی حرکات ہی ہو سکتی ہیں۔ لیکن میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ مجھے کسی فتنے سے بچالیا اور یہ سب اُس کا کرم اور میری امی کی دعائیں تھیں۔ ورنہ کچھ بھی ایسا غلط ہوتا جو میرے گھر والوں کے لیے باعثِ شرمندگی ہوتا۔ یہ میرے کردار کی مضبوطی نہیں ہے صرف میرے رب کا کرم ہے۔

میری یہ کہانی سنانے کا یہ مقصد تھا کہ لڑکیاں میل اساتذہ کے ساتھ محتاط رہیں۔ اُن کا خواہ مخواہ فری ہونا نوٹ کریں اور کوئی موقع ایسا نہ دیں جس سے دوسرے کو کوئی غلط فہمی ہو۔ ورنہ ذرا سی غلطی سے دنیا اور معاشرے میں کتنے کتنے جہنم لیتے ہیں۔ اور پھر سب بچ بھی نہیں پاتے۔ کوئی نادان شیطانی حرکات کو سر کی بے لوث محبت سمجھ بیٹھے تو کیا ہوتا؟ غور ضرور کریں۔ احتیاط واقعی بہت ضروری ہے۔

☆☆.....☆☆

کھڑے ہو گئے۔ میری گھڑی میری فائل پر پڑی تھی۔ ایک لڑکی ڈانس پر آ کر لیکچر دے رہی تھی۔ سر سمیت ہم سب متوجہ تھے۔ مگر شاید میری گھڑی کی طرف متوجہ تھے۔ سر مجھے مخاطب کر کے ٹائم بھی پوچھ سکتے تھے۔ مگر سر نے میری گھڑی اٹھا کر خود ٹائم دیکھا تھا۔ مجھے کوفت تو ہوئی مگر کیا کر سکتی تھی۔ اول تو سر کے اس قدر قریب کھڑے ہونے پر میرا موڈ خراب تھا اور پھر گھڑی اٹھالینا میرا موڈ مزید آف ہو گیا تھا۔

اگلے دن میں نے اپنی جگہ شعوری طور پر بدل لی۔ میں سر کو کوئی مزید موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ سر کی شخصیت کے برعکس یہ سب بہت حیران کن تھا۔

مگر سر اُس دن بھی میرے نزدیک ہی کھڑے رہے تھے۔ اب تو میری آنکھوں میں بے بسی سے آنسو آ گئے تھے۔ اب مجھے سر سے چڑھی ہو رہی تھی۔

اب میں ایسی کوئی حوریری بھی نہ تھی جو بات سمجھ میں آتی۔ میری سمجھ سے باہر تھیں یہ باتیں۔ میں سر کے روم میں بھی بہت کم جاتی تھی۔ اکیلی تو بالکل نہیں مگر کسی لڑکی کے ساتھ جاتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا سر سے دل خراب ہو اسی وجہ سے میری کوشش تھی کہ میں سر سے دور رہوں۔

ایک بار ضروری کام کے سلسلے میں مجھے چند لڑکیوں کے ساتھ سر کے روم میں جانا پڑا۔ میں شعوری طور پر خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی کہ اتنی دیر میں سر نے کہا۔

”سارینہ آپ میرے پاس آئیں۔“ میں ابھی اسی سوچ میں اٹھنے والی تھی کہ ایک لڑکا آیا اور سر سے ضروری بات چیت کرنے لگا۔ میں نے شکر ادا کیا اور کام ختم کر کے باہر کو بھاگی۔

اس کے بعد سر نے مجھے لڑکیوں کی موجودگی میں بھی بلانا شروع کر دیا کہ سارینہ آپ بہت چپ ہیں۔ آپ کوئی بات نہیں کریں گی۔“

میں نے کیا کہنا تھا البتہ سر مزید چھکا لیا تھا۔ میں اب بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔ سر آخر چاہتے کیا ہیں؟ یہ وہ سوال تھا جو کہ آج

بیک حل طلب ہے۔

READING
Section

جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس سمجھ سکتی ہیں

انسانوں کے جنگل میں

شازلی سعید مغل

اس مرد کی کہانی، جو انسانوں کے جنگل میں ایک غیر انسانی مخلوق بن کر رہ گیا تھا

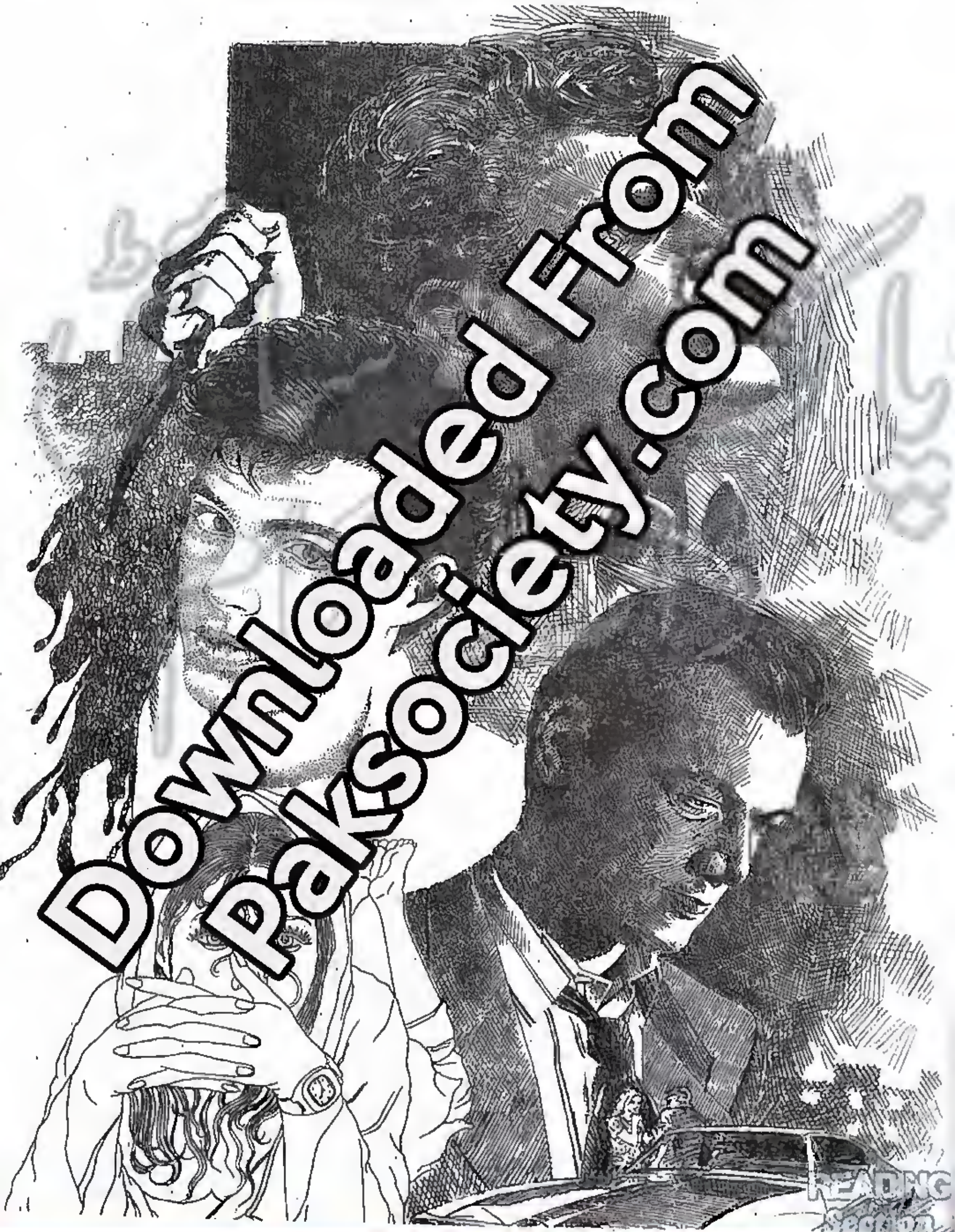
دیکھ کر پھولے نہیں سماتی تھیں اور آج بھی جس دن سے شمر گل کو نزوس بریک ڈاؤن ہوا اس دن سے وہ شمر کی بیٹی سے جڑا بیٹھا تھا۔ کتنے ہی آنسوؤں بھرے سجدے تھے جو اس نے رب کے آگے کیے تھے۔ شمر کی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ اسے اللہ رب العزت کی بارگاہ سے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا گیا تھا۔ شمر گل نے آنکھ کھول دی تھی، وہ بچ گیا تھا۔ سب کو لگ رہا تھا کہ وہ موت سے زندگی جیت کر آیا ہے مگر اگر سانس لینا زندگی تھا تو ہاں وہ زندہ تھا۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ جسم کے اس خوبصورت ڈبے کے اندر کا اصلی جوہر دور کہیں نکل گیا ہے۔ بس جسم کا خوبصورت ڈبا رہ گیا تھا۔ جس کی پذیرائی کی جا رہی تھی۔

شمر گل کے وجود کو چھوٹے موٹے زلزلوں سے آشنائی تو بچپن سے ہی تھی۔ وہ بچپن کا پہلا واقعہ دھندلا ہی رہ جاتا اگر اس کی ماں وقتاً فوقتاً عمر کے ساتھ دہرا دہرا کے اُسے گہرا نہ کرتی رہتیں۔ کہ کس طرح آن کی آن میں اپنی پہلی نئی سائیکل خالہ کے بیٹے کا شان کو دے دی تھی کہ وہ شمر گل کی شاندار سی نئی سائیکل دیکھ کر پھل اٹھا تھا۔ خالہ کو اُن کی کم مائیگی کے احساس نے شرمندہ سا کر ڈالا تھا۔ انہوں نے اس بات پر کزن

شمر گل کا خاندان صرف چار افراد پر مشتمل تھا۔ ابا، اماں اور ایک پندرہ سالہ بڑا بھائی..... اور وہ خود۔ ابا ایک معقول سے چلتے ہوئے کاروبار کے مالک تھے جبکہ اماں پڑھی لکھی مگر سادہ سی گھریلو خاتون تھیں۔ بھائی برطانیہ سے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا تھا اور اب اپنے ملک کی ایک یونیورسٹی میں بطور لیکچرار علم کی روشنی پھیلا رہا تھا۔ عمر کے اس 15 سالہ فرق کے باوجود شمر گل کے بڑے بھائی گل محمد کی جان شمر گل میں بست تھی۔ اس نے سارا بچپن ترستے ہوئے ایک ننھے بھائی بہن کے طویل ترین انتظار میں تنہا گزارا تھا۔ جب شمر گل غیر متوقع طور پر اس دنیا میں آیا تو گل محمد کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ابا اماں کے مطابق بھی یہ گل محمد کی بچپن سے مانگی ہوئی دعاؤں کا ثمر ہی تو ہے۔ چنانچہ یہ گل تھا شمر ہوا یعنی 'شمر گل' گل محمد نے نام اپنی مناسبت سے رکھا۔ پڑھائی کے بعد سارا وقت وہ شمر کو پھیلی کا چھالہ بنا کے رکھتا تھا۔ اماں سے چھین کے نہلانا دھلانا خود کرتا تھا یہ اور بات تھی کہ اماں کو بعد میں مدد کے لیے پکارنا پڑتا تھا۔

شمر گل تھوڑا سا بڑا ہوا تو گل محمد اپنے ساتھ کھلانے لگا اس کا ہر کام کرنے کی کوشش کرتا۔ اماں دونوں کا پیار

کاشان کو ایک تھیٹر بھی جڑا لایا تھا۔ مگر ٹرن گل نے بڑی
فراخ دلی سے اپنی سائیکل کاشان کو دے دی ہمیشہ کے
لیے۔
خالی تو بہت جڑ بڑ ہوئی تھیں، کاشان کو گھور کر



READING
Section

ضروریات پوری کرتا تھا۔ پینل، ربر، شاپنرز، کلر مارکرز، اسکلنغ رض کوئی بھی چیز کسی کی بھی، کسی بھی وقت ختم ہو جاتی یا کھو جاتی تو وہ بڑے حق سے ٹرگل کے جیومیٹری بکس کا رخ کیا کرتا۔

ٹرگل کا بڑا بھائی ابا، اماں اُسے آئے دن نٹ نٹے ڈیزائنز کے ربرز شاپنرز، پینسلز، مارکرز وغیرہ لاکر دیتے ہی رہتے تھے اور وہ کچھ خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت اپنی جیب خرچ سے بھی خریدتا رہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

ٹرگل کی اماں اُن کو اکیلا گھر میں چھوڑ کر جانے سے تھوڑا خوف کھانے لگی تھیں حالانکہ اب وہ 9th کلاس میں آچکے تھے۔ بچے نہیں رہے تھے زیادہ، لیکن ان کی اماں ابا کے ساتھ، ٹرگل کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر بہت مجبوری کی حالت میں جاتی تھیں۔ وجہ وہی تھی، سماج سیوا..... ماں باپ کی غیر موجودگی میں کوئی سائل، کوئی فقیر آ جاتا..... ٹرگل سے سوال کرتا۔ اس کے پاس نقد کچھ نہ ہوتا تو وہ فقیر کوڑکنے کا کہتا اور گھر میں ادھر ادھر چکراتا پھرتا، خالی ہاتھ لوٹانا اُس کی شان کے خلاف جو تھا۔ کچھ نہ بن پڑتا تو اپنے گھر سے آنا، چینی، چادل جو جو ہاتھ لگتا اٹھا کر دے دیتا۔ ایک بار سردیوں میں اپنے اوڑھنے والا لحاف اور بھائی کا کبیل بھی ایک فقیر جوڑے کو دے ڈالا تھا۔ ماں باپ جب گھر واپس لوٹتے تو اماں کچن اور اسٹور کا جائزہ لینا نہ بھولتیں اور پھر جس بات کا دھڑکا لگا ہوتا وہی بات سامنے آ جاتی۔ کچن آدھا خالی ملتا اور اسٹور حسبِ توفیق..... ٹرگل حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر مسرور سا بیٹھا ہوتا تھا۔ اماں غصے میں آگے بڑھتیں ٹرگل کی کلاس لینے مگر ابا آڑے آ جاتے۔

”چھوڑ د جانے دو، ہمارا بچہ نیک کام کرتا ہے۔ ہمیں اللہ نے دیا ہے تو کیوں نہ اُس کی اور مخلوق کو شامل کر لیں۔ تھوڑا سا خرچ کر ڈالیں۔“

”تھوڑا ہے! سمجھ صاحب۔“ اماں کچن کی بد حالی کی طرف اشارہ کرتیں۔ جہاں تقریباً سارے ڈبے آدھے یا پورے خالی پڑے ہوتے تھے۔ سمجھ صاحب جواب میں تہقہہ مار کر ٹیلی فون لے کر ایک طرف بیٹھ

سائیکل واپس کرنے کے اشارے بھی دے رہی تھیں۔ مگر ٹرگل نے اپنے ابا کی طرف بڑے یقین سے دیکھا اور کہا۔

”مجھے تو ابا کل اور لادیں گے، ہیں نا ابا؟“ ٹرگل سر اپا یقین بنا اپنے ابا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں، ہاں بیٹا کیوں نہیں، ہم تمہیں کل اور سائیکل لادیں گے۔“ ابا نے ٹرگل کے یقین پر اعتماد کی مہر لگادی۔

”جاداب جا کر دونوں بھائی سائیکل چلا د..... شاباش۔“ خالہ نے ٹرگل کو بہت محبت سے چمکارتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ کیا..... کاشان نے ٹرگل کے سائیکل کی جانب جو بڑھتے قدم دیکھے تو دونوں ہاتھوں سے سائیکل دبوچ کر صدر دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ اپنی ماں کو بلند آواز میں بلا رہا تھا کہ اب گھر چلیں۔ اس کا شور بڑھتا ہی گیا۔

سائیکل ملتے ہی وہ اب یہاں ایک منٹ ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ٹرگل نے اُس کی بڑی منتیں کیں، بڑی سماجت کی کہ وہ ایک مرتبہ تو اس سائیکل پر اُسے بیٹھنے دے، مگر نہیں..... کاشان تو دھاڑیں مار کر روتے ہی لگ گیا۔ خالہ تو بس شرمندہ شرمندہ اٹھیں اور کاشان بمعہ سائیکل اپنے گھر کو روانہ ہو گئیں۔ اس دن ٹرگل بہت اُداس د لگتا تھا۔ وہ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا اور پھر کھانا کھائے بغیر ہی سو گیا۔ ماں نے اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں اٹھا۔

صبح اٹھا تو اُس کے گالوں پر آنسوؤں کے نشانات تھے۔ پتا نہیں سوتے سوتے ردیا یا روتے روتے سویا؟ مگر دوسرے دن وہ حسبِ معمول اسکول گیا اور جب واپس گھر آیا تو دیکھا ایک خوبصورت پہلے سے بھی اچھی چچھائی سائیکل اس کے گھر کے آنگن میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ سائیکل کو دیکھ کر مسرت سے چیخ اٹھا اور کل کا واقعہ بھول گیا۔

وقت تھوڑا سا اور سرک گیا۔ مگر اس دوران ٹرگل کے ساتھ اس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے۔ اپنی کلاس میں تو وہ ان چیزوں کے لیے بہت مشہور تھا۔ اس کا جیومیٹری بکس پوری کلاس کی ایمر چنسی

جائے۔ ایک سپر اسٹور کو نوٹ لگاتے۔ سٹٹ تیار کرواتے۔ شام سے پہلے ٹرگل کی اماں کا بچن اور فریج دوبارہ اللہ کی دی گئی نعمتوں سے بھر جاتا۔ ابا فخریہ کہتے۔

”دیکھو ٹرگل کی اماں دینے سے مال بڑھتا ہے۔ میرا بیٹا سخی ہے سخی۔“

اور اماں نے کچھ کہنے سننے کے بجائے اُس کا سیدھا حال یہ ڈھونڈا کہ اب کہیں مجبوراً ٹرگل کو چھوڑ کر جانا ہوتا تو ٹرگل کی کھانے پینے کی چیزیں کھانے کی میز پر رکھ کر وہ بچن اور اسٹور کو باقاعدہ سیل بند کر کے یعنی تالا لگا کر جاتی تھیں۔

وقت اپنی مخصوص جال سے آگے سرکتا گیا۔ مگر ٹرگل کے خدمتِ خلق کے دائرے کو بھی حتی الامکان وسیع کرتا گیا۔

شراب کالج کے دوسرے سال میں تھا بلکہ دوسرا سال بھی ختم تھا۔ امتحان دے چکا تھا زلٹ کا منتظر تھا۔ اس کے بعد وہ ایک آرٹ کالج میں ایڈمیشن لینے والا تھا۔ پینٹنگ کے حد درجہ بڑھے ہوئے شوق اور مہارت نے اس کے خدمتِ خلق کے کاموں میں مدد کی تھی۔ جب امیر شہر کی جانب سے انٹر کالجیٹ پینٹنگ کا ایک مقابلہ منعقد کیا گیا تھا تو ٹرگل کی پینٹنگ نے یہ مقابلہ جیتا تھا۔ اُس سے حاصل ہونے والی انعامی رقم اور پھر پینٹنگ کے اچھے داموں سیل ہونے والی رقم سے اُس نے ایک حاجت مند کی مدد کی تھی۔ تب سے ہی اُس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ آرٹ کی اسی فیلڈ میں تعلیم حاصل کرے گا۔ پینٹنگز بنا کے بیچا کرے گا ایک اور اچھا ذریعہ تھا، ہنر تھا اس کے پاس سماج سیوا میں مدد کرنے والا۔

پھر ایسا بھی ہوا کہ ٹرگل نے دھوکے بھی کھائے۔ کیوں نہ کھاتا دنیا خود ایک دھوکہ گھر جو ہے۔ کئی دوست احباب مطلب نکلنے تک دوست رہتے، مطلب نکلنے کے بعد وہ ٹرگل کو دیکھ کر کترا ہی جاتے تھے۔

’پتا نہیں کیوں؟ یہ کیوں؟‘ ٹرگل کو بہت ڈسٹرب کرتا تھا اور اس مرتبہ کے کیوں؟ نے تو ٹرگل کو اسپتال کے بستر پر لایا تھا۔

اس مرتبہ اس کی ہمدرد طبیعت، رحم دلی اور فیاضی سے صرف غلط فائدہ ہی نہیں اٹھایا گیا تھا۔ کیونکہ ایسا تو اُس کے ساتھ ہوتا ہی رہتا تھا، وہ سہہ جاتا تھا۔ مگر اس بار تو بات حروف سے نکلی ہوئی تھی۔ اتنی کہ اُس کی ذات کے پر نچے اڑ سے گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

ٹرگل شہر کے ایک بہترین آرٹ کالج میں ایڈمیشن لے چکا تھا۔ یہ ایک کواہجو گیشن کالج تھا۔ ٹرگل کلاس میں بھی لڑکیاں موجود تھیں۔ کالج میں ایک سے ایک آرٹ کے دلدادہ، فسوں گر موجود تھے جن کی جادو گر انگلیاں کینوس پر وہ مناظر پینٹ کرتیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ بڑے بڑے بہترین آرٹسٹ اس کالج کی پہچان بنے۔ ایک سال کے اختتام پر ٹرگل نے بھی ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ٹرگل کو کہ سب کا دوست تھا۔ مگر بابر سے اس کی دوستی تقریباً پانچ سال پرانی تھی۔ بابر اس کا پڑوسی بھی تھا۔ اور اب اس کے ساتھ اس آرٹ کالج میں اُس کا کلاس فیلو اور بہترین دوست، دونوں بہت سیادقت ساتھ گزارتے تھے۔ دلچسپیاں بھی اُن کی مشترکہ تھیں۔ کم ہی وہ دونوں ایک دوسرے سے کوئی اختلاف رائے رکھ پاتے تھے۔ بڑے بھائی کے بعد ٹرگل کی زندگی میں بابر کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس آرٹ کالج میں اب ٹرگل اور بابر کا دوسرا سال بھی اختتام پذیر تھا۔ اُن کے ایگزام نزدیک ہی تھے۔ اس دن ٹرگل لائبریری میں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا سامنے کھلی کتاب سے کچھ پوائنٹ آؤٹ کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ سامنے والی کھڑکی پر پڑی۔ لائبریری کی یہ کھڑکی اس حصے کی طرف کھلتی تھی جہاں پر ایک چھوٹا سا جنگل اُگ آیا تھا۔ کیونکہ یہ کالج کا عقبی حصہ تھا۔ انتظامیہ نے اس طرف سے کچھ سستی برتی ہوئی تھی اور یہ جگہ یوں ہی چھوڑ رکھی تھی۔

وہ بھی ایک بڑے سے گول پتھر پر ایک زرد رنگ کے پھولوں سے لدے جھاڑ کے نیچے بیٹھی تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے وہاں بیٹھی پھل سے آرٹ پیپر پر اسکیچز بنا رہی تھی۔ اس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ اُسے معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی گلہری اس کے آس

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ شمر گل کی بھگتی نگاہوں کا مرکز کون ہے۔ اس کی ساتھی لڑکیاں آپس میں ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتیں اور پھر قہقہے بکھر جاتے۔ بابر وہاں سے شمر کو گھسیٹ کر لے جاتا۔

”بیڑا غرق ہو تمہارا، اس طرح کام نہیں چلتا۔ تم پاگلوں کے مانند کیوں ہو جاتے ہو، اُس کے سامنے؟“

شمر گل سر جھکائے بیٹھا تھا اور بابر اُسے لتاڑ رہا تھا۔

”کتنی مرتبہ موقع ملا اس سے بات کرنے کا مگر تم ہونق بنے رہتے ہو یا۔ اگر ایسا ہی رہا شمر گل صاحب تو

آپ کے منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت نہ رہے گی۔ وہ وقت آ جائے گا۔ ویسے تو تم سماج سیوک ہو

اور ہر وقت ہر کسی کی مدد کے لیے ہر گھڑی تیار مگر کیا اپنی مدد کر پائے اب تک یا آئندہ کر پاؤ گے؟“ بابر

اس پر گرج برس رہا تھا اور شمر گل سر جھکائے بیٹھا تھا۔

بابر کی باتوں میں سچائی جو تھی، شمر گل آج تک جس طرح بھی ہولوگوں کی مدد کے لیے مشہور ہے مگر جب

خود اپنی مدد کا نام آیا تو ہاتھ پیر چھوڑے بیٹھا تھا۔ ان دنوں شمر گل صرف ہاتھ پیر ہی نہیں کھانا پینا بھی تقریباً

چھوڑے بیٹھا تھا۔

ماں باپ دونوں نے نوٹ کیا مگر شمر گل ٹال گیا۔

ماں کی چٹھی حسن بابر جس خدشے کی طرف اشارہ کر رہی تھی بالآخر وہ سچ نکلا۔ بابر نے ایک دن شمر کی ماں

کی شدید باز پرس کے آگے کچھ کچھ چھپا کے پوری بات بتادی۔ وہ کالج کا ذکر گول کر گیا۔ بس اتنا کہا کہ آنٹی

ایک لڑکی ہے شمر کو اچھی لگتی ہے مگر شمر اس کے بارے میں جانتا ہی نہیں کہ کہاں رہتی ہے؟ نہ ہی پوچھنے کی ہمت رکھتا

ہے۔“ بابر نے شمر گل کی ماں کے سامنے کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ تڑپ ہی اٹھیں۔ بابر نے تو اس کے بعد اپنے گھر

کی راہ لی۔ مگر شمر گل کی ماں نے شمر کو سامنے بٹھا کر نصیحتوں اور زمانے کی اونچ نیچ کا باقاعدہ دفتر کھول لیا

اور پھر رونے لگیں۔ شمر گل جو پہلے ہی پریشان تھا بابر کے اس طرح راز اُگلنے پر سچ و تاب کھانے لگا۔

ماں کو بڑی مشکل سے سب صحیح ہونے کا یقین دلا کر اور ماں کے بہت اصرار پر ناچاہتے ہوئے بھی کچھ کھاپی کر وہ اب بابر کے گھر کے دروازے پر کھڑا

پاس پھدک رہی ہے۔ شمر گل ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اُسے دیکھے ہی جا رہا تھا۔ اس وقت لائبریری میں خال خال لوگ ہی تھے۔ بابر جو کچھ دیر پہلے اُٹھ کر باہر گیا تھا۔ وہ دوبارہ کب آیا شمر کو پتا ہی نہیں چلا۔ بابر نے شمر کو آواز دی مگر شمر گل کا اٹھنا نہ ٹوٹا تو بابر نے باقاعدہ شمر کا بازو جھنجھوڑ ڈالا، تو وہ ہوش کی دنیا میں آ گیا۔

”کیا ہوا بھئی؟“

”وہ..... اوہ آدھر.....“ شمر نے نظروں سے اشارہ کیا تو بابر نے شمر کی نگاہوں کے تعاقب میں جھاڑ

میں چھپی لڑکی کی جانب دیکھا۔

”اوہ..... تو اس میں کیا ہے۔ وہاں تو اکثر لڑکیاں بیٹھتی ہی ہیں، لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے اس میں کمال کیا۔“

”نہیں، کچھ نہیں..... وہ وہاں گلہریاں بھی ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا۔“ شمر بے ربط سا بول رہا تھا۔

”گلہری..... اچھا نام ہے۔“ بابر معنی خیز انداز میں مسکرایا تو شمر جھینپ گیا۔

اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر اُس رات شمر گل کو نیند نہیں آئی۔ عجیب سی بے کلی تھی۔ پوری رات ٹہل کر بیٹھ کر گزاری تھی۔ آج چاند بھی بہت روشن تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بالآخر شمر گل پر یہ منکشف ہو چکا تھا کہ وہ کائنات کے سب سے حسین

جدبے کا اسیر ہو چکا تھا۔ وہ نیو ایڈمیشن ہے فرسٹ ایئر کا، بنفشہ نام ہے اس کا۔

”بنفشہ کتنا خوبصورت نام ہے۔“ شمر زرب بڑبڑایا۔ وہ بنفشہ کا نازک خوبصورت پھول لگتی ہے اپنے

نام کی طرح..... پھر تو ہر دن کے ساتھ بابر اور شمر ہر اس جگہ پائے جانے لگے جہاں بنفشہ کا گزر ہو۔ لائبریری

میں بھی وہ اُسی مخصوص جگہ اُسی کرسی پر بیٹھتے جہاں سے کھلی کھڑکی اور کھڑکی کے باہر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

اگر وہ کرسی خالی نہ ملتی تو شمر لائبریری کے دروازے سے ہی لوٹ جاتا تھا۔ دو تین مرتبہ بابر اور شمر امتاس

کے درختوں کے نیچے ایزل لگائے بظاہر کام میں مصروف نظر آتے مگر بنفشہ اور اس کی ساتھی لڑکیوں کو

تو بھی نتیجہ صفر ہی نکلا۔ بڑی مشکل سے شمر گل نے کھولتے دھاڑتے بابر کو ٹھنڈا کیا۔ بڑی منتیں سماجتیں کیں تب جا کر بابر راضی ہوا اور پھر طے پایا کہ یہ فریضہ اب بابر ہی انجام دے گا۔

اب بابر نے بنفشہ سے دوستی کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ہائے ہیلو سلام دعا کے بعد وہ روز کی رپورٹ شمر گل کو پیش کرنے لگا کہ آج بابر نے شمر گل کے حوالے سے کیا بات کی اور بنفشہ نے کیا تاثر دیا۔ ابھی سلسلہ چلا ہی تھا کہ بدلتے موسم کی لہروں نے شمر کو اپنے لپیٹے میں لے لیا۔ وہ تین دن شدید فلو کی زد میں رہا۔

☆.....☆.....☆

آج تیسرا دن تھا اس کی بابر سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ جب بابر آتا وہ سوتا ملتا، اماں بتاتیں کہ بابر چکر لگا کر گیا تھا۔ وہ اماں پر ناراض بھی ہوتا کہ اس کو اٹھایا کیوں نہیں۔ بنفشہ کی فکر نے اس کے بخار کو دو آتھہ کر رکھا تھا۔ وہ باہر جانے اور بابر سے ملنے کو بے تاب تھا۔ اسی تڑپ میں دو تین دن اور گزر گئے۔ اب شمر گل کی طبیعت بہت بہتر ہو چکی تھی۔ بابر اس سے ملنے آیا تو وہ اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں اپنے پسندیدہ کوئی ہاؤس میں بھاپ اڑاتی کوئی کے پیچھے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بابر نے بات ہی ایسی بتائی تھی کہ بنفشہ کی منتیں ہو رہی ہے۔ جسے سن کر شمر گل کا وجود دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

”تم نے اس سے میرے لیے کوئی بات نہیں کی۔“ شمر گل نے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کی تھی.....“ بابر ناخن سے میز کی سطح کو کھرچتے ہوئے بولا۔

”پھر!“ شمر گل دل کو سنبھالتے ہوئے بڑے لاچار سے انداز میں بولا۔

”چھوڑو بار، شمر کیا دنیا میں ایک ہی بنفشہ ہے۔ اس سے اچھی اچھی لڑکیاں ہیں..... اور تم میں کوئی تھی بھی نہیں۔ تم چھوڑو اس کا خیال۔“ بابر نے ہمت کر کے شمر گل کو سمجھایا۔

”میں نے جو پوچھا اس کا جواب دو۔“ شمر گل نے بابر کی ہر بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہوا

تھا۔ شمر گل نے باقاعدہ بابر پر وہ ہتھ لگا دیے۔ بہت لعن طعن کے بعد بابر اور شمر گل میں طے پایا کہ بابر شمر کے لیے کام کرے گا۔ یعنی وہ بنفشہ تک شمر گل کے دل کی بات پہنچائے گا اور ان کے درمیان پل کا کام دے گا۔ شمر گل کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور وہ بابر کی دوستی کا تہہ دل سے قائل بھی ہو چکا تھا۔ پھر اس کے بعد بابر نے اپنا کام تیزی سے کرنا شروع کر دیا اب شمر گل پیچھے اور بابر آگے آگے رہتا تھا۔

بابر ایک تیز طرار لڑکا تھا۔ جلد ہی وہ بنفشہ کا فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نمبر لا کر اس نے شمر گل کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

”اب آگے تمہارا کام ہے۔“ بابر نے کہا۔

”مگر میں کیسے بات کروں گا۔“ شمر گل کو گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔

”او بابا معاف کرو پھر..... بس کرو۔ چھوڑو یہ محبت و جنت تمہارے بس کا روگ نہیں یار۔“ بابر نے باقاعدہ شمر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”لاؤ نمبر واپس دو۔ کوئی ضرورت نہیں تمہیں اس کی۔“ بابر نے شمر سے وہ چٹ چھیننا چاہی جو اس کی منگیلی میں تھی۔

”نہیں نہیں میرے یار..... میں ضرور کروں گا بات۔“ شمر گل نے بابر کو چکارے ہوئے کہا۔

”ٹو ناراض تو نہ ہو پلیز۔“

”ہاں یہ ہوئی نا بات۔“ بابر نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”بہادر بن بہادر۔“

اور پھر شمر گل نے واقعی بہادری دکھائی۔ کئی مرتبہ بنفشہ کا سیل نمبر لڑائی کیا اور دوسری طرف سے بنفشہ کی خوبصورت آواز سنتے ہی رکھ دیا۔ دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ شمر گل کانپتے لرزتے ہاتھوں اور دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ فون کرتا مگر بنفشہ کی آواز سنتے ہی رکھ دیتا۔ ایک مرتبہ جی کڑا کر کے بات کی بھی تو اتنی کہ ”میں ڈونیشن کے لیے بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ اور سامنے بیٹھے بابر نے بری طرح اپنا سر پیٹ ڈالا۔ اتنے دن کی ناکامی کے بعد بابر نے اپنے سامنے فون کر دیا

سے سب بہت پریشان ہیں مگر وہ مجبور تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کے وجود سے روح ہی کھینچ لی گئی ہو۔ وہ پتھر سا ہو رہا تھا بظاہر حالت تو سب جانتے تھے مگر اس کے دل کی حالت سب سے چھپی تھی۔ لیکن ہفتہ بعد شمر گل نے وہی کیا جو اس کی طبیعت کا اولین خاصہ تھا۔ بڑی بہادری کے ساتھ اپنے دل کو نظر انداز کرتے ہوئے سوگوار روح کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ کب تک سوگ مناسکتا تھا؟ وہ اکیلا نہ تھا..... اس کی بیماری کے ان پندرہ دنوں میں اتنے لوگ اس کے دروازے پر آئے اور اتنے ہی فون اس کے لیے آئے کہ اس کی ماں حیران رہ جاتی۔

اس کی دوبارہ باہر سے ملاقات بھی نہیں ہو پارہی تھی۔ بہت مصروف تھا وہ آج کل، اس کی بیماری کی وجہ سے بہت سے کام ادھورے رہ گئے تھے۔

آج بھی وہ ایک بیمار بچوں کے فلاحی ادارے سے لوٹا تھا جب اس کی اماں نے باہر کی منگنی کا کارڈ اس کے سامنے لا کر رکھا۔

”باہر کی اماں دے کر گئی ہیں۔“

”باہر کی منگنی؟“ اسے تھوڑی حیرانی تھی۔

”کیا تمہیں نہیں پتا تھا کچھ۔“ اس کی اماں اس کی حیرانگی پر حیران تھیں۔

”نہیں تو! مجھے تو کچھ نہیں بتایا تھا اُس نے۔“

”تمہاری طبیعت بھی تو خراب رہی ہے، اتنے دنوں تک۔ اُس کی اماں بھی کہہ رہی تھیں کہ بس لڑکی والوں کا اصرار ہے کہ منگنی کر لیں اور پھر باہر کی بھی یہی خواہش تھی۔“ اس کی اماں تو یہ کہہ کر منگنی کا کارڈ اُسے تھما کر چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن اُسی کوئی ہاؤس میں باہر اور شمر آسنے سامنے بیٹھے تھے۔ اُس کے کیوں، کیا کیسے کے جواب میں باہر نے تو بس اتنا ہی کہا کہ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم ایسا ری ایکشن بھی دے سکتے ہو۔“

”نہیں دینا چاہیے تھا کیا۔“ شمر گل نے بے یقینی سے باہر کی جانب دیکھا۔

”نہیں یار! میرا مطلب ہے کہ تم ایک ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی ہو۔ یا ایسے لوگوں کو حقیقت تسلیم

”صاف صاف سُنا چاہتے ہو۔؟ ہمت ہے؟“

”ہاں ہے..... شمر گل اتنا کمزور بھی نہیں جتنا تم

سمجھتے ہو یا پھر وہ.....“

”تو پھر اُس نے انکار کیا ہے۔“ باہر نے بالآخر

امید کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے کہا۔

”اب کے... بس پھر مجھے گھر چھوڑ دو۔“ شمر گل

بالکل سپاٹ لہجے میں بولا۔ باہر اس سے کچھ اور بھی کہنا

چاہتا تھا۔ مگر شمر کچھ کہنے یا سننے کے موڈ میں نہ تھا۔ اس

نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”کیا تم اور کچھ جاننا نہیں چاہو گے اس بارے

میں۔“ باہر نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ شمر نے روبرو کی مانند انکار یہ انداز

میں سر ہلا دیا۔ باہر نے گاڑی اشارت کر دی۔

”اوکے..... جیسے تمہاری مرضی۔“ پھر خاموشی

کے درمیان کوئی ہاؤس سے گھر تک کا راستہ طے ہوا۔

شمر گل کو اس کے گھر پر چھوڑ کر باہر نے اپنی راہ لی۔

☆.....☆.....☆

رات شمر گل کو پھر سے تیز بخار نے آیا صبح تک وہ

بے سدھ پڑا تھا۔ پھر سے ڈاکٹر بلا یا گیا۔ کیونکہ شمر گل

کہیں جانے کے قابل ہی نہ تھا۔ ماں پیشانی پر ٹھنڈی

پٹیاں رکھ رہی تھی اور ساتھ شمر گل کو یاد دلا رہی تھی کہ کل

وہ منع کر رہی تھیں کہ ابھی اُسے آرام کی ضرورت ہے۔

آدھے دن وہ گھر سے باہر رہا۔ تمام احتیاط پس پشت

ڈال کر..... یہ اُسی کا نتیجہ ہے۔“

شمر گل کو ڈاکٹر دیکھ گیا تھا۔ فکر کی کوئی بات نہ تھی۔

دوا میں تبدیلی کی تھیں اور کچھ اضافی نسخہ دے گیا تھا۔

دو تین دن میں شمر گل کی طبیعت میں بہتری کے

آثار نظر تو آئے مگر وہ اب بھی چپ چاپ بستر پر پڑا

چھت کو گھورتا رہتا۔ اماں بڑے اصرار کے ساتھ کچھ

کھلاتی تو چند لقمے زہر مار کر لیتا۔ گل محمد یونیورسٹی سے

واپس آ کر سارا وقت شمر گل کے ساتھ ہی رہتا۔ دلجوئی

کی باتیں کرتا مگر شمر ہوں، ہاں کے علاوہ کوئی جواب

دے ہی نہ پاتا تھا۔ سب گھر والے پریشان تھے اس کی

ایسی حالت پر۔ اُسے پتا بھی چل رہا تھا کہ اس کی وجہ

”آئینے کو.....“ شرگل نے دفاعی انداز اختیار کیا

ہوا تھا۔

”غلط آپ خود کو نہیں جانتے مسٹر شر!“ بنفشہ زہر افشانی کرتی جا رہی تھی۔ شر کے بدن پر ایک نا دیدہ لرزہ طاری ہو چکا تھا۔ وہ سنبھل رہا تھا۔ اس نے میز سے پانی کی بوتل اٹھائی اور پوری حلق میں انڈیل لی۔ دھوکہ فریب خصوصاً دوستی میں دیا گیا۔ دھوکا وہ بھی محبوب ہستیوں کا اُسے نکل رہا تھا۔ وہ بڑے ضبط سے صبر کا دامن تھامنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں بابر اور بنفشہ کو مسکنی کا کارڈ اس کی بندھنی میں چوراچورا ہو رہا تھا۔ اُس کی جانب اندھیرے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ جسم کا لرزہ اب ظاہر ہو رہا تھا۔

”تم دونوں چلے جاؤ میرے سامنے سے۔“

ساری قوت جمع کر کے بولا۔

”دیکھو اس کو، میں نہ کہتی تھی۔ ٹھنڈا گلشیر ہے یہ۔ اس کو فرق نہیں پڑتا کہ میں تم سے شادی کر رہی ہوں۔ اور تم بہت فکر کر رہے تھے اس کی۔ کیسے آرام سے کہہ رہا ہے چلے جاؤ۔ دان پن کی عادت ہے اسے۔ انسانوں والی کوئی بات ہی نہیں اس میں۔“ شر گل کی خاموشی بنفشہ کو خوب راس آ رہی تھی، وہ خوب ہی ہرزہ سرائی کر رہی تھی۔

”ایسی غیر انسانی مخلوق کے ساتھ انسانوں کا کیا گزارا۔ پھر دیکھو سوال بھی کرتا ہے ہم سے! ہونہہ۔“

شرگل کے کان بند ہو رہے تھے اب صرف ایک جملہ گردان کر رہا تھا کانوں میں، غیر انسانی مخلوق، کیا وہ عام انسانوں کے جذبات سے عاری ہے۔ انسان نہیں!

انسانوں والی بات نہیں، کیا کسی پر خطرناک حد تک اعتبار کرنا غیر انسانی فعل ہے۔ اُس کے آگے اندھیرے ناچ رہے تھے۔ اس کے جسم کا لرزہ بڑھا، اور بڑھا اور پھر اس کے پرچے اڑاتا، باہر نکل آیا۔

اُس کا زورس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھ اسپتال کے بستر پر کھلی۔ بچ گیا تھا وہ سانس لے رہا تھا۔ واقعی وہ غیر انسانی مخلوق تھا اپنے ارد گرد بے انسانوں کے جنگل میں۔

☆☆.....☆☆

کرنا بہت آسان ہوتی ہے۔“ بابر مسکرا سا دیا۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔ میں حقیقت تسلیم کر دوں اور تم کیا کرو؟ یہ، جو کیا ہے؟“

”میں تو سچ میں اُسی دن تم کو بتا دینا چاہتا تھا۔ جب بنفشہ کی مسکنی کی خبر دی تھی۔“ بابر نے اکتے ہوئے کہا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں تم سے کیسے پیش آؤں؟ اتنی بڑی خبر مجھے تمہارے مسکنی کے کارڈ سے ملی۔ تم مجھے خود نہیں بتا سکتے تھے کہ..... کہ۔“

”کیا؟“ پیچھے سے بنفشہ کی آواز ابھری۔

”تم..... ادا..... آؤ۔“ شرگل آج بالکل بھی بنفشہ کے سامنے پزل نہ ہوا تھا بلکہ ایک عجیب سی تمکنت کا اظہار اُس کی ذات سے ہو رہا تھا۔

”اچھا تو کیا مسٹر شرگل؟ آپ جو بابر سے کہہ رہے ہیں مجھ سے پوچھیے۔ آپ کو جواب چاہیے؟ مجھ سے گیس آپ جواب؟“

”میں نے آپ سے سوال نہیں کیا جو آپ سے جواب لوں۔“ شرگل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”پلیز بنفشہ چپ ہو جاؤ پلیز۔“

”مگر میں چپ نہیں رہ سکتی۔“ بنفشہ پھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ بنفشہ کا ہر انداز شرگل کو ہی نہیں بابر کو بھی ورطہ حیرت میں ڈال رہا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے شر کے سامنے تنی کھڑی تھی۔

”اتنا زہر بھرا ہے تمہارے اندر، میرے خلاف۔“ شرگل بنفشہ کا یہ روپ دیکھ کر بھر بھرے انداز میں گویا ہوا۔ اُسے خود اپنی آواز جیسی معلوم دی۔

”شرگل صاحب! محبت کسی کی جاگیر نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ دان پن کی جانی ہے۔ آپ ایک حقیقت پسند انسان ہیں اور مختلف بھی۔ کبھی آئینہ دیکھا ہے غور سے آپ نے۔“

”بنفشہ پلیز!“ بابر نے کمزور سا احتجاج کیا۔ مگر بنفشہ نے ہوا میں اڑا دیا۔

”کیوں کیا ہوا ہے مجھے؟“ شرگل کی تمکنت دوبارہ عود آئی۔ ”میں جانتا ہوں خود کو۔“

”ایسا تو نہیں کہ آئینے میں خود کو دیکھ کر پتھر مارنے کو دل کرے۔“

ایک چھوٹی سی لوائسٹوری

لکھنؤ پریس بلوچ

اُس نوجوان کا قصہ، جس کی محبت فقط چار دن ہی کی ثابت ہوئی تھی

گیا۔ وقت کا بے لگام گھوڑا اپنی مخصوص رفتار میں دوڑتا رہا اور میں نے میٹرک اعلیٰ نمبروں سے پاس کر لیا۔ اب میں جان چکا تھا کہ میرا بچپن یہاں نہیں بلکہ میری خالہ کے گھر گزرا ہے۔ تب مجھے شدت سے اُن کی یاد آنے لگی۔ میری خالہ میرے لیے ماں ہی کے درجے پر فائز تھیں۔

میٹرک کے بعد میں نے مزید پڑھنے کی ضد کی کہ مجھے بہاولنگر میں کسی کالج میں ایڈمیشن دلوا دیں۔ میرے پڑھنے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس لیے گھر والوں نے بخوشی مجھے میرے پسند کے کالج میں داخل کروا دیا۔ میں بہت خوش تھا کہ چلو اب میں خالہ جی سے مل لیا کروں گا۔

میں نے اپنا سامان تیار کیا اور دوسرے ہی دن کالج میں داخلہ کروا کے ہوسٹل میں سیٹل ہو گیا۔ میں دن بھر کالج میں پڑھتا رہتا اور جب چھٹی ہوئی تو خالہ جی کے گھر چلا جاتا اور رات ہوسٹل میں گزارتا۔

بیٹے کے لیے خالہ کی حسرت اب تک حسرت ہی تھی۔ وہ میرے گھر آنے پر واری صدقے ہو جاتیں۔ بہنیں تو مجھے گھیر ہی لیتی تھیں۔ پھر کوئی مجھے دباتی تو کوئی کھانا کھلاتی۔ غرض جتنے، پیار چاہت اور

جب میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو ہزاروں منگیں اور خوشیاں میری منتظر تھیں۔ پیدا ہوتے ہی میری والدہ نے مجھے میری خالہ کی جھولی میں ڈال دیا۔ کیونکہ خالہ کی صرف تین بیٹیاں ہی تھیں بیٹا نہیں تھا۔ اُن کو بیٹے کی بہت حسرت تھی۔ تب میری والدہ نے خالہ سے کہا کہ اگر میرے گھر لڑکا پیدا ہوا تو وہ میں تمہاری جھولی میں ڈال دوں گی۔

پھر جب میں نے جنم لیا تو وعدے کو نبھاتے ہوئے مجھے خالہ کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ عرصہ آٹھ سال تک میں اپنی خالہ اور تایا ابو کی زیر تربیت رہا۔ میری زندگی کے یادگار اور خوبصورت لمحے ان ہی کے آنکھ میں کھیلے ہوئے گزرے۔

پھر کسی ناچاقی کی وجہ سے دو خاندانوں میں لڑائی ہوئی اس لیے میری والدہ مجھے اپنے گھر لے آئیں جو کہ ایک گاؤں میں واقع تھا۔

اس وقت میں چونکہ ایک بچہ تھا اس لیے رشتوں کی اہمیت مجھے بالکل معلوم نہیں تھی۔ لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ پہلی دفعہ میرے منہ سے جو لفظ ماں نکلا تھا وہ میری خالہ کے لیے تھا۔

کہ لانے کے بعد مجھے اسکول میں داخل کروا دیا

میرے دل میں ہر وقت یہ خواہش انگڑائی لیتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے امی ابو کی خالہ کے ساتھ صلح کرادوں۔ پر ایسا اتنا آسان نہیں تھا۔ اُن کی آپس میں ناراضگی برسوں سے تھی۔ اس لیے اسے ملانا فی الحال ایک مشکل کام تھا۔

ابو مجھے کبھی کبھی کالج میں ملنے آتے مگر خالہ کے گھر نہیں جاتے تھے۔ حالانکہ اُن کا گھر میرے ہوٹل سے تھوڑی مسافت پر تھا۔ میں نے بار بار کوشش کی کہ کسی طرح ابو کو خالہ کے گھر لے جاؤں مگر وہ ہر بار مجھے ڈانت دیتے اور ایسا کہنے سے باز رکھتے۔ دن گزرتے گئے لیکن دو خاندانوں کو ملانے کی یہ خواہش خواہش ہی رہی۔

☆.....☆.....☆

خلوص کی مجھے طلب اور خواہش تھی وہ اس سے بھی زیادہ ہی کرتی تھیں۔

اور کرتیں بھی کیوں نا، میں نے ان کے آنگن میں آٹھ سال جو گزرے تھے اور بہنوں کو بھائیوں سے کتنا پیار ہوتا ہے اس کو تو بہنوں والے بھائی مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہوں گے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے میں روز چھٹی ہوتے ہی خالہ کے گھر چلا جاتا اور شام ہوتے ہی ہوٹل واپس آ جاتا۔ کیونکہ ہوٹل میں رات کو حاضری ہوتی تھی اور اس میں حاضر ہونا لازمی تھا اور دوسری بات میرے امی ابو بھی میرے خالہ کے گھر ٹھہرنے پر راضی نہیں تھے اس لیے انہوں نے مجھے ہوٹل بھیجا تھا۔



READING
Section

کچھ دن صبا نے پھول پر بالکل توجہ نہ دی اور اسے نظر انداز کرتے ہوئے گزر جاتی، جو میں اس کے راستے میں رکھتا۔ لیکن کب تک..... جب مسلسل پھول اس کے راستے میں ایک مخصوص جگہ پر رکھا ملنے لگا تو اس نے اس میں دلچسپی لیتے ہوئے اسے اٹھانا شروع کر دیا۔

پھول رکھ کر میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ جاتا اور چوری چوری اسے دیکھتا رہتا۔

وہ پھول اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتی جیسے اس پھول کے رکھنے والے کو دیکھنا چاہتی ہو۔

رفتہ رفتہ میں نے پھول کے ساتھ ایک تحریر بھی رکھنا شروع کر دی۔

جس میں، میں اس کے حسن کی خوب تعریف کرتا اور ساتھ اپنی ایک خواہش بھی لکھ دیتا۔ کبھی لکھتا کہ مجھے آپ پر لال کمر کا سوٹ اچھا لگتا ہے، تو کبھی لکھتا کہ مجھے آپ کے ہاتھوں میں چوڑیاں دیکھنے کو دل کرتا ہے تو کبھی کبھی کچھ تو کبھی کچھ.....

میں دیکھ رہا تھا کہ اس نے ان خواہشات کو پورا کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں بہت خوش تھا۔ چاہتا تو تھا کہ اس کے سامنے آ کر اظہارِ محبت کر ہی دوں پر ابھی نہیں۔ کیونکہ مجھے صحیح وقت کا انتظار تھا۔

مجھے پھول رکھتے ہوئے ایک ماہ سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ایک دن میں پھول رکھ کر اپنی مطلوبہ جگہ پر چھپ گیا۔

آج بھی وہ مقررہ وقت پر آئی تھی۔ لیکن اس نے پھول نہ اٹھایا مجھے بہت حیرت اور دکھ ہوا۔ جب وہ دور چلی گئی تو میں اس رکھے ہوئے پھول کے پاس آیا اور جھپک کر پھول اٹھالیا۔ تو مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرا سانس جیسے حلق میں اٹک گیا کیونکہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ صبا تھی۔

میری چوری پکڑی جا چکی تھی۔ میرا دل بے قابو اور بے ترتیب ہونے لگا۔ جیسے پسلیوں کے کمزور پنجرے کو توڑ کر باہر آنے کو پھل رہا ہو۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اس نے جیسے میرا ارادہ

کالج لائف میں مجھے دو طرح کے لوگ ملے اچھے اور برے۔ جس کالج میں میرا داخلہ ہوا تھا وہاں مخلوط نظام تعلیم تھا۔ مطلب لڑکیاں لڑکے اکٹھے پڑھتے تھے، اس لیے ہر لڑکے کا کسی نہ کسی لڑکی سے انفیئر تھا سوائے میرے۔

ان کو دیکھ کر مجھے بھی دوستی کی سوجھی۔ اس نادان اور بچکانہ سی خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے ایسی لڑکی کا انتخاب کیا جو کہ خوبصورتی میں بے مثال تھی۔ اس کا نام صبا تھا۔ اس کی آنکھیں گہری نیلی، سفید گورا رنگ براؤن لمبے بال، درمیانہ قدی موتیوں کی طرح چمکتے دانت، غرض وہ مکمل سراپا حسن تھی۔ اس سلسلے میں، میں نے اپنی کلاس کے مانیٹر عزیز سے رائے طلب کی تو وہ بولا۔

”دیکھو احمد! لڑکیاں لڑکوں سے دوہی چیزیں مانگتی ہیں، پہلی یہ کہ ان کی کھل کر تعریف کرو اور دوسرا ان کا پیچھا کرو مگر اس انداز سے کہ انہیں برا نہ لگے اور نہ ہی کسی دوسرے کو شک ہو اور ان کی عزت پر حرف نہ آئے۔“

میں نے عزیز کے ان دو گروں کو پلے باندھ لیا کیونکہ اس کی کئی گرل فرینڈز تھیں اور وہ اس معاملے میں ایکسپرٹ تھا۔

اب میں اپنی تمام تر کوششوں کے ساتھ صبا کو دوست بنانے میں لگ گیا۔ وہ چونکہ بہت خوبصورت تھی اس لیے مغرور بھی کیونکہ خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔

اسے اپنا بنانا آسان نہیں تھا۔ پورا کالج اس پر لٹو تھا۔ مگر وہ کسی کو گھاس نہ ڈالتی تھی۔

مجھے بھروسہ تھا کہ میں اسے پالوں گا کیونکہ کسی سخت پتھر پر بھی پانی مسلسل ٹپکتا رہے تو اس میں بھی گڑھا پڑ ہی جاتا ہے۔ وہ لڑکیوں کے ہوشل میں رہتی تھی اور ان کا ہوشل ہمارے ہوشل کے قریب تھا۔

میں نے روزانہ ایک ایک پھول اس کے راستے میں رکھنا شروع کر دیا۔ یہ ترکیب میں نے ایک فلم میں دیکھی تھی۔

مجھے لگا یہ سب بھی ایک فلم کی طرح ہوگا۔ پہلے تو

تھا۔ میں اس لمحے خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اپنی صبا کو پالیا تھا اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ زندگی کے ہر موڑ اور مشکل وقت میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اس دن ہم نے بہت سے وعدے کیے۔ بہت قسمیں کھائیں ساتھ رہنے کی، دوستی نبھانے کی۔

☆.....☆.....☆

صبا سے میری دوستی دن بدن پختہ سے پختہ ہوتی چلی گئی اور پھر ہم دوستی کی حد پار کر کے محبت کے ایسے اٹوٹ اور گہرے رشتے سے منسلک ہو گئے جس کے بارے میں ہمارا دہم و گمان بھی نہ تھا۔

میں اب صبا پر مکمل اعتماد کرنے لگا تھا۔ وہ محبت کے پاکیزہ رشتے کو احسن طریقے سے نبھا رہی تھی۔ اس کا ساتھ پا کر میں اپنی قسمت پر رشک کرتا نہ تھکتا۔ اس کی قربتوں میں گزرے لمحات میری زندگی کے حسین اور یادگار پل ہوتے۔

میری اس محبت کا علم جب میرے دوست عزیز کو ہوا تو وہ کہنے لگا۔

”احمد! صبا سے تمہارا رشتہ جس قدر تیزی سے بڑھ رہا ہے، وہ ٹھیک نہیں۔ کسی پر اتنا بھروسہ اور اعتماد کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ وہ ایک مغرور اور بے دفا لڑکی ہے جو تمہیں کبھی بھی دھوکہ دے سکتی ہے۔“

میں عزیز کی باتیں سمجھنے کی بجائے اس پر غصہ ہو جاتا کہ تو مجھ سے اور میری محبت سے جلتا ہے۔ اور اسی غصے میں کئی کئی دن میں اس سے بات تک نہ کرتا۔ میں بھلا اس کی باتوں کو کیسے سچ جان لیتا جبکہ صبا میں مجھے کوئی کمی نہ دکھتی تھی۔ جب وہ مجھے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تو اُس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

☆.....☆.....☆

میں صبا سے ہر بات شیئر کر لیتا تھا اور کوئی بھی بات نہ چھپاتا پھر ایک دن میں نے اُسے اپنے ای ابو اور خالہ کے درمیان پیدا رنجش کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس نے میری بات کو بہت توجہ سے سنا اور بولی۔

بھانپ لیا تھا۔ اس لیے ہاتھ پکڑ لیا۔

اس کے چھوتے ہی مجھے ایک کرنٹ سا لگا۔ جیسے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رہی ہوں۔ پسینے کی بوندیں میرے ماتھے پر عیاں تھیں۔ پھر وہ اپنے گلابی ہونٹوں سے گویا ہوئی۔

”مجھ سے دوستی کرنا چاہتے ہو؟“

اس کا دوستی کے لیے اس قدر کھل کر اظہار کرنا مجھے سٹپٹا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے اس سوال کا جواب دیتا، اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔

”بولو کیا مجھ سے دوستی کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”جی..... نہیں..... وہ..... تو..... میں.....“

میری زبان اس وقت میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میرے الفاظ بے ترتیب ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ میں اس طرح بول رہا تھا جیسے میں تو تلا ہوں۔

”میں نے تھوڑا سوچا پھر بول دیا کہ ہاں میں آپ سے دوستی کا خواہاں ہوں۔“ کیونکہ آج نہیں تو کل اسے اس حقیقت کو جاننا ہی تھا تو آج کیوں نہیں؟ اپنی نیت سے باخبر تو میں نے اُسے کر دیا تھا پر وہ اب خاموش ہو گئی جانے وہ کس سوچ میں گم تھی۔

اس کی یہی خاموشی میرے دل کو بٹھائے جا رہی تھی۔ ذہن میں عجیب سے وسوسے اور خیالات اُٹھ آئے تھے۔ اس کی خاموشی طویل سے طویل ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی نظریں اٹھائیں اور خاموشی توڑتے ہوئے بولی۔

”دیکھو احمد! دوستی کوئی مذاق نہیں ہوتی۔ دوستی کرنا بہت آسان ہوتا ہے پر اسے نبھانا اتنا ہی مشکل۔ یہ ایک ایسا پرخطر اور کٹھن سفر ہے۔ جس کی کوئی منزل نہیں۔“

تم اگر واقعی مجھ میں انٹرسٹڈ ہو تو ٹھیک ہے میں وعدہ کرتی ہوں کہ دوستی کے تمام قواعد و ضوابط پر عمل پیرا رہوں گی اور میں اُمید کرتی ہوں کہ تم بھی یہ رشتہ بخوبی نبھاؤ گے اور اس کٹھن سفر میں مجھے تنہا نہیں چھوڑو گے۔

میں نے یہ باتیں سن کر میرا چہرہ کھل اٹھا

میری صحت اب بہتر ہوتی جا رہی تھی کرشمہ قدرت کہ جب میں مکمل صحت باپ ہوا تو دو خاندانوں کی رنجشیں بھی ختم ہو گئیں۔ میرے دل میں صبا کے لیے پیار اور مقام اور بھی بڑھ گیا۔ کیونکہ اسی کی بدولت یہ دشمنی ختم ہوئی تھی۔

ایک ہفتے بعد میں نے دوبارہ کالج جانا شروع کر دیا اور صبا کے احسان پر اس کا مشکور ہوا۔ میرے والدین بھی اب گاؤں چلے گئے تھے۔ میں بہت خوش تھا ابو کی طرف سے مجھے جو بھی جیب خرچ ملتا، اس کا بیشتر حصہ میں صبا پر اڑا دیتا۔ بہت سے لڑکوں نے مجھے تنبیہ کی کہ یہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا اور بھی لڑکوں سے چکر ہے۔

پر میں ان کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا۔ میں اس کے پیار میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ مجھے یہ سب باتیں محض الزام لگتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

ایک دن روٹین کے مطابق ہفتہ مکمل ہونے پر میں گھر جانے کی تیاری کرنے لگا تو میرا دوست اور کلاس مانیٹر عزیز میرے پاس آیا اور بولا۔

”ہم تم سے نہ کہتے تھے کہ وہ لڑکی بے وفا ہے، پر تم کو ہماری باتیں محض الزام لگتی تھیں مگر اب آج جب تم اسے کسی اور لڑکے کے ساتھ گپ شپ کرتا دیکھو گے تب بھی کہنا کہ ہم جھوٹ بولتے تھے۔“

پھر وہ زبردستی مجھے ایک ہوٹل میں لے گئے جہاں میں کئی بار صبا کو کھانا کھلانے لایا تھا۔

میں نے ہوٹل میں چاروں اطراف نظریں گھمائی تو ایک جگہ میری نظر ٹھہر گئی۔ مجھے میرا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ایسے لگا جیسے میں ابھی چکرا کر گر پڑوں گا۔

میرے سامنے صبا کسی اور کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باتوں میں مگن تھی۔ میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا، میں نے اسے کسی چیز کی کمی نہ آنے دی تھی۔ پھر بھی اس نے مجھے دھوکہ دیا۔

میری دنیا لٹ گئی۔ صبا نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس

”ان کی ناراضگی کو تم ہی ختم کر سکتے ہو۔“

”کیا؟“ میرے منہ سے حیرت کے مارے نکلا۔

”صبا میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”احمد تم صرف اپنے گھر والوں کو کسی طریقے سے کچھ دن خالہ کے گھر لے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ جب وہ اکٹھے رہیں گے تو ان کی نفرت محبت میں بدل جائے گی۔“

پھر صبا نے مجھے ایک پلان سمجھایا کہ کس طرح میں اپنے گھر والوں کو خالہ کے گھر لے جا سکتا ہوں۔

میں نے اس کی تمام باتیں پوری توجہ اور انہماک سے سنیں اور پھر اپنے آپ کو اس کے پلان پر عمل کے لیے تیار کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

سخت سردیوں کے دن تھے۔ صبح کی دھند نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں واش روم میں کھس کر ٹھنڈے پانی سے نہانے لگا۔ میرے روم میٹ میری حماقت پر حیران تھے میں خود بھی جانتا تھا کہ یہ اپنے پیروں پر کھپاڑی مارنے کے مترادف ہے۔

مگر یہ سب پلان میں شامل تھا۔ میں نہا کر جیسے ہی باہر آیا میرے سر میں شدید درد ہونے لگا اور مجھے اتنا زبردستی بخارا آیا کہ خدا کی پناہ۔

میں نے کالج سے درخواست کے ذریعے ہفتے کی چھٹی منظور کروائی اور خالہ کے گھر چلا گیا۔ خالہ میری حالت دیکھ کر رونے لگیں پھر انہوں نے میرے ای ابو کو فون پر اطلاع دی اور ساری صورت حال بتلائی۔ اگلے ہی گھنٹے وہ سب خالہ کے گھر موجود تھے۔

شہر میں میرا علاج چونکہ گاؤں کی نسبت بہتر ہو سکتا تھا اس لیے وہ مجھے خالہ کے گھر ہی رکھنے پر متفق ہو گئے۔

صبا کی بات سچ نکلی۔ دنوں کی دنوں میں میرے گھر والے خالہ سے کھل مل گئے اور ساری ناراضگی کو پس پشت ڈال دیا۔

کرنا چاہیے کہ نہیں۔ مجھ سے کوئی فیصلہ نہیں ہو پارہا تھا۔

دماغ کہتا کہ جس نے ایک بار دھوکہ دیا ہے، وہ دوبارہ بھی دے سکتی ہے کیونکہ فطرت کبھی نہیں بدلتی، اس لیے اسے اپنانے کا کوئی فائدہ نہیں اور دل کہتا کہ وہ تم سے معافی مانگ رہی ہے تو معاف کر دو۔ ارے وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں، اُس سے بھی ہوئی ہے۔ اس لیے غصے کو چھوڑ کر اُسے اپنا لینا ہی بہتر ہے۔ ”پوری رات اسی کشمکش میں گزری۔

☆.....☆.....☆

صبح جیب میں تیاری کر کے کالج پہنچا تو وہ کلاس میں موجود تھی۔ وہ اب بھی رونے جا رہی تھی کلاس تقریباً شروع ہونے والی تھی کہ وہ سب کے سامنے روتے ہوئے کہنے لگی۔

”پلیز احمد مجھے معاف کر دو۔ آئی ایم سوری! آئی لو یوسوچ! میں دل سے معافی مانگتی ہوں۔“
مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اسے کسی کی بھی پروا نہیں تھی اور وہ اپنے پیار کا اظہار اس طرح کھل کر کر رہی تھی جیسے سب سے بیگانہ ہو۔ اس کو اس طرح روتا دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ وہ سب میں ایک مذاق بن گئی تھی۔

لڑکوں کی ہلسی کی آواز سن کر پرنسپل صاحب چلے آئے۔ جب انہیں ساری بات کا علم ہوا تو انہوں نے فی الوقت صبا کو کالج سے بے عزت کر کے نکال دیا اور مجھے وارننگ دی کہ آئندہ ان معاملوں میں پڑے تو تمہاری بھی چھٹی سمجھو۔“

میں ڈر گیا لیکن صبا کے لیے میرے دل میں دبا پیار ایک بار پھر سے زندہ ہو گیا۔ میں کوئی پتھر نہیں تھا جو اب بھی سخت رہتا۔ میرے دل میں بھی دھڑکنے والا دل تھا، جس میں اس کے لیے پیار موجود تھا۔

☆.....☆.....☆

چھٹی ہوئی تو میں ہوٹل جانے کی بجائے صبا کے گھر چلا گیا۔ میں نے دروازے پر نیل دی تو دروازہ اس کی ای نے کھولا۔ وہ مجھے جانتی تھیں کیونکہ صبا ہی

کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور چلے گئے، اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ کہتی میں پلٹا اور سیدھا ہوٹل میں آ کر دم لیا۔

آنسو مسلسل میرے گالوں کو بھگور رہے تھے۔ عزیز نے مجھے بہت تسلی دی کہ خود کو سنبھالو احمد اور رونا بند کرو۔ پر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں نے مجھے دل کے ساتھ تیاری کی اور گھر چلا گیا۔

گھر میں بھی سب سے کٹا کٹا رہا۔ ای ابو نے مجھے پوچھنے کی بہت کوشش کی کہ مسئلہ کیا ہے۔ پر میں اُن کو کیا بتاتا۔ میں نے اُن کو کہا کہ کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ ”وہ بے چارے کیا کرتے۔ میں نے کالج سے مزید ایک دن کی چھٹی کی اور پھر دوسرے دن چلا آیا کیونکہ کسی کے لیے میں اپنے گھر والوں کے خواب تو نہیں توڑ سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

جب میں اگلے دن کالج پہنچا تو صبا پہلے سے موجود تھی حالانکہ وہ وقت سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف ہلکی اور آ کر معافیاں مانگنے لگی۔ میں اسے کیسے معاف کر سکتا تھا۔
میں نے اس کی تمام باتیں اُن سنی کر دیں پھر پیریڈ کا ٹائم ہو گیا اور ہم کلاس میں چلے گئے۔ میں اُسے دیکھتا رہا وہ چھٹی ہونے تک روتی رہی۔ جب چھٹی ہوئی تو وہ پھر میرے پاس آئی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

”احمد آئی ایم سوری! مجھے معاف کر دو۔ وہ لڑکا جو تم نے میرے ساتھ ہوٹل میں دیکھا تھا ایک امیر لڑکا تھا۔ میں صرف اس سے اس کے پیسے بٹورنا چاہتی تھی، ورنہ اس کا میرے ساتھ اور کوئی تعلق نہیں ہے۔“
میں نے اس سے کہا کہ صبا تمہیں جتنے پیسے چاہیے تھے مجھ سے مانگ لیتیں پر اس طرح دھوکہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔“

تو وہ بولی کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں اپنی اس غلطی پر نادم ہوں۔ پلیز معاف کر دو۔“

مگر میں اُسے روتا چھوڑ کر ہوٹل چلا آیا۔ ساری رات اس کے بارے میں سوچتا رہا کہ اسے معاف

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اب میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آج رات مجھے بھرپور نیند آئی۔ صبح جیب میں اٹھا تو بالکل فریش تھا۔ میری خوشی قابل دید تھی۔ میں نے جلدی سے تیاری کی اور کالج آ گیا۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں سارا دن انتظار کرتا رہا۔ چھٹی کے وقت اس کی دوست سحر نے مجھے ایک لفافہ دیا اور چپ چاپ چلی گئی۔

عجیب سے دسو سے میرے دماغ پر حاوی ہونے لگے۔ میری چھٹی حس مجھے کہہ رہی تھی کہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ چاک کیا اس میں تحریر کچھ اس طرح تھی۔

ڈیر احمد!

”مجھے معاف کرنا۔ میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکی۔ میں اس کالج میں دوبارہ نہیں آ سکتی جہاں مجھے بے عزت کیا گیا تھا۔ کیونکہ میری ہمت نہیں کہ میں ان لڑکوں کا سامنا کر سکوں جن کے سامنے مجھے شرمندہ کیا گیا تھا۔ احمد عزت ایک ایسی شے ہے جو ایک بار چلی جائے تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ تمہیں جب میرا خط ملے گا تب میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ لیکن میرے دل میں تمہارا پیار ہمیشہ زندہ رہے گا۔ محبت وصل کا نام نہیں بلکہ فراق کا نام ہے۔ ضروری نہیں جسے چاہا جائے وہ ملے بھی۔ ایک بات یاد رکھنا۔ صبا نے تم سے پیار کیا تھا، کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ تم اپنا نمبر آن رکھنا میں تم سے خود رابطہ کروں گی ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

فقط تمہاری صبا

لیٹر پڑھ کر احمد کے آنسو برسات کی طرح برسنے لگے وہ کس خوبصورتی سے اس کی زندگی سے چلی گئی تھی۔ وہ خود کو اس کی بے عزتی کا ذمہ دار سمجھنے لگا۔ پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا اور اس نے کالج بھی خیر باد کہہ دیا۔ اسے زندگی سے نفرت سی ہونے لگی۔ اُس کی لُو اسٹوری کتنی چھوٹی سی ثابت ہوئی تھی۔ صبا اُس کی زندگی میں بادِ صبا بن کر آئی تھی اور صبا بن کر ہی غائب بھی ہو گئی تھی۔

☆☆.....☆☆

کے اصرار پر میں ایک دو بار ان کے گھر گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پہلے تو وہ حیران ہوئیں پھر آنے کا سبب دریافت کرنے لگیں۔

”میں نے بہانہ کیا کہ صبا کی خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔“ تو وہ بولیں۔

”بیٹا جب سے وہ کالج سے آئی ہے اپنا دروازہ بند کر کے روئے جا رہی ہے۔ اس کے ابو اور بھائی گھر پر نہیں ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

میں نے انہیں تسلی دی کہ آئی ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں دیکھتا ہوں۔“

میں جب اس کے کمرے کے پاس پہنچا تو دروازے کے ساتھ کان لگا دیے اندر سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اب تک روئے جا رہی تھی۔ میں نے اسے آواز دی کہ صبا دروازہ کھولو تو اس نے میری آواز سن کر فوراً دروازہ کھول دیا۔

اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے جاتے ہی گلے سے لگایا اور بولا۔

”صبا تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی تھی، پر اب میں سچائی کو جان گیا ہوں اس لیے تمہیں سچے دل سے معاف کرتا ہوں۔ اب پلیزی یہ رونا بند کرو۔ کیونکہ تمہاری آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔“

میری باتیں سن کر اس نے میرے سینے سے لگا سرائٹھایا اور بولی۔

”احمد صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔ اب میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“

میں نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار سے آزاد کر دیا کیونکہ اس کے گھر میں یہ سب ٹھیک اور مناسب نہیں تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسوؤں کو صاف کیا پھر کہا کہ صبا میرا یہاں رُکنا مناسب نہیں، میں صبح تمہارا کالج میں انتظار کروں گا۔“ پھر اس سے اجازت لے کر میں واپس آ گیا۔

تیسری مرد کہانی

قدرت

نازیہ ہتھال رضا

اُس نوجوان کی کہانی، قدرت نے جس کی محنت کی لاج رکھ لی تھی

ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن میرے خواب بہت اونچے تھے اور ویسے بھی خواب تو سب ہی

آج میں بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ میں نے میٹرک میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی گوکہ میں



READING
Section

میں آنسو آند آئے اور میں بے اختیار ای سے لپٹ گیا۔ امی نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور بولیں۔

”بیٹا خواب دیکھنا نہ دیکھنا کسی کے اختیار میں نہیں ہے ہاں لیکن انہیں پورا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ میرا بیٹا اس قابل ہے کہ وہ اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کرے گا۔ اور دیکھنا انشاء اللہ ایک دن وہ آئے گا جب تمہارے خواب تعبیر بن کر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ میں نے صدق دل سے کہا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا ابو آئے تھے۔ کچھ شاپران کے ہاتھ میں تھے۔ میں بکس سے دیکھنے لگا کہ نجانے ان میں کیا ہے۔ ابو تخت پر آ کر بیٹھے۔ بڑی بہن شازیہ نے ابو کو پانی کا گلاس تھما دیا ابو نے گلاس خالی کر کے اسے واپس دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”دانش بیٹا تمہارا زلٹ کیسا رہا؟“ میں اسی بات کے انتظار میں تھا جھٹ سے بولا۔

”ابو میرا اے دن گریڈ آیا ہے۔ میں آج بہت خوش ہوں۔“ ابوسن کر بہت خوش ہوئے۔ مجھے گلے لگایا، پیار کیا امی بھی خوشی کے آنسو بہانے لگیں۔

”بیٹا اب آگے کیا ارادہ ہے؟“ امی کھانا لائیں تو ابو بولے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ گھر کی حالت اور مفلسی میرے سامنے تھی۔ گھر کے حالات کی وجہ سے بڑی بہن شازیہ آپنی بھی صرف میٹرک ہی کر سکی تھیں۔ سب سے چھوٹا حسن ابھی پانچویں جماعت میں تھا اپنی قلیل تنخواہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن ابو نے کبھی حرام کمائی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور یہی درس وہ ہمیں بھی دیتے تھے کہ محنت میں عظمت ہے۔ اب میں کس منہ سے کہتا کہ ابو میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں، اس لیے سمجھداری سے بولا۔

”ابو جو آپ بہتر سمجھیں میرے لیے۔“

”شاباش بیٹے مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی پڑھائی کا خرچہ خود اٹھاؤ۔ دیکھو بیٹا

دیکھتے ہیں۔ امیر بھی اور غریب بھی یہ بھی کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے اور نہ ہی خواب دیکھنے کا حق ہم سے کوئی چھین سکتا ہے۔

سو میں بھی خواب دیکھتا تھا۔ کبھی خود کو بہت بڑے مشاعرے میں داد وصول کرتے ہوئے اور کبھی خود کو ادب کی محفل میں ایوارڈ لیتے ہوئے۔ میں اس وقت بھی خوشی میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا تھا، خود کو بڑے سے کالج میں ایڈمیشن لیتے ہوئے پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہوئے اور پھر آگے اور آگے اور بہت آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ خوابوں کا سلسلہ امی کی آواز سے ٹوٹا۔

”ارے بیٹا کب سے کھانا رکھا ہے، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کیا سوچ رہے ہو کھانا کھاؤ۔“ میں نے گڑ بڑا کر دیکھا تو میرے آگے ایک پلیٹ میں دال، اچار اور روٹی رکھی ہوئی تھی اور میں کھانا کھانے کے بجائے خوابوں کی دنیا میں سیر کونکل پڑا تھا۔

”جی امی! کھانا بہت گرم تھا نا اس لیے تھوڑا رُک گیا تھا کھا رہا ہوں۔“

”بیٹا تو اپنی ماں سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔ بتا کیا سوچ رہا تھا؟“

”کچھ نہیں امی بس ایسے ہی۔“

”اچھا مت بتا ویسے بھی مجھے بس معلوم ہے کہ تو کیا سوچ رہا تھا۔“

”آپ کو کیسے پتا کہ میں کیا سوچ رہا تھا؟“

”بیٹا میں تیری ماں ہوں اور ماں سب جانتی ہے، بن کہے بھی اپنی اولاد کی ہر خواہش جان جانی ہے۔ اس کی آنکھوں کے خوابوں تک پہنچ جاتی ہے اور تو سوچ کی بات کر رہا ہے۔“

”اچھا پھر بتائیے کہ میں کیا سوچ رہا تھا؟“ امی نے لحظہ بھر کو میری آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے لگا جیسے وہ میرے اندر تک جھانک رہی ہیں۔ میں نے گھبرا کر نظریں چرائیں امی مسکرا دیں اور بولیں۔

”تو اس وقت اپنی پڑھائی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ تھوڑا توقف کے بعد بولیں۔

”صحیح کہہ رہی ہوں ناں میں؟“ میری آنکھوں

”رحمت“

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب رات کا آخری تہائی حصہ رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے۔

☆..... کون ہے جو مجھ پکارے اور میں اُس کی پکار کو قبول کروں؟

☆..... کون ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اُس کو عطا کروں؟

☆..... کون ہے جو مجھ سے معافی مانگے اور میں اُس کو معاف کروں؟

حسن انتخاب: سلمیٰ۔ بحرین

کوئی کام حقیر نہیں ہوتا حقیر تو انسان ہوتا ہے اپنے عمل سے، اپنے کردار سے۔

☆.....☆.....☆

جلد ہی میں نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ میں صبح کالج جاتا واپس آ کر کھانا کھاتے ہی اپنا مال بیچنے چوک پر پہنچ جاتا۔ وہاں سے واپس آ کر میں اپنی پڑھائی کرتا۔ کچھ دنوں بعد مجھے دو ٹیوشن بھی مل گئے گھر جا کر پڑھانا تھا، اچھے پیسے مل رہے تھے۔ میں نے ٹیوشن پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ اس سے میں مصروف تو بہت ہو گیا لیکن میرے اخراجات با آسانی پورے ہونے لگے۔

ایک دن میں چوک پر کھڑا مال بیچ رہا تھا کہ میرے اسکول ٹیچر سر حامد میرے پاس چلے آئے۔ میں انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ لیکن وہ بالکل نارمل انداز میں چلتے ہوئے آئے اور بولے۔

”ہاں تمہی دانش محنت ہو رہی ہے۔“

”جی سر۔“

”ہاں تو اس میں شرمانے گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اچھا یہ بتاؤ پڑھائی جاری رکھی ہوئی ہے ناں؟“ میں نے جواباً اپنی روٹین بتائی تو میری پیٹھ تھپتھپائی اور بولے۔

”واہ بیٹا اسی طرح محنت کرو انشاء اللہ بہت آگے جاؤ گے اور ہاں پڑھائی کی فکر مت کرو۔ میں اتنا تو کر ہی سکتا ہوں کہ اپنے ایک ہونہار اسٹوڈنٹ کو ٹیوشن دے دوں۔“

”مگر سر!“ میں ہچکچایا کہ میں فیس کیسے بھروں گا۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ محنت کرنے سے بھی نہ شرمانا، خواہ وہ کام کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بس تمہارے دل میں یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ تم حلال روزی کما رہے ہو اور حلال روزی کمانا بھی عبادت ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے گلہ بانی بھی کی ہے اور تجارت بھی جب وہ محنت سے نہیں شرمائے تو ہم بھی اُن ہی کے امتی ہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم حلال روزی کمائیں اور محنت کرنے سے نہ شرمائیں۔“

”جی ابو میں جانتا ہوں۔ میں محنت کروں گا اور ہمیشہ حلال روزی کماؤں گا۔ آپ ہمیشہ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔“

”گڈ بوائے!“ ابو نے میری پیٹھ تھپتھپائی پھر شاپر کھولتے ہوئے بولے۔

”اچھا دیکھو آج یہ میں کچھ سامان لایا ہوں، یہ تمہیں بیچنا ہے۔ سمجھو تمہارا امتحان اور محنت شروع۔ مجھے دیکھنا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ یاد رکھو بیٹا اگر تمہاری لگن سچی ہوگی تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔“

”جی ابو بہتر ہے۔“

اور اسی دن شام سے میں نے چوک پر کھڑا ہونا شروع کر دیا۔ جی ہاں میں کمر بند، رد مال اور بنیان بیچ رہا تھا اور مجھے اس کام میں کوئی شرم محسوس نہیں ہو رہی تھی کیونکہ نہ تو میں چوری کر رہا تھا نہ ہی کسی کی جیب کاٹ رہا تھا، جو مجھے شرم یا غیرت محسوس ہوئی۔ میں تو محنت کر رہا تھا۔ حلال روزی کما رہا تھا۔ اور ویسے بھی

تھی۔ ایک دن ایک نظم لکھ ڈالی سوچا کس کو دکھاؤں جو میری اصلاح کر سکے۔ اچانک خیال آیا ہمارے محلے میں ایک شاعر رہتے تھے۔ جو اکثر لوگوں کو اپنی شاعری سناتے رہتے تھے میں بھی سن چکا تھا۔ لہذا اپنی نظم لے کر ان کے پاس پہنچ گیا اور اصلاح کی درخواست کی تو وہ بہت خوش ہوئے لیکن جب انہوں نے میری نظم پڑھی تو بارہ غلطیاں نکال دیں۔ میں دلبرداشتہ ہو گیا تو انہوں نے مجھے حوصلہ دیا۔ ”بیٹا ابھی تو شروعات ہے ابھی سے ہمت نہ ہارو۔ ابھی بارہ غلطیاں ہیں اگلی بار شاید دو تین ہوں یا پھر شاید نہ ہوں۔ کوشش جاری رکھو۔“

میں ان کے پاس سے اٹھ آیا پھر اکثر میں شعرو شاعری کرنے لگا۔ شروع شروع میں بہت غلطیاں ہوتیں لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب انکل بھی میری شاعری پڑھ کر جھوم اٹھے۔ اس دن میں بہت خوش تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری تین ڈائریاں بھر چکی تھیں۔ پھر میں نے افسانے اور ناول میں بھی قسمت آزمائی اور مجھے کامیابی ملی۔

میں نے بچپن میں امی سے سنا تھا کہ اللہ پاک کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا اور اب واقعی میں اگر محنت کر رہا تھا تو مجھے صلہ بھی مل رہا تھا۔ دن پڑ لگا کر اڑتے گئے اور میں کامیابی کی شیرھیاں پھلانگتا گیا اور جس دن میری تعلیم نمایاں کامیابی کے ساتھ مکمل ہوئی اس دن امی کے گلے لگ کر میں نے خوشی کے خوب آنسو بہائے۔

☆.....☆.....☆

اب مجھے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ یہاں بھی میرے ٹیچر سر حامد میرے بہت کام آئے انہوں نے مجھے ایک کالج میں ٹیچر ار کی جاب دلوا دی۔ میں صبح میں کالج میں ٹیچر ار تھا تو شام میں اپنے گھر پر کوچنگ کلاسز لیتا تھا۔ میرے پاس اتنے بچے تھے کہ سر کھجانے کی فرصت نہ ہوتی تھی۔ میں نے آنے جانے کے لیے ایک کار خرید لی تھی اور گھر کی حالت بھی بہت اچھی ہو گئی تھی۔ ابوریٹا رڈ ہو گئے تھے جبکہ حسن پڑھ رہا تھا۔

”ارے یار میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھ کر پڑھاؤں گا۔ اپنے بچوں سے کوئی نہیں لیتا ہے کیا؟“ انہوں نے میرے دل کی بات پڑھ ڈالی تو میں تشکر سے انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے فوراً اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیا جس پر ان کے گھر کا ایڈریس بھی تھا۔ وہ گھر پر ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ میرے لیے تو یہ عیبی امداد تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس منہ سے ان کا شکریہ ادا کروں۔ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

”تھینک یوسر۔“

”ارے پھر وہی بات بس تم آج شام سے ہی آ جاؤ۔ اچھا یہ رومال مجھے چاہیے کتنے کا ہے؟“

”سر لے لیجیے۔“ میں نے رومال بڑھایا۔

”پیسے بتاؤ میں ایسے نہیں لوں گا۔“

”میں سمجھ گیا کہ بغیر پیسوں کے سر نہیں لیں گے، میں کہا۔

”دس روپے سر۔“ سر آگے بڑھ گئے میں دوڑ کر ان کے پاس گیا۔

”سر کیوں نہیں لے رہے یہ دس روپے کا ہے۔“

سر نے اک لمحہ مجھے دیکھا اور بولے۔

”میں جانتا ہوں کہ یہ رومال بس روپے کا ہے تم جان بوجھ کر کم بتا رہے ہو۔ کیوں؟“

”سر آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں آپ سے پیسے کیسے لے سکتا ہوں۔“

”اچھا تو پھر میں یہ رومال بھی نہیں لے سکتا۔“

سر پھر سے آگے بڑھ گئے میں پھر دوڑا۔

”سر پلیز سر لے لیجیے ناں۔“ میں لجاجت سے بولا۔

”اچھا تو پھر یہ پکڑو پیسے، میں اس وقت صرف گا ہک ہوں استاد نہیں سمجھے۔“ سر نے مجھے پیسے پکڑائے اور رومال لے کر شام کو ٹیوشن آنے کا کہہ کر چلے گئے اور میں ان کی عظمت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

☆.....☆.....☆

اور پھر دن گزرتے گئے میں انٹر میں آ گیا مطالعے کا شوق بچپن سے تھا۔ شعرو شاعری بھی پسند

غزل

اشکوں کو ٹھکانہ چاہیے تھا
مجھے رونے کو شانہ چاہیے تھا

ذرا سی بات پہ وہ مجھ سے روٹھا
ترک تعلق کا بہانہ چاہیے تھا

دے گیا ہجر کی سوغات مجھ کو
وہ سمجھا مجھ کو خزانہ چاہیے تھا

چلو اپنے تمہارے محفل میں آئے
نہ مجھ کو یوں اٹھانا چاہیے تھا

منتظر ہوں اب تک میں اس کی
نہ آیا عید پر، محرم پر تو آنا چاہیے تھا

مجھے معلوم ہے میرے سیل رواں کو
وہ اک تکیہ پرانا چاہیے تھا
شاعرہ: پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل۔ جنیوب آباد

کیے بغیر نہ رہ سکا واقعی وہ رب بہت رحیم ہے، بڑا کریم
ہے ہم ہی ناشکرے بندے ہیں۔ میں نے ڈائریاں
اٹھائیں اور چل پڑا۔

اور ہاں میرے رب کی ایک اور کرم نوازی تو
سُن لیں میں آج کراچی کے سب سے بڑے کوچنگ
سینٹر میں پچھ رہیوں۔ نام جان کر کیا کریں گے۔ بس یہ
سمجھ لیں کہ یہ بھی میری زندگی جو میں نے آپ کے
سامنے کھول کر رکھ دی ہے تاکہ آپ سب میری زندگی
سے سبق حاصل کریں۔ کبھی محنت سے نہ شرما میں اور
ہاں اپنے اللہ پر کامل یقین رکھیں کیونکہ وہ کسی کی محنت
رایگاں نہیں جانے دیتا۔

☆☆.....☆☆

پھر میری شادی ہو گئی اور مریم میری زندگی میں
بہار بن کر آ گئی۔ زندگی بہت پرسکون ہو گئی تھی میں
انہتے بیٹھتے خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنی شاعری
کی کتابیں چھپواؤں امی اور مریم سے مشورہ کیا تو وہ
دونوں بھی اصرار کرنے لگیں سو میں نے اپنی تینوں
ڈائریاں اور کچھ رقم بیگ میں ڈالی اور ڈرائیور کے
ساتھ پبلشر کو دینے چل پڑا۔

بیگ کچھلی سیٹ پر تھا۔ گاڑی سگنل پر رُکی گاڑی
کے شیشے کھلے تھے کہ اچانک ایک اچکا نجانے کب سے
مجھے نظر میں رکھے ہوئے تھا آیا اور جھٹ پٹ کچھلی
سیٹ سے بیگ اٹھا کر رنو چکر ہو گیا۔ میں ہکا بکا رہ
گیا۔

مجھے لگا جیسے میری کل متاع حیات لٹ گئی ہو۔
جیسے میں نے جو کچھ لکھا تھا۔ میں سب بھول چکا ہوں
میں نے دماغ کو ٹٹولا تو خالی پایا۔ میرے ہاتھ پاؤں
سن ہو چکے تھے کہ ڈرائیور بولا۔

”سر چلیں بیگ ڈھونڈتے ہیں۔“ تب مجھے ہوش
آیا میں بجلی کی تیزی سے کار سے باہر نکلا اور جس
طرف وہ بائیک والا گیا تھا اس طرف دوڑا۔ بائیک
والے کا ظاہر ہے کہ نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں آنکھیں
بھاڑ بھاڑ کے دیکھ رہا تھا۔ مجھے پیسوں کی پروا نہیں
تھی۔ مجھے تو اپنی ڈائریاں چاہیے تھیں۔ میں اللہ سے
گڑگڑا کے دعا مانگنے لگا۔

”یا اللہ تو کسی کی محنت رایگاں نہیں جانے دیتا
مجھے میری محنت (ڈائریاں) واپس دے دے۔“ میں
آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ مجھے ایک میدان نظر آیا جس
میں جا بجا درخت لگے تھے۔ میں نجانے کس خیال کے
تحت میدان میں داخل ہو گیا اور اپنا بیگ ڈھونڈنے
لگا۔ نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ میری ڈائریاں مجھے
مل جائیں گی اور وہی ہوا۔

ایک درخت کے نیچے میری تینوں ڈائریاں رکھی
ہوئی تھیں شاید کسی کو یقین نہ آئے لیکن یہی حقیقت ہے
میری ڈائریاں میری آنکھوں کے سامنے رکھی تھیں۔
میں نے سجدہ شکر ادا کیا اور اللہ کی رحمت کی تعریف

READING
Section

مکان دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں ہل کر جرم بننے والوں کی عبرت سماں
 اور آئینہ میں جن میں آئینوں کی نمی بھی ہے اور سستی ہوئی زندگی کے نور بھی

ندامت



چلو پیرا ہی

اُس مجرم کی محبوبہ سے محبت ہی اُسے تختہ دار تک لے گئی

آرڈر دیا اور انتظار کرنے لگا۔ ابھی میرا نمبر نہیں آیا تھا کہ وہی میرے پیچھے لائن میں لگا لڑکا میرے پاس آکھڑا ہوا، اس نے بھی شربت کا کہا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔
 ”بس جی فار میلیٹی پوری کر رہے ہیں۔ جن کو رکھنا تھا وہ تو فیصلہ پہلے سے ہی ہو چکا ہے۔“ میں نے تائید میں سر ہلایا اور شربت والے کا بڑھایا ہوا گلاس پکڑتے اس سے پوچھا۔

”آپ نے کس پوسٹ کے لیے انٹرویو دیا ہے؟“
 ”گریجویٹیشن کر کے نائب قاصد کی آسامی کے لیے قسمت آزمائی کر رہا ہوں۔“ اس کے لہجے کی کڑواہٹ بتا رہی تھی کہ وہ بے روزگاری سے خاصا دلبرداشتہ تھا۔
 اس نے گلاس خالی کرتے جیب سے پچاس کا نوٹ نکالتے شربت والے کو دیتے ہوئے دو گلاسوں کے پیسے کاٹنے کا کہا۔ میں نے روکا مگر اس نے ہاتھ سے اشارہ کر دیا کہ میرے بھی کاٹ لے۔

شہر کی جانب جانے والے بہت سے چنگ جی رکتے آدازیں لگا رہے تھے۔ اس نے مجھ سے پوچھا ”شہر یا بس اسٹینڈ؟“
 میں نے کہا شہر میں۔

”میں بھی ادھر جا رہا ہوں۔“ پھر ہم دونوں ایک

جون جولائی کی جس اور آگ برساتا سورج گورنمنٹ کالونی کے بہبود آبادی دفتر کے باہر چاروں جانب لڑکے اور لڑکیاں خالی آسامیوں کی کل تیرہ مختلف سیٹوں کے لیے سینکڑوں امیدوار ایک دوسرے سے آگے جانے کی کوشش میں پریشان تھے۔ قطار میں لگے میرے پیچھے والے لڑکے نے مجھے مخاطب کیا تو میں نے گھوم کر دیکھا وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے کس آسامی کے لیے انٹرویو دینا ہے؟“

”سپر وائزر کے لیے“ میں نے مختصر جواب دیتے دوبارہ گیٹ کی طرف دیکھا جہاں دھینگا مشتی پروگرام عروج پر تھا۔

آخر میں بھی گیٹ عبور کر کے اندر ہال میں پہنچ گیا۔ وہ لڑکا بھی میرے قریب آکھڑا ہوا۔ ایک طرف خواتین کا انٹرویو لینے والا گروپ بیٹھا تھا دوسری طرف بڑے سے ہال میں مردوں کے لیے انتظام تھا۔ میرا نام پکارا گیا۔ میں نے تین ممبران کے سامنے پہنچ کر ان کے سوالات کا جواب دیا اور مجھے فارغ کرتے ڈاک مین رابطہ کرنے کا کہا گیا۔ میں دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

پچاس کے مارے گلا خشک ہو رہا تھا۔ ایک طرف شربت کی پڑھی پرش لگا ہوا تھا میں نے بھی ایک گلاس کا

طعنہ زنی کے ہاتھوں تنگ تھا فوراً حامی بھری اور اس کے پاس چلا گیا۔

یہاں ہوزری کا کام ہوتا تھا۔ مشینوں کے علاوہ ہاتھ سے کرنے والے بھی یہاں بہت سے کام تھے، خواتین والے حصے میں پیکنگ کا کام ہوتا۔ یہاں ہر عمر کی خواتین کام کرتی تھیں۔ ادھر مرد حضرات کے لیے جانا منع تھا صرف چند لوگ تھے جو اسٹاک وغیرہ اور دیگر ایسے کام سرانجام دیتے۔

دوہ ماہ تک میں کئی شعبوں میں کام کرتا رہا مجھے کمپیوٹر کی سوجھ بوجھ تھی۔ پروڈکشن منیجر نے میری ڈیوٹی اوپر والے کاموں سے ہٹا کر پیکنگ والے شعبہ میں لگا دی۔ چونکہ میں پروڈیز بھائی کے ساتھ کوارٹر میں رہ رہا تھا اور کھانا بھی ہم دونوں اکٹھے کھاتے اور سامان کی ادائیگی مل بانٹ کر کر لیتے۔ گوکہ تنخواہ قلیل تھی مگر نہ ہونے سے تو بہتر تھا۔

خالہ رضیہ جس محلہ میں رہتی وہاں کی دکان کیان میرا اور زینب بھی اس کے ہمراہ میری طرح ڈیلی وریز پر کام کے لیے آتی تھیں۔ خالہ سے میری واقفیت آتے ہی اس

رکشہ میں پیچھے بیٹھ گئے۔

”آپ کا نام؟“ اس نے بیٹھے ہی مجھ سے پوچھا۔

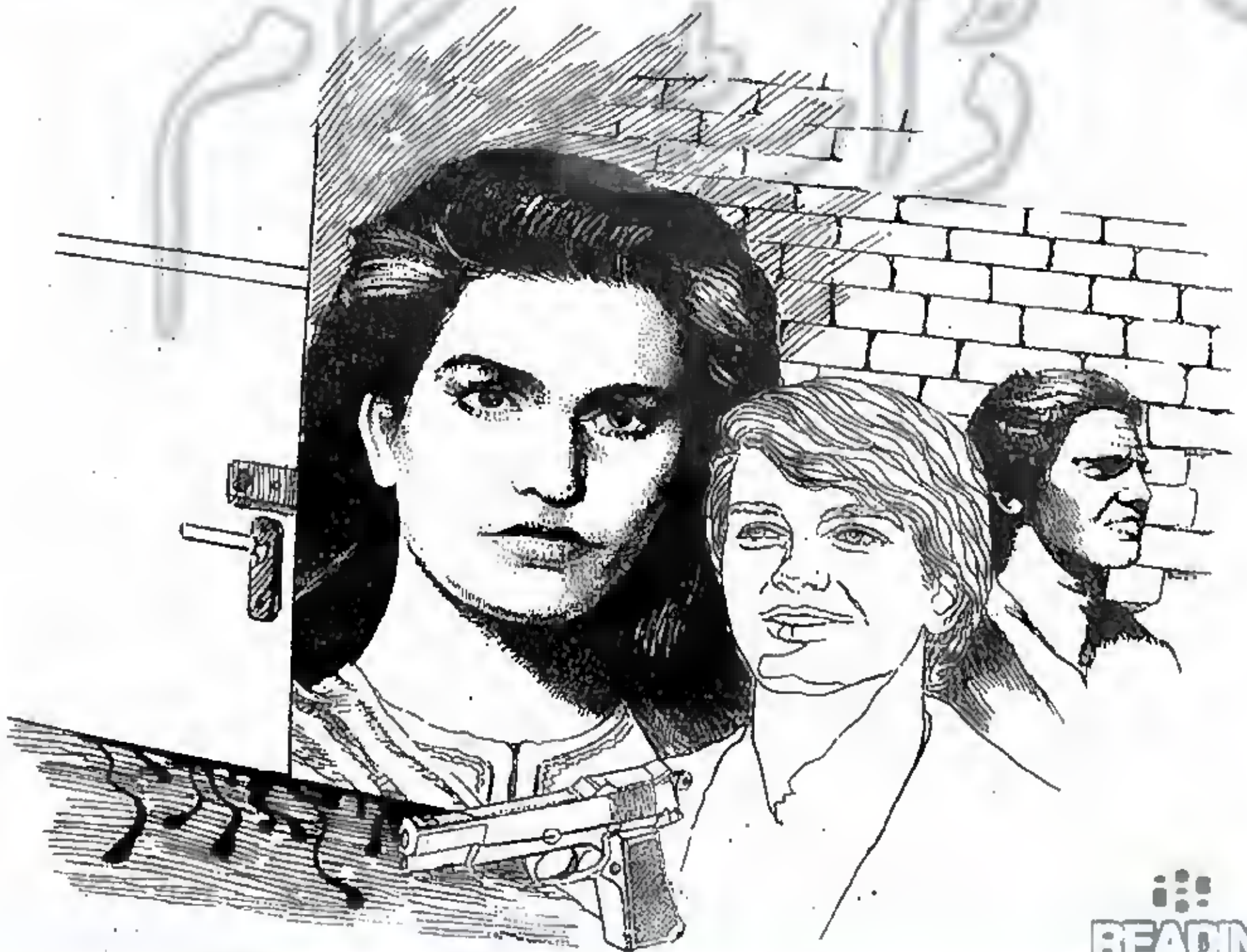
”عامر علی“ میں نے بتایا اور تمہارا۔

”پروڈیز احمد“ اس نے اپنی فائل سنبھالتے جواب دیا۔ ادھر ادھر کی باتوں میں ہم دونوں نے ایک دوسرے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا اور شہر اسٹاپ پر ہم دونوں ایک دوسرے کو نمبر دیتے الگ ہو گئے۔

عامر علی نے جیل میں کھڑے کھڑے میرے پوچھنے پر اپنی زندگی کے تاریک باب اُلٹے ہوئے پھر سے کہنا شروع کیا۔

”میرے اور پروڈیز کے بیچ جو بے روزگاری کا پل قائم تھا اس پر آتے جاتے کئی ماہ ہو گئے۔ اس دوران ہمارے درمیان بہت سے دن رات مشترک ہو گئے۔

ایک روز پروڈیز کا فون آیا اسے کسی فیکٹری میں حساب کتاب کی چھوٹی سی جاب مل گئی تھی اور وہ بڑا خوش تھا۔ مجھے بھی اس نے اسی فیکٹری میں ڈیلی وریز پر کام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں یہ روزگاری اور گھر والوں کی



READING
Section

قریب جا کھڑا ہوا۔ خدا جانے مجھ میں کہاں سے ہمت آگئی میں نے زینب کو براہ راست مخاطب کرتے پوچھا۔
”جناب مجھ سے کوئی شکایت؟“
وہ اس اچانک حملہ پر گھبرا گئی۔

”جی نہیں تو!“ اس کی گھبراہٹ پر سیرا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور برجستہ درمیان میں کود پڑی۔

”اس سے بڑی شکایت اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو دل میں ہے اس کا اظہار کیوں نہیں کر دیتے یوں گیلی لکڑی کی طرح سلگتے رہتے ہو۔ یہ آپ کو کچھ نہیں کہتی۔“ سیرا نے اشارہ زینب کی طرف کیا۔

”دیکھیں میرے دل میں آپ دونوں کے لیے بڑی عزت اور جگہ ہے۔“

”نہ نہ صرف ایک کے لیے۔ دل میں دو نہیں ایک ہی رکھا جاتا ہے۔“ سیرا کے لہجہ میں شرارت کا عنصر نمایاں تھا۔ میں واقعی گھبرا گیا تھا اس کی بات پر۔

”اچھا اب جلدی سے بتادیں کہ زینب آپ کو کیوں اچھی لگتی ہے؟“

”سیرا ان کو بھی کچھ بولنے دیں یا آپ ہی سب کچھ سرانجام دیں گی؟“ مجھے یکدم پرویز بھائی کی کہی بات یاد آگئی کہ زینب اپنا بھاء بڑھا رہی ہے۔ میں کچھ اور بولتا مگر خالہ رضیہ کھانے والا ڈبہ سنبھالتے سیدھی ہمارے پاس آرکی۔

”ہاں جی کیا مسئلہ چل رہا ہے؟“

”وہی خالہ شکایت والا۔“ میں نے ہنستے ہوئے جوابا کہا۔

”ہاں پوچھ لو خود زینب سے جو کہہ رہی تھی کہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے آتے جاتے گھورتا رہتا ہے۔“

”خالہ جی کھا جانے والی نہیں پیار بھری نظروں سے انہیں دیکھتا ہوں۔“ کچھ اور بات آگے بڑھتی کہ اچانک سائرن کی آواز پر وارج مین نے اندر سے گیٹ کی زنجیر گرا دی اور ورکر اپنے اپنے کھاتوں کی طرف بڑھنے لگے۔

زینب اور میں زن آشنائی کے راستے پر آگے بڑھتے جا رہے تھے وہ بہت اچھی اور کم گولڑ کی تھی۔ دو ماہ کی رفاقت میں صرف دو چار بار ہم دونوں نے موٹر سائیکل پر ادھر ادھر سیر کرنے اور بریانی برگر تک محدود رہے۔ نہ میں نے حد

پیکنگ کھاتے میں ہوئی تھی۔ اس کا خاندان سے چھوڑ کر کہیں کسی کے ساتھ منہ کالا کر گیا تھا۔ یہ بیچاری اپنے تین چھوٹے بچوں کی کفالت خود کر رہی تھی۔ سیرا اور زینب دونوں اس کے ساتھ ساتھ ہی رہتی تھیں اس لیے ان کے پر پر زے نہیں نکلے تھے ورنہ تو خدا کی پناہ تھی ادھر۔

زینب مجھے پہلے ہی دن سے اچھی لگی اور میں کسی نہ کسی بہانے اسے مخاطب کرنے لگا تھا مگر وہ صرف مطلب کی بات کا جواب دیتی تھی۔

ایک دو بار خالہ رضیہ نے میرا اس طرح زینب میں دلچسپی لینا محسوس تو کیا مگر جان بوجھ کر نظر انداز کر گئی۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ زینب کو شیشے میں اتار کر ہی دم لوں گا۔

اس بات کا تذکرہ میں نے پرویز بھائی سے بھی کیا تو اس نے منہ بناتے کہا کہ عامر جی یہ لڑکیاں بڑی تیز طرار ہوتی ہیں اپنا بھاء چڑھا رہی ہے ایک دن خود ہی لفٹ کروا دے گی، ڈٹے رہو۔“ اس نے بستر پر کروٹ لیتے آنکھیں بند کر لیں۔

آخر کار میری بے چینی پر خالہ رضیہ کو ترس آ گیا اس نے بندل رکھتے مجھے آہستگی سے مخاطب کیا۔

”عامر بیٹا۔“

”جی خالہ!“ میں نے ہاتھ ردکتے اس کی طرف دیکھا۔

”زینب تمہاری شکایت کر رہی تھی مجھ سے۔“

میں گھبرا گیا اور آنکھیں چرا لیں۔

”وہ بہت مجبوری کے تحت اس کام پر آئی ہے ورنہ اس کے گھر والے تو.....“

بات ادھوری چھوڑتے وہ گودام کھاتہ سے باہر چلی گئی۔ تمام رات میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ رہ رہ کر مجھے خالہ رضیہ کی بات پریشان کر رہی تھی کہ زینب تمہاری شکایت کر رہی تھی۔ میں نے کیا کیا تھا جو اس نے میری شکایت کر دی۔ کسی کو دیکھنا یا دل میں رکھنا تو کوئی جرم نہیں۔

پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ صبح جلدی تیار ہو کر میں فیکٹری پہنچ گیا کیونکہ تمام لوگ ادھر ادھر بیٹھے یا گھومتے پھرتے مل جاتے تھے سائرن بجتے اپنے اپنے شعبوں کی طرف چل پڑتے تھے۔ زینب اور سیرا اکیلی باہر کی دیوار کے باجئے میں کھڑی تھیں۔ میں بتلا جھجھک دونوں کے

مجھے یقین ہو گیا کہ پرویز بھائی سو گیا تو میں چپکے سے اٹھا اور کوارٹر باہر سے بند کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ پیچھے سے گھوم کر اے لائن کے پچھوڑے پہنچ گیا یہاں سب اپنے گھر کی خود نگرانی کرتے تھے چاروں جانب خاموشی تھی۔ میں ایک مناسب گھر کو ذہن میں رکھتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ چند پل ادھر ادھر دیکھنے کے بعد میں نے دیوار کے اوپر ہاتھ جماتے ایک جست بھری اور اس کے اوپر چڑھ گیا۔ دونوں جانب ایک ہی طرح کی اونچائی تھی۔ مجھے اندر اترنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی چھوٹا سا دالان تھا جسے میں کوئی آواز کیے بغیر عبور کر گیا۔

ایک کمرے میں گھر والے سوئے ہوئے تھے گھبراہٹ کے مارے میرا برا حال تھا۔ دوسرا کمرہ جس میں گھر کا سامان رکھا ہوا تھا، میں دبے پاؤں اس کے اندر داخل ہو گیا ادھر ادھر ہاتھ مارتے مجھے دراز میں چین اور بندے پڑے مل گئے۔ دوسرے دراز میں چھوٹا سا پرس جس میں کچھ پیسے پڑے تھے میں نے اسی کو غنیمت جانا اور دھک دھک کرتے دل کو سنبھالتا ہوا کمرے سے نکل کر دوبارہ دالان میں آ گیا۔

دروازے کی کنڈی لگی ہوئی تھی جس کو میں نے آہستہ سے کھولا اور باہر نکل آیا۔ سب کچھ ٹھیک پا کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا مزدوروں کے کوارٹروں کی طرف چل پڑا۔ ایک جگہ رُک کر میں نے لمبے لمبے سانس لیے اور آگے بڑھ آیا۔

اپنے کوارٹر میں آ کر میں نے خود کو بستر پر گراتے پرویز بھائی کی طرف دیکھا جو بندستور پڑا سو رہا تھا۔ جب میرا ذہن کچھ سوچنے کے لائق ہوا تو مجھے خود پر یقین نہ آیا کہ میں کیا کر آیا ہوں بہر کیف میں نے پرس کھول کر اس کے اندر پڑی نقدی کا جائزہ لیا وہ سات ہزار تین سو روپے تھے پرس میں نے پھاڑ کر واٹس روم کے کٹر میں بہا دیا اور چین بندے سنبھال کر رکھ لیے اور سو گیا۔

☆.....☆.....☆

ڈیوٹی پر آ کر میں نے سات ہزار روپے زینب کو دیتے کہا کہ جلدی جا کر وکیل کے سپرد کر دینا تاکہ آپ کے والد کا مقدمہ لڑنے میں وہ کوئی تاخیر نہ کرے۔ زینب نے تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور شکر یہ کہ ساتھ

کر اس کرنے کی کوشش کی اور نہ اس کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ میرا اور خالہ رضیہ ہمارے تعلقات سے آگاہ تھیں۔ میں اس کے انکار کے باوجود کچھ نہ کچھ اس کے لیے لے آتا جو وہ پس و پیش کے بعد رکھ لیتی۔ زینب کی ایک بہن اور ایک بھائی تھے۔ دونوں اس سے چھوٹے ہونے کے سبب وہ ہی ان کی کفالت کرتی۔

☆.....☆.....☆

ایک روز وہ بہت پریشان دکھائی دی۔ میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ والد صاحب پر غبن کا الزام تھا اور وہ جیل میں تھے اس کا مقدمہ لڑنے کے لیے اسے اس نوکری کا سہارا لینا پڑا۔ وکیل بقایا کا تقاضا کر رہا تھا میرے پونچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کو دس ہزار روپے دینے ہیں۔ میرے پاس مشکل سے تین ہزار اکٹھے ہوئے ہیں۔ زینب کی بات سے میرے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ میرا حال بھی ایسا ہی تھا کیونکہ زیادہ تر تنخواہ کا حصہ میں زینب پر ہی خرچ کر ڈالتا تھا۔ جواب میں اسے مطمئن تو کر دیا مگر سات ہزار کیسے آئیں گے؟ رات کو میں نے پرویز بھائی سے پوچھا اس نے دو ہزار دینے کا وعدہ کر دیا۔

صبح ڈیوٹی پر آتے میں نے بہت سے قافیے جوڑے مگر بات کوئی بنی نہیں کے مصداق آگے سوچنے لگا۔ اگر فیکٹری میں کوئی گڑ بڑ کرتا تو سیکورٹی اتنی سخت تھی چاروں جانب کیمروں کا جال بچھا ہوا تھا، کوئی چیز اندر سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ ادھر میں نے زینب سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں ضرور اس کی مدد کروں گا۔

پرویز بھائی نے حسب وعدہ دو ہزار دیے اب پانچ ہزار کی بات تھی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد جو میرے دل میں خیال آیا وہ بڑا ہی خطرناک تھا۔

فیکٹری کے ہم سے بڑے درگزر کے لیے اے لائن کی طرف جانا پڑتا تھا کیونکہ وہ سب سے آخر میں تھی ہمارے لیے تو اوپر نیچے تین منزل کوارٹر تھے جبکہ ان کے لیے چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے گھر الگ الگ مالکان نے بنا کر دیے ہوئے تھے۔

جو فیصلہ میں نے کیا گو کہ بڑا ہی گھٹیا تھا مگر زینب کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

نیا کہ پر چیکنگ ہو رہی تھی مجھے رکنا پڑا۔ بسی لائن لگی ہوئی تھی۔ جب میری نظر پیچھے پڑی تو سواری غائب تھی اور ایک شاپر کونے میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دیا تو میں نے وہ بڑا سا شاپر اٹھا کر اپنے پیروں میں رکھ لیا اور رکشہ آگے بڑھایا۔ خالی رکشہ دیکھ کر ایک سواری نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا مگر میں فراتے بھرتا آگے نکل آیا۔ ایک گلی میں رُک کر میں نے شاپر کھولا اوپر کپڑے اور نیچے چرس کے بڑے بڑے پیک نکلے بھرے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی منشیات فروش تھا یا تو اس کے لیے چیکنگ تھی یا روٹین کانا کہ تھا مگر وہ ڈر کر نو دو گیا رہ گیا۔

میں شاپر کو پھر سے سنبھالتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ رکشہ روک کر شاپر اٹھایا اور اپنے کمرے میں اسے چھپا کر دوبارہ کام پر نکل پڑا۔ اصل میں مجھے اس سواری کی تلاش تھی مگر شام تک مجھے وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ رکشہ چھوڑ کر میں گھر آ گیا اور پھر سے اس شاپر کا جائزہ لیا۔ وہ بیس کلو گرام تھے بڑے بڑے، وزن دس بارہ کلو سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

کئی دن تک میں نے اسے گھر میں چھپائے رہا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ چرس میری ملکیت تھی تو اسے ٹھکانے لگانے کا سوچنے لگا۔ میرے کئی بیٹی بھائی چرس کے عادی تھے ایک لڑکا عنصر تھا جس کو میں نے پوچھا کہ وہ چرس کہاں سے لیتا ہے تو اس نے بتایا کہ گوالمنڈی میں ایک ہے ملنے والا جو فروخت کرتا ہے۔ کیوں خیر ہے؟ اس نے برجستہ پوچھا۔

نہیں بس یونہی پوچھا تھا۔ پھر میں نے اس سے پورا پتالیا چرس بیچنے والے کا۔ دوسرے دن ایک ٹکڑا رکشہ میں سیٹ کے نیچے رکھا اور اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ وہاں اسے ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہ ہوئی اور وہ کباڑیا بازار میں مل گیا۔

اسے بڑے اعتماد میں لے کر اس سے بات کی تو اس نے مال دکھانے کا کہا۔ میں نے سیٹ کے نیچے پڑا چرس کا چھتر نکال کر اسے دکھایا تو وہ مال لینے کے لیے تیار ہو گیا۔

روپے پکڑ لیے۔ دو ہزار پرویز بھائی کو لوٹا دیے کہ اب ان کی ضرورت نہیں۔

چھٹی والے دن میں نے وہ چین اور بندے سنا کر کوئی اس کے بدلے زینب کے لیے بالیاں لے لیں۔ شام کو اس کے گھر فون کر کے اسے ملنے کی بات کی تو اس نے کہا کہ تم میرے گھر آ جاؤ۔ پہلے بھی ایک آدھ بار اس کے ساتھ جا چکا تھا ان کے گھر اس لیے بغیر جھجک کے پہنچ گیا۔ زینب کی والدہ پہلے سے بھی زیادہ محبت سے پیش آئیں اور چائے بنانے کچن میں چلی گئیں۔ میں نے جیب سے بالیاں نکالتے بڑی اپنائیت کا مظاہرہ کرتے زینب کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ پہلے تو اسے حیرت ہوئی پھر وہ یکدم خوشی سے بے قابو ہوتے میرے سینے سے لگ گئی۔

ہماری زندگی اب نئے راستے پر گامزن تھی۔ میں زینب کے والد کا مقدمہ اب خود لڑ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ زینب کو میں نے فیکٹری سے ہٹا لیا تھا اور خود بھی نوکری چھوڑ کر زینب کے محلہ میں ایک کرائے کا مکان حاصل کر لیا تھا۔

اس مکان سے تھوڑے فاصلے پر ایک کریاناہ اسٹور تھا جس سے تھوڑی بہت واقفیت بن گئی۔ اس کے بیچ پر بیٹھ کر محلہ کے اور بھی لوگ اخبار پڑھتے ہیں بھی چلا جاتا ادھر ہی ایک رکشہ والے سے سلام دعا ہو گئی جو دوسری گلی میں رہتا تھا۔ چوری چکاری سے خرچہ تو چل رہا تھا مگر زینب کی فرمائشیں آگے آگے بھاگ رہی تھیں اور مجھے کام کرنے کی اشد ضرورت پیش آ گئی تو میں نے رکشہ ڈرائیور بلو سے بات کی تو اس نے آٹو دھاڑی پر لے کر دینے کا مشورہ دیا۔ میں چونکہ اچھا ڈرائیور بھی تھا۔ اس لیے میرے دل کو اس کی بات لگی اور میں رکشہ چلانے لگا۔

دو چار دن ذرا مشکل لگا پھر ٹرینڈ ہو گیا۔ پہلے پہل علاقوں کی نشاندہی پریشانی کا مسئلہ بنی پھر کچھ سواریوں سے اور کچھ پوچھتاچھ سے کام نکل جاتا۔ رکشہ چلانے کا ایک فائدہ ہوا گھروں اور علاقوں کو تاڑنے کا موقع مل گیا۔

اعوان ناؤن کی ایک سواری اٹھائی اور ڈوبن پورہ سے ہوتا ہوا کھڑا ک نالہ کر اس کر رہا تھا کہ آگے پولیس

اپنے بیٹے کو کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے دروازہ باہر سے بند کرتے اس کو وارننگ دی اگر کوئی گڑبڑ کی تو مجھ سے کسی نیکی کی توقع نہ رکھنا۔ اس نے یقین دلایا کہ میں کچھ نہیں کرتی۔

میں دروازے کی جانب گھوما تو سامنے گھر کا ملازم سبزی والا تھیلا پکڑے حیرانگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ریوالور جو نیفے میں چھپا لیا تھا فوراً نکالا اور اس کی جانب بڑھا جو دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا اس نے چیخنا شروع کر دیا میں نے گھبراہٹ میں اس پر فائر داغ دیا۔

گولی اس کے سر پر لگی اور وہ میرے پیروں میں لڑھک گیا۔ گولی کی آواز اور اس کے چیخنے پر آس پاس کے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں ایک طرف بھاگا جا رہا تھا اور لوگ میرے پیچھے چور چور کرتے چلے آ رہے تھے کہ سامنے سے آنے والی اینٹ میرے سر پر لگی اور میں زمین پر گر پڑا اور ریوالور میرے ہاتھوں سے نکل کر دور جا گیا۔

پہنچا کرنے والوں نے مجھے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ میرا پورا جسم لہولہا ہوا چکا تھا۔ اگر بروقت پولیس کی گاڑی نہ پہنچ جاتی تو لوگ مجھے مار مار کر ختم کر ڈالتے۔ مجھے اسپتال لایا گیا۔ میں نیم بے ہوشی میں تین دن تک پڑا رہا۔ میرے ہاتھوں کو تھکڑی لگا کر پولیس نے اسپتال کے بیڈ پر حراست میں لے رکھا تھا۔ جب میں ذرا سا بولنے اور اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوا تو میری انکوائری شروع ہوئی۔ میں نے جو کچھ بھی آج تک کیا تھا سب کچھ سچ سچ بتا دیا مگر اس کے باوجود ان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ قتل تو مجھ سے ہو چکا تھا اس گھر کے ملازم کا۔ ڈکیتی، چوری اور قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔

زینب کے چکر میں اور اس کے والد کو بچاتے بچاتے میں خود سر تک غلاظت کی ولدل میں دھنس گیا ہوں۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اس نے ہاتھ سے صاف کیا اور اپنا سر جیل کی سلاخوں سے ٹکا دیا۔ میں اُس کی بے چارگی دیکھ کر ٹک نہ سکا اور جیل سے نکل گیا۔

☆☆.....☆☆

شام کو ایک جگہ کا تعین اس نے کیا اور میں شارپ لے کر آ گیا۔ بندہ وہ ایماندار اور کاروباری تھا۔ اس نے اس ساری چرس کے مجھے چالیس ہزار دیے۔ اتنی بڑی رقم زندگی میں پہلی بار نصیب ہوئی تھی۔ تمام رات میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ اس کو کس طرح استعمال کروں۔ پہلے سوچا آدھی گھنٹہ دوں اور باقی خود پر اور زینب پر خرچ ڈالوں پھر یہ سوچ کر گھر کا خیال دل سے نکال دیا اور زینب پر دل کھول کر روپیہ لٹا تا رہا۔

رکشہ تو صرف دکھاوے کے لیے تھا اصل میں تو میرے اندر بڑا ہاتھ مارنے کی جستجو چل رہی تھی۔ رکشہ ڈرائیوروں کے ساتھ رہ کر ہر بڑی جگہ اور بڑے لوگوں کا پتا چل گیا تھا۔ چالیس ہزار میں سے ایک ریوالور بھی خرید لیا تھا میں نے۔ کسی کو ساتھ ملانے کی بجائے میں اکیلا ہی کوئی واردات کرنے کے بارے میں پلان کر رہا تھا اس کے لیے جو گھر میں ذہن میں رکھا ہوا تھا وہ کسی سرکاری آفیسر کا تھا۔ دو چار بار اس کا جائزہ لیا گھر میں ایک خاتون دو بچے اور شاید ایک نوکر تھا۔ آج میرا مکمل پروگرام بنا ہوا تھا کہ رکشہ کسی جگہ چھوڑ کر خود اس گھر میں داخل ہو جاؤں۔

ایک محفوظ جگہ پر رکشہ کھڑا کیا اور دوکاندار کو یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا کہ ابھی آتا ہوں۔ وہ گھر دو تین گلیوں کو کر اس کر کے آتا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ڈکیتی کے لیے تیار ہوں تو میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ باہر لگی بیل کا ہٹن دبا دیا۔

دروازہ کھولنے والا پانچ چھ سالہ لڑکا تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹا ہوا اندر کی طرف لپکا گھر کی مالکن کو میں نے بار بار دیکھ رکھا تھا جو ہٹی کو گود میں لیے ٹی وی دیکھ رہی تھی میرے ہاتھ میں ٹیکڑے پستول اور اپنے بچے کا بازو دیکھتے سکتے میں آگئی۔ میں نے آہستہ آواز میں کہا کہ اگر شور مچایا تو اس کو گولی مار دوں گا۔ جلدی سے اٹھو اور سب کچھ نکالو۔

وہ بچی کو ساتھ لگائے تیزی سے اٹھی اور میرے آگے ایک کمرے کی طرف چل پڑی۔ سامنے لوہے کی الماری رکھی ہوئی تھی اس کے پٹ کھولتے گھر کی مالکن نے سونے کے زیورات اور نقدی میرے حوالے کرتے


خوف اور رگوں میں لہو جمادینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک
ایسی ناقابل یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ
یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 9

صنوبر کو اس کا شرجیل مل گیا تھا اور وہ بہت خوش تھی۔ مگر اس کی خوشی کو در شہوار نے یہ کہہ کر کافی حد تک کم کرنے
کی کوشش کی کہ کچھ بھی ہو۔ چاہے وہ جتنی بھی معافیاں مانگے لیکن اس نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا تھا وہ غلط تھا۔ اگر
اپنی طاقت ہار جاتا اور باپ کے سامنے جھک جاتا تو کیا ہوتا؟ کیا تم ساری زندگی اسی طرح ابہام میں گھری
رہیں اور یہ جان بھی نہ پاتیں کہ تمہارے ساتھ ہوا کیا ہے۔“
”لیکن ماما غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں اور وہ بھی ایک انسان ہے۔ کوئی غلطی ایسی نہیں ہوتی جسے انسان
معاف کرنا چاہے اور معاف نہ کر سکے۔“ صنوبر کو اپنی ماں کی مخالفت بلا جواز محسوس ہو رہی تھی۔
”چلو پھر ٹھیک ہے میں اور کچھ نہیں کہتی۔ اپنی پیاری بیٹی کے لیے دعا کروں گی کہ زندگی میں اسے پھر ایسے کسی
مرحلے سے نہ گزرنا پڑے۔“

در شہوار سمجھ چکی تھی کہ محبت کا جادو صنوبر کے رگ رگ میں اتر چکا ہے اور اس قسم کی کیفیت میں کسی کی کوئی بھی
بات خواہ وہ کتنی ہی دور اندیشا نہ کیوں نہ ہو سمجھ نہیں آتی۔ ویسے بھی اسے اپنی بیٹی کی خوشی عزیز تھی اور اس کی بیٹی جس
بات میں خوش تھی اسے بھی اس کے ساتھ خوش ہونا تھا۔ وہ اب پہلے والی در شہوار نہیں رہی تھی۔ سلمان کی ہٹ دھری
اور صنوبر کی بیماری نے اسے یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ آصف کریم کے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ
دو جوان بچوں کی ماں ہے۔ اور جب سے اسے یہ احساس ہوا تھا زندگی اسے پہلے کہ مقابلے میں بہت فرحت بخش
اور جذبوں سے بھرپور لگنے لگی تھی۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اسے بدلنے اور ماما کے احساس سے روشناس کرانے
میں خود صنوبر کا کتنا اہم کردار تھا۔ اس کی بیٹی حساس ہے اور حساس لوگوں کو اپنے دل کی باتوں پر یقین ہوتا ہے۔
ویسے بھی در شہوار کو لگا کہ اس کے پاس شرجیل کو مستقبل میں بے وفا ثابت کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ دلیل نہیں تھی تو
پھر اپنی بیٹی کا دل ابھی سے اداسیوں میں دھکیلنے کا کیا فائدہ ہے۔

دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ سلمیٰ نے کھانے کے برتن اٹھاتے ہوئے ایک نظر صنوبر کی طرف دیکھا۔ صنوبر نے
ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے جیسے اپنے شانت ہونے اور سلمیٰ سے راضی ہونے کا اشارہ دیا۔
”تو کیا اب یہ بات تمہارے پاپا کو بتادی جائے؟“ در شہوار نے سلمیٰ کے چلے جانے کے بعد کہا۔



**Downloaded From
Paksociety.com**

READING
Section

”نہیں... ابھی نہیں در شہوار نے اس کی طرف مزید وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
”پہلے شرجیل اپنے والدین کو راضی کر لے۔ پھر پاپا کو بتا دیجئے گا“ صنوبر نے سوچتے ہوئے کہا۔
”تھیک ہے“ در شہوار نے اٹھتے ہوئے کہا ”اب تم اپنے کمرے میں آرام کرو میں دیکھتی ہوں یہ سلمان کہاں رو گیا؟“

”کیا مطلب... وہ اب تک بھی نہیں آیا؟“ صنوبر نے کہا تو در شہوار کو ہنسی آگئی۔
”میری بیٹی اپنی محبت میں اس قدر کھوئی ہوئی ہے کہ ڈانگ ٹیبل پر سلمان کو موجود نہ پا کر بھی اسے پتا نہیں چلا کہ سلمان غیر حاضر ہے“ صنوبر شرمندہ سی ہونے لگی۔
”سوری ماما“ اس نے کہا۔ ”تو آپ اس کا انتظار کب تک کریں گی اور کیا وہ اسی طرح روز روز اتنی ہی دیر سے آتا ہے؟“ صنوبر نے پوچھا۔

”ہاں اسے تم اچھی طرح جانتی ہو۔ نو جوان خون ہے۔ جب میں ڈھیروں پیسا ہے۔ باپ کی کمائی پر پیش کرتا ہے۔ اور میرے دوست بھی ایسے ہی بنائے ہیں جو اسے جلدی گھر نہیں آنے دیتے۔“ در شہوار کی باتوں میں شکوہ شکایت تو تھی مگر ایک ایسی مجبور بھی تھی جو صنوبر سمجھ نہیں سکی۔ ویسے بھی اب صنوبر اپنے بھائی سلمان کے ساتھ اسکول آتی جاتی نہیں تھی۔ وہ ایسا کیوں نہیں چاہتی تھی۔ یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ اب شرجیل واپس آچکا تھا اور شرجیل کے ہوتے ہوئے کسی بھی وقت اس کا موڈ کہیں بھی جانے کا بن جاتا تھا۔ الگ ہونے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ تو ایسے میں وہ سلمان کو اسے پک کرنے کا کہتی تو وہ عین وقت پر آ جاتا اسے لینے اور اسے اپنے ساتھ ساتھ شرجیل کے دل کا جبر بھی سہنا پڑتا۔ اس لیے اس نے سلمان کو خود ہی منع کر دیا تھا۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں سلمان تو پہلے ہی اس ڈیوٹی سے بیزار تھا کہ روز روز صنوبر کو اس کے اسکول چھوڑا اور پھر ٹھیک وقت پر لینے بھی جاؤ۔ صنوبر نے ڈرائیور کی ڈیوٹی لگا دی تھی اور اس کے لیے اسے اپنی ماما کو قائل کرنا پڑا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ کوئی بھی تہذیب کیسی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو ماں باپ سے بچوں کو کچھ نہ کچھ جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔ صنوبر کو بھی اسکول میں پڑھائی اور کچھ عملی امتحانات کے بارے میں بتا کر ہی اس تبدیلی کے لیے راضی کرنا پڑا تھا۔

در شہوار جانتی تھی کہ ایسا کرنے سے سلمان کی پہلے سے ہی قابل اعتراض سرگرمیاں اور بھی بے لگام ہو جائیں گی۔ لیکن وہ مجبور تھی اور اتنی سمجھدار تو دنیا کی کوئی بھی ماں نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے بچوں کے سارے جھوٹ وقت پر پکڑ سکتی ہو۔ اب اسی تبدیلی کی وجہ سے در شہوار کو سلمان کا انتظار کرنا تھا تا کہ وہ کھانا ٹھیک سے کھا سکے۔ ایک ماں کے جو بھی فرائض ہو سکتے تھے اسے اب سب ہی نبھانا تھے اور وہ جان چکی تھی کہ ماں ایک ایسی قربانی کا نام ہے جسے کسی خاص دن، خاص وقت میں ہی قربان نہیں ہونا پڑتا بلکہ وہ ہمیشہ ہر وقت اپنے بچوں کے لیے قربان گاہ پر بیٹھی رہتی ہے۔ صنوبر نے ماں کی طرف دیکھا اسے لمحے بھر کو ماں کی پریشانی دیکھ کر ترس سا آ گیا لیکن محبت کی پکار دنیا کی سب آوازوں سے زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے۔ اس نے خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆.....☆.....☆

جن زادے سلمان کے باپ ابراہیم کو اب ساری صورت حال کا علم تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اس کا بیٹا کون سے روگ میں مبتلا ہے اور اس کی بیوی زلیخا کے مطابق یہ روگ لا علاج بن چکا ہے اسی لیے جن زاوہ سلمان کسی بھی قیمت پر ہمیشہ کے لیے گھر واپس آنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس اس نے اپنی ماں کو یہ تجویز کیا تھا کہ وہ اور بابا دونوں اس کے ساتھ وہاں انسانوں کی دنیا میں چلیں۔ زلیخا جانتی تھی کہ یہ بات اس کا شوہر ابراہیم کسی بھی صورت میں نہیں مانے گا۔ کیوں کہ وہ ایک روایت پسند جن تھا اور ایسے کٹر جنات اپنی جان دے سکتے ہیں لیکن اپنی روایات کو نہیں چھوڑتے۔ بیٹے کی ضد اور محبت بھی ابراہیم کو مجبور نہیں کر سکی تھی اور اسے سلمان جن زادے کے بارے میں یہ جان کر کہ وہ ایک انسان لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے شدید غصہ تھا۔ اس کے اندر جو الہ کبھی کھول

رہا تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو لے جا کر قبیلے کی مجلس کے سامنے پیش کر دے اور اس کے سارے گناہوں کا اقرار بھی کرنے میں دیر نہ کرے۔ لیکن یہاں بھی محبت غالب تھی اور یہ محبت اکلوتے بیٹے سے زیادہ اس کی بیوی زلیخا کی محبت تھی۔ اس نے زلیخا سے محبت کی شادی کی تھی اور شادی کی رات اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ساری زندگی اسے کوئی ایسا دکھ نہیں دے گا جیسے وہ سہار نہ سکے۔ اور زلیخا اپنے بیٹے سلمان سے ایسی ہی محبت کرتی تھی کہ اگر اسے سلمان سے جدا کر دیا گیا تو وہ دو دن بھی زندہ نہیں رہ سکے گی۔ یہ



Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

بات ابراہیم جانتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے بیٹے سلمان سے دھیرج اور صبر تحمل سے بات نمٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بیٹے سے وہ بھی کوئی کم محبت نہیں کرتا تھا، کون ہے جو اپنے اکلوتے بیٹے سے محبت نہیں کرتا۔ اکثر اکلوتے بیٹوں کے ماں باپ ان کی ایسی باتیں بھی مان لینے پر مجبور ہوتے ہیں جو اولاد کی کثرت والے والدین نہیں بھی مانتے۔ حالانکہ ماں باپ کے لیے سب ہی بچے برابر ہوتے ہیں۔ پر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اکلوتے بیٹے کے ماں باپ کی ساری محبت ایک جگہ، ایک اولاد پر مرکوز ہونے کی وجہ سے زیادہ لگتی ہے۔

سلمان ابراہیم اس وقت ایک گھپا میں بیٹھا ہوا صنوبر کے حسن کو یاد کر رہا تھا اور ان سارے دنوں اور سارے پلوں کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جو اس کے دل کی دنیا سے نکل کر اس کے سامنے محو رقص تھے۔

یہ کچھ زیادہ ہی روشن دن تھا۔ پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھوپ ایسے چمک رہی تھی کہ نیا لے پہاڑ دور سے دیکھنے پر سونے کے معلوم ہوتے تھے۔ ابراہیم نے دور دور تک اپنی نظروں کو دوڑایا مگر اسے اپنا بیٹا کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ ”کہاں چلا گیا“ اس نے خود سے کہا۔ اسی لمحے اسے زلیخا کی وہ بات یاد آئی کہ اگر سلمان کی بات نامانی گئی تو وہ کسی رات کسی خاموش دن میں چپ چاپ یہاں سے چلا جائے گا۔ ابراہیم کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے سلمان کو آواز میں دینا شروع کر دیا۔

خواب و خیال کی دنیا میں کم سلمان ابراہیم کو کئی آوازوں کے بعد اپنے بابا کی آواز سنائی دی۔ تو وہ گھپا سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے بابا کی طرف ہاتھ ہلایا اور پھر نظریں پیچی کر لیں۔ وہ جانتا تھا اس کا بابا اسے کیوں تلاش کر رہا ہے۔ جو بات وہ کرنا چاہتا تھا اسے کرنے سے سلمان کترار ہاتا تھا کیونکہ اسے پتا تھا اس کے بابا کی بات میں کیا معنی چھپے ہیں اور وہ خود اپنے دل کے ہاتھوں اس قدر مجبور تھا کہ اسے بابا کی بات سے کسی بھی صورت میں اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بات چیت کا انجام ہر صورت میں اس کے باپ کی دل آزاری پر ہی منتج ہونا تھا اس لیے ایسی بات کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے جس کا انجام کوئی پہلے سے جانتا ہو۔

ابراہیم جلدی جلدی اس کے پاس ہی چلا آیا اور دونوں آرام سے اس خاموش اور کشادہ گھپا میں بیٹھ گئے۔

”تم یہاں ہو میں تو سمجھا.....“ ابراہیم نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

سلمان اپنے بابا کی ادھوری بات کا پورا مطلب سمجھ چکا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں تو سمجھا تم جا چکے ہو۔ یہ سمجھ کر بھی سلمان کچھ نہیں بولا چپ ہی رہا۔

”بیٹا سلمان میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں“ ابراہیم کے لہجے میں چھپی مجبوری اور باپ کی محبت دونوں سلمان نے محسوس کر لی تھیں۔

”بابا اگر آپ یہ بات نہ کریں تو زیادہ اچھا ہوگا“ سلمان نے بمشکل کہا۔

”کیا مطلب ہے... تم میری بات سننے سے پہلے ہی جان چکے ہو کہ میں کیا بات کرنے والا ہوں؟“ ابراہیم کو سلمان کی بات میں انکار کی بو محسوس ہوئی۔

”جی... میں یہ جانتا ہوں آپ کیا بات کرنے والے ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں بابا میں آپ کے چہرے پر مایوسی اور غم دیکھنا نہیں چاہتا۔ بس اتنا سمجھ لیں۔ میں آپ کی بات مان نہیں سکوں گا۔ مجبور ہوں“ سلمان نے اس طرح کہا جیسے اگر اس نے اب نہیں کہا تو شاید پھر بھی نہیں کہہ سکے گا۔

”اس کا مطلب ہے تم میری بات نہ سننے کا فیصلہ کر چکے ہو۔ لیکن میں چاہتا ہوں سن لو ہو سکتا ہے ہم کوئی ایسا راستا نکالنے میں کامیاب ہو جائیں جس سے دونوں کی بات رہ جائے۔“ ابراہیم نے اپنا غصہ دباتے ہوئے پوری طرح امن سے کہا۔

سلمان نے اپنے بابا کے چہرے کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔ اور اسے اپنے بابا پر ڈھیروں پیار آگیا۔ وہ یکلخت اپنے بابا کے سینے سے لگ گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اور وہ اسی طرح بابا کے سینے سے لگے

لگے بولا۔
 ”میں کتنا مجبور ہوں بابا کاش آپ کو بتا سکتا۔ ورنہ میں اپنے بابا کی بات کبھی رونا کرتا۔“ سلمان کی رقت آمیز لہجے میں کی گئی بات سن کر ابراہیم کا دل بھی پستج گیا۔ وہ بیٹے کو اپنے سینے سے بچھین کر بولا۔
 ”کاش تیرا باپ ساری دنیا کا بادشاہ ہوتا میرے بچے تو میں تیری ہر خواہش بنا تیرے کہے ہی پوری کر دیتا۔ مگر تم جانتے ہو تمہارا بابا کتنا مجبور ہے۔“ ابراہیم کی آنکھوں میں بھی پانی تیر گیا۔

کچھ دیر تک دونوں اسی طرح ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ادھر ادھر کی اور سلمان کے بچپن کی ایک دوسرے کی چاہت کی باتیں کرتے رہے اور کسی قدر دونوں کو ہی یہ یاد نہیں رہا کہ وہ اس سے پہلے کیا بات کرنے والے تھے۔ ابراہیم نے آج کتنے ہی سے بعد اپنے بیٹے سے ایسی پیار بھری اور دل کو اندر تک سکون دینے والی باتیں کی تھیں اسے یہ سب اتنا اچھا لگنے لگا کہ اس کا دل چاہا کہ کاش یہ لمحے اسی طرح رہیں اور وقت رک جائے آگے نہ بڑھے۔ لیکن وقت تو کبھی نبیوں اور ولیوں کے لیے نہیں رکا تو جنات کے لیے کیسے رک سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو بھی ذی روح اس دنیا میں آیا ہے اسے جلد یا بدیر واپس ضرور جانا ہوگا۔ مگر ابراہیم اس وقت سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ اس لیے کچھ ہی دیر میں دونوں کھیلنے لگے اور یہ کھیل جنات کی دنیا میں کافی مقبول کھیل تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو پکڑنے اور پکڑ کر سر سے اوپر گھمانے کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ جب سلمان نے ابراہیم کو اس طرح پکڑ کے اپنے سر سے اونچا گھمایا تو ابراہیم کو بڑی حیرت ناک خوشی ہوئی اسے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بیٹا اتنا بڑا ہو چکا ہے اور اس کے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے۔

اسی طرح مسخریاں کرتے، ہنستے بولتے جب دونوں اپنے گھر میں داخل ہوئے تو پریشانی اور الجھن میں بے چین زلیخا کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کی آنکھیں پٹی رہ گئیں اور اس کے منہ میں الفاظ جیسے رک سے گئے۔ وہ کہنا چاہتی تھی ”کیا ہوا کہیں تم دونوں دیوانے تو نہیں ہو گئے۔ میں یہاں پریشانی سے ہول رہی ہوں اور تم مسخریاں کر رہے ہو۔“ مگر وہ کہہ نہ سکی۔ سلمان اپنی ماں کی کیفیت کو سمجھ گیا اس لیے اس نے ماں کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر زور زور سے گھومتے ہوئے کہا۔

”ماں تم سمجھ رہی تھیں بابا میری لاش لے کر گھر میں داخل ہوگا۔ پر دیکھو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا بابا بھی مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اور جو محبت کرتے ہیں وہ محبت کا درد بھی سمجھتے ہیں۔“ دیوانگی میں سلمان یہ سب کہتا رہا اور ابراہیم اس کی بات سن کر مسکراتا رہا۔ زلیخا کو یہ سب سن کر اتنا اچھا لگا، ایسا سکون ملا کہ وہ اپنے سلمان سے یہ کہنا تک بھول گئی کہ ارے باڈے مجھے نیچے تو اتارو کیوں میری حالت برباد کرنے پر تلے ہو۔ اور جب سلمان نے اسے نیچے اتارا تو وہ سلمان کو اپنے سینے سے لگا کر ایک دم ہی چھلک پڑی۔
 ”اللہ نے میری دعائیں سن لیں میرے بچے۔ میری جان سب ٹھیک ہو گیا۔“ یہ سن کر ابراہیم چونکا مگر بولا کچھ نہیں وہ جانتا تھا کہ سب ٹھیک نہیں ہوا ہے۔

”تم دونوں بیٹھو میں کھانا لگاتی ہوں، صبح سے تم نے کچھ نہیں کھایا تو تمہارا بابا بھی بھوکا ہے“ یہ کہہ کر زلیخا اندر چلی گئی اور سلمان سرشاری سے غار میں کچھ چھال پر ڈھیر ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کو زلیخا نے ابراہیم کی گردن میں باہیں حائل کرتے ہوئے کہا۔

”تم واقعی ایک شاندار جن ہو۔ اور اس سے بھی اچھے باپ ہو۔ مگر میں یہ جاننے کو بے چین ہوں کہ یہ سب ہوا کیسے۔ تم نے سلمان کو کیسے منایا۔ میری تو وہ ایک بات بھی ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا۔“ تب ابراہیم کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ زلیخا کتنی بڑی غلط فہمی کا شکار تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ سلمان نے ابراہیم کی بات مان کر اب ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یا خدا کس قدر مشکل ہے اس ماں کو سچائی بتانا۔ واقعی اولاد انسان کی ایک آزمائش

ہی ہوتی ہے رب تعالیٰ نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ابراہیم سوچوں کی پگڈنڈیوں پر چلتا رہا اور زلیخا اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ جب ابراہیم کو خاموش ہونے کا کافی وقت ہو گیا تو زلیخا کا صبر جواب دے گیا۔

”کیا بات ہے اس طرح چپ کیوں ہو مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ سلمان کو تم نے کس طرح، کیا کہہ کر منایا؟“

”سنا ہی چاہتی ہو تو پھر سنو! سلمان کو میں نے نہیں منایا“ ابراہیم کی آواز میں ایک دکھ تھا۔ جسے محسوس کر کے زلیخا جیسے لرز کر رہ گئی۔

”کیا مطلب ہے اس بات کا، جلدی سے بتاؤ۔ میرا تو سانس پھول رہا ہے“ زلیخا کی برداشت جواب دینے لگی۔

”اس نے تو میری بات تک سنا گوارا نہیں کیا۔ وہ اپنے فیصلے میں اس قدر اٹل ہو چکا ہے کہ میں اگر اپنی بات کر بھی لیتا تب بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس نے میری بات ماننا ہی نہیں تھی اس لیے وہ میرے بات کرنے سے پہلے ہی بول اٹھا کہ بابا مجھ سے ایسی کوئی بات نہ کریں۔ میں آپ کے چہرے پر مایوسی اور شکست دیکھ نہیں سکتا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں مجبور ہوں۔ وہ رو گیا۔ میرے سینے سے لگ کر جب آنسو بہاتے ہوئے اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو پہلی بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنے بیٹے سے وہ مانگنے کی کوشش کر رہا ہوں جو دینا اس کے اختیار میں ہی نہیں ہے۔ تب پھر ہم دونوں نے کوئی بات نہیں کی اور اپنی محبت، اس کی پیدائش، بچپن اور اس کی شرارتوں کی باتیں کرتے ہوئے کب کے کب ہم کھیل میں لگ گئے خود ہمیں بھی پتا نہیں چلا اور اسی حالت میں تمہارے سامنے آ گئے۔ تم سمجھیں وہ میری بات مان گیا ہے میں شاید اسی لیے خوش ہوں لیکن میں اس لیے خوش تھا کہ میں تم سے یہ لچاتی خوشی، یہ مسرت چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ بولو کیا اس لمحے تم زندگی میں سب سے زیادہ خوش نہیں ہوئی تھیں؟“ ابراہیم نے بنا رکے جیسے ایک ہی سانس میں ساری بات زلیخا کو بتادی۔ سن کر زلیخا بالکل خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی اتر آئی اور وہ بولنے کی طاقت سے جیسے کچھ لمحے کے لیے محروم ہو گئی۔ طویل وقفے کے بعد اس کی آواز غار کے سکوت میں ابھری۔ یہ آواز پوری طرح رنج و الم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”تو اب تم نے کیا سوچا ہے ابراہیم؟“

”میں نے بہت سوچ کر ایک درمیان کا راستا نکالا ہے!“ امید کی ایک کرن زلیخا کو دکھائی دی اور اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔

”وہ کیا ابراہیم... دیکھو میرا دل کتنی زور سے دھڑک رہا ہے۔ جلدی سے بتاؤ نہیں تو سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکل آئے گا“

”وہ یہ کہ ہم اسے جانے دیتے ہیں۔ اور سردار کے کارندے کی تلاش سے اسی طرح جھوٹ بولتے رہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا تمہارے بھائی کے گھر رہتا ہے۔ تم اپنے بھائی کو سمجھا دو کہ اس سے کوئی پوچھنے آئے تو وہ یہی جواب دے کہ سلمان اس کی دیکھ بھال کے لیے اسی کے ساتھ رہتا ہے کیونکہ وہ بیمار ہے اور اپنی دیکھ بھال خود سے کر نہیں سکتا۔“ ابراہیم کی بات پوری نہیں ہوئی تھی وہ بس سانس لینے کو رکا تھا۔ اسی وقفے میں زلیخا بولی۔

”پھر اس کے بعد کیا ہوگا ابراہیم... کی تلاش اس بات کو زیادہ دیر تک نہیں مانے گا۔ وہ ضرور میرے بھائی بدیل سے تفتیش کرنے اس کے قبیلے اپنا آدی بھیجے گا ہو سکتا ہے وہ خود وہاں جا پہنچے تب؟؟؟“ زلیخا کی فکر مندی کو ابراہیم نے محسوس کر لیا۔

”میں جانتا ہوں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اللہ کی ذات سے ایک امید ہے کہ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو تم بدیل کو پہلے سے سمجھا دینا۔ وہ کوئی بہانہ کر دے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجلس بدیل کی بات مان جائے اور کوئی زیادہ باز پرس نہ ہو۔ اور اگر ایسا ہوا تو میں اتنے عرصے میں سلمان کو جا کر انسانوں کی دنیا سے لے آؤں گا۔ پھر ساری بات نمٹ جائے گی۔“ ابراہیم نے اپنی زلیخا کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر وہ مطمئن نہیں ہوئی۔ اسے معلوم تھا یہ

بات یہیں پر ختم نہیں ہوگی۔ اس سے آگے جائے گی۔

”میں جانتی ہوں جو کچھ ہو سکتا ہے، اس کے بارے میں تم سوچنا نہیں چاہتے۔ ابراہیم لیکن میری ایک بات کا جواب دے دو۔ اگر ایسا ہوا کہ ہم واقعی ٹھنسن گئے اور سردار کو ساری حقیقت کا پتا چل گیا تب تم کیا کرو گے؟“

زلیخا کے اس سوال سے ابراہیم بچنا چاہتا تھا لیکن بچنا محال تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ اس نے زلیخا کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں ڈھیروں فکرات کا میلہ سالگا تھا وہ اپنی زلیخا کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے پاس جواب بھی کوئی نہیں تھا کہ کیا کہے۔

”محبت ہمیشہ ایک قدم آگے کا سفر کرتی ہے ابراہیم... کہہیں یاد ہوگا جب تم نے مجھ سے محبت کا اقرار کیا تھا تو یہ بات تم بھی جانتے تھے اور میں بھی کہ یہ ممکن ناممکن ہے۔ ہم دونوں کے قبیلوں میں صدیوں پرانی دشمنی تھی اور میرے قبیلے کا سردار کسی بھی صورت یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے قبیلے کی لڑکی کی شادی کسی مخالف قبیلے کے جن سے ہو۔ تب بدیل بھائی نے کہا تھا کہ مجھے انتظار کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ ہمارے قبیلے کے سردار کی تمہارے قبیلے کے سردار سے دشمنی ذاتی تھی اس لیے ہمارے قبیلے کے سردار کی موت کے بعد ہی ہماری شادی ممکن ہو سکتی تھی اور بدیل بھائی کو معلوم تھا کہ ہمارے قبیلے کا سردار زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے گا کیونکہ وہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا تھا۔ کیسے تڑپتے تھے ہم... بدیل بھائی نہ ہوتے تو ہماری ملاقاتیں بھی ممکن نہ ہوتیں۔ اللہ ایسا بھائی سب کو دے۔“ زلیخا نے بات جاری رکھتے ہوئے اپنے بھائی کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ ابراہیم کو یہ باتیں بے وقت کی راگنی معلوم ہوئیں۔ وہ سوچنے لگا آخر زلیخا کہنا کیا چاہتی ہے۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ محبت ہمیشہ ایک قدم آگے کی طرف سفر کرتی ہے۔ ہمارا بیٹا ہماری محبت کی نشانی ہے

اور اسے ایک انسان لڑکی سے محبت ہوئی ہے جو ہماری محبت سے زیادہ مشکل محبت ہے“

”تمہاری یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی زلیخا۔ تم جو کہہ رہی ہو اسے سمجھ نہیں رہیں، یہ محبت نہیں ایک

قسم کی نادانی ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ کسی شیر کو کسی لومڑی سے محبت ہو سکتی ہے؟“

”یہ شیر اور لومڑی کی نہیں انسان اور جنات کی بات ہے ابراہیم۔ جانور انسانوں اور جنات دونوں سے الگ

ہوتے ہیں لیکن جنات اور انسانوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔“

”بیٹے کی محبت میں تم خود کو فریب دینا چاہتی ہو۔ انسان اور جنات میں فرق ہوتا ہے جیسے آگ اور پانی

میں فرق ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں کا ملاپ ناممکن ہے زلیخا!“ ابراہیم نے بحث

کرتے ہوئے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

”تم نے تو خود ابراہیم میری بات کی ہی تائید کر دی ہے۔ آگ اور پانی کا ملاپ تو ہوتا ہے بس یوں ہے کہ اس

ملاپ سے ایک کا وجود مٹ جاتا ہے“ زلیخا کی بات سن کر ابراہیم کو جھٹکا سا لگا۔

”تم کہنا چاہتی ہو ہمارا بیٹا مٹ جائے گا کیونکہ وہ آگ سے بنا ہے؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو زلیخا۔ اگر ایسا ہے تو

ہمیں اپنے بیٹے کو اس کھیل سے روکنا ہوگا جس میں اس کی زندگی، اس کے وجود کو مٹنا ہوگا۔ ہم ایسی محبت کا ساتھ کیسے

دے سکتے ہیں جو ہم سے ہماری سب سے بڑی خوشی چھین کر لے جائے۔ جو ہماری آرزوں کا دیا ہی بچھا دے“

ابراہیم جذباتی ہو گیا اور زلیخا اسی طرح شانت رہی۔ اس کے چہرے کا اطمینان دیکھ کر ابراہیم کو بڑی حیرت

ہوئی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم اپنے بیٹے کے مٹ جانے کے تصور سے اس قدر پرسکون رہ سکتی ہو؟“

”جو میں دیکھ رہی ہوں وہ تم دیکھ نہیں رہے۔ اور جو میں سمجھ رہی ہوں وہ تم سمجھنے سے قاصر ہو ابراہیم... ہمارا بیٹا

اپنے عشق میں مٹ سکتا ہے۔ مرنے نہیں سکتا، اس کا وجود مٹ سکتا ہے پر ہمیشہ کے لیے غائب نہیں ہو سکتا“ زلیخا نے

اپنی پراسرار روح کی طرح سے کہا۔

”یہ تم کس قسم کی باتیں کیے جا رہی ہو زلیخاں مجھے تو تمہاری یہ پہیلیوں جیسی الجھی ہوئی باتیں بالکل بھی سمجھ نہیں آرہیں۔ خدا کے لیے، مجھے بتاؤ تمہاری بات کا کیا مطلب ہے؟“ ابراہیم کی بے چینی سوا ہونے لگی۔

”تو پھر سنو ہمارے بیٹے نے ایک انسان لڑکی سے محبت کی ہے اور اسے اس لڑکی کو پانے کے لیے انسان بننا ہوگا!“

”انسان بننا ہوگا.... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو پاپ ہے، گناہ ہے۔ اس کی اجازت اسے جن جاتی کبھی نہیں دے سکتی اور سردار اس کی جان کا دشمن بن جائے گا“

”اب جو بھی ہو ہمارے بیٹے کے مقدر میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ اسے نہ تم روک سکتے ہو نہ میں بدل سکتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں شاید کہیں کوئی ایسا آئین، کوئی ایسا دستور بھی ہو جسے جنات جانتے نہ ہوں اور خدا جانتا ہو۔ عشق میں ایسی ہی انہونی باتیں ہوتی ہیں۔ ابراہیم ممکن ہے اس نامعلوم دستور کے مطابق ہمارے بیٹے سلمان کا انسان بن جانا پاپ نہ ہو۔“

”میں یہ نہیں مانتا“

”تو میں کب کہتی ہوں تم مانو... مگر میں یہ جانتی ہوں جس طرح سب جنات کے بیچ میں سے ہمارے بیٹے نے یہ اندکھی ضد کی تھی کہ اسے انسانوں کے ساتھ پڑھنا ہے۔ اوپر یاد کرو تم نے اس کی یہ ضد مان کر ہی اسے جن جاتی سے بالکل مختلف اسے انسانوں کے بیچ پڑھنے کی اجازت دینی تھی۔ یہ بات کسی کو نہیں معلوم۔ جرم اور گناہ تو یہ بھی ہے ابراہیم“ زلیخاں کی بات سن کر ابراہیم فکروں میں ڈوب گیا اور بہت دیر بعد اس نے بس یہ ایک بات کہی۔

”اس کا مطلب ہے ہماری عاقبت خراب ہو چکی“

غار میں اس کے بعد کوئی آواز سنائی نہیں دی اور گہرے سکوت نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی۔

☆.....☆.....☆

سلمان کریم نے اپنے دوستوں کو اپنے گھر پارٹی میں مدعو کرتے وقت حسب عادت نہ اپنی ماں سے پوچھنا ضروری سمجھا اور نہ ہی اپنے باپ آصف کریم کو اطلاع دی۔

یہ سڑے نائٹ تھی اور سلمان کے دوستوں نے گھر کی چھت پر جہاں ایک پینٹ ہاؤس بھی بنا ہوا تھا۔ کشادہ اور وسیع چھت پر اس کے دس پندرہ دوستوں نے پوری آوارگی سے ڈیرہ جمایا اور خوب موج مستی کرتے ہوئے زور زور سے ناچ گانے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ان کی ہڑ بونگ اتنی زیادہ تھی کہ اس محلے کے لوگوں نے اس سے پہلے ایسی ادھم چوڑی نہیں دیکھی تھی مگر ان آبادیوں میں لوگ قانون پر عمل درآمد کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے۔ پینا تان کر اپنے زور بازو پر کوئی کسی کو کسی ایسے کام سے بھی نہیں روکتا تھا جو دوسروں کے لیے تکلیف اور زحمت کا باعث ہو۔ اول تو یہاں کے رہنے والے ایسی حرکتوں سے پرہیز کیا کرتے تھے تاکہ اس آبادی کی اپنی ایک پہچان باقی رہے ویسے بھی یہاں سب ہی غیر معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے گھر تھے اور جو پڑھے لکھے نہیں تھے وہ بھی چلتے پڑھے لکھے لوگوں کے چال پر تھے تاکہ انھیں جاہل ہونے کا طعنہ نہ سننا پڑے۔ پھر یہ جو سلمان نے ایک انوکھا کام کیا شور شرابے سے آس پاس کے لوگوں کا سکون غارت کر دیا تو ایسے میں سب ہی لوگ حیرت میں ڈوبے ہوئے جاگ رہے تھے۔ انھیں غصہ بھی آ رہا تھا تو وہ غصے سے زیادہ اپنی حیرت کا ہی اظہار کر رہے تھے کہ آخر یہ آصف کریم جیسے سمجھدار اور سلجھے ہوئے بزنس مین کو کیا ہوا جو انھوں نے بیٹے کو ایسی بدتہذیبی کرنے کی اجازت دی۔ ایسی ہلڑ بازی تو جاہلوں کے ایریا میں بھی ناپسندیدہ کی جاتی ہے چہ جائیکہ یہاں اس علاقے میں۔ لیکن چونکہ یہ پہلی غلطی تھی اس لیے کوئی بھی آصف کریم کی عزت کی وجہ سے فون اٹھا کر پولیس کو فون نہیں کر رہا تھا۔ سب یہی سوچ رہے تھے کہ صبح آصف کریم سے پوچھیں گے کہ انھوں نے ایسی لے ہو دگی کرنے کی چھوٹ اپنے بیٹے اور اس کے دوستوں کو کیوں دی۔ انھیں موج مستی کرنا تھی تو وہ کوئی ہوٹل یا کوئی کلب بک کر کے وہاں یہ سب کر سکتے تھے۔ پیسے والوں کی

اولادیں ایسی حرکتیں اسی قسم کی جگہوں پر کرتی ہیں۔ پر سلمان تھا ہی ایسا خود سر اور سرکش نوجوان اسے یوں بھی دوسروں کو تنگ کرنے میں مزا آتا تھا۔ اسی لیے اس کے دوستوں نے جب یہ پروگرام بنایا تو اس نے خود آگے بڑھ کر ہیکڑی دکھاتے ہوئے یہ آفر کی کہ یہ پروگرام اس کے گھر کی چھت پر زیادہ اچھا رہے گا۔ اس کے دوستوں نے حیرت سے اس کی بات سنی اور پھر زور سے ہرا کہہ کر اس آفر کو قبول کر لیا کیونکہ وہ جانتے تھے وہ کتنے ہی اپنی جینز سے باہر نکل جائیں مگر ان کے والدین انہیں یہ سب کرنے کی گھر پہ اجازت کبھی نہیں دیں گے۔ سلمان نے تو ماں باپ کو اس لائق بھی نہیں سمجھا تھا کہ وہ انہیں اطلاع ہی دے دیتا۔ اب محلے والوں سے زیادہ صنوبر، در شہوار اور آصف کریم پریشان تھے۔ کیونکہ چھت کتنی ہی مضبوط اور دھماکہ پر وف کیوں نہ ہو جس قسم کا ہلڑیہاں مچایا جا رہا تھا اس کی آواز ہی اتنی بلند تھی کہ دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔

”آخر تم اسے جا کر منع کیوں نہیں کرتے؟“ در شہوار نے آصف کریم سے کہا۔

”میں اس وقت گیا تو تم جانتی ہو وہ اپنے دوستوں کے سامنے بے عزتی محسوس کرے گا اور میری بات ماننے کے بجائے بدتمیزی پر اتر سکتا ہے۔ اولاد جوان اور خود سر ہو تو ماں باپ کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یاد نہیں جب اس نے تمہیں بھی دھکا دے دیا تھا۔ آج اگر میں نے ایسا کچھ کیا تو وہ میرے ساتھ بھی ایسا کچھ کر سکتا ہے جسے میں ساری زندگی کسی زخم کی طرح چاٹتا رہوں“ آصف کریم نے جیسے پہلے سے یہ جواب سوچا ہوا تھا۔

”کل جب محلے والے پوچھیں گے تو انہیں کیا جواب دو گے، اور اس سے بھی زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے آصف اس طرح اس کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور وہ آئندہ بھی اس قسم کی حرکت کر سکتا ہے؟“ در شہوار نے کہا تو آصف نے اسے گھور کے دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں... مگر اس وقت اسے روکنا ممکن نہیں ہے در شہوار تم سمجھ کیوں نہیں رہیں!“ وہ چیخا۔

”اور بعد میں؟“ در شہوار نے آنے والے خوف کی طرف اشارہ کیا۔

”کل میں اس سے اکیلے میں یہ بات سمجھاؤں گا۔ اس نے اگر اب ایسی حرکت کی تو محلے والے بعد میں پولیس کو بلائیں گے میں پہلے اطلاع دوں گا“

”لیکن اس وقت... کیا ساری رات ہم اسی طرح اس عذاب کو جھیل کر گزاریں گے۔“ در شہوار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے، کیا کرے۔ بے بسی سے وہ اپنے کانوں کو بند کرتی رہی پھر یہ کہہ کر اپنے کمرے سے اٹھ کر چلی گئی۔

”میں صنوبر کے کمرے میں جا رہی ہوں“ آصف اسے بے چارگی سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لیکن جب در شہوار صنوبر کے کمرے میں پہنچی تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ صنوبر اپنے کمرے میں موجود ہی نہیں تھی۔

”تو کیا وہ بھی اس بدتمیزی کا حصہ بننے اور چلی گئی ہے“ در شہوار نے ہاتھ روم وغیرہ چیک کرنے کے بعد سوچا۔ جب اسے در شہوار میسر پر بھی نہیں ملی تو ڈرتے ڈرتے اوپر چھت پر پہنچی اور یہ دیکھ کر اس کا خون کھول گیا کہ سلمان اپنی بہن پر زور زور سے چلا رہا تھا۔ اور اسے نیچے جانے کو کہہ رہا تھا۔ دونوں بہن بھائیوں میں یہ جھگڑا کاپی ویر سے جاری تھا۔ اس جھگڑے کو سارے ہی لڑکے انجوائے کر رہے تھے کیونکہ ان کے لیے یہ بات کوئی خلاف توقع نہیں تھی۔ لیکن فارس عباسی ایک ایسا بگڑا ہوا نوجوان تھا جو دل پھینک مشہور تھا۔ لڑکیوں کو اور غلا کر ان کی عزت کا موٹی چرانا اس کی گھناؤنی حرکتوں میں سب سے نمایاں تھی۔ خوبصورت لڑکی تو اس کی ایسی کمزوری تھی کہ جب تک وہ اسے حاصل نہ کر لے اس کی نینداڑ جاتی تھی۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اب تک ملنے والی ساری ہی خوبصورت لڑکیاں اس کی ہوس کا شکار ہو چکی تھیں کتنی ہی ایسی تھیں جو اسے شکست دے چکی تھیں لیکن وہ دوستوں میں اپنا بھرم باقی رکھنے کے لیے ایسے پوز کرتا تھا جیسے اس نے جسے چاہا اسے اپنے پہلو میں ضرور سلایا۔ اس وقت بھی وہ سارے ماحول سے بے گانہ ہو کر صرف اور صرف صنوبر کو ایسی وحشت ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل

میں یہ ارادے باندھ رہا تھا کہ اس ہی اور خوبصورت کلی کو کیسے مسلمان ہے۔ اس کی ان حرکتوں سے سارے ہی دوست واقف تھے۔ سلمان بھی یہ بات جانتا تھا اس لیے کوئی بھی دوست اسے اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دیتا تھا خصوصاً ایسے دوست جن کے گھروں میں بہنیں موجود تھیں۔ لیکن سلمان تو تھا ہی مغرور اور گھمنڈی اس نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اس پارٹی کے ذریعے وہ کتنی بڑی مصیبت کو دعوت دے رہا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ تھا کہ سلمان نے یہ سوچا ہی کب تھا کہ صنوبر جیسی لڑکی اس طرح اس کے دوستوں کی پروا کیے بغیر یوں اس پارٹی کو خراب کرنے اور چلی آئے گی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ رات کے دو بج رہے تھے اور صنوبر بصد ہی کہ اس پارٹی کو ابھی اور اسی وقت ختم کیا جائے۔ سلمان کی ضد تھی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ تم شرافت سے نیچے جاؤ۔ پتا نہیں صنوبر کو کیا ہوا پہلی بار وہ سلمان کی دھمکی سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوئی۔ اسے شاید اپنے ماں باپ کی بے آراہی کا خیال اپنی بے سکونی سے بھی زیادہ تھا۔ اس لیے وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ در شہوار نے یہ منظر دیکھا تو پہلے تو اس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ نیچے چلے۔ لیکن جب صنوبر نے یہ کہا وہ اس پارٹی کو ختم کرائے بغیر نیچے نہیں جائے گی تو در شہوار بھی بیٹی کی حمایت میں کھڑی ہوئی۔ سلمان بد کمینری پر اترنے لگا تو باقی لڑکے حیرت سے اس تماشے کو انجوائے کرنے لگے ابھی ماں اور بیٹی میں بات بڑھتی کیونکہ در شہوار نے ساری چیزوں کو سمیٹنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ سب کچھ ہنس نہس کرنے آگے بڑھی اس نے گنار، کی بورڈ اور شراب کی بوتلیں سب کو اٹھا کر ادھر ادھر پھینکنا شروع کر دیا تھا۔

سلمان اپنی ماں کو مسلسل روک رہا تھا دھمکی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑتا۔ اسی لمحے آصف کریم اوپر آگئے اور انہوں نے آتے ہی سلمان کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ رسید کیا۔ یہ منظر سب کے لیے حیران کن اور ناقابل یقین تھا۔ سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ایسا کہ اس کے باپ نے جو اس کے دوستوں کے سامنے اس کی بے عزتی کی اس کا ازالہ ہو جائے۔ شاید وہ جواب میں آصف کریم کے منہ پر ایک ایسا ہی زور دار پھینچ جڑ دیتا کہ آصف نے اس کے دوستوں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ دوست جو پہلے ہی بھاگ نکلنے کا راستا تلاش کر رہے تھے وہ دم دبا کر چلتے بنے اور یوں سلمان کی ساری زندگی کی سب سے بڑی بے عزتی کا ایک ریکاڈ قائم ہو گیا جو اب باقاعدہ بجنے بھی والا تھا۔ در شہوار اور صنوبر بھی آصف کی اس جرأت پر ششدر تھیں۔ انہوں نے آصف کا دونوں طرف سے ہاتھ پکڑا اور اسے نیچے لے گئیں... سلمان زخمی سانپ کی طرح دیر تک اوپر ہی بیٹھا رہا۔ اسے اپنی اس طرح بے عزتی کا ذرا سا بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو خاص طور پر اپنے ماں باپ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا اس کا باپ آصف کریم زیادہ سے زیادہ اسے سخت سست سنائے گا کہ اس نے یہ ٹھیک نہیں کیا اور اس کی ماں جو کچھ بھی کہے گی اسے وہ ایک کان سے سنے گا اور دوسرے سے نکال دے گا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ صنوبر جیسی مہذب اور خاموش طبع لڑکی اس طرح اوپر آ کر اس سے جھگڑا کرے گی اور اس کے باپ نے اس کے دوستوں کے سامنے اس کے منہ پر جو پھینچر رسید کیا تھا وہ تو اس کی سوچوں سے بھی مبرا تھا۔ وہ کھولتا رہا مگر کس کے خلاف؟؟

جس نے اسے بے عزت کیا تھا وہ اس کا ساگ باپ تھا۔ تو کیا وہ اپنے باپ سے اس بے عزتی کا بدلہ لے گا؟ یہ سوال اس وقت تو اس کے ذہن میں گونجتا رہا اور اسے اپنے باپ کی اس حرکت پر شدید غصہ آتا رہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی کے ابھی نیچے جائے اور اپنے باپ کی وہ دھلائی کرے کہ اسے ساری زندگی یاد رہے۔ مگر کوئی بات تھی جو اسے روک رہی تھی۔

سب سے بڑی بات تو یہی تھی کہ آصف کریم کوئی غیر یا کوئی ایسا انسان نہیں تھا جس کے ساتھ وہ کوئی بھی سلوک کر سکتا تھا۔ جو بھی سنے گا اسی کو برا بھلا کہے گا۔ خود اس کے دوست بھی اسے اس قسم کے رویے پر شاباش نہیں دیں گے۔ اسی وقت اسے اس بلبے کا خیال آیا جس نے اس وقت اس پر حملہ کر دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ منحوس کالا بلا پھر سے آ گیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو اسے کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے ورنہ ایک بار پھر اسے ہسپتال جانا پڑ سکتا

ہے۔ اسے یاد آنے لگا کہ اس وقت اگر اس کا باپ آصف نہ ہوتا تو اسے پتا نہیں کتنے دن تک ہوسپتال میں رہنا پڑتا۔ یہ بھی اس کے والد کی وجہ سے ہی تھا کہ وہ بلا پھر اس گھر میں نظر نہیں آیا تھا۔ اس کو اپنے والد کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ اچھا ہوا جو میں نے ان سے زیادہ بد تمیزی نہیں کی۔ پتا نہیں غصے میں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔“

ایسی باتیں وہ دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن جب بھی اسے اپنے دوستوں کا سامنا کرنے کا خیال آتا تو اس کا خون کھولنے لگتا اور وہ سوچتا کچھ بھی تھا انھیں میرے دوستوں کے سامنے اس طرح میری بے عزتی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ وہ جانے کب تک اس قسم کی باتیں سوچتا رہا۔ پھر چپ چاپ نیچے آ کر اپنے کمرے میں سو گیا۔

☆.....☆.....☆

سلمان ابراہیم کی اپنے ماں باپ سے سمجھو اب جیسے کوئی بات ہونا باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کی طرف اس طرح دیکھتے کہ وہ کب یہ کہنے والا ہے کہ ”میں جا رہا ہوں“ البتہ زلیخا نے اسے ابراہیم سے ہونے والی ساری بات بتا دی تھی۔ اس نے خاموشی سے سنی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا دل کہتا تھا یہ وقتی حل ہے لیکن اس کا بابا اس حل کو آزمانا چاہتا ہے تو اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ بات اس کے دل میں سرسرا رہی تھی کہ ہونہ ہو ایک دن آپ دونوں کو میرے پاس آنے کا فیصلہ کرنا ہی ہوگا کیونکہ اب میں یہاں واپس آؤں گا بھی تو صرف چند گھنٹوں کے لیے اس سے زیادہ اپنی صنوبر کو میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بلکہ وہ خود صنوبر کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ جتنا وقت لگانا تھا وہ اس بار لگا چکا تھا لیکن اب اس کے بعد یہ ممکن نہیں ہوگا۔

”اپنی ماں سے تو ملنے آؤ گے نا؟“ زلیخا کے لہجے میں جیسے کوئی التجا چل رہی تھی۔ اس کا بیٹا اس انسان زادی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور وہ اپنے بیٹے کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ احساس سے لبریز آنکھوں سے اس نے ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔

”میں تمہیں نہیں چھوڑنا چاہتا ماں۔ تم کوشش کرنا بابا کو راضی کر لو اور وہاں میرے پاس چلی آؤ۔ اس طرح ہم ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گے۔“

”کاش یہ بات اتنی آسان ہوتی تو میں ابھی تمہارے ساتھ چلتی میرے بچے۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اور جو کچھ تم چاہتے ہو اس کے پیچھے پیچھے طوفانوں کا اندازہ نہیں ہے تمہیں۔ ہم نے اگر یہ فیصلہ کر بھی لیا تمہارے پاس آنے کا تو یہ سمجھ لو اس کے بعد تم صنوبر کے ساتھ چین سے نہیں رہ سکو گے۔ ایک نہ ایک دن قبیلے کے سردار کو ہمارا پتا چل ہی جائے گا اور پھر وہ ہمیں چین سے جینے نہیں دے گا۔ ہمارے ساتھ تمہارا بھی سکھ چین چین جائے گا۔ اس لیے میں سوچتی ہوں ہم یہیں رہ کر حالات کا سامنا کریں۔“ زلیخا نے صاف گوئی سے بیٹے کو ان مشکلات کے بارے میں بتایا جن سے وہ بے خبر تھا۔

”تو کیا میں یہاں آپ کو اور بابا کو بے رحم سردار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چین سے رہ سکوں گا؟ آپ دونوں میرے سامنے رہو گے تو ہم آنے والی ہر مصیبت کا مقابلہ مل کر کر لیں گے۔ لیکن اگر زور زور رہے تو ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔“ سلمان کی بات میں وزن تھا۔ زلیخا نے اس کا ماتھا چوما اور اسے سینے سے لگا کر کہا۔

”میں جانتی ہوں میرے بیٹے کو اپنے والدین کی بھی فکر ہے۔ تم پریشان مت ہو اگر جان بچانے کے علاوہ کوئی راستہ نہ رہا تو ہم تمہارے پاس آ جائیں گے۔“ زلیخا کی بات سن کر سلمان کو کسی قدر سکون مل گیا۔ اور اس نے وہ بات کہہ دی جو وہ کہنے کی کب سے کوشش کر رہا تھا۔

”اب میں جانا چاہتا ہوں ماں“ زلیخا نے اس کی طرف افسردگی سے دیکھا۔ اور اپنا غم سینے میں دبائے ہوئے چہرے پر ایک زخمی سی مسکراہٹ بولی۔

”کب...؟“

”جب تم اجازت دو گی؟“

Downloaded From
Paksociety.com

”میں تو کبھی بھی اجازت نہیں دوں گی تو کیا تم اپنا ارادہ بدل دو گے؟“ زلیخا نے مصنوعی پن سے کہا۔
”مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کرو گی کیوں کہ تم میرے دل کی حالت جانتی ہو“ وہ ماں کے کاندھوں پر سر رکھتے ہوئے بولا۔

”تو پھر جب تمہارا دل چاہے چلے جانا!“

”اچھا...“ اس نے ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور یہ کہتے ہوئے گھر سے چلا گیا۔ ”میں آج رات کو چلا جاؤں گا۔ ابھی کیلاش سے ملنے جا رہا ہوں“

☆.....☆.....☆

کیلاش سے ملنے سے سردار کی مجلس والی عمارت میں آنا پڑا۔ جسے سب ”حل و عقد“ کہہ کر بلاتے تھے۔
”ارے سلمان تم... میں تو سوچ رہا تھا تم کبھی یہاں مجھ سے ملنے نہیں آؤ گے۔ ہمیشہ مجھے ہی تمہاری خبر لینے کے لیے آنا ہوگا۔“

کیلاش نے اسے دیکھ کر کہا۔ اس سے پہلے کہ سلمان کوئی جواب دیتا اس نے کہا ”باتیں تو ہوتی رہیں گی میں تمہارے لیے قبوہ منگواتا ہوں“ یہ کہہ کر اس نے پاس کھڑے جن سے قبوہ لانے کو کہا۔ ”ہاں اب کہو کیسے ہو؟“
”میں تو ٹھیک ہوں مگر جیسا کہ تمہیں معلوم ہے میرے ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تو میں آج رات وہاں چلا جاؤں گا“ سلمان نے ایسے ہی دوستانہ انداز میں کہا۔

”اچھا“ کیلاش کے لہجے میں تشویش کو سلمان فوراً ہی بھانپ گیا۔ ”تمہیں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ابھی تو تم سے ٹھیک سے ملاقات بھی نہیں ہوئی اور تم جانے کی بات کر رہے ہو!“ کیلاش جو کچھ بن رہا تھا۔ اسے اپنی گود میں رکھ کر وہ سلمان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مجبوری ہے ورنہ میں کیوں جاتا“ سلمان نے تشفی بنائے رکھنے کی پوری کوشش کی۔

”تم یوں کیوں نہیں کرتے۔ اپنے ماما کو یہاں بلو الو اپنے قبیلے میں۔ تم کہو گے تو میں ان کے رہنے کی اجازت سردار سے دلوا دوں گا۔ اس طرح تمہیں ان کی دیکھ بھال کے لیے اپنے ماں باپ سے دور بھی نہیں ہونا پڑے گا۔ کیوں کیا کہتے ہو؟“ کیلاش کی بات ٹھیک تھی مگر سچ کیا تھا یہ وہ جانتا ہی کب تھا۔

”دیکھو کیلاش تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے مجھے اپنے ماں باپ سے دور رہنے میں کوئی مزا آتا ہے۔ ارے میرے بھائی یہ بات تو ہم ان سے کتنی بار کہہ چکے ہیں۔ ضد کر چکے ہیں اور اس بار تو میری ماں بھی جا رہی ہیں میرے ساتھ انہیں منانے۔ مگر وہ ہیں کہ ہماری بات مانتے ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اپنا آخری وقت اپنے ہی قبیلے میں گزارنا چاہتے ہیں۔“ اس بار سلمان کا لہجہ پہلے سے زیادہ بے تکلفانہ تھا تا کہ کیلاش کو ذرا سا بھی شک نہ ہونے پائے۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔ چلو پھر جاؤ میرے دوست۔ بس جاتے جاتے دفتری کارروائی پوری کرتے جانا“ کیلاش نے ایک بڑا سا رجسٹراس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ دفتری کارروائی کیا ہے؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟“ سلمان نے فکر مندی سے کہا۔

”پریشان مت ہو یہ کوئی اتنی گھبرانے والی بات نہیں ہے۔ اصل میں مجلس کو پتا ہونا چاہیے کہ اس کے قبیلے کے جنات کہاں گئے ہیں اور کب واپس لوٹیں گے۔ یہ ایک قسم کا ریکارڈ رکھنے کا طریقہ ہے تاکہ بوقت ضرورت کام آسکتا ہو۔“ کیلاش نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”مگر میں یہ کیسے بتا سکتا ہوں کہ کب واپس آؤں گا۔ پتا نہیں میرے ماما مجھے کب اجازت دیں گے اور یہ بات تو وہ ہی جانتے ہیں“ سلمان نے مزید کرید کر کے اپنی تسلی کرنا چاہی کہ غیر حاضری کی صورت میں کیا ہوتا ہے۔
”کوئی بات نہیں۔ ہم اس میں واپسی کے ٹائم کی جگہ غیر معینہ مدت تک کی غیر حاضری لکھ دیں گے۔“ کیلاش

نے سوچتے ہوئے بتایا۔

”پھر ٹھیک ہے“ سلمان نے سکھ کا سانس لیا۔ اسی اثنا میں قبوہ آگیا اور وہ قبوہ پینے لگا۔

”تمہاری ماں تو جلدی واپس آجائیں گی؟“ کیلاش نے قبوہ کا مزا لیتے ہوئے ایسے ظاہر کیا جیسے یہ تو کوئی بات

ہی نہیں ہے۔

”بالکل ٹھیک کہا۔ اماں بابا کو اکیلا کہاں چھوڑ سکتی ہیں۔ وہ تو کل ہی واپس آجائیں گی۔“ یہ بات اس طرح

اپنے اختتام کو پہنچی۔ گھر آ کر سلمان نے کیلاش سے ہونے والی بات اپنی ماں کو بتا دی۔

”ارے تم میرے بارے میں بتا کر آ گئے۔ میں تو دو ایک روز بعد جانے والی تھی۔ اب تمہیں بھی میری وجہ سے

اپنے ماما کے پاس ان کے گھر جانا ہوگا!“ زلیخا نے کھانا نکالتے ہوئے کہا۔

”اس خبیث کو شک نہ ہو اس لیے مجھے ایسا کہنا پڑا“ سلمان نے برا سامنہ بنا کر یہ بات کہی تو زلیخا کی ہنسی نکل

گئی۔

”ہائے بے چارے تمہارے ابا۔ اچھا ہوتا ان کے بارے میں بھی بتا دیتے اب میں واپس کس کے ساتھ آؤں

گی۔ تم تو وہاں سے انسانوں کی دنیا میں چلے جاؤ گے۔ اس سے بھی زیادہ پریشانی والی بات یہ ہے تمہارے ابا تو

میرے بغیر کبھی اکیلے رہے نہیں۔ وہ اکیلے کیسے رہیں گے؟“ زلیخا کے لہجے میں فکر مندی تھی جس نے سلمان کو بھی

متاثر کر دیا۔

”اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں ابھی کھانا کھا کر پھر کیلاش کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اسے بابا کے جانے کی بات

بھی لکھوادوں گا“ سلمان نے کھانے کا تھال اپنے آگے کی طرف سرکایا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وہیں سے آرہا ہوں“ ابراہیم نے غار میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں نے

کیلاش کو یہ بات بتا دی ہے کہ سلمان تو وہیں رہ جائے گا اس کی ماں اکیلے کیسے واپس آئے گی اس لیے میں بھی

ساتھ جاؤں گا۔ اس نے اندراج تو کر لیا ہے۔ لیکن....!“ ابراہیم کی بات سن کر سلمان اور زلیخا دونوں پریشان

ہو گئے۔

”لیکن کیا ابراہیم؟“ زلیخا سے صبر نہیں ہوا۔

”وہ مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے ہم پر کوئی شک ہو؟“ ابراہیم نے سلمان کے ساتھ ہی بیٹھتے ہوئے اپنی بات

جاری رکھی۔

”کیسا شک....؟“ سلمان نے پوچھا۔

”یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں بیٹا۔ وہ شاید یہ سوچ رہا ہو کہ ہم تینوں یہاں سے کہیں بھاگ تو نہیں رہے!“ ابراہیم

نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”وہ ایسا کیوں سوچے گا؟ اس کی کوئی وجہ تو ہوگی“ زلیخا نے گفتگو میں حصہ کیا۔

”وجہ تو سامنے ہے۔ سلمان.... جو یہاں رہتا نہیں ہے... تو اسے شک ہے کہ کہیں ہم بھی تو سلمان کے ساتھ

یہاں سے جا تو نہیں رہے۔ تم شاید نہیں جانتے جنات اپنے قبیلے کے باسی کو کسی اور قبیلے میں جا کے بسنے کو اپنی عزت

اور جان کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیں کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ ہم یہاں سے ہمیشہ کے لیے جائیں اور

کسی اور قبیلے میں جا کے بس جائیں“

”چلیں چھوڑیں آپ کھانا کھائیں۔ ویسے بھی ہم کون سا جا رہے ہیں۔ ہم تو واپس آجائیں گے ایک دن بعد۔

جب وہ ہمیں یہاں واپس دیکھے گا تو اس کا سبب شک خود بخود دور ہو جائے گا“ زلیخا کی بات نے جیسے اس موضوع

کو سمیٹ لیا۔

☆.....☆.....☆

سلمان کریم نے اگلے دن اپنے باپ سے اس بات کا شکوہ کیا کہ انھوں نے اس کے دوستوں کی بھی پروا نہیں کی۔ اور ان کے سامنے اس کی بے عزتی کی۔

”اور تمہیں اس بات کا کچھ خیال ہے۔ تم کیا کر رہے تھے۔ تم اپنی بہن سے لڑ رہے تھے اور اپنی ماں کی بات بھی نہیں مان رہے تھے۔ ذرا سوچو تمہارے دوستوں کے سامنے ہمارے گھر کا کیسا امپریشن بڑا ہوگا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تم اپنی ماں سے بے عزتی کر رہے تھے۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو تم پہلے کی طرح اس کے ساتھ کچھ ایسا کرنے والے تھے جس کے بعد یہ بات سب لوگوں کو معلوم ہو جاتی کہ آصف کریم کا بیٹا اپنی ماں کے ساتھ کیسے پیش آتا ہے“

”میں تو سمجھ رہی تھی اس واقعہ کے بعد تم سدھر گئے ہو۔ مگر تم تو ذرا بھی نہیں بدلے“ آصف کریم کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور درمیان سے درشہوار بول اٹھی۔

”میں پوری بات کر لوں اس کے بعد تم بات کرنا۔ سمجھ گئیں“ آصف کریم نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

”سلمان تم نے ایک ایسی پارٹی ارنج کی وہ بھی اپنے گھر میں۔ جس کا اس ایریا میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ یہ ایک پرسکون رہائشی علاقہ ہے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کا اور سماجی قوانین کا خیال کر کے زندگی گزارتے ہیں۔ اور میری تمہارے باپا کی ایک ریپکٹ ہے۔ لوگ میرے گھر سے جب ایسی آوازیں سنیں گے جو ان کا سکون غارت کر دے تو سمجھ لو وہ مجھے عزت سے نہیں دیکھیں گے۔“ وہ رکا اور پھر اس کے عین قریب جا کر بولا۔

”تم کیا سمجھتے ہو اگر رات کو پولیس یہاں اس گھر پر نہیں آئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ انھوں نے تمہاری اس حرکت کو برداشت کیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم لوگوں کی برداشت کا امتحان لو۔“ سلمان کریم کا گلہ جاتا رہا اور اسے ٹھیک ٹھاک اپنے باپ کی صلواتیں سننے کو مل گئیں۔ اسے غصہ تھا صنوبر پر لیکن اس وقت وہ خاموش رہا اور بہت ہی آہستگی سے جیسے زبردستی کہہ رہا ہو ایک چھوٹا سوری کہہ کر وہ وہیں گردن جھکائے بیٹھا رہا۔

”مجھے امید ہے تم مجھے آئندہ ایسی کوئی شکایت کا موقع نہیں دو گے“ یہ کہہ کر آصف کریم بھی چلے گئے۔ صنوبر البتہ اس کے سامنے جم کے بیٹھی رہی اور اپنی اس جرأت پر خود صنوبر کو بھی حیرانی تھی۔ اسے تو یہ بھی یقین مشکل سے ہی آیا تھا کہ رات کو اس نے ایک لڑکوں کی پارٹی میں پہنچ کر اسے رکوانے کی کوشش کی۔ درشہوار اپنے دونوں بچوں کی طرف خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے یقین ہے تم اپنی بہن کے لیے دل میں کوئی برائی نہیں رکھو گے۔ اس نے جو بھی کیا یہی تمہارے فائدے میں تھا۔ ذرا سوچو اگر کسی نے پولیس کو فون کر دیا ہوتا تو کل کے اخبار میں یہ خبر کیسا تاثر قائم کرتی۔ اچھا ہوا جو صنوبر نے مداخلت کی اور یہ قصہ مزید بگڑنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ تم شاید ابھی اس بات کو نہیں سمجھو گے لیکن جب ٹھنڈے دل سے سوچو گے تمہیں صنوبر کا شکر گزار ہونے میں ذرا بھی شرمندگی محسوس نہیں ہوگی۔“ درشہوار کی بات سن کر بھی وہ چپ رہا لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل میں کیا لاوا ایک رہا ہے۔ اس نے سارا دن گھر پہ گزارا اور اپنے کسی دوست کا فون بھی ریسیو نہیں کیا کیونکہ اس میں کسی کا بھی سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

آج چھٹی کا دن تھا لیکن مدرسے میں نہیں... مدرسے میں جمعے کے دن چھٹی ہوتی تھی اور اتوار کا دن بھی پڑھائی کے لیے مختص تھا۔ سلمان ابراہیم نے مدرسے میں قدم رکھا تو اس کی سب سے پہلی ملاقات اپنے ہم شکل سے ہوئی۔ یہ ملاقات اس کے لیے کسی ایسی حیرانی سے کم نہیں تھی جو اس کے اندر خوف کو جنم دینے والی تھی۔

”تم یہاں کیسے۔ میں اس بار تو تمہیں یہاں چھوڑ کر نہیں گیا تھا؟“ سلمان ابراہیم نے حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

”جی آقا آپ مجھے یہاں چھوڑ کر نہیں گئے تھے مگر میں آپ کے واپس آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس لیے یہاں ہر روز ہی آتا ہوں، بلکہ یہاں سے جاتا ہی کچھ دیر کے لیے ہوں۔ یہیں رہتا ہوں“ ہم شکل نے اطمینان سے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا۔ تم یہاں کیوں رہتے ہو؟ کس کی اجازت سے؟“ سلمان کو اس کی بات

سن کر ایک دم زور سے غصہ آنے لگا۔ ”کسی کی اجازت سے نہیں۔ میں تو بس.....“ وہ گڑ بڑا گیا۔

”میں پوچھ رہا ہوں تم اب تک۔ یہاں موجود کیوں ہو۔ یہاں سے گئے کیوں نہیں۔ تمہیں تو میں نے غائب ہونے کے لیے کہا تھا۔ اگر اس طرح تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو جانتے ہو کیا ہوگا؟“ سلمان تلملا کر رہ گیا۔

”پریشان نہ ہوں میرے آقا مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا کیونکہ میں انساں نہیں آپ کا ہم شکل جن ہوں۔ آپ کا ہمزاد ہوں“ ہم شکل کے لہجے میں ندامت سے زیادہ ایک قسم کی بے چینی تھی۔

”میں پوچھ رہا ہوں۔ تم یہاں سے گئے کیوں نہیں۔ موجود کیوں ہو؟“ سلمان چیخ ہی تو پڑا۔

”اب میں واپس نہیں جاسکتا میرے آقا!“ ہم شکل مسایا۔

”کیا بکتے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ سلمان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔

”آپ نے مجھے بھیجنے کے لیے جو منتر پڑھا تھا وہ صحیح نہیں تھا میرے آقا اور یہ آپ جانتے ہیں کہ اگر منتر غلط ہو جائے تو مجھے بارہ سال تک کوئی دوبارہ سے غائب نہیں کر سکتا۔“ ہم شکل نے لجاجت سے کہا۔ ”لیکن آپ کو

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کا خادم ہوں اور جو آپ کہیں گے وہ بجالانا مجھ پر لازم ہے میرے آقا“ ہم شکل اور جانے کیا کیا بولتا رہا سلمان کی تو جیسے سٹی کم ہو چکی تھی۔ یعنی اب بارہ سال تک یہ یہاں اسی دنیا

میں رہے گا۔ بارہ سال تک اسے ایک نئی زندگی مل چکی ہے اور سلمان جا ہے بھی تو اسے واپس نہیں بھیج سکتا۔ یہ انتہائی لرزہ خیز خبر سن کر سلمان کے حواس جاتے رہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اسے

یاد آنے لگا اسی لیے اس کے بابا نے اسے ہم شکل کو وجود میں لانے سے منع کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا یہ بہت خطرناک کھیل ہے اور کسی بھی جن کی ذرا سی غلطی سے وہ بہت بڑی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔ بد قسمتی سے سلمان اس مصیبت کا

شکار ہو چکا تھا۔ شاید عشق میں انسان اور جنات دونوں کے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور بہت سے کام بگڑنے لگتے ہیں۔ سلمان کا بھی یہ ایک بہت اہم اور اس کی شکستوں کا غیر معمولی ذخیرہ اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اسے سمجھ

نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ کیسے اس ہم شکل کو یہاں سے اور خود سے دور کرے۔ آتے کے ساتھ ہی یہ کیا مشکل کھڑی ہوگئی۔ اس نے سوچا۔

”تم کیا کہنے والے تھے۔ کس بات کے لیے میرا انتظار کر رہے تھے؟“ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد سلمان نے فیصلہ کیا کہ اس مصیبت سے بعد میں نمٹے گا پہلے مدرسے کی خبر لے۔ اس کے پاس ضرور مدرسے کی کوئی ایسی بات

ہے جو یہ مجھے بتانا چاہتا ہے۔

”میرے پاس آپ کے لیے زیادہ اچھی خبر نہیں ہے میرے آقا اس لیے میں سوچ رہا ہوں یہ بات آپ کو بتاؤں یا نہ بتاؤں؟ بتاتا ہوں تو آپ کا دل خراب ہوگا۔ نہیں بتاتا تو یہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ بہتر یہی ہے

کہ آپ کو ہر بات کا پہلے سے علم ہوتا کہ آپ اپنی زندگی کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکیں“ ہم شکل کی تقریر سے سلمان کو اور بھی طیش آنے لگا۔ اور کچھ پہلے اس نے جو اپنے غصے کو مشکل سے قابو کیا تھا اب وہ پھر اس کی رگوں کو

سلاگنے لگا۔

”تم اپنی بکو اس اور نصیحتیں اپنے پاس رکھو، ابھی میں اتنا لا جا رہیں ہوا ہوں کہ تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ سیدھی طرح وہ بات بتاؤ جس کے لیے تم بے چینی کا میرا انتظار کر رہے تھے۔“ سلمان کی سرد مہری

اور جلال کی تپش کو ہم شکل محسوس کرنے لگا۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور بہت ہی مؤدب ہو کر بولا۔
”مجھے افسوس ہے کہ یہ انتہائی تکلیف پہنچانے والی خبر مجھے آپ کو سنانی پڑ رہی ہے لیکن میں آپ کے حکم کے سامنے خود کو مجبور پاتا ہوں، سنائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔“ وہ رکا پھر منہ کھول کر ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا۔
”آپ جس لڑکی محبت کرتے ہیں وہ.....“

”کیا ہوا سے جلدی بول ملعون! نہیں تو میں ابھی تیری گردن مار دوں گا“ سلمان کوچ کوچ خود پر قابو نہیں رہا۔
ہم شکل کو ڈر محسوس ہوا۔ اس نے نیچے بیٹھ کر دوزانو ہو کر کہا۔

”آقا آپ کی محبت آپ کا عشق صنوبر آپ سے نہیں کسی اوز سے محبت کرتی ہے“ سلمان نے ایک زور کا گھونسا اس کے جڑے پر رکھ کے دیا۔

”کیا بکتا ہے کہینے“
”آپ بھلے ہی مجھے جتنی چاہیں سزا دے لیں۔ بن پڑے تو میرے نکلے نکلے کر دیں۔ مگر یہ سچ ہے میرے آقا! صنوبر کسی شہزادہ کے سے محبت کرتی ہے۔“ ہم شکل ایک طرف کو لڑھک گیا تھا اور اسی طرح گھاس پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی بات دوہرائی۔

”تجھے کیسے پتا۔ تو کیسے جانتا ہے یہ سب۔ بول کس نے کہا ہے تجھ سے؟ کون ہے جو تیرے کان بھر کر گیا ہے۔ کہیں تجھے کیلاش نے تو نہیں ورغلا یا۔ کہینے اگر یہ بات سچ نہ ہوئی تو میں تجھے بارہ سال تو کیا بارہ گھنٹے بھی زندہ نہیں رہنے دوں گا سمجھا تو!“

سلمان اس وقت خود بھی غائب ہو چکا تھا اور کوئی انسان آس پاس ان دونوں جنات کی بات چیت کی آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔

”میں سچ کہتا ہوں یا جھوٹ یہ تو آپ کو خود بھی معلوم ہو ہی جائے گا مگر آپ میری اس بات کا یقین کریں مجھے آپ کے خلاف کوئی نہیں بھڑکا سکتا۔ اگر کسی نے ایسا کرنے کی بھی جرأت کی تو میں اس کا منہ پہلے توڑوں گا اس کی بات بعد میں سنوں گا۔“

”اب زیادہ مجھے اپنی وفاداری اور تابعداری کے قصے نہ سنا، یہ بتاؤ صنوبر کو کیسے جانتا ہے؟“ سلمان کے لہجے میں دھیرے دھیرے نرمی اور مصلحت کی سطح بلند ہو رہی تھی اور وہ اب اپنے ہوش و حواس میں اس سے ساری بات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کہینہ مجھے ساری بات بتانے کے مجھ سے جھوٹ بولنا شروع کر دے محض اس خیال سے کہ میں اسے سزا دوں گا یا اس کی بات کا برامانوں گا۔ یہ عقل مندی نہیں ہوگی۔ سلمان نے سوچ کر آرام سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”آپ کے جانے کے بعد میرے پاس کوئی کام تو تھا نہیں۔ میں جنات کی بھی کسی محفل میں جانے کی شگفتی نہیں رکھتا تھا کیونکہ میں میں نہیں آپ کا سایا ہوں۔ اس لیے جب میں بہت بوجھ رہا تھا تو سوچا آپ کی اس زندگی کے بارے میں پتا کروں جس کے لیے آپ کو مجھے وجود میں لانے کی ضرورت پڑی تھی۔ آخر آپ مدرسے سے غیر حاضر رہ کر اور اپنی جگہ مجھے مقرر کر کے کہاں رہتے ہیں۔ اور آپ کی ایسی کیا مصروفیات ہیں جو آپ کو مدرسے سے غیر حاضر رہنے پر مجبور بنائے ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ حقیقت میں میرا وجود اپنی مرضی اور منتر سے مٹا دیتے، گم کر دیتے تو نہ میں ہوتا اور نہ ہی اس طرح سے سوچتا۔ بس یہی سوچتے ہوئے میں نے آپ کی زندگی کے نشانات پر چل کر اس لڑکی صنوبر کو پایا اور ایک دن میں اس کے اسکول جا پہنچا جہاں مجھے یہ منحوس اور دل دکھانے والی خبر ملی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ ایک لڑکے کی بانہوں میں تھی اور اس سے والہانہ محبت کا اظہار کر رہی تھی۔“

”اف یہ مجھ سے کیا ہو گیا، میری ایک چھوٹی سی غلطی نے مجھے یہ دن دکھایا کہ میرے سب سے قیمتی راز سے تم

واقف ہو گئے، سلمان کی آواز بھرائے گی۔

”اس بات سے آپ پریشان نہ ہوں میرے آقا! میں تو آپ کا غلام آپ کا خادم ہوں، میں کسی سے بھی اس راز کے بارے میں کچھ بھی کہنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ مجھے بارہ سال کی قلیل زندگی ملی ہے۔ آپ جیسی شکستیاں تو میرے اختیار میں نہیں ہیں، وہ کافی خوشامدانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ سلمان کو اس کا وجود اس وقت کسی ایسی نفرت انگیز چیز کی طرح معلوم ہوا جسے برداشت کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اسے برداشت کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

”اچھا اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں پھر یہاں مت آنا سمجھے“ سلمان نے مدرسے کی عمارت کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ اس سارے معاملے میں کہیں دفتر بند نہ ہو جائے۔ اسے دفتر میں اپنی حاضری لگوانا تھی۔ ہم شکل نے اس کی بات پر سر تسلیم کیا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

”رکو.....“ سلمان نے اسے جاتے دیکھ کر کہا۔ وہ آواز سن کر واپس آ گیا۔

”جی میرے آقا“ وہ واپس آ کر پھر سے دوزانو ہو گیا۔

”انھوں اس قسم کے ڈراموں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔ یہ بتاؤ تم رہتے کہاں ہو؟“ سلمان کا ذہن

الجھ رہا تھا۔

”وہ سامنے درخت پر“ اس نے ایک گھنے اور ڈالیوں سے اٹکے ہوئے درخت کی طرف اشارہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے اب جاؤ“ یہ کہہ کر سلمان مدرسے کی طرف مڑ گیا اور ہم شکل نے اسے تسلیم کیا جسے غصے اور جھنجھلاہٹ کے مارے سلمان نے دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔

☆.....☆.....☆

مدرسے کی ایک ویران راہداری میں سلمان نے خود کو انسانی چولے میں اتارا اور تیز تیز قدموں سے ننگراں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح ابوریحان بھی وہیں مدرس کے کمرے ہی میں مل گئے۔ انھوں نے سلمان کو دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک باریک سی مسکراہٹ طلوع ہوئی۔

”اس بار بہت دن بعد آئے سلمان؟“ مدرس کے کوئی سخت بات کہنے سے پہلے ہی ابوریحان نے اس سے

پوچھا۔

”جی جناب وہ امی نہیں آنے دے رہی تھیں!“ سلمان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی مدرس نے غصے سے کہا۔

”تو آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو اس طرح سے ہوگی پڑھائی۔ سب طالب علم تم سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اور سارا کورس کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہے۔ تم نے تو اسے اپنے باپ کا گھر سمجھا ہوا ہے۔ جب منہ اٹھایا چلے آتے ہو۔“ ننگراں کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

”میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا ایک دوسرے شہر سے یہاں پڑھنے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پتا نہیں کیسے میں نے تمہارے والد کے کہنے پر اور تمہارے شوق کو دیکھتے ہوئے تمہیں داخلہ دے دیا تھا۔ غلط کیا تھا میں نے یہ میری غلطی تھی۔ مجھے منع کر دینا چاہیے تھا۔ ارے اس سے تو اچھا تھا تم اپنے ہی شہر کے کسی مدرسے میں داخلہ لے لیتے۔ اس طرح تمہیں بار بار یوں چھٹیاں لے کر اپنے ماں باپ سے ملنے تو نہ جانا پڑتا۔ جانتے ہو یہاں جو طالب علم پڑھتے ہیں ان کے والدین نے انہیں یہاں ہمیشہ کے لیے... جی ہاں اس وقت تک کے لیے چھوڑ دیا ہے جب تک ان کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی، وہ تمہاری طرح چھٹیاں لے لے کر پڑھائی کا اور پڑھانے والا حرج نہیں کرتے۔ دیر آید درست آید مجھے اب اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ اس لیے میں اب تمہارا داخلہ منسوخ کرتا ہوں۔ تم جا سکتے ہو۔“ ننگراں ہانسی کی طرح چٹکھاڑ رہا تھا۔

سلمان کو لگا کہ اس بار تو شہر میں قدم رکھتے ہی مصیبتوں کی برسات ہو گئی ہے۔ دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی خبر اس منحوس ہم شکل نے سنائی تھی، اس سے ابھی سنبھلا بھی نہیں ہوں کہ اب مدرسے سے نکالا جا رہا ہوں۔ پتا

نہیں قسمت کیا رنگ دکھانے والی ہے۔

”جناب عالی... ایک منٹ ذرا تحمل کیجئے... یہ سلمان ہے مدرسے میں اس سے زیادہ ہونہار اور صاحب نظر طالب علم کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس طرح تو ہماری اور اس کی سب محنت رائیگاں چلی جائے گی۔ ذرا اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجئے ہمیں ایسا ایک موقع اور دینا چاہیے۔“ ابوریحان کی بروقت مداخلت سے نگران بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اگر یہ طالب علم سب سے زیادہ ہونہار اور قابل ہے تو اسے نکال کر واقعی اس کو خود ہی نہیں مدرسے کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ یہ بات کہ سلمان اس قدر غیر معمولی طالب علم ہے نگران کو آج سے پہلے یا تو پتا نہیں تھا یا تو تھا اسے یا وہ نہیں رہا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ اور ایک طالب علم کے سامنے اپنی بات کو واپس لینا اسے اپنی ذہن کے مترادف معلوم ہوا۔ اس نے ایک اور راستے کا انتخاب کیا۔

”جتنا کورس اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے کل اس کا اس کورس میں سے امتحان کیا جائے۔ اگر تو یہ اس آزمائشی امتحان کو پاس کر لیتا ہے تو ہم اسے واپس مدرسے میں داخلہ دینے کے لیے تیار ہیں۔“ ابوریحان کو یہ بات بہت عجیب لگی کہ جو ابواب اس نے پڑھے ہی نہیں ہیں ان کا امتحان کوئی جہی طالب علم کیسے دے سکتا ہے یہ بہت ہی غیر منطقی بات تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے سلمان نے کہا۔

”مجھے منظور ہے جناب!“ سلمان کا اعتماد دیکھ کر ایک لمحے کو نگران بھی ڈر گیا۔ لیکن ابوریحان کو یہ بے جا اعتمادی سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوا۔ تاہم اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ نگران کا چیلنج سلمان قبول کر کے پوری طرح پھینس گیا تھا۔

دوسرے دن سلمان کو کلاس میں لایا گیا۔ اس عرصے میں اسے کتابوں سے استفادہ کرنے کی پوری اجازت دی گئی اور رات کو سلمان کو ایک سزا دینے کے لیے مخصوص کمرے میں رہنے کے لیے کہا گیا۔ اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے وہ مجبوراً... اکیلا ہی رہا اور یہ تاثر دیتا رہا کہ وہ پڑھ رہا ہے۔ حالانکہ وہ مسلسل اپنے اس دکھ سے لڑ رہا تھا کہ اگر صنوبر کسی اور سے محبت کرتی ہے تو اس کی محبت کا کیا بنے گا۔ وہ صنوبر کے لیے اتنے بڑے بڑے مخالفانہ محاذ کھول کے آیا تھا اس نے ایسے جھوٹ بولے تھے جو اگر پکڑے گئے تو بے وقت کی موت اس کا مقدر تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ کی زندگیوں کو بھی داؤد پھینکا دیا تھا۔ اس سب کے بعد اسے پتا چلتا ہے کہ صنوبر کسی اور سے محبت کرتی ہے تو کیا وہ اس محبت کو تسلیم کر لے گا۔ کیا وہ صنوبر کو اس شخص سے چھین سکے گا۔ چھین بھی لیا تو کیا صنوبر اس کے ساتھ کبھی خوش رہ سکے گی۔ کوئی بھی عورت اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھولتی ایسا اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا ممکن ہے یہ سچ نہ ہو مگر پھر بھی وہ اسے اپنے محبوب کے سامنے ترجیح تو نہیں دے سکتی۔ اسے لگا پہلی بار جب اس نے صنوبر کو بالکل کوئی میں او اس اور جاگتے ہوئے پریشان دیکھا تھا تو اس کی وجہ یہی محبت تھی۔ اگر وہ کسی سے محبت کرتی تھی تو جتنے دن سلمان اس کے پاس رہا، کبھی بلا بن کر بھی جن بن کر تو وہ آدمی کہاں تھا۔ کیا ان دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ جو اب پھر سے محبت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی کے ابھی صنوبر کے پاس پہنچے اور ساری سچائی معلوم کرے اس کی اپنی زبانی مگر یہ اس کے لیے اس وقت ناممکن تھا۔ نگران کے چیلنج کو ٹھکرا کے یارڈ کر کے اس کا جانا ٹھیک نہیں تھا۔ یہ امتحان ایسا بھی نہیں جس کی ذمہ داری وہ ہم شکل پر ڈال کر جاسکتا۔ اسے خود ہی اس امتحان کو دینا ہوگا اور اچھے نمبروں سے پاس بھی کرنا ہوگا۔ کیسا قسمت نے کھیل رچایا ہے کہ وہ اپنی صنوبر کے شہر میں ہوتے ہوئے بھی اس سے دور رہنے پر مجبور ہے۔

تب ہی اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا اور اس نے کچھ ہی دیر میں ایک خطرناک فیصلہ کر لیا۔ محبت خطروں سے کھیلنے کا ہی کام ہے۔ اس کے دل نے چپکے سے کہا۔

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے
سطر سطر ہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ دسمبر میں پڑھیے)



سین پرستم لیے وای لہانیاں
جن میں صدائی اور ملن کی وکل بھی شامل ہے

پلیٹ فارم



واپسی

ممتاز احمد

اُس نوجوان کی داستان جس نے ٹھوکر میں کھا کھا کر ہی سونے اور پتیل کے فرق کو جانا تھا

رہی تھی۔ پلیٹ فارم بھی وہی تھا اور ریلوے اسٹیشن بھی
وہی مگر آج فرق صرف اتنا تھا۔ ٹرین اور ٹائم وہ نہیں
تھا۔ آج جاوید اور عمرین کے دلوں کی دھڑکیں کچھ
بے ترتیب تھیں۔ وہ دونوں اسی پلیٹ فارم کے بیچ پر

شدید دھند بڑینے کے کئی دنوں کے بعد آج
ایک چمکدار دھوپ لگی تھی۔ سورج اپنی سنہری کرنوں
سے فرحت بخش حرارت فضا میں بکھیر رہا تھا۔ دھوپ
کی تمازت سردی میں ٹھٹھے جسموں کو حرارت بخش



READING
Section

ایک دوسرے کے ساتھ بڑا کر بیٹھے تھے جس پر وہ گزشتہ چھ ماہ سے بیٹھے آرہے تھے۔ مگر پہلے ٹائم صبح کا ہوتا تھا جبکہ آج دوپہر کے ایک بجے کا ٹائم تھا۔ آج منزل بھی نئی تھی۔ ارادے بھی کچھ اور تھے پہلے منزل جانی پہچانی تھی مگر آج منزل انجانی تھی۔ پہلے وہ دونوں خالی ہاتھ ہوتے تھے مگر آج دونوں کے پاس بھاری بھرم سفری بیگ تھے۔ ٹرین کے آنے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ پڑا تھا۔ جاوید نے ابلے انڈوں کے ساتھ دو کپ چائے منگوائی جسے وہ دونوں گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے۔ جاوید وقفے وقفے سے پاکٹ سے موبائل نکال کر ٹائم دیکھتا۔

عنبرین ناز ایک انتہائی خوبصورت پچیس سالہ لڑکی تھی۔ گورا رنگ، درمیانہ قد، تیکھی ناک، غزالی آنکھیں اور پر والے ہونٹ کی ایک سائڈ پرتل سینے کے پرکشش ابھار تیلی کمر نرم و نازک گورے ہاتھ۔ عنبرین پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔ عنبرین نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی تھی اور پھر وقت گزاری کے لیے اُس نے بیچنگ کی جاب کر لی۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے اپنے ہی شہر چنیوٹ میں ایک سرکاری اسکول میں جاب ملی تھی۔ عنبرین اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ ایک آزاد خیال خوابوں کی دنیا میں رہنے والی مغرور لڑکی تھی۔ اُسے غربت اور غریب لوگوں سے نفرت تھی۔ وہ سپنوں میں اپنے لیے کسی شہزادے کو دیکھتی۔ کار کوٹھی وجیہہ خوبصورت ماڈرن براڈ مائینڈ مرد اُس کا خواب اور آئیڈیل تھا۔

عنبرین صبح تیار ہو کر اسکول چلی جاتی جہاں وہ طالبات کو پڑھانے کی بجائے گیس مارٹی، ہنسی مذاق کرنی اور پھر دوپہر کو گھر واپس آ کر کھانا کھانے کے بعد سو جاتی۔ پھر رات گئے تک رومانوی ڈائجسٹ پڑھتی، ٹی وی دیکھتی۔ عجب بے فکری کی زندگی تھی اُس کی۔

عنبرین کے والد ایک پرائیویٹ جاب کرتے تھے۔ جس مکان میں اُن کی رہائش تھی وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جو کہ عنبرین کے والد کے ایک دیرینہ دوست

نے اُن کو رہنے کے لیے دیا ہوا تھا اور وہ خود باہر کے ملک میں تھا۔ عنبرین کی والدہ ایک گھریلو خاتون تھیں جو کہ سارا دن گھرداری میں مصروف رہتیں۔

عنبرین کے والد کو اچانک دل کی شدید تکلیف ہوئی فوری طبی امداد اور علاج سے سنبھل گئے۔ اب عنبرین کے والد کو یہی فکر اور تمنائیں تھیں کہ اُن کی زندگی میں عنبرین کی شادی ہو جائے۔

رشتے کی تلاش شروع ہو گئی اور جلد ہی عنبرین کا رشتہ آ گیا۔ لڑکے کی تعلیم میٹرک تھی اُس کا ایک کریانے کی دکان تھی، گھر میں ایسا تھا۔ لڑکا بہت شریف تھا۔ عنبرین کو جب اس رشتے کا پتا چلا تو اُس نے بھرپور مخالفت کی اپنی ماں سے لڑی مگر جب اُس کی والدہ نے کہہ کر تمہارے انکار سے تمہارے ابو کو صدمہ اور دکھ ہوگا۔ وہ پہلے ہی دل کے مریض ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کو کچھ ہو جائے۔

یہ سن کر عنبرین خاموش ہو گئی چنانچہ رشتہ قبول کر لیا گیا اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ اور پھر وہ دن آن پہنچا جس کا انتظار ہر لڑکی کو ہوتا ہے۔

عنبرین رخصت ہو کر اپنے سرسراہٹ آگئی اور حجلہ عروسی میں دلہن بنی اپنے خاوند کی منتظر تھی۔ پھر خدا خدا کر کے رسمیں ختم ہوئیں اور رات کے بارہ بجے عنبرین کا شوہر اشرف کمرے میں آیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔

عنبرین نے پلکیں اٹھا کر اپنے خاوند کو دیکھا تو اُس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے کیونکہ وہ ایک معمولی شکل و صورت کا سانوے رنگ کا لڑکا تھا۔ عنبرین کے دل پر گھونسا لگا اور وہ بہت مایوس ہوئی۔

شادی کے چوتھے روز سے اشرف نے اپنی دکان پر جانا شروع کر دیا۔ جبکہ عنبرین نے ایک ماہ کی چھٹیاں لی ہوئی تھیں۔ دو تین ہفتے رشتہ داروں کے ہاں دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور پھر زندگی اپنی روٹین پر واپس لوٹ آئی۔ عنبرین کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور اُس نے اسکول کی ڈیوٹی جوائن کر لی جبکہ اشرف صبح سویرے فجر کی نماز کے بعد ناشتا کر کے دکان چلا جاتا اور پھر رات گئے واپس گھر لوٹتا۔

اشرف ایک انتہائی سادہ، کم گو احساس اور پیار بھرا دل رکھنے والا پانچ وقت کا نمازی، پرہیزگار انسان تھا۔ وہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ اُس نے عنبرین کو بہت پیار دینے کی کوشش کی۔ اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا اور عنبرین سے کہتا کہ ملازمت چھوڑ دو۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔“

مگر عنبرین نے ملازمت چھوڑنے سے انکار کر دیا اور اشرف سے کہتی کہ وہ لی اے پاس ہے اور اُس نے تعلیم اس لیے حاصل نہیں کی کہ وہ گھر بیٹھ کر تمہاری اور تمہاری ماں کی غلامی کرے صفا سیاں کرے، برتن اور کپڑے دھوئے۔“

وہ ہر وقت اپنی تعلیم اور جاب کا رعب اشرف پر ڈالتی رہتی۔ عنبرین کی ساس بہت اچھی عورت تھی۔ وہ ہر لحاظ سے عنبرین کا خیال رکھتی۔ بیٹی بیٹی کہتے اُس کی زبان نہ ٹھکتی مگر عنبرین اُس کو بھی خاطر میں نہ لاتی۔ عنبرین نے جو خواب دیکھے تھے اُن میں سے کوئی بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اشرف نہ تو خوبصورت مرد تھا نہ ہی اُس کے پاس کار، کوئی جگہ تھا جس کی وجہ سے شادی کی پہلی رات سے ہی وہ اشرف سے متنفر ہو گئی۔ اُس کے اندر بہت تلخی آ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا شروع کر دیتی۔ اشرف کو کہ خوبصورت مرد نہ تھا مگر اس کے برعکس وہ انتہائی سلجھا ہوا، شائستہ، ہنس مکھ اور بااخلاق انسان تھا۔ مگر عنبرین کو اُس کی یہ خوبیاں نظر نہ آتی تھیں۔

اشرف اور اُس کی ماں بہت صلح جوتھے۔ وہ خاموشی سے عنبرین کی ہر جلی کٹی سن لیتے جس کی وجہ سے کوئی بڑا جھگڑا نہ ہوتا۔

عنبرین کی شادی کے ایک سال بعد اُس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ عنبرین جب بھی اپنی ماں سے ملنے جاتی ہر وقت اپنے خاوند اور ساس کی برائیاں کرتی، خوب کوستی اور یہی ظاہر کرتی کہ وہ بہت دکھی اور تنگ ہے۔ اُس کی ماں اُسے سمجھاتی کہ بیٹی اب تمہارا گھر وہی ہے۔ اپنے خاوند اور ساس کی خدمت کیا کرو۔ مل جل کر حسن سلوک سے رہا کرو۔“ مگر عنبرین کہتی کہ میں اُن کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں۔

ان ہی روز و شب میں تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ اشرف عنبرین کی ہر خواہش پوری کرتا۔ اُس نے بھی عنبرین سے اُس کی تنخواہ کا ایک روپیہ تک نہیں لیا۔ عنبرین کی خاطر وہ دوپہر کو وکان بند کر کے گھر آ جاتا اور دو تین گھنٹے اُس کے ساتھ گزارتا۔ ہر چھٹی والے دن عنبرین کو موٹر سائیکل پر گھمانے پھرانے لے جاتا مگر ہر بار عنبرین یہی کہتی کہ اُسے موٹر سائیکل پر بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ شرم آتی ہے۔“

ابھی تک عنبرین کے ہاں اولاد نہ ہو سکی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود نہیں چاہتی تھی کہ وہ ماں بنے۔ وہ احتیاطی تدابیر کرتی۔ ساتھ ساتھ میڈیسن بھی استعمال کرتی کہ اُس کا فکر خراب نہ ہو۔

پھر محکمہ تعلیم میں وسیع پیمانے پر رد و بدل اور تبدیلیاں ہوئیں چونکہ عنبرین کا سروس ریکارڈ کوئی اچھا نہ تھا۔ اُس کی کارکردگی خراب تھی۔ جس کے نتیجے میں اُس کی ٹرانسفر سرگودھا میں ہو گئی جو کہ چنیوٹ سے پچھن ساٹھ کلومیٹر دور تھا۔ عنبرین نے سرگودھا میں ڈیوٹی جوائن کر لی اور چنیوٹ سے روزانہ سرگودھا آنے جانے کے لیے ٹرین کا انتخاب کیا۔ اب اتفاق سے صبح ایک ایکسپریس ٹرین عنبرین کو بروقت سرگودھا پہنچا دیتی اور اسی طرح دوپہر کو اسکول سے چھٹی کے بعد بھی اُس کو واپسی کے لیے ٹرین مل جاتی۔ اشرف نے اب بھی بہت منت سماجت اور اصرار کیا کہ ملازمت چھوڑ دو۔ اتنی مشقت نہ اٹھاؤ مگر عنبرین اپنی ضد پر اڑی رہی اور اُس نے اپنی ملازمت جاری رکھی۔



جاوید احمد ایک انتہائی خوب رو و جیہہ مروانہ و جاہت کا شاہکار حسن پرست مرد تھا۔ ایک متوسط میڈلی سے اُس کا تعلق تھا۔ وہ ایم اے کر رہا تھا کہ اُس کے والد جو کہ ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے۔ ایک روز ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے دماغ کی نس پھٹنے کے باعث اُن کی موت واقع ہو گئی تو اُن کی جگہ پر اُسی محکمے میں اُسے (Employee Son) ملازمین کے بچوں کے کوٹے کی بنیاد پر فوراً اپنے باپ کی جگہ پر ملازمت مل گئی۔ جاوید احمد کے خواب بہت اونچے تھے۔ وہ ایسی

پروہ کرتی تھی۔ اُس نے شادی سے پہلے کبھی کسی لڑکے کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ پیار، محبت اور عشق کے جذبے کی قائل تھی مگر اُس کی سوچ یہ تھی کہ وہ صرف اپنے خاوند سے محبت، پیار اور عشق کرے گی اور اپنا سارا پیار اپنے شوہر پر بچھا کر دے گی۔

یاسمین نے اپنی پللیں اٹھا کر جب جاوید کو دیکھا تو اُس کا دل کھل اٹھا اور پہلی نظر میں اُسے جاوید سے پیار ہو گیا۔ جاوید نے اُسے ایک انگوٹھی منہ دکھائی میں دی جسے یاسمین نے بڑی خوش دلی سے قبول کیا اور جاوید سے درخواست کی کہ ہماری ازدواجی زندگی کی آج پہلی رات ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس نئی زندگی کی شروعات اللہ کے نام سے نوافل کی ادائیگی اور رب کے حضور دعا کے بعد شروع کی جائے مگر جاوید نے نہ تو یاسمین کی اس بات کو اہمیت دی اور نہ مالی اور کمرے کی لائٹ آف کر کے زیر و کابلب آن کر دیا۔

یاسمین کو اس بات کا بہت دکھ اور افسوس ہوا مگر اس نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیے بغیر اپنے آپ کو اپنے مجازی خدا کے سپرد کر دیا۔ کیونکہ وہ اپنے خاوند کی رضا میں راضی رہنا چاہتی تھی۔

یاسمین نے اپنی سلیقہ داری، حسن اخلاق اور خدمت کے جذبے کے تحت نہ صرف گھر کے ہر فرد کا دل جیت لیا بلکہ پورے گھر کو ایک خوبصورت مکمل گھر بنا دیا۔ وہ نوکرائیوں کی طرح اپنے خاوند کے آگے پیچھے پھرتی، کوئی معمولی سا چھوٹا سا کام بھی جاوید کو نہ کرنے دیتی۔ اُس کے جوتے پالش کر کے اُن میں موزے رکھ کر، شلواریں ازار بند ڈال کر باتھ روم میں لٹکانا، پانی گرم کر کے بالٹی میں ڈال کر، یہاں تک اُس کی شیو کا سامان تک اُس کے لیے ریڈی کر کے رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ اور کسی قسم کی شکایت تک کا موقع نہ دیتی اس کے علاوہ پورے گھر کی صفائی ستھرائی، کپڑے دھونا اور کھانا پکانا یہ سب کچھ اُس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ جاوید کا دل نہ جیت سکی۔ یاسمین کی اکثر جاوید کے کاموں کی وجہ سے نماز اور تلاوت بھی لیٹ ہو جاتی مگر کبھی حرف شکایت تک زبان پر نہ لاتی۔

شریک حیات کا خواہش مند اور طلب گار تھا جو کہ انتہائی خوبصورت، گوری چٹی، ماڈرن اور آزاد خیال ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ ڈھیر سا راجہیز، نقد روپیہ اور کار لے کر آئے۔ جاوید ہمیشہ اپنے اس خواب کی تعبیر پانے کے لیے سرگرداں رہتا تھا۔ مگر ابھی تک اُس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو پایا تھا۔ اُس کی تلاش جاری رہی اور ملازمت کرتے تین سال کا عرصہ بیت گیا۔

ہر ماں کی طرح جاوید کی ماں بھی اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے پوتے پوتیوں کو اپنی گود میں کھلانا چاہتی تھی۔ وہ پچھلے دو سال سے جاوید کو شادی کے لیے رضا مند کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر جاوید کے مسلسل انکار نے اُن کو نہ صرف مایوس کر دیا بلکہ وہ بیمار ہو گئیں۔ جاوید کے والد اپنی زندگی میں جاوید کا رشتہ اپنے قریبی عزیزوں میں طے کر گئے تھے۔ جب جاوید کو تلاش بسیار کے باوجود خوبصورت اور امیر لڑکی کا رشتہ نہ ملا تو وہ بھی مایوسی کا شکار ہو گیا۔ پھر اپنی والدہ کی بیماری، اُن کی ناراضگی کے ڈر سے وہ اس رشتے پر حامی بھرنے کو تیار ہو گیا۔ کیونکہ اس کی والدہ نے اُسے واشگاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ تمہارا رشتہ تمہارا باپ طے کر گیا ہے۔ اگر تم اس رشتے سے انکار کرو گے تو تمہارے والد کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔“ جاوید نے بادل نخواستہ شادی کے لیے رضا مندی ظاہر کر دی۔ بس پھر کیا تھا دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اور پھر یاسمین جاوید کی دلہن بن کر آگئی۔

☆.....☆.....☆

یاسمین مجلہ عروسی میں دلہن بنی اپنے مجازی خدا کی منتظر تھی۔ جب تمام رسومات اختتام پذیر ہو گئیں تو جاوید کمرے میں آیا۔ جب اُس نے اپنی دلہن یاسمین کا گھونگھٹ اٹھایا تو اُس کے جذبات پر اوس پڑ گئی کیونکہ یاسمین بہت زیادہ خوبصورت تو نہیں تھی مگر اچھے نین نقش والی گندی رنگت کی قبول صورت لڑکی تھی۔ یاسمین کی تعلیم میٹرک تھی اور اُس نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا تھا۔ گھر داری امور خانہ داری کی ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شرم و حیا کا پیکر اور صوم و صلوة کی پابند تھی۔ وہ مکمل شرعی

اور پھر مسافروں کی دھکم پیل میں دونوں ٹرین سے اتر گئے۔

چونکہ آج ٹرین تقریباً بیس منٹ لیٹ پہنچی تھی تو اس لیے وہ دونوں ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر جلدی جلدی اپنی منزلوں کی طرف عازم سفر ہو گئے۔

جاوید نے اندازہ لگایا کہ لڑکی ملازمت کرتی ہے۔ اگلے روز جاوید اپنے مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا اور اُس کی نگاہیں اُس پر پڑیں۔ چہرے کو ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں جبکہ آج عنبرین بھی کسی نامحسوس جذبے کے تحت آدھا گھنٹہ پہلے پلیٹ فارم پر آ گئی اور اُس کی متلاشی نظریں بھی اپنے خوابوں کے شہزادے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آج دونوں کی سچ دھج پہلے کی نسبت کچھ زیادہ تھی جب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اُن کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے اور دونوں ایک ساتھ خالی بیچ پر بیٹھ گئے۔

جاوید نے عنبرین کو سلام کیا اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ تعارف ہوا اور ٹرین آنے تک جاوید اور عنبرین دوست بن چکے تھے اور پھر ایک ماہ کے اندر اندر دونوں کی دوستی گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔

اگرچہ دونوں ہی شادی شدہ تھے مگر اپنی اپنی نا آسودہ خواہشات کا بوجھ اٹھائے اپنے حالات سے خود ساختہ ناخوش اور غیر مطمئن نئی راہوں کی جستجو میں تھے۔ جبکہ حقیقت اور سچائی یہ تھی کہ عنبرین کا شوہر اشرف ایک انتہائی اچھا مخلص اور پیار کرنے والا احساس کرنے والا خیال رکھنے والا انسان تھا اور عنبرین کی ہر جائز ناجائز خواہش پوری کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا اسی طرح جاوید کی بیوی یا سمین نیک شرم و حیا کا پیکر اور خدمت گزار تھی۔ اُس میں کوئی کمی نہیں تھی مگر وہ جاوید کے دل میں اپنا مقام نہ بنا سکی۔ اسی طرح عنبرین کے دل میں اشرف کی کوئی قدر و قیمت نہ بن سکی۔

جاوید اپنی بیوی کی جھوٹی برائیاں کرتا اسی طرح عنبرین اپنے خاوند کی برائیاں کرتے نہ تھکتی۔ جاوید عنبرین کے حسن کی دل کھول کر تعریف کرتا اُس کے حسن، خوبصورتی کے قصیدے پڑھتا جسے سن کر عنبرین نہ صرف بہت خوش ہوتی بلکہ سکون محسوس کرتی۔ اسی طرح

جاوید ایک کھلندرا، حسن پرست اور مغربی تہذیب کا ولدادہ مرد تھا۔ وہ اپنی ہر جائز، ناجائز خواہش یا سمین سے منوا کر رہتا مگر اس طرح جیسے کسی کھلونے سے دل بہلا کر اُسے پھینک دیا جائے۔

وقت پر لگا کر اڑتار ہا اور پھر تین سال کا عرصہ بیت گیا۔ اسی عرصے میں اللہ کریم نے اُن کو ایک بیٹی کی شکل میں اپنی خاص نعمت سے نوازا تھا۔ چند وجوہات اور ناگزیر انتظامی امور کی بنا کر جاوید کی ٹرانسفر چنیوٹ سے سرگودھا ہو گئی اور اُس نے ڈیوٹی پر آنے جانے کے لیے ٹرین کا انتخاب کیا تھا جو صبح سویرے چنیوٹ ریلوے اسٹیشن پر آ جاتی اور اُسے بروقت سرگودھا پہنچا دیتی، اسی طرح واپسی کے لیے بھی اُسے ٹرین مل جاتی۔

☆.....☆.....☆

آج بھی حسب معمول جاوید چنیوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ٹرین دس منٹ لیٹ تھی اچانک اُس کی نگاہ پلیٹ فارم کے بیچ پر بیٹھی ایک لڑکی پر پڑی جو کہ بے حد حسین و جمیل، خوبصورت، گوری چٹنی حسن کا پیکر تھی۔ جس نے بہت عمدہ قیمتی اور جدید فیشن کے مطابق لباس پہن رکھا تھا۔ جاوید تھوڑا سا بیچ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور پُرشوق نظروں سے بڑے انہماک سے اور غور سے اُس حسینہ کو دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد لڑکی نے محسوس کیا کہ کوئی اُسے متلسل دیکھ رہا ہے تو اُس نے جب گھوم کر دیکھا تو وہ بھی دیکھتی رہ گئی کیونکہ اُس کے خوابوں کا شہزادہ ایک خوبصورت، گورا چٹا، خوش لباس مرد جو کہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب دونوں کی نظریں ملیں تو دونوں کے دلوں کے تاریخ اٹھے۔ عنبرین اور جاوید ایک ٹک محویت سے ایک دوسرے کو دیکھنے میں گم تھے کہ آنے والی ٹرین کے تیز وصل کی آواز نے اُن کی محویت کو توڑ دیا اور اگلے لمحے ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی اور وہ دونوں ایک ہی کپارٹمنٹ میں سوار ہو گئے۔ آج ٹرین میں رٹش تھوڑا زیادہ تھا مگر دونوں کو بیٹھنے کی الگ الگ جگہ مل گئی اور سرگودھا پہنچنے تک دونوں ایک دوسرے کو چوری چوری دیکھتے رہے اور پھر آخر میں مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا جو کہ دونوں کی طرف سے ایک دوسرے کو گرین سگنل تھا

عبرین بھی جاوید کی مردانہ وجاہت کی تعریفوں کے پل باندھتی۔

آج جب اُس نے عبرین کے منہ سے طلاق کا مطالبہ سنا تو اشرف کی زبان گنگ ہو گئی۔ وہ خاموش رہا۔ ایک ہفتے تک وہ لگا تار طلاق کا مطالبہ کرتی رہی۔ اشرف نے اُسے پیار سے بہت سمجھایا مگر عبرین اپنے مطالبے پر اڑی رہی کیونکہ جاوید کا اصرار دن بدن بڑھ رہا تھا کہ جلد از جلد طلاق لے لو تا کہ وہ دونوں ایک ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ مگر اشرف نے عبرین کو دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ اُسے ہرگز طلاق نہیں دے گا۔

☆.....☆.....☆

کچھ دنوں کے بعد اشرف کے خاندان میں ایک شادی تھی۔ عبرین نے پہلے تو شادی میں شرکت سے انکار کر دیا پھر کچھ سوچ کر وہ شادی میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

شادی ہال میں ڈیڑھ دو سو کے قریب عورتیں تھیں۔ ایک بوڑھی عورت نے عبرین کی ساس سے پوچھا کہ تمہارے بیٹے اشرف کی شادی کو تین سال کا عرصہ بیت گیا ہے مگر ابھی تک بہو کے پاؤں بھاری نہیں ہوئے۔ اُس پر عبرین کی ساس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ”پوتے پوتی کو اپنی گود میں کھلانے کی بڑی حسرت اور آرزو ہے مگر اللہ کی مرضی.....“ ابھی وہ مزید کچھ کہنے والی تھیں کہ عبرین بول پڑی۔

”پاؤں کیسے بھاری ہو، ان کا بیٹا اشرف تو نامرد ہے۔“ جب عبرین کے منہ سے یہ سنا تو کچھ عورتیں کھیانی انہی مننے لگیں، کچھ توبہ توبہ کرنے لگیں کہ یہ کتنی بے شرم ہے اور کچھ عورتیں چسکے لینے لگ گئیں۔

عبرین کی ساس کو شرمندگی کے مارے چپ لگ گئی خیر شادی کا فنکشن جیسے تیسے ختم ہوا، عبرین کی ساس گھر آ کر چار پائی پر ڈھے گئی۔ پھر عبرین نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور شدت سے طلاق کا مطالبہ شروع کر دیا۔

جب اشرف کو پتا چلا کہ عبرین نے بھری تحفل میں اُس پر نامرد ہونے کا الزام لگایا ہے تو وہ شرم سے زمین میں گڑھ کر رہ گیا۔ اُسے سانپ سونگھ گیا اور حیرت کے مارے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

عبرین نے اپنا بیگ تیار کیا اور کہا کہ وہ اپنی امی کے

جلد ہی دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا آئیڈیل قرار دے دیا گو کہ جاوید کے پاس کار، کوٹھی دولت نہیں تھی مگر وہ جاوید کو دل سے پسند کرنے لگی اسی طرح جاوید بھی کسی امیر کبیر لڑکی یا عورت کی تلاش میں تھا گو عبرین کے پاس کار، روپیہ، پیسہ تو نہ تھا مگر وہ دلکش حسن کی دولت سے مالا مال تھی۔ بے باک تھی، آزاد خیال اور ماڈرن تھی جس کی وجہ سے وہ جاوید کے دل کو بھلی لگی اور وہ اُسے پسند کرنے لگا۔ جاوید نے عبرین سے کہا کہ وہ اشرف سے طلاق لے لے تا کہ وہ اُس سے شادی کر لے۔

☆.....☆.....☆

پچھلے ایک ماہ سے عبرین اپنے شوہر اشرف سے کچھ زیادہ ہی بے زار رہنے لگی تھی۔ وہ اسکول سے واپس آ کر موبائل فون پر جاوید سے ایس ایم ایس پر باتیں کرتی، کال پر بھی باتیں کرتی حالانکہ دونوں ٹرین میں ایک ہی کپارٹمنٹ میں، ایک ہی سیٹ پر ساتھ ساتھ بیٹھے اور ڈھیروں باتیں کرتے مگر پھر بھی دونوں کا دل نہیں بھرتا تھا۔ ادھر جاوید بھی یاسمین سے بے زار اور تنگ رہنے لگا تھا۔ اُس کی ہر بات اور ہر کام میں کیڑے نکالتا، بات بات پر اُس کی بے عزتی کرتا مگر آفرین ہے یاسمین پر جو اُس نے اُف تک بھی بھیجی کی ہو۔ وہ جاوید کی خوشنودی کے لیے نوکرانیوں کی طرح اُس کے ہر کام بھاگ بھاگ کر کرتی تا کہ جاوید کو کسی قسم کی کوئی شکایت کا موقع نہ ملے مگر جاوید کی زبان پھر بھی اُس پر انگارے برساتی مگر یاسمین خاموشی سے اُس کی ہر زیادتی کو برداشت کر جاتی۔

ایک دن عبرین نے اشرف سے طلاق کا مطالبہ کر دیا، جسے سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اشرف نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ عبرین کے دل میں جگہ بنا لے۔ اُس نے عبرین کی خاطر اپنے معمولات بھی تبدیل کر دیے تھے مگر عبرین اسے نفرت اور حقارت سے دیکھتی اور کہتی۔

”مجھے تم جیسے پرچون فروش سے نفرت ہے۔ تمہاری اوقات کیا ہے۔ سارا دن دکان پر روئے دو روپے کی چیزیں بیچتے ہو، نہ ہی کوئی تمہارا سوشل اسٹیٹس ہے۔ تم

نے بھی اپنی ماں کو حکمانہ تعلیمی کورس کے لیے پندرہ روز لاہور جانے کا بتایا اور اگلے روز دونوں اپنے اپنے سفری بیگ لے کر چنیوٹ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

جاوید نے لاہور کے دو ٹکٹ فرسٹ کلاس سلیپر کے لیے اور اب وہ دونوں پلیٹ فارم کے بیچ پر بیٹھے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔

پورے ڈیڑھ بجے ٹرین آگئی اور وہ اُس میں سوار ہو گئے۔ اور پھر شام تک لاہور ایک دوست کے گھر پہنچ گئے۔ جہاں اُس کے دوستوں نے نکاح کا بندوبست کیا ہوا تھا۔

مغرب کے بعد نکاح ہوا پھر کھانا کھا کر جاوید اور عنبرین ایک ہوٹل کے کمرے میں شفٹ ہو گئے۔ جاوید اور عنبرین پورے دس دن لاہور رہے۔ خوب گھومے پھرے موج مستی کی اور پھر اسلام آباد چلے گئے۔ وہاں سے مری گھوم پھر کر پندرہویں دن بذریعہ ٹرین واپس چنیوٹ آ گئے۔

☆.....☆.....☆

جیسے ہی چنیوٹ کا ریلوے اسٹیشن قریب آیا تو اسٹیشن سے تھوڑا پہلے ہی ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ٹرین ایک دم اسٹیشن سے پہلے کیوں رُک گئی ہے۔ کچھ مسافر اترنا شروع ہو گئے تو پتا چلا کہ ایک آدی ٹرین کے نیچے آ کر مر گیا ہے۔ اب پوکیس اور ریلوے کا دوسرا عملہ آنے تک ٹرین ادھر ہی رُکے گی۔ جب جاوید اور عنبرین ٹرین سے نیچے اترے تو ٹرین کا عملہ گاڑی کے نیچے سے مرنے والے کی لاش نکال چکے تھے۔ لاش دو ٹکڑے ہو چکی تھی۔ جب عنبرین کی نظر لاش پر پڑی تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ وہ لاش اُس کے سابقہ خاوند اشرف کی تھی۔ اُس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا اور وہ بے چارہ پاگل پن کی کیفیت میں ٹرین کے نیچے آ کر جاں بحق ہو گیا تھا۔

عنبرین کے دل پر گھونسا لگا۔ کچھ دیر کے لیے اُسے دکھ بھی محسوس ہوا پھر جلد ہی اُس پر بے بسی طاری ہو گئی چنیوٹ پہنچ کر عنبرین اپنے بیگ کے ساتھ اپنی امی کے ہاں پہنچ گئی۔ جاوید اُس کے ساتھ ہی تھا جہاں پہنچ کر عنبرین نے اپنی امی کو بتایا کہ اُس نے جاوید سے شادی

گھر جا رہی ہے اور ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر کل شام تک اُسے طلاق اور جہیز کا سامان نہ ملا تو وہ عدالت میں خلع کا مقدمہ دائر کر دے گی اور وہاں بھی یہی بیان دے گی کہ اشرف نامرد ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے بیگ اٹھایا اور اپنی ماں کے گھر چلی گئی جہاں جا کر اُس نے رورو کر آسمان سر پراٹھالیا اور اشرف اور اس کی ماں کے ظلم و ستم کے جھوٹے قصے سنانے لگی۔

اگلے روز عنبرین کو اشرف نے طلاق دے دی اور جہیز کا سامان بھی اُسے جلد ہی مل گیا تو وہ بہت خوش ہوئی اور فوراً جاوید کو کال کر کے یہ خوش خبری سنائی۔ عنبرین کی امی کو بہت دکھ ہوا کہ اُس کی بیٹی کا گھر اجڑ گیا ہے۔ وہ بہت روئی مگر عنبرین نے اُس کو سلی دی کہ اُسے اشرف سے اچھا شوہر ملے گا۔ پھر عنبرین نے عدت کے لیے اسکول سے پانچ ماہ کی چھٹی لے لی۔ مگر دورانِ عدت اُس کا موبائل فون پر جاوید سے مسلسل رابطہ رہا۔

☆.....☆.....☆

اشرف نے اتنا بڑا الزام سننے کے بعد عنبرین کو طلاق تو دے دی مگر وہ جیتے جی مر گیا کیونکہ اُس کے پورے خاندان، برادری محلے میں یہ بات پھیل گئی کہ عنبرین نے اشرف سے طلاق کس وجہ سے لی ہے۔ اُس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا اور دماغ پر اتنا اثر لیا کہ اُس کی ذہنی حالت خراب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

جیسے ہی عنبرین کی عدت پوری ہوئی تو جاوید اور عنبرین نے اگلے رز کا پروگرام بنایا کہ لاہور جا کر نکاح کر لیتے ہیں۔ دراصل جاوید اس نکاح کو اپنے گھر والوں خاندان اور بیوی سے خفیہ رکھنا چاہتا تھا تو اس وجہ سے وہ لاہور جا کر خاموشی سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ جاوید کے کچھ دوست اور جاننے والے لاہور میں رہتے تھے۔ جاوید نے اُن کو ساری صورت حال بتادی تھی تو اُس کے دوستوں نے اس معاملے میں مکمل مدد اور نکاح کے انتظام کا بندوبست کا وعدہ کیا تھا۔

جاوید اور عنبرین کی تیاری مکمل تھی۔ جاوید نے اپنی ماں اور یاسمین کو بتایا کہ حکمانہ ٹریننگ کے سلسلے میں وہ پندرہ روز کے لیے لاہور جا رہا ہے۔ اسی طرح عنبرین

کر لی ہے اور وہ دونوں بہت خوش ہیں۔ اُس کی ای نے دونوں کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہا جس طرح تمہاری خوشی اور تمہاری خوشی میں وہ بھی خوش ہے۔ دونوں کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں چنانچہ اگلے روز سے دونوں کا وہی چنیوٹ سے سرگودھا آنے جانے کا سفر شروع ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

جاوید اب یاسمین کی طرف سے مکمل طور پر غافل ہو چکا تھا۔ اُس نے عنبرین سے شادی کے لیے بہت سارا قرض لیا ہوا تھا۔ اُس نے عنبرین کو زیور دیا تھا۔ کافی سارے پیسے لاہور، اسلام آباد، مری کے ٹور پر خرچ ہو گئے تھے۔ اُس کی محدود تنخواہ بھی مگر اُس نے عنبرین کے آگے ڈینگیں مار مار کر اپنے آپ کو بہت امیر آدی ظاہر کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گھر میں بہت تنگی آگئی۔

ادھر عنبرین اپنی ساری تنخواہ اپنی عیاشیوں میں اڑا دیتی، ادھر جاوید کی آدمی سے زیادہ تنخواہ قرض کی ادائیگی میں خرچ ہو جاتی۔

کچھ عرصہ گزرا تو عنبرین کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور اُن کے انتقال کے چند ماہ بعد مکان کا مالک باہر سے آ گیا اور عنبرین سے مکان خالی کرنے کا کہا۔ جب جاوید کو اس صورت حال کا پتا چلا تو وہ تھوڑا پریشان ہو گیا۔ پھر جاوید نے عنبرین کو سرگودھا میں ایک فلیٹ کرائے پر لے دیا۔ چونکہ عنبرین کی پوسٹنگ ابھی تک سرگودھا میں ہی تھی۔ چنانچہ عنبرین کا ضروری سامان ایک چھوٹے ٹرک کے ذریعے سرگودھا پہنچا دیا گیا، فالتو سامان فروخت کر دیا گیا۔ اب جاوید روزانہ چنیوٹ سے سرگودھا ڈیوٹی پر آتا اور ایک رات عنبرین کے پاس رہتا اور ایک رات چنیوٹ میں رہتا۔ جاوید پہلے ہی تنخواہ سے قرض اتار رہا تھا، اب عنبرین کو فلیٹ بھی لے کر دیا، اُس کا کرایہ بھی الگ سے دینا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر دونوں گھروں میں ہلکا پھلکا لڑائی جھگڑا چلتا رہتا۔

یاسمین کو کسی ذریعے سے پتا چل گیا تھا کہ جاوید نے عنبرین نامی کسی عورت سے دوسری شادی کر رکھی ہے مگر پھر بھی وہ حرف شکایت زبان پر نہ لائی اور ہر طرح کی تنگی

ترشی اور حالات کو برداشت کرتی رہی۔ ادھر عنبرین ایک دن پھاؤں بھسلنے کے باعث فرش پر گر گئی اور گرنے کی وجہ سے اُس کا تین ماہ کا حمل ضائع ہو گیا۔ اُسے اسپتال داخل کروانا پڑا جس پر جاوید کا بہت سارا روپیہ خرچ ہو گیا، جس کی وجہ سے جاوید کے مالی حالات بہت خراب ہو گئے۔ اس حادثے کی وجہ سے عنبرین میں ایسا نقص پڑ گیا جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے ماں بننے سے محروم ہو گئی۔

مالی پریشانیوں نے جاوید کو بہت جلد تھکا دیا اور اُس کے اندر بہت تنگی آ گئی۔ ادھر عنبرین اپنی ساری تنخواہ اپنی من مانیوں اور ذاتی اخراجات، کپڑوں کی خریداری میک اپ وغیرہ کے سامان میں خرچ کر دیتی اور اس کے علاوہ جاوید سے بھی رقم کا تقاضہ کرتی رہتی، جس کی وجہ سے جاوید اور عنبرین میں اچھی خاصی جھڑپ ہو جاتی۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں بڑے بڑے جھگڑوں میں تبدیل ہونے لگیں۔

اب دونوں ایک دوسرے سے تنگ آ چکے تھے۔ عنبرین کو خوبصورت ہینڈ سم شوہر تو مل گیا تھا مگر کنگلا نکلا تھا۔ کار کوشی والا نہیں تھا۔ اسی طرح جاوید کو عنبرین کی شکل میں خوبصورت ماڈرن بیوی تو مل گئی تھی مگر ایسی، جو نہ تو جہیز میں روپیہ، پیسہ کار لے کر آئی اور نہ ہی کوٹھی۔ اب دونوں اپنی اپنی جگہ پچھتا رہے تھے۔ اب اتفاق سے جاوید کی ٹرانسفر سرگودھا سے واپس چنیوٹ ہو گئی تو اب وہ ہفتے میں ایک آدھ چکر عنبرین کے پاس لگاتا۔ روزانہ فون پر دونوں کی لڑائی ہوتی۔ ادھر قرض خواہوں نے جاوید کی ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ ادھر عنبرین اپنا خرچہ مانگتی۔ جاوید اُسے ایک بات کہتا تو عنبرین اُسے آگے سے پانچ باتیں سناتی۔

عنبرین پیسے کی بچاری اور کچھ زیادہ ہی آزاد خیال ثابت ہوئی تھی۔ جاوید سے مایوس ہو کر اُس نے ایک پینتالیس سالہ انتہائی امیر شخص سے دوستی لگالی، جو عنبرین کو مہنگی شاپنگ کرواتا۔ فیسی تحائف دیتا اور کار میں بٹھا کر خوب سیر سیانا کرواتا اور بدلے میں عنبرین کے جوان خوبصورت جسم سے لطف اندوز ہوتا۔ عنبرین اُس دولت مند شخص عرفان کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی

تھی۔ اب تو وہ عرفان کے دوستوں کے پاس بھی جانے لگی تھی۔ جاوید کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اُس نے عنبرین کو طلاق دے دی۔

اب عنبرین مکمل طور پر آزاد تھی۔ اُس کی بطور ٹیچر کارکردگی پہلے ہی خراب تھی۔ اب وہ اپنی موج مستی اور سپر سائے کی وجہ سے اکثر اسکول سے غیر حاضر رہنے لگی۔ مزید برآں اُس کی غیر اخلاقی سرگرمیوں کا بھی اسکول میں اور محکمے والوں کو پتا چل گیا اور پھر بالآخر مختلف انکوائریوں کے بعد اُسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ ادھر جاوید نے عنبرین کو طلاق دی تو اُس نے سکھ کا سانس لیا۔ اب وہ یاسمین اور عنبرین کے درمیان موازنہ کرتا تو اُسے اپنے آپ پر شرم آتی کیونکہ ثابت ہو چکا تھا کہ یاسمین سونا ہے اور عنبرین پیتل۔

ایک شام ایک قرض خواہ اپنے پیسے مانگنے آیا اور جب جاوید نے ادا نہ کیے تو اُس نے گھر کے دروازے کے آگے کھڑے ہو کر جاوید کو برا بھلا کہا، خوب گالیاں دیں اور دھمکی دی کہ اگر دو دن کے اندر اندر رقم واپس نہ کی تو وہ جاوید کو تھانے میں بند کروادے گا۔

جاوید بہت پریشان ہوا تو یاسمین نے اپنا سارا زیور لاکر جاوید کی گود میں ڈال دیا کہ اسے فروخت کر کے سارا قرض چکا دیں تو جاوید کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆.....☆.....☆

جب عرفان کی بیوی کو پتا چلا کہ اُس کا شوہر دولت لٹانے کے ساتھ ساتھ اپنی راتیں عنبرین کے ساتھ کالی کرتا ہے تو پہلے تو اُس نے عرفان سے بات کی پھر نوبت لڑائی جھگڑے تک جا پہنچی۔ مگر عرفان باز نہ آیا تو عرفان کی بیوی نے چپکے سے اپنے ایک وفادار نوکر کو کافی رقم دی اور ایک منصوبہ بنایا اور پھر چند دنوں کے بعد اُس منصوبے پر عمل ہو گیا۔

اُس نوکر نے اپنا چہرہ چھپا کر ایک شام عنبرین پر تیزاب پھینک دیا جس کے نتیجے میں اُس کا آدھے سے زیادہ چہرہ اور سینہ جل گیا اور وہ چیختی چلاتی رہ گئی۔ نوکر چپکے سے اپنا کام کر کے آ گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

☆.....☆.....☆

جاوید آج جب یاسمین کا زیور بیچ کر تمام قرضہ ادا کر کے گھر آیا تو وہ بہت ہلکا پھلکا اور پُرسکون تھا مگر اُس کے چہرے پر ندامت تھی۔ جب وہ رات کو کمرے میں آیا تو اُس نے پہلے تو یاسمین کا شکریہ ادا کیا پھر معافی مانگنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے آگے جوڑ دیے تو یاسمین نے اُس کے ہاتھ پکڑ کر چوم لیے اور جاوید کے قدموں میں بیٹھ کر کہا۔

”پلیز مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ میرے سرتاج ہیں۔ میرا سب کچھ صرف آپ کا ہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ زیور کے بدلے مجھے میرا مجازی خدائے مل گیا۔ میرا خاوند واپس آ گیا۔“ اور ساتھ ہی جاوید کو بتا دیا کہ اُسے عنبرین سے جاوید کی شادی اور دیگر تمام حالات کا علم ہے۔ وہ جاوید پر کیس بھی کر سکتی تھی کہ اُس نے پہلی بیوی سے دوسری شادی کی اجازت لیے بغیر عنبرین سے نکاح کیا تھا۔ مگر اُس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ جاوید سے سچا پیار اور عشق کرتی ہے۔ اُس نے ہر نماز کے بعد جاوید کی سلامتی اور واپسی کی دعائیں مانگی ہیں تو اُسے یقین تھا کہ اُس کی دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی اور جاوید کی واپسی ہوگی۔

یہ سن کر جاوید نے فرط جذبات سے یاسمین کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ تو یاسمین نے کہا۔

”جاوید میں نے شادی کی پہلی رات ایک درخواست کی تھی کہ از دو اجی زندگی کی شروعات اللہ کے ذکر، نوافل کی ادائیگی اور دعا کے بعد کی جائے مگر آپ نے اُس وقت میری یہ درخواست نہیں مانی تھی۔ جس کا مجھے آج تک دکھ ہے۔ تو پلیز آج آپ کی واپسی ہو چکی ہے تو میری یہ درخواست قبول کر لیں۔“ جاوید نے فوراً وضو کیا اور نماز عشاء کی ادائیگی کے بعد دونوں نے مل کر شکرانے کے نوافل پڑھے۔ جاوید نے رورور کر اپنے گناہوں اور زیادتیوں کی معافی مانگی اور دعا کے بعد وہ پُرسکون ہو گیا۔ واپسی کے سفر کے بعد آج اُن دونوں کی دوسری سہاگ رات تھی۔ آج دونوں کے دل ایک دوسرے کی محبت اور پیار میں سرشار تھے۔

☆☆.....☆☆

مسئلہ ہے

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس ناڈی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپروڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مر وہ) کے لیے دعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپروڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات ٹو کین منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II - خیابان جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

ہوں۔ آپ واقعی میں اللہ کے نیک اور سچے بندے ہیں۔ میں بہت بری عورت ہوں۔ حالات نے مجھے کیا سے کیا کر دیا۔ وہ ایک الگ کہانی ہے۔ مگر میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا میں آپ کے ٹرسٹ کے لیے کچھ دے سکتی ہوں۔ شاید میری دی گئی رقم سے کوئی لڑکی برائی کے راستے پر چلنے سے بچ جائے اور عزت سے اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے اجازت دے دیں۔ میں اپنا صحیح نام بھی نہیں لکھ رہی۔ شاید لوگ مجھے پہچان جائیں۔ آپ بس مجھے اجازت دے دیں میں ہر ماہ ایک خطی رقم آپ کے ٹرسٹ کو بھجوانا چاہتی ہوں۔

☆ بی بی ترنم! اللہ تم پر رحم فرمائے۔ تمہیں نیکی کی ہدایت تو اُس نے دے دی ہے بس برائی کا راستہ ترک کرنے کی کوشش کرو۔ تم مجھے رقم ارسال کر سکتی ہو شاید تمہاری یہ نیکی تمہاری بخشش کا باعث بنے اور دنیا میں بھی تم تائب ہو کر سرخرو ہو سکو۔

□ شافعیہ۔ کراچی

o بابا جی گزارش یہ ہے کہ میں نے آپ کو اس سے پہلے بھی خط لکھا تھا۔ تقریباً چودہ پندرہ سال پہلے اپنی بیماری کے بارے میں (Uterus) بچہ دانی پر رسولی تھی۔ جس کا آپ نے آپریشن کا بولا تھا۔ لیکن میں نے جب نہیں کرایا تھا۔ اب اپنے شوہر کے انتقال کے بعد جو کہ 8 سال ہو گئے ہیں اور آپریشن کو 3 سال ہو گئے ہیں۔ آپریشن کے بعد مجھ کو ایک دم سے اتنی گرمی لگتی ہے کہ سر پر، منہ پر پینہ آجاتا ہے۔ اور ایک دم سے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ایک تو اس کا علاج بتا دیں۔

عزیزانِ من! اللہ ہم سب کو اپنی مان میں رکھے۔ رزق وافر عطا فرمائے، اولاد کی خوشیاں دکھائے، مشکلات اور مسائل سے نمٹنے کی استطاعت عطا کرے۔ میں اپنے اُن بچوں کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے میری درخواست پر لبیک کہا اور میرے اُن بچوں کی امداد کی جو بہت ضرورت مند ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اگر مہینے کا خرچا باندھ دیا جائے تو پھر کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ عزت دار انسان ایک زندگی میں بار بار مرتا ہے جب اُسے اپنی ضرورت کے لیے کسی سے مدد مانگنی پڑتی ہے۔ ہم اپنے دل بڑے کر کے انہیں اُس ذلت سے بچا سکتے ہیں۔ عزت سے جینے کا حق سب کو ہے اور جو لوگ انسان کو عزت سے جینے میں مدد دیتے ہیں اللہ انہیں بے حساب عزت و توقیر دیتا ہے۔۔۔۔۔ ماہ محرم کا بابرکت ماہ ہم سب کو نصیب ہوا۔ اس ماہ میں خوب دعائیں کرنی چاہئیں، صدقات نکالنے چاہئیں۔ اسلامی سال کی ابتداء اس ماہ سے ہوتی ہے۔ ابتدا اچھی ہو تو انتہا بھی اچھی ہوتی ہے، لہذا کوشش ہونی چاہیے کہ قرآن مجید کو بامعنی پڑھیں اور سمجھیں اور اللہ کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزاریں۔۔۔۔۔ 9 اور 10 محرم کو روزہ رکھنا افضل ہے اور سورۃ بقرۃ پڑھنا نہایت مبارک اس کے علاوہ سورۃ کہف، سورۃ نمل، سورۃ نور، اور سورۃ قصص ضرور پڑھنی چاہئیں۔ اللہ ہم سب پر اپنا کرم فرمائے اور عزت والی زندگی عطا فرمائے۔ آمین۔

□ ترنم ناز۔ لاہور

o بابا جی! میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتہ: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیزا۔ 7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122۔ 35893121۔ (021)

پاس جمع ہوئی ہے، ضائع نہیں ہوئی۔ میں اور یہ دو بچے جس حال میں ہیں اللہ تعالیٰ ہی بہتر دیکھنے اور جاننا والا مہربان ہے۔ اگست سے نہ تو گھر ہے اور نہ سکون ہے۔ اور میں بیمار بھی بہت ہوں۔ کسی دور کے رشتے دار نیک بندے سے کچھ وقت کے لیے اپنے لیے مدد مانگی۔ کیونکہ میں یہاں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ رب العزت کی یاد سے بھی غافل رہتی ہوں۔ بابا جی میرا یہ خط ضرور شائع کریں۔ کیونکہ میں اُس نیک شخص کا بہت شکر یہ ادا کرتی ہوں اور اُس کے لیے دعا گو ہوں۔ اور بابا جی اللہ کا یہ نیک اور برگزیدہ بندہ میری مدد کچھ وقت کے لیے کر سکتا ہے یہی سال ڈیڑھ سال۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے انشاء اللہ کوئی راہ کھول دے گا اور ہمارے لیے باہر سے دیز آ جائے۔ بابا جی آپ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔ یہ زندگی مختصر سی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خوش نصیب اور جنتی لوگ وہ ہیں جو کسی بے بس کو زندگی اور خوشی دے سکتے ہیں۔ یہی نیکی کی تمیح مرنے کے بعد آرام اور سکون کا ذریعہ ہوگی۔ بابا جی ایک بار پھر اُس نیک بندے کی میں بہت شکر گزار ہوں اور اُس کے لیے دعا گو ہوں۔

☆ بیٹی! اللہ تعالیٰ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ یہ میری دعا ہے۔ مجھے اپنے بچوں پر بہت یقین اور فخر ہے کہ وہ میری درخواست پر فوراً البیک کہتے ہیں۔ بیٹی اللہ مسبب الاسباب ہے۔ تم اس سے مدد مانگتی رہو وہ اپنے نیک بندوں کے ذریعے تمہاری مدد فرمائے گا۔

□ رحمان علی۔ چکوال

○ بابا جی میں کالی عرصے سے سچی کہانیاں میں آپ کا کالم پڑھ رہا ہوں اور بڑی ہمت کر کے جسارت کر رہا ہوں کہ بابا جی کوئی اللہ کا ایسا نیک بندہ ہے جو میرا قرض اُتار دے۔ مجھے نہ دے آپ کو ہی دے، آپ مجھے بھجواد میں معلومات بھی کر لیں۔ میں بہت مجبور ہو کر لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنی والدہ کی بیماری کے لیے مختلف وقتوں میں قرض لیا تھا۔ جواب بڑھ کر 4 لاکھ کی خطیر رقم بن چکا ہے۔ بابا جی آپ کے جاننے والوں میں بہت سے لوگ باہر ملک میں ہوں گے، ان کے لیے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ میری مدد کرویں۔ میں آپ کو سوائے دعا کے کچھ نہیں

دوسرے میری ایک جگہ ہے جو کرائے پر دی ہوئی ہے، دو حصوں میں کی ہوئی ہے ایک حصہ کے کرائے دار تو مطمئن ہیں اس کا کاروبار بھی صحیح چلتا ہے جبکہ دوسرے حصے کا کرائے دار شکایت کرتا ہے۔ اس حصے میں کچھ اثرات ہیں جو تنگ بھی کرتے ہیں اور منافع بھی نہیں ہوتا۔ جس سے مجھے پریشانی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے جب میرے شوہر کام اپنا کرتے تھے تو انہیں بھی منافع نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے پاس سے بل بھرنے پڑتے تھے۔ اب میں اس جگہ کو فروخت کرنا چاہتی ہوں کہ اسے فروخت کر کے لیز جگہ لے لوں۔ کیونکہ وہ لیز نہیں ہے۔ میں بیوہ خاتون ہوں۔ میرا خرچ اس کے کرائے سے چلتا ہے۔ کرائے دار کرایہ دینے میں بھی پریشان کرتے ہیں۔ گزارش ہے کہ میرے ان دونوں مشکلوں کے لیے کچھ ایسا بتائیں کہ میری پریشانی دور ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے۔

☆ بیٹی شافعہ! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ جو کیفیت تم نے لکھی ہے اس کی وجہ ہارمونز کا بگڑنا ہے۔ تمہیں کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے اس سلسلے میں رجوع کرنا چاہیے۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو اس کے لیے مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ انشاء اللہ کلام الہی کی برکت سے کام ہوگا۔ خط جوابی لفافے کے ہمراہ بھیجنا کہ تمہیں تفصیلی جواب دیا جاسکے۔

□ زیڈ۔ کوئٹہ

○ محترم بابا جی اللہ تعالیٰ سے آپ کی خیریت کی امید رکھتی ہوں۔ اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس زندگی میں بھی اور دنیا میں بھی جنت جیسا امن اور خوشی عطا کر دے۔ آمین۔ عید کی وجہ سے اکتوبر کا رسالہ لیٹ ملا اور انہی چند دنوں میں، میں نے خواب دیکھا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے لیے رقم آئی ہے۔ بابا جی آپ کا دل حضرت عمرؓ خلیفہ جیسا ہے۔ یقیناً آپ اللہ تعالیٰ کے بہت پیارے بندے ہیں۔ جس نیک بندے نے یہ نیکی آپ کے ذریعے میرے ساتھ کی ہے۔ وہ بھی بہت برگزیدہ بندہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اُس نیک اور پیارے بندے کو بہت اجر اور خوشی دے آمین۔ یہ دنیا اُس انسان کے لیے جنت ہو جائے اور اُس کی یہ نیکی اللہ تعالیٰ کے

دے سکتا۔ نوکری کرتا ہوں مگر تنخواہ تو روزمرہ کے خرچوں میں نکل جاتی ہے۔ بچوں کو بھی اسکول میں داخل نہیں کروا سکا ہوں۔ مگر اس سب سے زیادہ پریشانی مجھے قرض کی ہے۔ باباجی ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہوں میری مدد کر دیں۔

☆ بیٹے رحمان! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ہمت رکھو اللہ ضرور کرم کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ضرور اللہ کا کوئی نیک بندہ تمہاری مشکل حل کرے گا۔ تم بعد نماز عشاء سورۃ واقعہ ضرور پڑھا کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ ہاشم خان۔ انک

○ باباجی! میں بہت پریشان ہوں۔ میں ایک بہت اچھی فرم میں نوکری کرتا ہوں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ پریشانی کی وجہ میری کولیگ ہے جو میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ باباجی! یقین مانئے میں نے صرف ایک کولیگ ہونے کے ناتے اس کی مدد کی۔ میں اپنی چچا زاد سے منسوب ہوں اور اس کو اور وہ مجھے بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ زیادتی میری طرف سے ہوئی۔ یہ لڑکی صوبہ سرحد سے ہے اور اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہے۔ کوئی رشتے دار یہاں نہیں ہیں یہی سوچ کر میں اس کا خیال رکھتا رہا۔ اب وہ مجھے شادی کے لیے کہہ رہی ہے اور انکار کی صورت میں خودکشی کر لے گی۔ باباجی! میں شدید ذہنی اذیت کا شکار ہوں۔ اس کی والدہ سے بھی بات کر چکا ہوں مگر ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے اس کو کچھ نہیں بتایا۔ آپ پلیز اس سلسلے میں میری مدد کریں۔

☆ بیٹے ہاشم.....! مجھے یقین ہے کہ تم جو کچھ لکھ رہے ہو وہ درست ہے۔ بیٹے.....! اس لڑکی سے مکمل طور پر قطع تعلق کر لو۔ اگر ممکن ہو تو اپنی ٹرانسفر کرالو۔ وہ صرف تمہیں ڈرا رہی ہے لیکن اگر تم نے اپنا رویہ سخت نہیں کیا تو وہ تمہاری زندگی برباد کر دے گی کیونکہ اس نے آج تک تم سے جو کہا وہ جھوٹ ہے۔ بہر حال اپنی والدہ سے کہو تم کو صبح و شام آیت الکرسی کے حصار میں رکھیں اور بیٹے! تم بھی بکثرت یا حسب کا ورد کیا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ شاہدہ۔ لاہور

○ السلام علیکم! باباجی! میرا نام شاہدہ ہے اور والدہ کا نام رئیسہ ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چار بیٹے ہیں اور ایک بیٹی ہے۔ پہلے ہمارے حالات بہت اچھے تھے لیکن اب پریشانیوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ ہمارا گھر بھی بک گیا۔ کام شروع کیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ گھر کے حالات اب کافی خراب ہو گئے ہیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے بڑے بیٹے کی شادی کے لیے پریشان ہوں۔ اس کا نام عامر ہے ماں کا نام ثریا ہے۔ بہت لڑکیاں دیکھی ہیں پر کہیں کوئی بات نہیں بنتی۔ کوئی رکاوٹ ہے یا اللہ کی طرف سے ہی دیر ہے؟ باباجی! میرا دوسرا بیٹا نشے میں مبتلا ہے اس کی وجہ سے کبھی میں بہت پریشان ہوں۔ برائے مہربانی اس کے بارے میں بھی مجھے کچھ بتا دیں۔ باباجی! میرے مسکوں کا جواب ضرور دیجیے گا میں بہت پریشان ہوں۔

بیٹی شاہدہ! میں تمہیں جلد از جلد تعویذ منگوانے کا مشورہ دوں گا۔ مزید دیر مت کرنا ورنہ حالات بالکل ہی قابو سے نکل جائیں گے۔

□ شوکت احمد۔ کوٹ اڈو

○ باباجی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو پیارے حبیب ﷺ کے صدقے میں اس خدمت کا اجر دے۔ باباجی! اس امید کے ساتھ خط لکھ رہا ہوں کہ آپ میرے اس خط کا جواب اس دفعہ ضرور دیں گے۔ باباجی! میں نے تقریباً ڈیڑھ مہینہ پہلے خط لکھا تھا اس خط میں جوابی لفافے کے ساتھ کچھ پیسے بھی تھے لیکن اس کا جواب اب تک نہیں آیا۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری دو مختلف جگہوں پر تھوڑی سی زمین ہے۔ ہم لوگ اسے بیچنا چاہتے ہیں لیکن والد صاحب کو زمین بیچنے کا کہتے ہیں تو وہ غصے ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ زمین اس لیے بیچنا چاہتے ہیں کہ اپنا گھر بنائیں اور چھوٹا موٹا سا کاروبار شروع کر دیں۔ ہم چار بھائی ہیں دو مجھ سے بڑے اور ایک چھوٹا ہے۔ والد صاحب ان دونوں بڑے بھائیوں کی وجہ سے زمین نہیں بیچنا چاہتے کیونکہ وہ کوئی کام نہیں کرتے بڑا بھائی تو اب کوئی کام نہیں کرتا جو اس سے چھوٹا ہے اس کو اگر کام ملتا ہے تو وہ کرتا ہے ورنہ گھر میں پڑا رہتا ہے۔ بڑا بھائی ہر وقت پریشان رہتا ہے

جو گھر میں روز روز لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور ہر بات کا محور میں ہوتی ہوں۔ باباجی! میری ساس اپنی بیٹیوں کی غلطیوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں لیکن میری چھوٹی سی بات بھی اچھالتی ہیں۔ باباجی! میں گھر میں ہر وقت ڈری سہی رہتی ہوں۔ باباجی! اگر شوہر نوکری کرتے تو کم از کم طعنے تو نہیں ملتے لیکن میرا اور میرے شوہر کا خرچ سارا میرے سر اٹھا رہے ہیں اور باباجی! میں چاہتی ہوں میرے شوہر کام کریں۔ ویسے ان کے پاس Doctor کی degree ہے لیکن ان کو کوئی interest نہیں بس وہ چاہتے ہیں میری CSS ہو جائے۔ باباجی! کیا CSS ان کے لیے سچ ہے؟ باباجی! ان کا mind کسی بھی چیز میں adjust نہیں ہوتا۔ سب سے لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔ باباجی! میں بہت پریشان ہوں۔ ایک تو گھر کا ماحول اور سے شوہر کا کام نہ کرنا۔ باباجی! آپ خود سوچیں ایسے جھگڑا ماحول میں مجھے اولاد کیسے ہوگی؟ باباجی! میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتی ہوں۔ پلیز آپ ایسی دعا کریں یا مجھے وظیفہ دیں کہ میرے شوہر کو پاکستان میں کسی بھی شہر میں اچھی جاب مل جائے جس سے میرے شوہر بھی خوش ہوں اور باباجی! میں چاہتی ہوں وہ نوکری یہاں کراچی میں نہیں ہو۔ مجھے اس ماحول سے آزادی چاہیے اور باباجی! میرے لیے اولاد کے لیے بھی دعا کیجیے گا اور اللہ تعالیٰ میرے گھر میں سکون پیدا فرمائے۔ (آمین!)

☆ بیٹی عائشہ! تم وظیفہ جاری رکھو۔ اس وقت اہم یہ ہے کہ تم خوش اور آباد رہو اور تمہارا شوہر تمہارے حقوق ادا کرے۔ باقی کیا ہو رہا ہے بھول جاؤ۔ نماز کی پابندی رکھو اور خوب دعائیں کیا کرو۔ بس یہی حل ہے۔

□ عزیز سندھو۔ سرگودھا

○ محترم باباجی! میری پریشانی کی وجہ میں بائیس سال سے ایک ذالی جائیداد کا مقدمہ ہے۔ مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے۔ مخالف بڑے طاقتور ہیں۔ میں اکیلا ان کے ساتھ مقابلہ کر رہا ہوں۔ میری ایک نہیں چلنے دیتے۔ کثیر دولت خرچ کر چکا ہوں۔ کوئی مددگار نہیں سوائے اللہ کے۔ سنا ہے آپ پریشان حال لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کی

گھر میں پریشانی رہتی ہے۔ دونوں بھائیوں کی شادی ہوئی ہے۔ والد صاحب اتنے غصے والے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ اور بددعا میں دیتے ہیں وہ بڑے بھائی سے ناراض ہیں اور حالت یہ ہے کہ دونوں بڑے بھائی والد صاحب سے بات بھی نہیں کرتے۔ میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ اب میری چھٹیاں ہیں۔ والد صاحب صرف مجھ سے خوش ہیں لیکن ان دونوں بڑے بھائیوں کی وجہ سے اب وہ کبھی کبھار مجھ پر بھی غصہ کرتے اور مجھے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ جو بابا میرے لیے دعائیں کرتا تھا اب ایسا نہ ہو کہ بددعا میں دے۔ باباجی! میں سخت پریشان ہوں۔ خدا کے لیے باباجی! کوئی ایسا وظیفہ بتا دیجیے کہ ہماری زمینیں فروخت ہو جائیں اور دونوں بھائی بھی کام کرنے لگ جائیں۔ باباجی! میرا خط اس دفعہ ضرور شامل کریں ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ باباجی! ساری عمر دعائیں دوں گا اگر میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دراز عمر دے۔ (آمین!)

☆ بیٹی شوکت! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ڈرود شریف بہت پڑھو۔ لفافے میں ہدیہ مت رکھا کرو۔ ڈاک خانے والے ہدیہ نکال کر لفافہ بھاڑ دیتے ہیں۔ بہر حال تم ہر نماز کے بعد 3-3 سبح اللہ اکبر پڑھو اور دعا کرو۔ انشاء اللہ ایک ماہ میں معاملہ حل ہو جائے گا۔

□ عائشہ۔ کراچی

○ محترم باباجی! السلام علیکم! باباجی! دل چاہا کہ آپ سے بات کر کے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دوں۔ باباجی! آپ کی دی ہوئی دعائوں سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ میرے شوہر کافی حد تک میرے ساتھ سچ ہیں۔ باباجی! لیکن میں پریشان اس وجہ سے ہوں میرے سسرال میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں بہنیں کھلے عام لڑکوں سے فون پر باتیں کرتی ہیں بیٹا ماں باپ کی عزت نہیں کرتا۔ باباجی! میں اس ماحول میں کیسے رہ رہی ہوں وہ میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتی اور دوسرا یہ کہ میرے شوہر کوئی بھی نوکری نہیں کرتے اور نہ ہی گھری کی کوئی ذمے داری اٹھاتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔ ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے.....
ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

وساطت سے میرا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔

☆ بیٹے عزیز! پریشان حال لوگوں کے مسائل حل کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، میری کیا حیثیت ہے؟ میں تو لوگوں کو مناسب دُعا تجویز کرتا ہوں اور دُعا کرنے کا طریقہ بتاتا ہوں۔ حاجت مند اپنے مالک حقیقی سے رجوع کرتے ہیں۔ رَبُّ الْعَالَمِينَ اپنے حبیب کے صدقے میں دُعاؤں کو قبول کرتا ہے اور اُن کے نتائج کو ظاہر کرتا ہے۔ رَبُّ کریم اپنے بندوں پر بے حد مہربان اور اُن سے ہر قرب سے بڑھ کر قریب ہے۔ تمہارے مسائل واقعی پریشان کن ہیں لیکن ان حالات میں اگر تم صبر اور نماز کے ذریعے اللہ سے رابطے میں رہو تو مسائل کے یہ پہاڑ ایک ذرنے سے بھی زیادہ حقیر ہو جائیں گے۔ ایک عمل بتا رہا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ اس عمل کو اسی صورت میں کرو جب تمہیں یقین ہو تم حق پہ ہو۔ ہر نماز کے بعد ایک مرتبہ آیت الکرسی پڑھو اور رَبُّ الْعَالَمِينَ سے مقدمے میں کامیابی کے لیے دُعا کرو۔ نماز فجر کے بعد دو رکعت نماز حاجت پڑھو نماز فجر کی طرح۔ دونوں رکعات میں سورۃ فاتحہ کے بعد ایک مرتبہ آیت الکرسی پڑھو۔ نماز ختم کر کے ایک سو دس مرتبہ کہو۔ حَسْبُنَا اللَّهُ نَعْمَ الْوَكِيلُ اُس کے بعد اپنے مسئلے کے لیے دُعا کرو اور نبی کریم کی ذات کو وسیلہ بناؤ۔ اس کے بعد بغیر کسی سے بات کیے گیارہ بار دُرود شریف پڑھو۔ اس کے بعد آیت الکرسی اس طرح پڑھو کہ جب يَعْلَمُهُ مَا بَيْنَ يَدَيْهِ تَوَدَّ يَعْلَمُهُ کہہ کر رک جاؤ اور اپنے دشمن کی شکست کا قصد کرو۔ اس کے بعد مَا بَيْنَ يَدَيْهِ خَالِدُونَ تک پوری آیت الکرسی پڑھو۔ انشاء اللہ کامیابی نصیب ہوگی۔

□ انیلا۔ سکھر

○ باباجی! السلام علیکم! میں ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ آج کل تو دولت مند گھروں کی لڑکیوں کو رشتے نہیں ملتے، میرا کیا مستقبل ہے؟ میری عمر ۳۶ سال ہو گئی ہے۔ میں ایک بدنصیب لڑکی ہوں۔ رشتے تو بہت آتے ہیں، کچھ کو گھر والے اہمیت نہیں دیتے اور کچھ پلٹ کر نہیں آتے۔ ہم تین بہنیں گھر کو چلانے کے لیے ملازمت کرتی ہیں۔ والد کا انتقال

ہو چکا ہے۔ والدہ حیات ہیں لیکن انہیں کوئی لڑکا پسند ہی نہیں آتا۔ کیا ہم زندگی بھر یونہی ملازمت کرتی رہیں گی؟ اگر خود کوشی جائز ہوتی تو شاید ہم کر گزرتے کیوں کہ والدہ ہمارے عم میں شوگر کی مریض ہو گئی ہیں۔

☆ بیٹی انیلا! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ جو رَبُّ الْعَالَمِينَ تمہیں عدم سے وجود میں لایا ہے اور جس نے ماضی میں تمہارے اوپر کرم کیا ہے وہ مستقبل میں بھی تمہیں ایک خوش گوار اور محفوظ زندگی عطا کرے گا۔ بس اس کا ذکر کرتی رہو اور صبر اور نماز کے ذریعے اس سے مسلسل رابطے میں رہو۔ دُعا تقدیر کے ہر بند دروازے کی کنجی ہے اور یہ کنجی رَبُّ الْعَالَمِينَ نے تمہیں عطا کر رکھی ہے اس طرح کہ اس نے دُعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔ جس ذات نے دُعا ایسی نعمت عطا کی ہے وہ تمہاری دُعاؤں کو ضرور قبول کرے گا۔ نبی کریم کے وسیلے سے زمین و آسمان کے خزانے بھی اللہ سے طلب کیے جائیں تو مل جاتے ہیں۔ ایک بہت سریع الاثر عمل تجویز کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد رکاوٹیں دور ہو جائیں گی اور اچھے رشتے اور خیر و برکت نصیب ہوگی۔ جمعے کے دن ایک گلاس پانی پر ایک مرتبہ سورۃ طہ (پارہ ۱۶) کی تلاوت کرو۔ ستر مرتبہ دُرود پڑھ کر پھونکو۔ اس پانی کو پاک صاف بالٹی کے پانی میں ملا دو۔ پہلے عام غسل کرو۔ جسم کو پاک کرو پھر کسی ٹب یا بڑے برتن میں بیٹھ کر پڑھے ہوئے پانی سے غسل کرو۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ پانی گندی جگہ پر نہ گرے۔ سارا پانی ٹب میں رہے۔ نہانے کے بعد ٹب کے پانی کو کیاری یا چھت پر ڈال دو۔ اگر کوئی زمین موجود ہو تو ٹب کی ضرورت نہیں ہے۔ مناسب سمجھو تو چالیس روز کے بعد مجھے نتائج سے مطلع کرو۔

□ نازش۔ خیر پور

○ میں اپنے ماموں زاد کو پسند کرتی ہوں وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے لیکن خاندانی رکاوٹیں حائل ہیں۔ بھائی کے دوست کی ٹیمپلی بھی اچھی ہے وہ لوگ بھی مجھے پسند کرتے ہیں لیکن بات آگے نہیں بڑھتی۔ وہ میرے چچا کے بیٹے کا دوست ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ میرا رشتہ مانگیں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایسا وظیفہ بتائیں کہ اس کے گھر والے ہمارے گھر رشتہ لے کر

☆ بیٹی ناہید! خوش اور آباد رہو۔ اولاد زینہ کے لیے تعویذ منگوا لو۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔ رزق میں کشادگی کے لیے ۲ دن تک ہر نماز کے بعد ۲ دفعہ یا باسبیط پڑھو اور دُعا کرو۔ خود اعتمادی اپنے اوپر بھروسہ کرنے کا نام ہے۔ تم اپنی ذات میں ایک مکمل لڑکی ہو لہذا ہر دم خدا کا شکر ادا کیا کرو اور خوش رہا کرو۔ لوگوں سے ملا جلا کرو۔ بات چیت کیا کرو۔ تنہا الگ تھلگ رہو گی تو رفتہ رفتہ بات چیت کرنا بھی مشکل ہو جائے گی۔ دن میں کسی وقت بھی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ۲۱ بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور اپنے اوپر دم کرو۔ وظیفے کی مدت نہیں ہے۔ جب تک چاہو کر سکتی ہو۔

□ سلمان احمد۔ مردان

☆ بیٹی سلمان! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بیٹی! محبت ایک جذبہ ہے یہ کوئی چیز نہیں جو حاصل کر لی جائے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جس شخص سے محبت کی جائے اسے حاصل بھی کر لیا جائے۔ جس سے بھی محبت کی جاتی ہے اس کی عزت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اس جذبے میں زور زبردستی نہیں چلتی۔ تم اپنے آپ کو اس قابل بناؤ کہ وہ لڑکی تمہیں پسند کرے پر جائز طریقے سے پیام بھجواؤ۔ لڑکی کو مذہب نے بھی اختیار دیا ہے کہ وہ اقرار کرے یا انکار۔ میں تمہیں بالکل اپنی اولاد جان کر نصیحت کر رہا ہوں اپنی توجہ اپنے کام اور پھر عبادت میں رکھو کامیاب رہو گے۔

□ سحرش۔ UK

☆ تمہارا خط پڑھ کر بے انتہا دکھ ہوا مگر ان حالات میں کچھ ذمے دار تم بھی ہو۔ بیٹی! اپنے شوہر کو تم خود اپنے ہاتھوں کھورہی ہو۔ انسان کو خدا نے بہت مضبوط بنایا ہے چٹانوں جیسا عزم رکھنے والا انسان کمزور ہو ہی نہیں سکتا۔ تم صرف یہ تہیہ کر لو کہ تمہیں اٹھ کر کھڑا ہونا ہے دکھ درد زندگی کا حصہ ہیں ان سے فرار ممکن نہیں۔ ہاں ان سے لڑا جا سکتا ہے۔ جب گھر کا ماحول خراب ہوتا ہے تو سب سے پہلے شوہر گھر سے دور ہوتا ہے پھر اولاد۔ تم مکمل نقصان میں آ جاؤ گی۔ بیٹی! نماز کی پابندی رکھو اور نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر گھر کے تمام افراد پر دم کرو۔ اب بھی حالات تمہارے قابو میں ہیں

آئیں۔ لڑکے کے سب گھر والے راضی ہیں لیکن اس کا بڑا بھائی جو پورے گھر کو سپورٹ کرتا ہے راضی نہیں۔ ہماری بھالی ہماری شادی نہیں ہونے دیتی۔ ہم تین بہنیں ہیں بھالی نہیں دبا کر رکھنا چاہتی ہے۔ لڑکے نے شادی کی ہاں تو بھر لی ہے لیکن وہ اپنے گاؤں جا رہا ہے وہاں اس کی بچپن کی منگیتر رہتی ہے۔ ایسا وظیفہ بتائیں کہ وہ وہاں انکار کر دے۔ میں بہت دکھی لڑکی ہوں میری مدد کیجیے۔

☆ بیٹی نازش! اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اللہ سے اپنے مقاصد کے لیے دُعا کرو۔ توجہ اور خلوص نیت سے مانگی گئی دُعا میں بہت جلد قبول ہوتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ دُعا نیک مقصد کے لیے مانگی جائے اور دُعا مانگنے والا ظالم نہ ہو ظالم ہر وہ شخص ہے جو کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکانات کے برعکس عمل سرانجام دے۔ یوں تو ہم سب گناہ گار ہیں لیکن کوشش کریں کہ گناہوں سے بچتے رہیں مثلاً جھوٹ، حسد، غیبت، خود نمائی، دوسروں کو حقیر سمجھنا، والدین کی آواز پر آواز بلند کرنا، پڑوسیوں کو اہمیت نہ دینا، نماز کو غیر اہم سمجھنا۔ بہر حال تم اس معاملے میں یہ نہ بھولو کہ اس کی منگیتر کی منگنی ختم کروانے کی صورت اپنے جیسی ایک لڑکی سے کیا ظلم کرنا چاہ رہی ہو۔ اللہ تمہیں سیدھا راستہ دکھائے۔

□ فرحانہ۔ کراچی

☆ بیٹی فرحانہ! تمہارا خط پڑھ کر نہایت دکھ ہوا۔ بیٹی! صبر سے کام لو۔ خدا تمہیں اس کا صلہ دے گا۔ بیٹی! نہایت مجرب عمل بتا رہا ہوں۔ نماز کی پابندی کے ساتھ اسے ضرور کرنا۔ کامیابی عطا ہوگی۔ خیال رہے کہ دوران عمل کسی قسم کی بخت و تکرار سے پرہیز لازمی ہے۔ تمہیں صرف خاموشی اختیار کرنی ہے۔ روزانہ نماز فجر کے بعد دو سو بار یا سارنوقف پڑھ کر کسی بیٹی چیز پر دم کرو اور یہ شیرینی دن میں کسی وقت بھی شوہر کو کھلا دو۔ یہ عمل اس وقت تک کرو جب تک تمہارا شوہر پاکستان میں ہے۔ الحمد شریف اور چاروں قل بھی پڑھ کر ضرور دم کیا کرو۔ مجھ سے رابطے میں رہو۔ مناسب ہوگا کہ مجھ سے پہلے تعویذ منگوا لو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ ناہید۔ گوادر

READING
Section

مدت ۳۱ دن ہے پھر وظیفہ ترک کیے بنا مجھے مطلع کرو۔

□ شگفتہ - کینیڈا

○ محترم باباجی! اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ مشکل وقت میں ہمیشہ آپ سے رابطہ کیا اور آپ نے میری رہنمائی فرمائی۔ باباجی! اب میں پھر بہت مشکل میں گرفتار ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے شوہر بہت اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔ میری طبیعت بھی بہت خراب رہتی ہے۔ باباجی! جب سے ہم اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آئے ہیں صرف مسائل ہی مسائل ہیں۔ مجھے کچھ ایسا حل بتائیے کہ سارے مسائل حل ہو جائیں۔ میں آپ کی ممنون رہوں گی۔

☆ بیٹی شگفتہ! ایک بات یاد رکھو کہ جب صدقہ و خیرات روک لیا جاتا ہے تو پھر بہت سی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اللہ کی راہ میں دینے سے رزق میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو کچھ رقم خیرات کرو۔ نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد ایک تسبیح یا ارحم الراحمین کی پڑھو اور حاجات ایک ایک کر کے بیان کرو۔ مدت ۲۱ دن ہے۔

□ عروشے - مقام نامعلوم

○ محترم باباجی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ آپ کی خدمت میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں مگر میرے ابو اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ مجھے ایسا وظیفہ دیں کہ میرے ابو اور سب گھر والے اس رشتے کے لیے راضی ہو جائیں۔ باباجی! میں بہت پریشان رہتی ہوں۔ میری عمر بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ مہربانی کر کے میرے لیے دعا کریں کہ میرا رشتہ جلدی طے ہو جائے اور کوئی بھی مشکل وغیرہ پیش نہ آئے۔ باباجی! آپ مجھے استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ رشتہ میرے لیے بہتر ہے کہ نہیں؟ باباجی! آپ مجھے مہربانی کر کے اس ماہ جواب دیں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی عروشے! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بیٹی! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ والدین کی رضامندی سے شادی کرو خوش رہو گی۔ ماہ محرم شروع ہو چکا ہے، خوب

مزید دیر نقصان دہ ہوگی۔ مجھ سے رابطے میں رہو اپنا آپ سنبھالو اپنا گھر سنبھالو۔ یہ سب صرف تمہارے ہاتھ میں۔ تم سے کتنے لوگ واسطے میں ہیں انہیں دکھ مت دو۔ خوش رہو اور خوش رہنے دو۔ ایک دفعہ سوچ لو کہ سب ٹھیک ہے تمہیں سب ٹھیک نظر آئے گا۔ اپنے بھائی کے بارے میں مجھے تفصیل سے لکھو جو بھی ممکن ہو! میں اس سلسلے میں کروں گا۔ اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔

□ صغیر - کوئٹہ

☆ بیٹے صغیر! سب سے پہلے تو نماز کی پابندی رکھو اور ذرہ ذرہ شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد ایک ایک ہزار بار پڑھو اللہ الصمد اور حاجت بیان کرو۔ یہ عمل لگا تا ۳۱ دن کرنا ہے۔ ایک دن بھی اگر نماز قضا ہوئی تو پھر نئے سرے سے وظیفہ شروع ہوگا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ شہزادی - کوٹری

☆ بیٹی شہزادی! تمہارا خط طوالت کے باعث شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ نماز کی پابندی از حد ضروری ہے۔ نماز فجر اور عصر کے بعد ۷۰۰-۷۰۰ بار پڑھو لا الہ الا اللہ اور حاجات ایک ایک کر کے بیان کرو۔ مدت اکیس دن ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو وہ ضرور کرم کرے گا۔

□ عابدہ - لاہور

☆ بیٹی عابدہ! دونوں حاجات کے لیے ۳۱ دن تک نماز فجر کے بعد ۳۱ بار الحمد شریف پڑھو اور حاجات بیان کرو۔ نماز عصر سے پہلے اپنے ہاتھوں سے چڑیوں کو باجرہ ضرور ڈالا کرو۔ اللہ سے بہتری کی دعا کرو۔ کرم ہوگا۔

□ سائرہ - وہاڑی

☆ بیٹی سائرہ! جو لوگ دوسروں کو دکھ دیتے ہیں جائز حق داروں کا حق نہیں دیتے تیسوں کا مال کھاتے ہیں ایسے تمام لوگ زمین پر عبرت کا نمونہ بنتے ہیں۔ اللہ انہیں ڈھیل ضرور دیتا ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو بہت سخت عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ تم صرف اللہ سے مدد مانگو۔ تمہارا شوہر محنت کرتا ہے بہت اچھی بات ہے۔ جو لوگ بہت محنت کرتے ہیں ان کو صلہ بھی بہترین ملتا ہے۔ بچے چھوٹے ہیں اس لیے سہل وظیفہ دے رہا ہوں۔ نماز عصر اور عشاء کے بعد ۷۰۰-۷۰۰ بار یا باسٹ پڑھو اور دعا کرو۔

بعد ایک بار سورۃ یسین ضرور پڑھو۔ انشاء اللہ معاملات بہتر ہوں گے۔

□ صوفیہ۔ جن

○ السلام علیکم! باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ایک ہی گھر ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ میری والدہ بہت بیمار رہتی ہیں۔ سب اسی فکر میں ہیں کہ میری والدہ کی آنکھ بند ہوتے ہی گھر کو بیچ دیں۔ باباجی! میں بہت پریشان ہوں! میں کدھر جاؤں گی؟ بھائی ساتھ رکھنے پر خوش نہیں ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا ہے میرے اوپر کالا علم کیا گیا ہے۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ اللہ کی طرف سے ہی دیر ہے یا کسی نے کوئی بندش وغیرہ کر رکھی ہے؟

☆ صوفیہ! اللہ تمہاری مشکلات حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ ظہر اور عشاء کے بعد 33 بار سورۃ الفاتحہ پڑھو اول و آخر دُرود شریف پڑھو اور حاجت پوری ہونے کی دعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

☆☆.....☆☆

دُعائیں کرو اور اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ طہ ضرور پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ فائزہ۔ ٹیکسلا

☆ بیٹی فائزہ! غصے پر قابو نہ رکھنے والے دراصل شیطان کے غلام ہوتے ہیں۔ تمہیں اپنی اس کی پر خود قابو پانا ہوگا اور بیٹی.....! شادی ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ اگر تمہارا یہی انداز رہا تو شادی کا برقرار رہنا ممکن نہ ہوگا۔ اپنے اندر صبر و تحمل پیدا کرو اور وہ ایسے ہوگا کہ نماز کی پابندی رکھو۔ ہر وقت با وضو رہو اور بعد نماز عصر قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھو۔ مجھے ایک ماہ بعد اپنے حالات سے آگاہ کرو۔

□ ادینہ۔ کراچی

☆ بیٹی ادینہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ مجھے تمہارے حالات جان کر بہت دکھ ہوا تھا اور بعض اوقات دکھ اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان کے پاس الفاظ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ بہر حال بیٹی! اللہ پر بھروسہ رکھو۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف کو اپنی عادت میں شامل کر لو۔ نمازِ فجر کے

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

- ☆ اگر آپ اپنے حلق اور گلے کے مسائل اور دوسری جلدی بیماریوں سے پریشان ہیں؟
- ☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
- ☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔
- ☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

88-C II فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈینٹس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی

ماہنامہ پارک

ڈکی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مزاہ سلون اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

ہوتے ہیں۔
☆ زندگی کے اسٹیج پر اپنی شہنائی بجائیں، دوسروں کی نہیں۔
☆ ہر بات کا روشن پہلو دیکھنا دانشمندی نہیں کیونکہ تصویر کے بھی دور رخ ہوتے ہیں۔
☆ جاہل کے لیے سب سے اچھی بات خاموش ہے۔
☆ عقل کی کوئی حد ہو سکتی ہے عقلی کی کوئی حد نہیں۔

مرسلہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

رازق

ایک مسافر تھکا ہارا رات کو کسی گاؤں کی مسجد میں پہنچا۔ امام صاحب موجود تھے۔ مسافر نے ان سے کھانا طلب کیا تو امام صاحب نے پوچھا۔ ”کیا تم نے نماز پڑھی؟“

مسافر بولا۔ ”بخدا میری عمر اسی برس ہے میرے خدا نے آج تک رزق دینے سے پہلے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے نماز پڑھی یا نہیں؟“

مرسلہ۔ ریحانہ علی، کوٹ ادو

پیمائش

نہ کبھی ہماری محبت کی آزمائش کر سکو گے
جان سے زیادہ کیا فرمائش کر سکو گے
چاہتے ہیں تم کو اتنا جتنا سمندر میں ہے پانی
کیا سمندر کے پانی کی پیمائش کر سکو گے
شاعرہ: فریدہ جاوید فری۔ لاہور

یہ اللہ والے

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ساری رات ایک باغ سینچا اور اجرت میں تھوڑے سے جو حاصل کیے۔ حضرت فاطمہؓ نے ان کا ایک حصہ لے کر آنا پیسا اور کھانا تیار کیا۔ عین کھانے کے وقت ایک مسکین نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا۔ ”میں بھوکا ہوں۔“ حضرت فاطمہؓ نے وہ سارا کھانا اسے دے دیا، پھر باقی اناج کا کچھ حصہ لے کر پیسا اور کھانا پکایا۔ ابھی کھانا پک کر تیار ہی ہوا تھا کہ ایک یتیم نے دروازے پر آ کر دست سوال دراز کیا۔ وہ سارا کھانا اسے دے دیا گیا۔ خاتونِ جنت نے پھر باقی اناج پیسا اور کھانا تیار کیا۔ اتنے میں ایک مشرک قیدی نے اللہ کی راہ میں کھانا مانگا، تیار شدہ کھانا اس کو دے دیا گیا۔ غرض سب اہل خانہ نے اس دن فاقہ کیا۔

تذکار صحابیات از طالب ہاشمی
مرسلہ۔ ممتاز اقبال اعوان۔ لاہور

انمول موتی

☆ تجھے اپنی زندگی کا سفر اکیلے ہی طے کرنا ہے کسی ہمدرد کی امید پر بھروسہ نہ رکھ۔
☆ بہ نسبت مصیبت کے خوشحالی زیادہ سخت امتحان کا وقت ہے خصوصاً جبکہ دفعتاً خوشحالی ہو جائے اس صورت میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔
☆ محبت گفتگو کی سمت ہے۔
☆ چھوٹے غم واویلا کرتے ہیں۔ بڑے غم خاموش

خیالات کی ندرت

ہے۔

☆ پاکستان کی سب سے بڑی لائبریری پنجاب یونیورسٹی کی ہے۔

مرسلہ: رانا حبیب الرحمن۔ سینٹرل جیل۔ لاہور۔

سانحہ پشاور!!

شوق تھا تعلیم کا یہ مدرسے میں سو گئے
یہ زمینوں کے ستارے آسماں میں کھو گئے
یہ میرے ننھے فرشتے باغباں تھے باغ کے
خون کے قطروں سے دیواروں میں کلیاں بو گئے
اے شہید و جان دے کرتم نے یہ احساں کیا
بکھری بکھری قوم تھی ہم لوگ یکجا ہو گئے
سڑگوں رتے تھے جو قوم عالم میں کبھی
سراٹھا کر زندگی گزارنے کے قابل ہو گئے۔

شاعر: شاہد رفیق سہو۔ کبیر والا

ماں کا دکھ

باپ کے انتقال کے بعد بیٹے نے ماں کو شہر کے اولڈ
ہاؤس میں داخل کر دیا اور سال میں صرف ایک بار
حیریت دریافت کرنے چلا جاتا۔ ایک دن اولڈ ہاؤس
سے فون آیا کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔
جب وہ وہاں پہنچا تو ماں عالم نزع میں تھی۔ بیٹے نے
روتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

”ماں! میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“ ماں بولی۔

”بیٹا! اس اولڈ ہاؤس میں سچے لگوا دو یہ اکثر خراب
رہتے ہیں۔“ بیٹا حیران ہو کر بولا۔

”ماں تو کالی عرصہ یہاں رہی۔ اب آخری وقت
میں یہ فرمائش کیوں؟“ ماں بولی۔

”بیٹا میں نے تو جیسے تیسے وقت گزار لیا لیکن ڈرتی
ہوں کہ کل جب تیرے بچے تجھے یہاں چھوڑ جائیں
گے، تو، تو اتنی گرمی کیسے برداشت کر پائے گا۔“

مرسلہ: سدرہ انور علی۔ جھنگ، صدر

سوئی

صبح ناشتے میں ایک پرائٹ، انڈے کے ساتھ اور
ستی دور کرنے کو میں دو بڑے چائے..... دوپہر

دنیا میں ہر کام خیال کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ خیال ہی سے یہ ساری ایجادات اور ترقیاتی کام ہوئے ہیں۔ انسانی ذہن میں ایک سکینڈ میں تین خیالات آتے ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ان پر توجہ دیں اور ضروری خیالات کو توجہ دے کر اپنے عمل میں شامل کریں۔ دنیا میں کامیاب لوگ وہی ہیں جو اپنے ہی خیالات پر توجہ دیتے ہیں اور ان سے Positive کام لیں۔ اسی طرح ضروری ہے کہ ہم اپنے خیالات کا انخلاء بھی کریں۔ روزانہ رات کی گہری نیند میں ہم جب اپنے ذہن کو سکون دیتے ہیں تو خیالات کا انخلاء ہوتا ہے لیکن لوگوں کی نیند سچی ہو، پوری نہ ہو اور پریشان خیالی ہو تو جاگتی حالت میں روزانہ 5 منٹ اپنے خیالات کو تنہا چھوڑ دیں۔ ریلیکس ہو کر بعد نماز درود شریف پڑھ کر اپنے اوپر پھونک لیں اور آنکھیں بند کر کے اپنے خیالات کو روکیں جو کچھ آ رہا ہے آنے دیں پھر اپنے خیالات کو Positive انرجی دے کر اپنے آپ کو ریلیکس کریں اور کام کی نئی طاقت لے کر مسکراتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آپ یقین کریں کہ اس طرح آپ کے بقایا کام بہت اچھی طرح ہوں گے۔ یوں صرف خیال کی ندرت کی وجہ سے آپ میں مثبت انرجی بڑھتی چلی جائے گی۔

حسن خیال: نزہت ناز۔ کراچی

معلومات پاکستان

☆ پاکستان میں سب سے بڑی مسجد کراچی بحریہ

ٹاؤن میں بنائی گئی ہے۔

☆ پاکستان کی تاریخی اہمیت کی حامل موٹر وے کا

افتتاح 26 نومبر 1997ء کو ہوا۔

☆ پاکستان میں تیار ہونے والے بلند ترین کیک کا

وزن آٹھ ٹن تھا۔ جس کی تیاری میں 156 گھنٹے لگے۔

☆ پاکستان کے غوری میزائل کی رینج 2300

کلومیٹر تک ہے۔

☆ پاکستان کے جہلم پل کی لمبائی 5000 فٹ

ہے۔

☆ پاکستان میں فوجک سرنگ 2043 میل لمبی

READING
Section

وہ تو تمہیں بھول چکا ہے کب سے
تم بھی اُسے بھول جاؤ اے دل
ہماری جاں لبوں تک آگئی قمر
اب تو ہمیں نہ آزماؤ اے دل
جب وہ ہی نہیں دھڑکن میں تمہاری
اب تو دھڑکنا بھول جاؤ اے دل

شاعرہ: شمسہ قمر۔ کراچی

زندگی کا سفر

زندگی کا سفر تو ہر انسان طے کرتا ہے اور اسے کرنا ہی ہوتا ہے لیکن بعض کے لیے اس سفر میں مشکلات پیش آتی ہیں کچھ لوگ راستے میں بھٹک جاتے ہیں اور کچھ خوش قسمت آسانی سے یہ سفر طے کر کے کامیابی و کامرانی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ دراصل زندگی بسر کرنا بھی ایک فن ہے جو ہر ایک کو نہیں آتا۔ یوں زندہ رہنے کو تو سب ہی لوگ زندہ رہتے ہیں لیکن زندگی برتنے کا سلیقہ اور قرینہ سب کو نہیں آتا۔ یہ بات جاننے اور سمجھنے کے لیے اُن اہل قلم کی تحریریں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات رقم کیے ہیں خاص طور پر جنہوں نے اپنی سرگزشت حیات یا سوانح عمری تحریر کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ زندگی کے سفر میں آنے والی مشکلات اور بے کار باتوں پر انہوں نے کیسے قابو پایا اور پھر زندگی کو کس طرح کامیابی سے بسر کیا۔ ہر شخص کے مشاہدات و تجربات مختلف ہوتے ہیں کیونکہ وہ مختلف ماحول اور حالات سے دوچار ہوتے ہیں اس لیے ہر سوانح عمری میں قارئین کے لیے پڑھنے اور سیکھنے کو بہت کچھ ہوتا ہے۔

سینئر مسز تنویر خالد کی کتاب ”زندگی کا سفر“ سے
ماخوذ۔

مرسلہ۔ ایم افضل آزاد۔ ساہیوال

غزل

مُذْنَم آ نکھیں بکھرے بال
کہہ رہے ہیں سب احوال
سنگ سنگ چلتے جائیں
میرا سفر تیرا خیال

میں بس ایک روٹی سالن کے ساتھ..... شام کی چائے
کے ساتھ کچھ پکوڑے ایک آدھ سموسہ بس..... رات کے
کھانے میں ایک روٹی کچھ زیادہ سالن..... اور رات
سونے سے پہلے نیم گرم دودھ ہاں نا تھکن کے بعد نیند
کہاں آتی ہے..... اور اگر رات کو آنکھ کھلے تو دو مکھن
سلاٹس تاکہ پیٹ بھرا رہے۔۔۔ برے خواب نہ آئیں۔ پھر
بھی آج تک میں یہ نہ سمجھ پائی سب مجھے ’موٹی‘ کیوں
کہتے ہیں..... کھانی کہاں ہوں میں۔

زورِ قلم: عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

مونالیزا

دنیا کی سب سے مشہور اور سب سے سادہ
تصویر ایک عورت کی ہے جو نہ کوئی ملکہ بھی نہ شہزادی نہ کسی
صدر یا کسی وزیراعظم کی ماں، بہن، بیٹی، بیوی۔ نہ کوئی
دولت مند عورت بھی بس وہ ایک معمولی سی دیہاتنہی۔
اس تصویر کا تخلیق کار عظیم اطالوی مصور لیونارڈو دا وینچی تھا
اور اس عورت کا نام تھا مونالیزا..... یہ تصویر کئی بار چرائی
گئی اور کئی بار اس کی نقل بھی ہوئی۔ آج لیونارڈو دا وینچی
کے ہاتھ کی بنائی یہ تصویر لوور میوزیم کے برآمدے میں
ایک دیوار پر آویزاں ہے۔ مونالیزا کی مسکراہٹ یورپ
بھر کو مسخر کرتی ہوئی ہمارے ایشیائی کچھڑ میں بھی در آئی
ہے۔ اس مرنج میں سب سے اہم نکتہ مونالیزا کی دہلی دہلی
معصومانہ مادرانہ خواہرانہ اور محبوبانہ مسکراہٹ ہے۔ یہ
مسکراہٹ ٹیکسپیٹر کے کرداروں یا غالب کے بہت سے
اشعار کی طرح ہے جن کے ہزاروں مفہوم ہیں جن میں
ہزاروں عالم چھپے ہیں۔

جمیل الدین عالی کی تصنیف ”دنیا مرے آگے“

سے انتخاب
حسن انتخاب۔ شاعر عتیق کراچی۔

غزل

جانے والا تو جا چکا ہے کب سے
اب تو اے نہ بلاؤ اے دل!
ابھی تو سکوں سے بیٹھے ہیں ذرا
اب تو ہمیں نہ ستاؤ اے دل
روتے ہوئے زمانے بیت گئے ہیں
اب تو کھل کے مسکراؤ اے دل

چیزوں کے بھی اچھے پیسے دیتا ہوں۔“
 ”لیکن میں نے تو تمہیں نہیں بلایا؟ میرا تو ہارمونیم
 بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں؟“ صاحب خانہ کا چہرہ سرخ
 ہو گیا۔ ”اور تم سے کس کم بخت نے کہا کہ میرا ہارمونیم
 ردی ہے؟ میں تو اسے صبح سے شام تک بجاتا ہوں؟“
 ”مجھے کیا معلوم صاحب مجھے تو آپ کے پڑوسیوں
 نے چندہ جمع کر کے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں ہر
 قیمت پر آپ سے ہارمونیم خرید لوں۔“ ٹھیلے والا سر کھجا کر
 بولا۔

مرسلہ۔ عامر بشیر خان۔ کراچی

فیصلہ

مقدمے کی سماعت کے سارے عرصے میں جج
 صاحب اپنے ذہن پر زور دیتے رہے کہ انہوں نے ملزم
 کو پہلے کہاں دیکھا تھا؟ جب سماعت مکمل ہو گئی اور صرف
 فیصلہ سنانا باقی رہ گیا تو وہ اپنے ججس پر قابو نہ پاسکے اور
 آخر ملزم سے پوچھ ہی بیٹھے کہ انہوں نے ملزم کو پہلے کہاں
 دیکھا تھا؟

ملزم نے کہا۔ ”جناب“ میں آپ کی بیگم صاحبہ کو
 موسیقی کا سبق دیا کرتا تھا۔“
 ”چودہ سال قید بامشقت.....“ جج صاحب نے
 فوراً فیصلہ سنا دیا۔

مرسلہ۔ محمد جواد انور اسلام آباد

خدا سے

میں پذیرائی کے آداب سے واقف ہوں
 مگر

اب کے برس میرے گھر
 یا تو برسات آئے
 یا مری تہائی

شاعرہ۔ پروین شاکر

حسن انتخاب۔ یاسمین عمران کوپرا۔

انمول موتی

☆ موت ایسا قرض ہے جو ہم سب کو ایک دن ادا
 کرنا ہے۔
 ☆ اگر منزل پانا چاہتے ہو تو کبھی مایوس نہ ہونا۔

سلجھے سلجھے تیرے خواب
 اُلجھے اُلجھے میرے سوال
 اپنا دل بے بس مہرہ
 تیری شطرنج، تیری چال
 تیرے غم میں کرچی کرچی
 تیرا شاعر، تیرا افشال

شاعر: نزابت افشال۔ مہورہ، فتح جنگ

ٹائی ٹینک

ٹائی ٹینک کی غرق آبی شاید اب تک کاسب سے
 مشہور حادثہ ہے تاہم اب تک ہونے والے حادثات
 میں مالی اعتبار سے اس کا نمبر دسواں ہے۔ 15 اپریل
 1912ء کو اس وقت کاسب سے بڑا اور لگژری جہاز جس
 پر تقریباً 1,800 افراد اپنی منزل کی طرف گامزن تھے
 وقت سے پہلے انجن کی طاقت بڑھانے سے اس کی رفتار
 تو تیز ہو گئی لیکن اس طرح وہ رات کی تاریکی میں ایک
 برفانی تودے کے قریب پہنچ گیا جس کی اطلاع کپتان کو
 پہلے ہی دی جا چکی تھی، جسے کپتان نے نظر انداز کر دیا
 تھا۔ نتیجتاً جب جہاز تودے کے بالکل قریب پہنچ گیا تو
 اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ تمام تر کوششوں کے باوجود نہ
 تو اسے روکا جاسکا، نہ ہی اس کا رخ موڑا جاسکا۔ او آرا ایم
 ایس ٹائی ٹینک برفانی تودے سے ٹکرا گیا۔ جس کی وجہ
 سے انجن روم اور بواکس روم میں پانی بھر گیا۔ یوں یہ
 سمندر کے نیچے بستی پانی میں غرق آبی ہو گیا اور اس
 میں سوار 1,500 افراد لقمہء اجل بن گئے۔ اس عظیم
 جہاز کی تیاری پر 1912ء میں 7 ملین ڈالرز کے
 اخراجات آئے تھے جو موجودہ دور کے 150 ملین ڈالرز
 کے برابر ہیں۔

تحقیق: عمران لاری

مرسلہ: شاہانہ خان۔ کراچی

درخواست

نیم ڈے اور ردی اخبار خریدنے والے نے ایک
 گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور صاحب خانہ کے باہر آنے پر

”میں آپ کا ہارمونیم خریدنے آیا ہوں“ میں ردی
 بولا۔

مٹی کا دیا

اباجی مجھے مارتے تھے تو امی بچا لیتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ اگر امی پٹائی کریں گی تو اباجی کیا کریں گے؟ یہ دیکھنے کے لیے میں نے امی کا کہنا نہ مانا۔ انہوں نے کہا۔ ”بازار سے دہی لا دو۔“ میں نہ لایا۔ انہوں نے سالن کم دیا۔ میں نے زیادہ پراصرار کیا۔ انہوں نے کہا۔ ”بیڑھی کے اوپر بیٹھ کر روٹی کھاؤ۔“ میں زمین پر دری بچھا کر بیٹھ گیا۔ کپڑے میلے کر لیے۔ مجھے پوری توقع تھی کہ امی ضرور ماریں گی مگر انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ ”کیوں پتر! ماں صدقے تو بیمار تو نہیں؟“ اس وقت میرے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہیں تھے۔

میرزا ادیب کی کتاب ”مٹی کا دیا“ سے انتخاب
حسن انتخاب۔ کوثر اسلم، راولپنڈی۔

جھوٹا

”چوکیدار! رات کو میرے گھر میں چوری ہو گئی تمہیں کچھ پتا بھی نہیں؟ کیا تم نے رات کھٹ پیٹ کی کوئی آواز سنی تھی؟“

مالک مکان نے چوکیدار سے استفسار کیا۔
”ہاں جناب، آواز تو سنی تھی پھر میں نے پوچھا تھا کہ کون ہے؟ اندر سے آواز آئی۔“ کوئی نہیں۔“ جناب، وہ صرف چور ہی نہیں بلکہ جھوٹا بھی تھا۔“ چوکیدار نے غصے سے بولتے ہوئے مالک مکان کو لاجواب کر دیا تھا۔
مرسلہ۔ زین ظہور، کراچی۔

غلط ہاتھ

شوہر اپنی تھپس کے بٹن ٹانگ رہا تھا۔ بیوی نے دیکھ کر کہا۔ ”سوئی غلط ہاتھ میں ہے۔“
شوہر نے کہا۔ ”ہاں اسے تمہارے ہاتھ میں ہونا چاہیے تھا۔“
مرسلہ۔ ام حبیبہ۔ ملتان

ایک قطعہ

مرا سکون، مرا صبر و قرار تم سے ہے
مری حیات، مرا اعتبار تم سے ہے
تم ہی کو دیکھ کے آنکھیں مری ہوئیں روشن
مرے حسین چمن کی بہار تم سے ہے
شاعرہ۔ نزہت عباسی
حسن انتخاب۔ نگہت منیر۔ اوکاڑہ

☆ کسی غریب انسان کے بھدے اور پھسے ہوئے لباس کو نہ دیکھو بلکہ اس کی شرافت اور انسانیت کو دیکھو۔
☆ آخرت کا کام آج کر لے۔ دنیا کا کل کر لینا۔
☆ خوش کھایا ایسا پھول ہے جو مرجھاتا نہیں۔
مرسلہ۔ شاہدہ سعید، گوجرانوالہ۔

دعوے دار

جان میجر جب وزیراعظم کے عہدے پر فائز تھے۔ (1990-97) تو لیڈی ڈیانا کے دوست دودی الفائد کے والد نے ان کے بھائی ٹیری میجر کو لندن میں واقع اپنے اسٹور کے گیٹ کیپر کی نوکری پیش کی تھی لیکن ملازمت کا ضرورت مند ہونے کے باوجود ٹیری میجر نے پیشکش اس لیے مسترد کر دی کہ ان کے بھائی جان میجر کہیں شرمندگی محسوس نہ کریں۔ ہمیں حیرانی اس بات پر ہے کہ ملک کے وزیراعظم ہونے کے باوجود جان میجر اپنے بھائی کو کوئی ملازمت فراہم نہ کر سکے۔ پاکستان جیسا کوئی ملک ہوتا تو بھائی تو ایک طرف، وزیراعظم کے گدھوں، گھوڑوں کو بھی بائیس گریڈ کی ملازمت مل جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے جھوٹے دعوے دار تو ہم ہیں لیکن اس کی حقیقی روح پر عمل کرنے والے مغربی ممالک ہیں۔
پروفیسر محمد سلیم کے آرٹیکل ”سیرِ راہے“ سے انتخاب
مرسلہ۔ زبیدہ اکرم، کراچی۔

ثبات

درختوں میں ہوا جھوما کرے گی
پرندے گائیں گے باغوں کے رخ پر
پونہی رقصاں رواں پانی ہے گا
گرے گی ایسے ہی سبزے پہ شبنم
گھلے گی شام کو پر بت میں سرخی
پونہی کھیلیں گے میدانوں میں لڑکے
بلیں گی چھپ کے ہیریں زرا بگھنوں سے
سین گے لوریاں ماؤں سے بچے
مری ہستی کی مٹھی بھر یہ مٹی
کہیں ذروں میں ذرہ ہو رہے گی

شاعرہ۔ ترنم ریاض، دہلی۔

حسن انتخاب۔ رقیہ یوسف، ڈسکہ۔



قارئین

اپنی سخنِ فہمی کو آزمائیے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

العام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

ملائکہ حریم۔ اوکاڑہ

عمر رواں، خزاں کی ہوا سے بھی تیز تھی
ہر لمحہ برگِ زرد کی صورت بگھڑ گیا

اشفاق شاہین۔ کراچی

جو دل میں قیام کرتے ہیں
یقین مانو! یہی نیندیں حرام کرتے ہیں

مسز نگہت غفار۔ کراچی

کوئی تو پھول کھلائے دعا کے لہجے میں
عجب طرح کی ٹھٹھن ہے ہوا کے لہجے میں
نہ جانے خلقِ خدا کون سے عذاب میں ہے
ہو میں چیخ پڑیں التجا کے لہجے میں

سدرہ انور علی۔ جھنگ

موت تو نام سے بدنام ہے ورنہ
تکلیف تو زندگی بھی بہت دیا کرتی ہے

عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

دعا کے ہاتھ پہ کوئی ظلم لکھ دینا
قبول ہو کے رہے ایسا اسم لکھ دینا
لغت جو عشق کی ترتیب دو تو یوں کرنا
وفا کو روحِ محبت کو جسم لکھ دینا

فرح انیس۔ کراچی

یہ محبت ہے جو پاگل سا بنا دیتی ہے
ورنہ ہر شخص سمجھدار ہوا کرتا ہے

سعدیہ عابد۔ نار تھ کراچی

کئی زمانے میں اپنی کڑی شکست کے بعد
خود اپنے ٹوٹے ہوئے بازوؤں میں قید رہا
وہ ایک چہرہ جو آنکھوں میں آسا تھا کبھی
تمام عمر میرے آنسوؤں میں قید رہا
نزاہت انشال۔ مہورہ، فتح جنگ

مدتوں بعد اُس نے پوچھا اب کہاں رہتے ہو
میں نے بھی کہہ دیا کہ اپنی اوقات میں

ارم خان۔ ڈی جی خان

تو کر دے اپنا سودا محبت سے اے دل نگر سن لے
میں تیری قیمت محبت سے وفا لوں گی

ملازم حسین۔ لیہ

تم جو کہو تو زندگی کی اگلی سانس لینا بھی بھول جاؤں
اک تجھ کو بھول جانا، مرے بس کی بات نہیں

ماہین فاطمہ۔ اوکاڑہ

کر لی نائلی تم نے دل توڑ کر میرا
کہا بھی تھا کچھ نہیں اس میں، تمہارے سوا

داؤد اشفاق۔ اوکاڑہ

تجھ سے ملنے کی تمنا لیے دل میں اب تک
میری حسرت، تیری فرصت کی طلب گار ہی رہی

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پھیرنے کی ادیت سہ چکی ہوں
کوئی غم اس سے بڑھ کر مانگتی ہوں
شازیہ ظہیر..... ساہیوال
ہاتھ کی اک لکیر بھی نہ گئی
میری تقدیر کے ستارے تک

عاشی شرافت..... گوجرانوالہ

یہ اور کچھ بھی نہیں، عشق کی کرامت سے
تسلی ورنہ ترے نام سے نہیں ملتی
جو زندگی دل ناکام سے ملی ہے مجھے
تمام عمر کسی کام سے نہیں ملتی

اللدرکھی..... سندھ

کوئی دوست ہے نہ رقیب ہے
تیرا شہر کتنا عجیب ہے
یہاں کس کا چہرہ پڑھا کروں؟
میرے کون اتنا قریب ہے؟

ثریا شاہد..... حیدرآباد

کیسے ممکن ہے دل بھی جلے اور دھواں نہ ہو؟
چوٹ پڑتی ہے تو پتھر بھی صدا دیتے ہیں

نسرین یاسین..... حیدرآباد

بڑا گمان تھا موسم شناس ہونے کا
وہی بہانہ بنا ہے اواس ہونے کا
فضا مہکنے لگی، روشنی جھلکنے لگی
جو یہ نشان ہے ترے آس پاس ہونے کا

☆☆.....☆☆

رئیسہ خالد۔ اسلام آباد
بہت آرام کرنا چاہتی ہوں
یہی اک کام کرنا چاہتی ہوں
میں اپنی عمر کے سارے خزانے
تمہارے نام کرنا چاہتی ہوں

شرین راجپوت۔ کھاریاں

قسمت نے تجھ کو چھین لیا مجھ سے اور پھر
ہے زندگی میں کس کی کئی پوچھتی رہی

رضوانہ کوثر۔ لاہور

عشق مانگے ہے مجھ سے اپنا خراج
اور وامن میں کچھ بچا بھی نہیں
عکس روٹھا ہوا ہے کیوں مجھ سے
آئینہ مجھ کو دیکھتا بھی نہیں

نرہت ناز۔ کراچی

قیمت ہر ایک شے کی مقرر ہے شہر میں
فسوس، آدمی بھی برائے فروخت ہے

ایم افضل آزاد۔ ساہیوال

چراغِ رہگزر سے دشمنی جن کا وتیرہ ہے
اجالے میں اندھیرے راستے تجویز کرتے ہیں

مور شاہد حسین۔ قمبر

زمانے والوں سے چھپ کے رونے کے دن نہیں ہیں
اسے یہ کہنا اداس ہونے کے دن نہیں ہیں

راشدہ اعجاز..... کراچی

ستاروں سا مقدر مانگتی ہوں
میں آئینے سے پتھر مانگتی ہوں

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

کوپن برائے



نومبر 2015ء

نام:

پتہ: